کمیٹی ماہرین تعلیم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

کا

سہ ماہی رسالہ

[illegible]

زیرِ ادارت

ڈاکٹر سید ظفر الحسن، پی ایچ ڈی، ڈی فل — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

خواجہ غلام السیدین بی اے، ایم ای ڈی

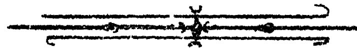
طابع وناشر:- محمد مقتدی خاں شروانی

مقام طبع ونشر:- مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

تعلیم و تربیت

جلد (۱) | جنوری ۱۹۲۸ء مطابق رجب المرجب ۱۳۴۶ھ | نمبر (۱)

فہرست مضامین



مضامینِ خاص

تعلیم ماضی و حال

ہندوستان میں رسالوں کے اجرا کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن اکثر رسالوں میں نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے نہ امتیاز اور وہ بغیر شہرت یا نیک نامی حاصل کیئے ختم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی اشاعت نیک ارادہ پر مبنی ہوتی ہے، لیکن لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ کن ذرایع سے رائے عامہ کی اصلاح ہو سکتی ہے اور کس طرح اس کی رہ نمائی کی جا سکتی ہے کہ اپنے ملک کے مقاصد کے لیئے بہترین نتائج مترتب ہوں۔ ایسے حالات میں جب کوئی نیا رسالہ جاری ہوتا ہے تو تشریح مقاصد کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ میں موجودہ رسالہ کی سکیم میں ابتدا ہی سے شریک رہا ہوں اس لیئے میں بہت خوشی سے اس فرض کو اپنے ذمّہ لیتا ہوں۔ میں اِس کام کو بغیر کسی پس و پیش کے اس لیئے بھی کر سکتا ہوں کہ میرا اس رسالہ کی ادارت سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے اور میں اس کے متعلق جو کچھ رائے دونگا اس میں خود بینی کا شائبہ مطلق نہ ہوگا۔

میں ایک مرتبہ علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ میرے قیام کے دوران میں چند سنجیدہ طبیعت کے احباب نے آپس میں اِس بات کے متعلق مشورہ کیا کہ دنیا کے تازہ ترین تعلیمی تجربات سے کس طرح فائدہ اُٹھایا جائے تاکہ ان سے ہمارے اپنے تعلیمی مسائل پر روشنی پڑے۔ مختلف تجاویز کے ضمن میں ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی کہ اردو میں ایک تعلیمی رسالہ جاری کیا جائے جس کی عنان ادارت قابل لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور اس کو تعلیمی کانفرنس، ٹریننگ کالج اور علی گڑھ کی دوسری انجمنوں کے لیئے ایک مفید معاون بنایا جائے۔ اس قسم

کے رسالے کے ذریعے دوسری زبانوں کے بارآور اور مفید تعلیمی خیالات کو اپنی زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور وقتاً فوقتاً خود اپنی قومی تعلیم کے مقاصد، نصب العین، طریق عمل اور مجموعی نظام پر مبصرانہ اور ناقدانہ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس تحریک کے سرگرم بانیوں نے اپنی تجاویز کو مکمل کر لیا ہے اور رسالہ کو اکتوبر سے جاری کرنے کے لیئے سرمایہ کا انتظام کر لیا ہے۔ یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہوگا جس کا موزوں نام "تعلیم" رکھا گیا ہے۔ بجائے ایک اڈیٹر کے اس کی ادارت میں تین صاحبان شریک ہونگے یعنی ڈاکٹر ظفر الحسن پروفیسر فلسفہ علی گڑھ یونیورسٹی ڈاکٹر عابد حسین پروفیسر جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی اور پروفیسر خواجہ غلام السیدین ایم اے ڈی پروفیسر ٹریننگ کالج علی گڑھ۔

مجھے اس سکیم سے اور رسالہ کے اڈیٹروں کے انتخاب سے اتفاق کلّی ہے۔ میرے خیال میں یہ بہت مناسب ہے کہ ایسے رسالہ کی ادارت، جس کے مقاصد اس قسم کے ہیں، ایک شخص کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ اس میں مختلف الخیال لوگ شریک ہوں۔ اگرچہ بالآخر ان کے نقطہ نظر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جائیں یہ تینوں صاحبان اکثر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تبادلہ خیال کر سکینگے اور خیالات اور طریق عمل میں جدت پیدا کر سکینگے۔

ڈاکٹر ظفر الحسن اپنے تجربہ سے، جو انھیں بحیثیت یونیورسٹی پروفیسر کے حاصل ہوا ہے، نہ صرف علی گڑھ کی تعلیمی روایات کی ترجمانی میں فائدہ اٹھا سکینگے بلکہ باہر سے جو تجاویز اور طریقے پیش کیئے جائینگے ان پر موجودہ علی گڑھ کے طلبا کی ذہنیت اور ضروریات کے اعتبار سے تنقید کر سکینگے۔ ہمیں ان سے توقع ہے کہ وہ یونیورسٹی کے حکام کے خیالات اور مقاصد کی نمائندگی بھی کرینگے اور طلبا کی ضروریات اور مشکلات کی ترجمانی کا حق بھی ادا کرینگے۔

ڈاکٹر عابد حسین ہمیں اپنے ان تجربوں سے مستفید کرینگے جو انھیں جامعہ ملّیہ دہلی کی نہایت قابل قدر تعلیمی جد و جہد میں حاصل ہوئے ہیں۔ میری رائے میں یہ تعلیمی تجربہ جو وہاں کیا جا رہا ہے کسی طرح علی گڑھ کی روایات کا مخالف یا متضاد نہیں۔ ممکن ہے وہ علی گڑھ کے بعض رجحانات کی اصلاح کر سکے اور خود بھی علی گڑھ کی زیادہ قدیم تحریک کے ساتھ اشتراک عمل کر کے فائدہ اٹھائے۔ کوئی شخص بھی جو مسلمانوں کی تعلیم کا فلسفیانہ نظر سے مطالعہ

کرتا ہی یا اُس کا خیر خواہ ہو ان میں سے کسی تحریک کی جانب بھی بے اعتنائی نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی ممکن نہیں کہ مستقبل کے لیئے جو ترقی کی شاہراہ ڈالی جائے اس میں ان دونوں تحریکوں کے بنیادی اُصولوں اور نصب العین کو نظر انداز کر دیا جائے۔ خواجہ غلام السیدین ان چند صاحبان میں سے ہیں جنھوں نے انگلستان سے ماسٹر آف ایجوکیشن کی جدید ڈگری حاصل کی ہو۔ ان میں اپنے والد خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی وہ ترقی پسند سلامت روی موجود ہو جس کی نہ صرف سیاسی اور معاشرتی مسائل کے لیئے ضرورت ہو بلکہ ہماری قوم کے تعلیمی مسائل کے لیئے بھی جو دن بدن زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں جوں جوں ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی نظام میں پیچیدگیاں راہ پاتی جاتی ہیں۔

میرا یہ کام نہیں کہ میں رسالے کی پالیسی کا تعین کروں یا اُس کو چلانے کے متعلق ہدایات دوں۔ اڈیٹروں کی ذاتی قابلیت اس بات کی ضامن ہو کہ وہ ان مسائل کو معقولیت کے ساتھ عملی ضروریات کا خیال کر کے طے کرینگے۔ اور اس بات کا خیال رکھینگے کہ فی الحال ہمارے پاس کیا ذرائع موجود ہیں اور ہماری تعلیم کی کیا حالت ہو۔ میری ذاتی رائے یہ ہو کہ ہماری پالیسی جس قدر بھی غیر معین ہو بہتر ہو۔ کیونکہ اسی طرح ہماری تعلیمی نشو و نما آزادی کے ساتھ ہو سکتی ہو۔ لیکن ممکن ہو کہ ہماری تحریک سے ہمدردی رکھنے والوں کو اس بات میں دلچسپی ہو کہ میں اپنی قومی تعلیم کے موجودہ نقائص کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں اور اس کی اصلاح کی جو صورتیں میرے پیش نظر ہیں اُن کو بیان کروں۔

جس وقت سر سید احمد خاں نے اپنی تحریک شروع کی تھی اُس وقت مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ مقابلۃً بالکل سادہ تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ان کی تعلیمی حالت ہندوؤں سے بہتر تھی۔ لیکن جب وہ اپنی حکومت کھو بیٹھے تو ان کو کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ انگریزی تعلیم کی نئی تحریک سے بے تعلق اور باہر ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے خصوصاً بنگال میں جہاں اس زمانے میں ہندوستان کا صدر مقام تھا، بہت شوق اور مستعدی کے ساتھ ان مواقع سے فائدہ اُٹھایا جو انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں کے لیئے بہم پہونچائے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کو ان ملازمتوں اور علمی پیشوں میں سے نکال دیا جو اس زمانے میں انگریزوں کی ہندوستانی رعایا کے لیئے کھلے ہوئے تھے۔ ہمارے اپنے رہبران قوم اوّل اوّل انگریزی تعلیم کی جانب سے بدظن تھے۔ اور ہمارے مذہبی راہنماؤں

نے تو اس کو بالکل مردود قرار دیا تھا۔ اس وقت ہمارے لیئے یہ صاف اور صریح سوال درپیش تھا کہ آیا ہمیں انگریزی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے یا ہم اس کو ترک کرکے اپنی اس جائز پوزیشن کو خراب کریں جو ہماری قوم کو ملک کے انتظام اور کاروبار میں حاصل ہے؟ اس سیدھے اور صاف سوال کا سرسید نے یہی سیدھا اور صاف جواب دیا کہ ہمیں انگریزی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ لارڈ لٹن نے جو اس وقت وائسرائے تھے اس تحریک کی ہمت افزائی کی۔ علی گڑھ کالج کا ہر طرف سے خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے ابتدائی دور کے طالب علموں کو بہت آسانی سے سرکاری ملازمتیں مل گئیں اور ہر شخص اس صورت حال سے مطمئن ہو گیا۔

اِس زمانے میں جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق تھا سرکاری ملازمتوں سے مراد ہوتی تھی دفتروں میں محرروں کا کام یا صوبہ کی حکومت میں نوکری۔ دفتروں میں شمالی ہندوستان کے زیادہ تر صوبوں میں اُردو زبان رائج تھی اور ان چھوٹی ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جہاں انگریزی جاننا ضروری ہوتا تھا وہاں ابھی تک کسی خاص فنّی قابلیت کی ضرورت نہ تھی۔ اور خود گورنمنٹ نے بھی اس وقت تک سوائے پولیس اور ملک کی حفاظت اور مال گزاری جمع کرنے کے کام کے اور کوئی فرائض بڑے پیمانے پر اپنے ذمہ نہیں لیئے تھے۔ یونیورسٹی کی تعلیم سے زیادہ تر آرٹس کے شعبہ کی تعلیم مُراد ہوتی تھی یعنی فی الجملہ انگریزی زبان سے معمولی درجہ کی واقفیت جو رپورٹ لکھنے اور سرکاری خط و کتابت کرنے کے کام میں آسکے۔

جس وقت مُسلمان آہستہ آہستہ سکول اور کالج کی معمولی تعلیم کی کمی کو پورا کر رہے تھے۔ پرانی یونیورسٹیاں رفتہ رفتہ اپنے میدانِ عمل اور وسعت نظر کو بڑھا رہی تھیں اور ساتھ ہی گورنمنٹ بھی اور زیادہ نئے فرائض اپنے ذمہ لے رہی تھی اور ہندوستانیوں کو ان ملازمتوں میں جگہ دے رہی تھی جن کے لیئے مخصوص قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے اور تنخواہیں زیادہ دی جاتی ہیں۔ غیر سرکاری پبلک نوکریوں کے مواقع بھی زیادہ ہوتے جا رہے تھے علمی پیشوں مثلاً قانون اور ڈاکٹری کا حلقہ وسیع ہو رہا تھا اور اُن کے لیئے مخصوص تعلیم اور مہارت کی ضرورت ہونے لگی تھی۔ علاوہ بریں ہندوستانیوں کی تعداد بھی ان پیشوں میں زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ جس طرح ایک دوڑ میں جو شخص پہلے روانہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ بعد میں روانہ ہونے والوں سے آگے رہتا ہے خواہ بعد میں روانہ ہونے والے اتنی ہی رفتار سے دوڑیں۔ اسی طرح ہندو مسلمانوں

ل اس دوڑ میں اگر ہماری قوم بھی اسی رفتار سے چلتی جس سے ہندو چل رہے تھے تو ہم اُن کے پیچھے ایک معیّن فاصلے پر رہتے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری رفتار ان سے سُست تھی اس لیئے ہم دن بدن اور زیادہ پیچھے رہ گئے۔ ہماری حالت صرف اس طرح سنبھل سکتی تھی کہ ہم نہ صرف دوسری قوم کے برابر رفتار قائم رکھتے بلکہ ان سے زیادہ تیز رفتاری اختیار کرتے تاکہ کچھ عرصے کے بعد ہم اس دوڑ میں ان کے برابر ہو کر سینہ بسینہ چلتے۔

معاملہ کے اس پہلو کو ہماری قوم کے دُور بین حضرات نے نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قوم کو بحیثیت مجموعی اُس وقت اس کا احساس تھا یا اب بھی اس کا احساس ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب بھی ہماری قوم کے لوگ محض پرانی قسم کی معمولی انگریزی تعلیم کے طالب ہیں حالانکہ اس قسم کی تعلیم کا دراصل یہ اثر ہوگا کہ وہ ہم کو اور زیادہ پستی کی جانب کھینچے گی اور ہم میں اور دوسری قوموں میں وہ فرق ہے جس کے خلاف عام طور پر شکایت کی جاتی ہے وہ اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ اب ہمیں کسی قسم کی "انگریزی" تعلیم کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس قسم کی آزادانہ تعلیم کی ضرورت ہے جو آج کل کی نئی صورت حالات و معاملات کے لیئے مناسب ہو جس میں کش مکشِ حیات زیادہ سخت ہو گئی ہے، کامیاب اور قابل آدمیوں کے لیئے زیادہ بڑے اور عمدہ مواقع ہیں اور ناکام لوگوں کی مایوسی اور مصیبت بھی زیادہ دل خراش اور تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ ان حالات میں خراب یا غیر موزوں تعلیم ہماری قوم کے لیئے بالکل تباہ کن ثابت ہو گی۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنی ضروریات کا مطالعہ کریں اور اپنے نظامِ تعلیم کی ترمیم اپنے ملک کی روز افزوں ضروریات کے مطابق کریں۔ آئیے ہم دیکھیں کہ یہ ضروریات کیا ہیں:۔

ہماری تعلیم کی سب سے مقدم اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کے متعلق ہمارے خیالات بالکل غیر معیّن اور مبہم ہیں۔ یہ مسئلہ اورنگ زیب کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اس دورِ تنزل میں جس کی ترجمانی سوؔدا اور میرؔ تقی نے اپنے کلام میں کی ہے ہماری حالت اور زیادہ بدتر ہو گئی۔ سرسید کے زمانے میں اس مسئلہ نے ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی اور اس کے بعد سے اس کی پیچیدگی اور فوری اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں، ایک مرتبہ فرانسیسی فلسفی برنیر (Bernier) اس قابل بادشاہ اور اس کے اتالیق کے درمیان ایک بہت گرم گفتگو کے موقع پر موجود تھا، اس اتالیق نے اس کو نوعمری

میں کچھ عربی پڑھائی تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے اتالیق سے نہایت ہی طنزیہ لہجہ میں کہا:- "تم نے مجھے یہ بتایا تھا کہ تمام فرنگستان محض ایک معمولی سے جزیرے کے برابر ہے.. جس کے بادشاہ چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے برابر ہیں اور ہندوستان کے فرمانروا تمام دنیا کے بادشاہوں سے شان و شوکت میں بڑھے ہوئے ہیں اور ان کے نام پر ایران، ترکستان، کاشغر، تاتار، پیگو، سیام، چین اور ماچین سب لرزہ براندام ہوجاتے ہیں۔ آپ کیا خوب جغرافیہ داں ہیں! کیسے اچھے تاریخ داں ہیں! کیا میرے معلم کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ مجھے تمام دنیا کی قوموں کی خصوصیات سے آگاہ کرے ان کے ذرائع اور ان کی قوت؛ ان کے جنگ و جدل کے طریقے، ان کے اخلاق و ادب، مذہب، طرز حکومت اور اہم مقاصد کا حال مجھے بتائے۔ اور باقاعدہ تاریخی مطالعہ کے ذریعے مجھے حکومتوں کی آغاز اور ترقی اور تنزل سے اور ان واقعات حادثات اور غلطیوں سے آگاہ کرے جن کی وجہ سے بڑی بڑی تبدیلیاں اور زبردست انقلابات عمل میں آئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ میں تم سے تاریخ عالم کا وسیع اور عمیق علم حاصل کرتا، تم نے مجھے میرے آباؤ اجداد اور اس سلطنت کے بانیوں کے نام بھی بمشکل بتائے۔"

اورنگ زیب کو تنگ نظر سمجھنا یا یہ خیال کرنا کہ وہ اس محدود ماحول سے مطمئن تھا جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی، بڑی تاریخی غلطی ہوگی۔ اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرنے کے بعد وہ عربی کے ذکر پر آجاتا ہے اور یہ کہ اس زمانے کی تعلیم میں اس کا کیا درجہ ہے۔ اس نے اپنے اتالیق سے کہا:- "تم نے مجھے میرے بزرگوں کی زندگی کے حالات اور ان سے پہلے کے واقعات سے ناواقف رکھا اور یہ نہ بتایا کہ وہ کیا غیر معمولی صفات تھیں جن کی وجہ سے ان کو اس قدر وسیع فتوحات حاصل ہوئیں۔ گرد و نواح کی قوموں کی زبان سے واقفیت بادشاہ کے لئے ضروری ہو سکتی ہے لیکن تم نے مجھے صرف عربی لکھنا پڑھنا سکھانے پر اکتفا کیا۔ تمہارا یقیناً یہ خیال ہوگا کہ تم میرے وقت کا اس قدر حصہ ایک ایسی زبان کی تعلیم میں صرف کرکے جس پر کوئی شخص دس یا بارہ سال کی سخت محنت کے بغیر عبور حاصل نہیں کرتا مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا مرہون منت بنا لوگے۔ تم یہ بالکل بھول گئے کہ ایک شاہزادہ کی تعلیم میں کس قدر ضروری مضامین شامل ہونے چاہئیں، تمہارے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا تم یہ سمجھتے تھے کہ سب سے زیادہ ضرورت صرف و نحو میں مہارت پیدا کرنے کی ہے یا فقہی علوم پر عبور حاصل کرنے کی۔ اور اس طرح تم نے میری جوانی کے قیمتی زمانے کو محض الفاظ کے خشک، بے سود اور لاتناہی مطالعہ میں ضائع کیا۔" ان الفاظ کی وقعت

آج بھی اتنی ہی ہے جس قدر اُس وقت تھی۔ ہمیں اب بھی گریمر اور الفاظ کے بے سود مطالعہ سے شغف ہے۔ مُغلوں کا آخری بڑا شہنشاہ اس تعلیم سے بالکل مطمئن نہ تھا جو اس زمانے میں شاہزادوں وغیرہ کو دی جاتی تھی کیونکہ وہ ان مسائل کے حل میں مدد نہیں دیتی تھی جن کو حل کرنے کے لیئے ایک زندہ نظام تعلیم کو مرتب کیا جاتا ہے۔ اور ہم اب تک اسی بے اطمینانی کی حالت میں اپنا راستہ ٹٹول رہے ہیں۔

"بدنظمی عظیم" (اٹھارویں صدی) کے دور میں تعلیم اور زندگی میں اور زیادہ بے تعلقی پیدا ہو گئی۔ ہر شخص کو سودا کے یہ چبھتے ہوئے طنزیہ اشعار یاد ہونگے جو اس نے اٹھارویں صدی کے وسط میں فقہ کے قدامت پسند علما کے خلاف لکھے تھے جو عقل کو پابہ زنجیر رکھتے تھے اور ان لوگوں کے اخلاق کی ہدایت کے لیئے کچھ بھی نہ کرتے تھے جن کی راہبری کا ان کو دعویٰ تھا۔

میر تقی کے آخری دنوں میں ہمیں جو تصویر نظر آتی ہے اُس میں زیادہ خود پسندی ظاہر ہوتی ہے تاہم اس میں ایسے نظام تعلیم کے اثرات کے خلاف تنبیہ موجود ہے جو گرد و پیش کے حالات اور واقعیت سے بے تعلق ہو۔ ہمیں اس زمانے کے افسانوں میں ایک دھندلی ہوائی دنیا کا مرقع نظر آتا ہے جس کے مکین معجزات اور جادو کے بھروسے زندگی بسر کرتے تھے اور جن کی تربیت نے ان کو انتہائی درجہ کا ناکارہ اور ناکام بنا دیا تھا۔

۱۸۷۶ء میں جب سر سید احمد خاں اپنی زبردست شخصیت کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مسئلے میں لگے ہوئے تھے، ہمارے مذہبی مناقشات صرف ہماری اپنی قوم تک محدود تھے۔ فرقہ وارانہ اختلافات موجود تھے اور سر سید احمد خاں کے خیالات پر سختی اور بسا اوقات درشتی کے ساتھ تنقید کی جاتی تھی۔ یہ خیالات ان کتابوں اور اُصولوں کی معقول اور موافق فطرت تفسیر پر مبنی تھے جنھوں نے عرصہ سے اسلام میں اختلافات پیدا کر رکھے تھے۔ باوجود جھوٹے اور سخت حملوں کے، سر سید نے اپنی تعلیمی سکیم میں مذہبی تعلیم کو اس طرح جگہ دی کہ اُنھوں نے دونوں بڑے اسلامی فرقوں کی ضروریات کو تسلیم کر کے ان کے اپنے مولویوں کے ذریعے پرانی اور رائج الوقت مذہبی تعلیم کا انتظام کر دیا۔ اُنھوں نے اس جنگ کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا جو قدیم اور جدید خیالات میں جاری تھی۔ گو ہمیں اُن کے مذہبی خیالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ذاتی ہمدردی کس جانب تھی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس وقت انگریزی تعلیم کے مسئلہ کو ان اعلیٰ تمدنی مسائل سے کوئی سروکار نہ تھا جن سے دراصل روحانی

تعلیم کا تعلق ہوتا ہے۔

لیکن آج کل یہی مسائل ہمارے قومی معاملات میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اب یہ میلان پیدا ہوتا جاتا ہے کہ پُرانے فرقہ وارانہ اختلافات کو دُور کیا جائے۔ لیکن مجھے اب تک کوئی ایسی زبردست تحریک نظر نہیں آتی جو خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ موجودہ حالات کی روشنی میں ہماری مذہبی تعلیم کے مسائل پر تنقیدی نظر ڈالے۔ بلکہ سیاسی اور معاشرتی تفرقوں کی وجہ سے جو قوم میں موجود ہیں ایسے نئے مواقع پیدا ہو گئے ہیں جن سے فائدہ اُٹھا کر اغیار سخت مخالفانہ حملے کرتے ہیں۔ اور ان حملوں کی مدافعت کے لیئے ہم میں ایک فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی قدر جارحانہ انداز سے مذہبی بحث و مباحثہ کرتا ہے۔ اور اس وجہ سے یہ اُمید مشکل ہو سکتی ہے کہ ہمارے مذہب کے اعلیٰ فلسفیانہ اصولوں کی زیادہ سنجیدہ تفسیر و تشریح ہو سکے جس کو ہماری قوم کے بیشتر افراد تسلیم کر لینگے۔ اسلام کی تاریخی اور فلسفیانہ تفسیر کے لیئے ہمارے فلسفی شاعر اقبال کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ اُن کے کلام کے اس حصّے سے لوگوں کو اتنا شغف اور اتنی عقیدت نہیں ہے جتنی بعض اور حصّوں سے جو اس قدر پائدار اور مستقل قدر و قیمت نہیں رکھتے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں جتنی بڑی بڑی اسلامی تعلیم گاہوں سے واقف ہوں ان میں سے ایک میں بھی ہماری مذہبی تعلیم کا تشفی بخش انتظام نہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے جمود کی وجہ سے اب تک اس پُرانے نظام پر قایم ہیں جس میں صرف الفاظ اور قواعد کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہم اپنے پیغمبر اور عہد سعادت کے ائمہ کی پیروی نہیں کرتے جنھوں نے اپنی تمام روحانی اور وجدانی قوتوں کو اس اَمر کے لیئے وقف کر دیا تھا کہ ان حیات بخش حقایق کی تفسیر کریں جنھوں نے معمولی چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو زبردست مجاہد اور شجاع بنا دیا اور قبیلوں کے رسم و رواج کو انسانی ترقی کے لیئے نہایت عظیم الشان اور پائیدار قوانین میں تبدیل کر دیا۔ اگر ہماری مذہبی تعلیم محض برائے نام نہیں تو ہمیں دیانت داری کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ موجودہ سائنس، موجودہ معاشیات اور تمام دنیا کے معاشرتی حالات کے تجربہ کی جانب ہمارا کیا رویہ ہوگا۔ ان معاملات میں کامل اتفاق رائے ممکن نہیں۔ لیکن یہ بہتر ہوگا اگر ہم صاف دلی کے ساتھ معاملہ کو انجام تک پہونچائیں اور ان سب لوگوں کو جو ایک طرز خیال کے ہوں ایک جھنڈے کے نیچے جمع کریں، تاکہ وہ موثر طریقے سے اپنے خیالات پر عمل کر سکیں اور ایک ایسی دعوت دے سکیں جس کا

سائنس اور علوم جدیدہ کے طالب علم استقبال کریں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آریا سماج میں ایک زبردست پارٹی، جو شاید تعداد میں سب سے زیادہ ہے، ایسی ہے جو صرف گروکل کی قسم کی تعلیم کو مانتی ہے۔ لیکن ایک کثیر تعداد جو بڑھتی جا رہی ہے اور جو میرے خیال میں آگے چل کر غالب ہو گی ایسے لوگوں کی ہے جو جدید تعلیم کے قائل ہیں۔ ان دونوں جماعتوں نے بالکل کھلم کھلا اپنے لیئے علیحدہ علیحدہ عمل کا میدان مقرر کر لیا ہے اور وہ ایک دوسرے کے کام سے تعارض نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر تحریک کی ایک کارکن جماعت ہے جس کو اپنے پروگرام پر کامل اور پُرخلوص ایمان ہے اور وہ اس پر عمل کرتی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ایک برائے نام اتحاد قائم کرنے کے لیئے بالکل مختلف الخیال لوگوں کو ملائیں جس کا نتیجہ صرف یہی ہوتا کہ کام مطلقاً معطّل ہو جاتا، اُنھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اس صریح اختلاف کو مختلف تعلیم گاہوں کی شکل میں ظاہر ہونے دیں جو پہلو بہ پہلو قایم ہیں اور بغیر دوسرے خیال کے لوگوں سے تعارض یا عدم رواداری کا اظہار کیئے ہوئے اپنا اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔

اگر ان مضامین پر غور سے نظر ڈالی جائے جو علی گڑھ یونیورسٹی، اسلامیہ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور کے طلبا ربالعموم لیتے ہیں تو معلوم ہو گا کہ ان جدید تعلیم گاہوں میں بھی طلبا کس افسوس ناک حد تک محض زبانوں یا ادبی مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور سائنس، حساب، ٹیکنالوجی (technology) وغیرہ علوم کو نظر انداز کر دیتے ہیں اگرچہ ہندوستان کا مستقبل انھی کے ساتھ وابستہ ہے۔ انتظامی عہدوں میں بھی ان خاص مضامین کو محض ادبی مضامین سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ آئندہ چل کر فوج اور بڑے اور خشکی اور ہوا کی "مشینی" فوجوں کے لیئے بہت اعلیٰ قسم کی مخصوص مہارت کی ضرورت ہو گی اور اعلیٰ تعلیم کا کام یہ ہے کہ ان چیزوں کے لیئے طلبا رکو تیار کرے۔ مستقبل میں صنعت وحرفت اور تجارت کا انحصار محض خط وکتابت اور چند تجارتی گروں پر نہ ہو گا بلکہ جدید علوم سے وسیع واقفیت اور معاشرتی امور میں عملی مہارت کی ضرورت ہو گی۔ اور ہمارے اُستادوں کو یہ بات سمجھ لینی ہو گی کہ محض کتابی علم کے ذریعے نہ تعلیم کا صحیح اور بلند مطمح نظر حاصل ہو سکتا ہے نہ طلبا رکی ترقی کی وہ عملی تجاویز پوری ہو سکتی ہیں۔ جن کا موجودہ دنیا کے حالات مطالبہ کرتے ہیں۔ ان پر بہت احتیاط سے غور کرنا پڑے گا اور اس غور وامتحان سے جو نتائج معلوم ہوں اُن کی رعایت سے اپنی تمام تعلیمی سکیم میں تبدیلی اور ترمیم کرنی ہو گی۔ اگرچہ میں نے اپنی تجاویز کو اعلیٰ تعلیم تک محدود رکھا ہے لیکن میرا مطلب یہی ہے کہ ان کو تعلیم کی

ہر منزل اور ہر پہلو پر عائد کیا جائے جس شخص کو ہمارے کالجوں کا تھوڑا سا بھی عملی تجربہ ہے وہ جانتا ہے کہ وہاں کے کام میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کی ناقص تعلیم کی وجہ سے کس قدر ہرج واقع ہوتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ کوئی قابل شخص اس کام کو جلد اپنے ذمّہ لے گا کہ تعلیم کے تمام مدارج پر ایک تنقیدی نظر ڈالے ترقی اسی بات پر منحصر ہے کہ نیچے سے لے کر اوپر تک تمام مدارج میں اصلاح کی جائے۔ مسلمانوں کی تعلیم کو ان تمام اصلاحات کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ ہمارے لیئے یہ جائز نہیں کہ ہم خیال و عمل کی دنیا کے انقلابات اور ہل چل سے علٰحدہ ہو کر ایک دور افتادہ گوشہ میں زندگی بسر کریں۔ اگرچہ ہماری بعض ضروریات قومی جداگانہ ہیں لیکن ہمارا اس میں نقصان ہے کہ ہم ان ضروریات پر بہت زیادہ زور دیں یا ایسی تعلیم دیں جو ہمارے اور دوسرے اقوام کے اختلافات کو زیادہ مستحکم کرے۔ ہماری قوم کے اور تمام ملک کے لیئے یہ بہتر ہوگا کہ ہم تعلیمی مسائل کو تنگ فرقہ وارانہ فضا سے باہر نکال کر اپنی توجہ اور نظر کو علمی اور اخلاقی قوت کے ان بڑے بڑے مسائل کی جانب لگائیں جن پر صحیح تعلیم کی بنیاد قایم ہوتی ہے اور جس کا حصول اس کا مقصد ہونا چاہیئے۔

عبداللہ یوسف علی

فلسفہ اور تعلیم

ہمارا موضوع بحث ہے "فلسفہ اور تعلیم"۔ اب پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس موضوع کا کیا مطلب ہے۔ کیونکہ اِس سے کئی مطلب ہو سکتے ہیں :۔

اوّل ۔ فلسفہ کیا ہے اور تعلیم کیا ہے ؟

یعنی ان کا مفہوم کیا ہے، ان کا تصوّر کیا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ فلسفہ کی ماہیت کیا ہے اور تعلیم کی کیا ہے؟ اندریں صورت اس بحث کا منشا یہ ہوگا کہ ان دونوں اصطلاحوں کی مفصّل اور مکمل تشریح کی جائے۔

دویم ۔ یا اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ

فلسفہ اور تعلیم میں کیا تعلق ہے ؟

یعنی یہ دونوں مضمون ایک دوسرے سے کس طرح وابستہ ہیں۔ اس میں یہ سوال بھی شامل ہو سکتا ہے کہ تعلیم میں فلسفہ کی جگہ کہاں ہے جو ایک عملی سوال ہے اور فلسفہ میں تعلیمات کی جگہ کہاں ہے جو ایک نظری بحث ہے

سویم ۔ فلسفہ اور تعلیم کا تعلق کیا رہا ہے ؟

یعنی زمانہ ماضی میں فلسفہ نے تعلیم پر اور تعلیم نے فلسفہ پر کیا اثر ڈالا ہے ؟

چہارم ۔ اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ

فلسفہ کا مطالعہ تعلیم کے لیئے کس طرح مفید ہو سکتا ہے اور شاید یہ بھی کہ تعلیم کا مطالعہ فلسفہ کے لیئے کس طرح مفید ہے۔ یعنی ایک مُعلّم کس طرح فلسفہ کو اپنے مقصد کے لیئے استعمال کر سکتا ہے۔ اور تعلیم کے طریقوں پر فلسفہ کو کیا اثر ڈالنا چاہیئے۔ معلّم کو فلسفہ کا مطالعہ کرنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے اور اسے کیا سبق حاصل کرنا چاہیئے ۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ آخری سوال یعنی فلسفہ کا مطالعہ تعلیم میں کس طرح مفید ہو سکتا ہے معلّموں کے لیئے خاص طور پر دلچسپ ہے اور وہ چاہینگے کہ خالصتًہ اسی پر بحث کی جائے۔ لیکن میری نیت یہ نہیں کہ خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ کو اٹھاؤں ہاں بحث کے دوران میں ضمنًا یہ سوال بھی آجائیگا اور ان کی خواہش ایک حد تک پوری ہو جائیگی۔

تیسرا سوال یعنی زمانہ ماضی میں فلسفہ اور تعلیم کا کیا تعلق رہا ہے تعلیم کے مورخ کا موضوع ہے۔ میں مؤرخ

نہیں ہوں۔ فلسفہ کی تاریخ بھی میرا موضوع نہیں۔ میرا دل تو خود فلسفہ میں ہے یعنی اشیا کی ماہیت حقیقی میں۔ گو یہ صحیح ہے کہ توضیح مطالب کے لیے ہمیں تاریخ سے بھی مدد لینی پڑتی ہے۔

میں بالخصوص دوسرے سوال کو اہم سمجھتا ہوں یعنی فلسفہ اور تعلیم کا کیا تعلق ہے۔ کیونکہ یہ ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں پہلا سوال بھی لازمی طور پر آجاتا ہے۔ یعنی فلسفہ کیا ہے اور تعلیم کیا ہے جو خود ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ جب تک ہمیں معلوم نہ ہو کہ فلسفہ اور تعلیم کی ماہیت کیا ہے اس وقت تک ہم ان کے باہمی تعلق کو نہیں سمجھ سکتے۔ دراصل اگر ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا مسئلہ حل کریں جس میں یہ دونوں لفظ فلسفہ اور تعلیم آتے ہیں تو ہم کو پہلے ان دونوں سوالوں کو (اگر ان کو دو علیحدہ سوال کہا جا سکے) حل کرنا چاہئے۔ اس لیے تعلیم کے مورخ اور تعلیمات کے معلم دونوں کے لیے فلسفہ کی تعلیم ضروری ہے اگر وہ اپنے مضامین کو بخوبی سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور میں آج یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ فلسفہ اور تعلیم دونوں میں ایک نہایت ضروری اور زندہ تعلق ہے۔

پس ہمارا موضوع بحث یہ قرار پایا کہ فلسفہ اور تعلیم کا کیا تعلق ہے۔ اور میں سب سے پہلے اس سلسلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ فلسفہ کے کیا معنی ہیں اور تعلیم کے کیا؟ لیکن قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ میں آپ کے سامنے دو عظیم الشان فلسفیوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں ایک تو یونانی حکیم سقراط ہے اور دوسرا جرمنی کا حکیم کانٹ ہے۔ ان دونوں سے فلسفہ کے دو بڑے دور شروع ہوتے ہیں جن کو فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدید کہتے ہیں۔ ان سے پہلے فلسفہ کی تاریخ میں جو کچھ ہوا وہ محض ابتدائی مراحل تھے۔ لیکن سقراط اور کانٹ نہ صرف فلسفہ میں سب سے بڑے تھے بلکہ تعلیم کی نظر سے بھی وہ بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے تمام فلسفہ اور فلسفیانہ تعلیم کا مرجع تعلیم ہی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق فلسفہ کا اعلیٰ ترین مقصد یہی ہے کہ وہ فطرت انسانی کی غایت کو معلوم کرے اور اس کی توضیح و تشریح کرے۔ یعنی وہ حکمت ہے۔ اور تعلیم وہ طریقۂ عمل ہے جو ہماری اس منزل کی جانب رہنمائی کرتا ہے اور ہمیں وہاں تک پہونچاتا ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین نصب العین یہی ہے کہ وہ انسان کو ایک "حکیم" بنا دے۔ "حکیم" اور "حکمت" کے الفاظ کو طب و طبیب سے کوئی تعلق نہیں فلسفہ سے کوئی قرابادین یا اصول طب مراد نہیں ہے اور نہ ٹریننگ کالج یونانی یا ویدی طب کی تعلیم دیتا ہے۔ میں ان الفاظ کو ان کے اصل معنی میں استعمال کر رہا ہوں یعنی جس معنی میں سقراط اور افلاطون حکیم کہلاتے ہیں۔ اور ان کی تعلیم حکمت کہلاتی ہے۔ اور جس معنی میں کہا گیا ہے:-

کاد الحکیم ان یکون نبیاً (حکیم نبوت کے بہت ہی قریب ہوتا ہے)

میں نے ان دونوں حکماء کا ذکر اس لیئے کیا ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ فلسفہ اور تعلیم میں کس قدر قریبی تعلق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے فلسفیوں نے تعلیم کے مضمون پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اس بیان سے صرف فلسفہ اور تعلیم کے تعلق کا اظہار مقصود تھا۔ لیکن میرا مقصد اور موضوع یہ ہے کہ فلسفہ اور تعلیم کے باہمی تعلق کی تشریح کروں یعنی محض تاریخی مثالیں دے کر نہیں بلکہ دونوں کی ماہیت سے بحث کر کے یہ ثابت کروں کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازماً وابستہ ہیں۔

فلسفہ

افلاطون کہتا ہے کہ ایک فلسفی تمام عالم حدوث و قدم پر نظر کرتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ نظر کرنا یا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ ہر انسان تمام عالم حدوث و قدم کا حکم بنتا ہے۔ اس حالت پر غور کیجئے جب آپ کسی مسئلہ کو سوچ رہے ہوں یا دو شخص کسی بات پر بحث کر رہے ہوں جب کبھی وہ کوئی جملہ بولتے ہیں تو وہ اپنے چشم و گوش کی حد سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اپنے تجربہ بلکہ تمام بنی نوع انسان کے تجربے کے دائرے سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ وہ بے تکان کلیات کا استعمال کرتے ہیں۔ قوانین عامہ بیان کرتے ہیں اور ایسی باتوں پر یقین کا اظہار کرتے ہیں جن کے دائرے میں ایک عالم داخل ہے۔ وہ انسان کے بڑے بڑے گروہوں اور جماعتوں کے متعلق، قوموں اور مذہبوں کے متعلق بلکہ تمام دنیا اور تمام عالم کے متعلق، تمام ماضی، حال اور استقبال کے متعلق اور موت، حیات اور حیات بعد الموت کے متعلق فیصلے صادر کرتے ہیں۔ وہ اس طرح باتیں کرتے ہیں گویا تمام عالم حدوث و قدم کے حکم ہیں۔ اور زمان و مکان، قانون وجود جیسے بڑے بڑے حقایق کے ساتھ اس طرح کھیلتے ہیں گویا وہ کھلونے ہیں۔

یہ واقعہ کس قدر حیرت ناک ہے یہ دو ٹانگوں والا بے پر کا جانور (جو اس کی کوئی دل خوش کن تعریف نہیں ہے!) جو انسان کہلاتا ہے، یہ چھوٹا سا کمزور، بے بس حیوان جس کی ہستی غیر محدود زمان و مکان کے ایک ننھا ذرا سے نقطے میں محدود ہے، اتنی بڑی بڑی حقیقتوں پر رائے زنی کرے جیسے زمین آسمان، ستارے، ماضی حال، مستقبل، فطرت اور تمام عالم ہست و بود! گویا وہ دیوتاؤں کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے اس دنیا سے بہت بلند اور بالا تر، اور ان قوتوں اور ہستیوں کا ہم پلہ ہے جنھوں نے اس کائنات کو بنایا ہے اور جو اس کا نظم و نسق کرتے ہیں! حضرات وہ ایک ذی عقل ہستی ہے۔ اس کی عقل ہی نے اُس کو تمام عالم حدوث و

قدم کا حکم بنا دیا ہے۔

اگر آپ پھر انسان کی اس امتیازی خصوصیت پر غور کریں جس کی طرف میں نے توجہ منعطف کرائی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عقل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلیات (مثلاً اصول و قوانین) اور کل (مثلاً قوم۔ ملک) کے متعلق سوچتی ہے۔ میں اس کی زیادہ تفصیل ضروری نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے مضمون زیادہ مشکل اور ناقابل فہم ہو جائیگا۔

لیکن یہ کہدینا ضروری ہے کہ یہ دونوں خصوصیتیں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے انسان اپنی قوت کی بدولت نہ صرف اس کل کے متعلق سوچتا ہے بلکہ وہ لازمی طور پر کل حقیقی (تام) یعنی عالم ہست و بود کے متعلق بھی سوچتا ہے۔ کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قایم نہ کرے۔ ہر شخص کے دماغ میں خواہ وہ عالم ہو یا جاہل اس عالم کی حقیقت اور اس کے ساتھ انسان کے تعلق کے بارے میں کوئی نہ کوئی خیال ضرور موجود ہوتا ہے۔ یہ بات کہ آیا وہ رائے اس نے خود قایم کی ہے یا کسی اور سے مستعار لی ہے چنداں اہم نہیں نفس الامر یہ ہے کہ وہ ایک رائے رکھتا ہے اس لیئے کہ عالم کی حقیقت کے متعلق کوئی رائے قایم کیئے بغیر اسے چارہ نہیں اس پر اس کا ایمان ہے اور اس کی زندگی پر اس کا اثر ہے۔ بہ عبارت آخری یہی اس کا مذہب ہے۔ کوئی شخص بے مذہب کے نہیں ہوتا۔ اگر ہم چاہیں تو بے خوف کہ سکتے ہیں کہ انسان ایک مذہبی حیوان ہے۔

لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ عقیدہ، یہ ایمان دلیل پر مبنی نہ ہو۔ بلکہ محض کسی بیرونی سند پر اس کی بنیاد ہو اور اس نے دوسروں سے سیکھا ہو جس طرح انسان اپنے دوستوں اور والدین سے بہت سے اور عقیدے سیکھ لیتا ہے۔ لیکن وہی عقل جو (جیسا کہ بیان ہوا ہے) فی الحقیقت اس ایمان کا سرچشمہ ہے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اس ایمان کی تائید بھی کراتی ہے۔ اس کی حمایت کرتی ہے اور اس کے موافق دلیل قایم کرنا چاہتی ہے۔ یہی منزل ہے جہاں علم کلام پیدا ہوتا ہے۔ تمام مذاہب اس منزل سے گزرتے ہیں۔ ہند وفلسفہ زیادہ تر اسی منزل کی پیداوار ہے۔ اس منزل میں بڑے بڑے بنیادی عقائد کا سرچشمہ بعض مقدس ہستیاں یا مقدس کتابیں ہوتی ہیں اور اُن کو الہام ربانی سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت ان اعتقادات پر جرح نہیں کی جاتی بلکہ اُن کو صحیح جان کر اُن کے لیئے دلائل کی تلاش ہوتی ہے تاکہ ان سے ایک منضبط نظام عقائد تعمیر ہو جائے۔

لیکن جب عقل ترقی کرتی ہے تو یہیں نہیں ٹھیر سکتی۔ وہ لازماً آگے قدم رکھتی ہے۔ اور خود ان اعتقادات

پر حج کرتی ہے کہ آیا وہ صحیح ہیں یا نہیں۔ یعنی مذہب نے جو نقشہ عالم کا پیش کیا ہے وہ قرین عقل ہے یا نہیں۔ اب عقل خود فیصلہ کرے گی وہ خود اپنے بل پر کھڑا ہونا چاہتی ہے۔ کسی چیز کو محض بیرونی سند پر قبول کرنا نہیں چاہتی۔ ضرور ہے کہ وہ خود ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ انسان کی بڑی گہری خواہش ہے کہ حقیقت عالم اور عالم سے انسان کے تعلق کا تصوّر اس کے ذہن میں ایک مدلّل اور مفصّل نظام کی صورت میں ہو۔ وہ علم ہو جائے اور محض اعتقاد نہ رہے۔ اس طرح عقل مذہب سے گزر کر عقل کے میدان میں پہونچ جاتی ہے۔

پس سوال یہ ہے کہ اس عالم کی حقیقت کیا ہے اور انسان کا اس سے کیا تعلق ہے؟ وہ مادہ ہے یا روح یا کوئی اور چیز؟ اس کی ترتیب محض اتفاقی ہے یا یہ قاعدہ اور قانون کا عمل گاہ ہے۔ یہ قانون فقط علت و معلول کی جکڑ بندی ہے (جبر)، یا ایک عمل ہے جو ایک غایت کی طرف لے جا رہا ہے (اختیار) نیز یہ کہ اس عالم میں انسان کا اصل کام کیا ہے؟

طبیعیات شاید یہ بتائے کہ مادہ کی ماہیت کیا ہے۔ حیاتیات یہ بتائے کہ حیات کی ماہیت کیا ہے۔ اسی طرح نفسیات نفس کی ماہیت بتائے۔ لیکن یہ سب علوم اس عالم کے اجزا یا حصّوں سے بحث کرتے ہیں اور ایسے اجزا سے جن کی نسبت بالعموم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے مشاہدہ کی سرحد میں ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی علم بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ عالم بحیثیت مجموعی کیا ہے۔ اور نہ یہ کوئی آخری اور قطعی بات اجزائے عالم کے متعلق بتا سکتے ہیں۔ ان سوالات کا جواب دینا فلسفہ کا کام ہے۔ یہ کل کا علم ہے۔ اور ہر سوال کو اس کی انتہا تک پہونچاتا ہے۔ یعنی عقل انسانی کی حد رسائی تک جہاں سے آگے ہم نہیں بڑھ سکتے۔ فلسفہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ وجود کی انتہائی حقیقت کیا ہے۔ اور جیسا کہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں یہ دونوں خصوصیتیں یعنی کل کا علم اور بحث کو انتہا تک پہونچا دینا ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

سقراط سے پہلے فلسفیوں کے پیش نظر یہ بڑا سوال تھا کہ اس عالم کی حقیقت کیا ہے۔ بعض کہتے تھے کہ اصل عالم کی پانی ہے بعض کہتے تھے کہ آگ ہے، بعض ہوا، بعض مٹی (یعنی مادہ) اور بعض کہتے تھے کہ یہ ان چار دُں چیزوں سے مرکب ہے۔ بعضوں کا خیال تھا کہ عالم کی حقیقت وحدت ہے بعض کہتے تھے کہ کثرت ہے۔ بعض کا عقیدہ تھا کہ وجود عالم محض اتفاقی ہے اور بعض کا یہ کہ اس پر قضائے مبرم مستولی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اختلافات خیالات ذہن کو پریشان کرنے والی چیز ہے۔ اور جب یہ فلسفے جیسی چیز میں پائی جائے جو علم ہونے کا مدعی ہے تو سخت تشکک پیدا کرتا ہے۔

دنیا کے بہترین دماغوں نے انتہائی کوششیں کی ہیں کہ اس عالم کا بھید معلوم کریں لیکن نتیجہ محض ایک ایسا اختلاف خیالات ہوا جسے دیکھ کر سقراط نے یہ کہا کہ فلسفیوں کی حالت دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مجنونوں کا ایک گروہ ہے جو بہت پی گئے ہیں۔ اور اپنی اپنی بک رہے ہیں اور کسی کی بات دوسرا نہیں سنتا۔

سقراط کو یقین تھا کہ عالم کی حقیقت ایسا مسئلہ ہے کہ اُس کو حل کرنا ممکن نہیں وہ کہتا تھا کہ میں سوائے اس کے کچھ نہیں جانتا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس لیئے اس نے اپنی توجہ کو اس مسئلہ سے ہٹا کر فلسفے کے دوسرے مسئلہ کی جانب مبذول کیا یعنی اس عالم میں انسان کا اصلی کام کیا ہے۔ سقراط نے اس سلسلے میں جو کام کیا وہ فلسفہ کے نشوونما میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ لیکن اس کے جلیل القدر شاگرد افلاطون نے اس بات کو محسوس کیا کہ فلسفہ یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔ لازم ہے کہ وہ آگے قدم بڑھائے کیونکہ ہم انسان کے اصلی کام کے متعلق کوئی رائے قایم نہیں کر سکتے۔ جب تک عالم کے متعلق بحیثیت مجموعی کوئی رائے قایم نہ کریں آپ کسی جزو کا منشائے وجود کیسے سمجھ سکتے ہیں جب تک اس کُل کا منشائے وجود نہ سمجھیں جس کا وہ جزو ہے؟ آپ کسی عضو بدن مثلاً ہاتھ کا کام کیسے جان سکتے ہیں جب تک اس جسم کی عام غایت سے واقفیت نہ ہو جس کا وہ ایک عضو ہے؟

اس طرح افلاطون نے پھر از سرِ نو فلسفہ کو کائنات یعنی کل کا علم بنا دیا۔ فلسفے کی دنیا میں دو ہزار برس تک افلاطون کی حکومت قایم رہی۔ جملہ فلاسفہ مابعد کی ساری کوشش یہی رہی کہ استدلال اور عقل کے ذریعے دُنیا کی حقیقت معلوم کریں اور اس کی توضیح کریں۔ اس سوال کے جواب جو اُن لوگوں نے پیش کیئے وہ بھی مختلف ہیں۔ گو وہ اس قدر ہنگم نہیں ہیں جس قدر سقراط سے قبل کے یونانی فلسفیوں کے جواب تھے۔ مگر ان کے مختلف، متضاد اور غیر متیقن ہونے میں ذرا بھی شک نہیں۔ جرمنی کے جلیل القدر حکیم کانٹ نے اس بات کو محسوس کیا اور اپنی غیر معمولی قوت کے ساتھ ان مسائل پر زور لگایا جس طرح اس سے پہلے سقراط نے کیا تھا۔ اور بالآخر اس کو بھی سقراط کی طرح یہی تسلیم کرنا پڑا کہ یہ مسئلہ ناقابل حل ہے۔ لیکن وہ سقراط سے آگے بڑھا۔ اس نے سقراط کی طرح اس پر اکتفا نہیں کیا کہ فلسفیوں پر اظہار غیظ کرکے ایک مسئلہ کو چھوڑ دے اور دوسرے مسئلہ پر جا پہونچے۔ بلکہ اس نے فلسفیانہ سنجیدگی کے ساتھ اس بات کی تحقیق کا بیڑا اٹھایا کہ آیا اس مسئلہ کا حل ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اور آیا فلسفہ اس معنوں میں کوئی واقعی چیز ہے یا نہیں۔

کانٹ نے مکمل اور مفصل تحقیق و تدقیق کے بعد دلائل و براہین سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ مسئلہ حل نہیں

ہو سکتا۔ اِس نے ہمیشہ کے لیئے یہ بات طے کر دی کہ عقل انسانی حقیقت عالم کا راز معلوم نہیں کر سکتی۔ بلکہ اس نے تردید کی اس سب سے بڑی شرط کو پورا کر دیا جو ارسطو نے بیان کی ہے یعنی یہ بتا دیا کہ فلسفے کی اس عبث کوشش کا سرچشمہ کیا ہے۔ چونکہ فلسفہ کی اس سربفلک عمارت کو کانٹ نے بیخ و بُن سے اکھاڑ دیا اس لیئے کانٹ کو "ہمہ شکن" کہتے ہیں۔ تمام علوم جو فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے نام سے پکارے جاتے تھے الٰہیات، کونیات، روحیات، دینیات عقلی سب کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔

کانٹ کی اس بحث و تمحیص کا نتیجہ سلبی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ فلسفہ اور انسانی ترقی کے لیے بڑا انتہا اہم ہے۔ اور اس پر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہُو بہُو وہی ہے جو ایک معمولی فلسفے سے ناواقف انسان کا اعتقاد ہے۔ کسی معمولی آدمی سے پوچھو کہ آیا ہم اس حقیقت کی اصلیت کو جان سکتے ہیں جو غیر محسوس ہے یعنی کُل کی حقیقت کو، تو اس کا صاف اور صریح جواب یہی ہوگا کہ نہیں۔ اور اگر آپ اس سے پوچھیں کہ کیوں نہیں تو وہ یہی سیدھی سادھی دلیل پیش کریگا کہ اس لیئے نہیں کہ ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ یہی دلیل ہے جو کانٹ پیش کرتا ہے۔ لیکن اس دلیل کو اہلِ فلسفہ سے قبول کروانے کے لیئے کانٹ جیسے شخص کی ضرورت تھی۔

لیکن کانٹ نے محض اس سلبی نتیجے پر اکتفا نہیں کیا۔ کوئی غور کرنے والا شخص اس پر اکتفا نہیں کرسکتا کیونکہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم کائنات کی حقیقت کو نہیں جان سکتے، اگر ہم کو کبھی یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس کُل اس حقیقتِ وجود کی اصلیت کیا ہے تو پھر فلسفہ کو کس چیز کی تحقیق کرنی چاہیئے؟ اس کے جواب میں مثل سقراط، کانٹ نے بھی اپنی توجہ کو انسان کی جانب مبذول کیا۔ لیکن زیادہ تعمق اور وسعت نظر کے ساتھ۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں مشہود یعنی وجود خارجی سے ابتدا نہیں کرنی چاہیئے، بلکہ شاہد یعنی انسان سے ابتدا کرنی چاہیئے۔ ہمیں یہ سوال نہیں اُٹھانا چاہیئے کہ علم کا مضاف الیہ یعنی عالم کیا چیز ہے بلکہ یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ خود علم کیا چیز ہے اور اس کے اُصول کیا ہیں۔ کیونکہ علم ہماری اپنی فعلیت ہے۔ ہم اس کو یقین کے ساتھ جان سکتے ہیں۔ اِسی طرح سے ہمیں یہ سوال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ چیز یا مقصد کیا ہے جس کی جانب تمام عالم حرکت کر رہا ہے یا بنی نوع انسان جا رہی ہے۔ بلکہ یہ پوچھنا چاہیئے کہ عزم خیر کیا چیز ہے۔ فرض اور نیکی کے کیا معنی ہیں اور ان کے بنیادی اُصول کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علم اور اخلاق انسان کے اپنے پہلو ہیں۔ علم وہ پہلو ہے جو وہ حق یعنی حقیقت، واقعیت کی جانب اختیار کرتا ہے۔ اور اخلاق وہ پہلو ہے جو خیر۔ کمال یا مثالیہ کی جانب اختیار کرتا ہے۔ فلسفہ کو چاہیئے کہ ان تمام بنیادی پہلوؤں کا مُطالعہ کرے جو انسان

اختیار کرتا ہے اور ان کا تجزیہ کرے۔ کانٹ اس سے اور آگے بڑھا اور اس نے انسان کے دو نئے پہلو یعنی اس کے وقوف کی دو نئی شکلوں کو دریافت کیا۔ ان میں سے ایک اس کا پہلو ہے جمال و جلال کی طرف یعنی خیر یا کمال کی طرف جو واقعہ بن گیا ہے اور مثالیہ کی طرف جو مجسم ہو گیا ہے۔ یہ پہلو ہے اربابِ فنونِ لطیفہ کا۔ دوسرا انسان کا وہ پہلو ہے جو وہ کل کی جانب اختیار کرتا ہے۔ یہ کل ان تینوں پر حاوی ہے، جن کا ذکر ہوا یعنی واقعیت، مثالیت اور مثالیت واقعی پر۔ دوسرے الفاظ میں تمام عالم پر۔ اس کا نام مذہبی پہلو ہے۔ پس فلسفہ کا کام اب یہ ہے کہ وہ ان پہلوؤں یا وقوف کی شکلوں کی توضیح کرے یعنی ان کا تجزیہ کرے، ان کے اصولوں کو معلوم کرے اور یہ بتائے کہ ان سے حقیقتِ عالم پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

فلسفہ اب "وجود کا بیان" نہیں رہا جس کو جرمن لوگ اپنے محاورہ میں "فلسفۂ طبیعت" کہتے ہیں۔ اب اس کا تعلق روحِ انسانی کی بلندیوں اور گہرائیوں سے ہے۔ اس کی حقیقی اُمنگوں اور دلی آرزوؤں سے، جرمنوں کی اصطلاح میں وہ "فلسفۂ انسانیت یا روحانیت" ہو گیا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر کانٹ کے بعد سے فلسفہ کا موضوع انسان کے مقاصدِ قصویٰ سے ہو گیا ہے۔ یعنی طلبِ حق سے، حصولِ کمال کے لئے اخلاقی جد و جہد سے، جمال و جلال کے مشاہدہ اور تخلیق سے اور حقیقتِ اصلی کے ساتھ اتحاد اور تعلق سے۔ یعنی فلسفہ عمیق ترین اور وسیع ترین بیان ہے روحِ انسانی کی غایت کا۔

لیکن انسان محض روح ہی روح نہیں ہے۔ وہ صرف ناطق ہی نہیں بلکہ وہ ایک حیوان بھی ہے۔ اگر فلسفہ کو تمام انسانی زندگی پر محیط ہونا ہے تو لازم ہے کہ وہ انسان کے حیوانی غایت کو بھی ظاہر کرے۔ پس فلسفہ یہ بھی کرتا ہے۔ یہ غایت ہے "راحت" یعنی خواہشوں کی تشفی۔ اس کو جسمانی اور مادی خوش حالی بھی کہہ سکتے ہیں یعنی جسمانی صحت اور مادی آسایش۔ صحت و آسایش کے اُصول کیا ہیں؟ اس کے جواب میں فلسفہ مختلف تجربی علوم کا حوالہ دیتا ہے یعنی حیاتیات، بدنیات، نفسیات، حفظانِ صحت، معاشیات وغیرہ۔ اس غایت کی جڑ ہماری حیوانیت میں ہے۔ لیکن ہم حیوان ہی نہیں ذی عقل و نطق بھی ہیں۔ پس یہ غایت شائستگی و تہذیب بن جاتی ہے۔ جو "انسانیت" سے مختلف ہے۔

لہٰذا انسانیت اور تہذیب انسان کی غایتِ تامہ ہوئے۔ اب فلسفہ کی عام تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ اس غایت کی توضیح و تشریح ہے۔ وہ اس انسانی غایت کو معلوم کرتا ہے اور اس کو اور اس کے اُصولوں کو بیان کرتا ہے۔ نہیں وہ اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ وہ نہ صرف اس غایت کی تعین کرتا ہے

بلکہ فلسفہ اخلاق کی حیثیت سے ہمیں اس پر مامور بھی کرتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارا اعلیٰ ترین فرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس غایت کو اپنی ذات میں حاصل کریں اور اُس کے حاصل کرنے میں دوسروں کی مدد کریں۔

اب چونکہ فلسفہ اس غایت کی تعیین کرتا اور اس کو ہمارے لیئے مقرر کرتا ہے اس لیئے ہم اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ غایت بہت سے عناصر پر مشتمل ہے۔ اس میں انسانیت و تہذیب دونوں شامل ہیں۔ اس لیئے فلسفہ کو ان دونوں کا تعلق بھی بتانا چاہیئے کہ ان میں سے کون مقدم ہے اور کون موخر، کون برتر ہے اور کون کم تر۔ معلم کو ان سوالوں کا جواب جانے بغیر چارہ نہیں۔ پھر وہ غایت بحیثیت انسانیت کے بھی متنوع ہے۔ اس میں علم اخلاق، فنون لطیفہ اور مذہب سب شامل ہیں اور یہ سوال ان سب کے متعلق پیدا ہوتا ہے فلسفہ کو اس مقصد کے لیئے ان کی قدر اضافی بتانی پڑتی ہے۔ یعنی غایت انسانی کی تکمیل میں ان میں سے ہر ایک کی جگہ کہاں ہے۔ اور ان کی ترتیب بلحاظ تقدم و تاخیر (منطقی و نفسی) کس طرح ہے۔

یہ بات زیادہ واضح ہو جائیگی اگر میں ان چند تعلیمی تجربوں کا ذکر کروں جو جرمنی اور بعض دیگر ممالک میں ہو رہے ہیں۔

---

(۱) زائی نش (Seinig) کا ایک مدرسہ ہے جس کو شارلوٹن برگ گمائن شولے (Charlottenburg Gemeinschule) کہتے ہیں۔ زائی نش زبانی لفظوں کے ذریعے کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ چاہتا ہے کہ طالب علم خود ہر چیز کو پیدا کریں۔ طلبا خود ہر قسم کے نمونے اور سائنس کے آلات وغیرہ تیار کرتے ہیں پس ان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مثلاً ٹیلیفون کیا چیز ہے۔ وہ اس کو خود بناتے ہیں اور اس طرح جان لیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم صرف مادی اور صنعتی چیزوں تک محدود ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زائی نش کے پیش نظر تعلیم کا جو مقصد ہے وہ فقط جسمانی اور معاشی خوش حالی ہے۔ اس لیئے خواہ اس کے نتائج کیسے ہی عجیب و غریب کیوں نہ ہوں اس کی تعلیم یک رُخی ہے یعنی تہذیب و شائستگی۔

(۲) بعض تعلیمی تجربوں میں انسانیت ہی کو ذریعہ تعلیم بتایا گیا ہے۔ لیکن بعض میں اس کے کسی ایک رُخ پر زور دیا گیا ہے اور بعض میں دوسرے پر۔ مثلاً

(۱) برٹ اولڈ اوٹو (Berthold Otto) کے مدرسے میں جو لشٹر فلڈ (Lichterfeld) میں واقع ہے اخلاق کے عنصر پر زور دیا گیا ہے۔ برٹ اولڈ فرد اور اس کے نشو و نما کو مقصد اول

قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ انفرادیت، فرد میں آزادی و خودی اور سیاسیات میں جمہوریت سکھاتا ہے۔

(ب) مدارس دیہی (Landserziehungsheime) جن کی بنا لیٹس (Lietz) نے ڈالی اور جو اب کافی تعداد میں جرمنی میں پائے جاتے ہیں، ان میں اخلاق کے اجتماعی عنصر پر زور دیا جاتا ہے۔ بچوں کو شہروں سے دیہات میں لے جاتے ہیں جہاں وہ ایک گھر کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُستاد اور شاگرد، ماں باپ اور بھائی بہنوں کی طرح رہتے اور کام کرتے ہیں۔ ہر بات سب کی رضامندی سے ہوتی ہے اور ہر امر میں سارے گھر کا فائدہ پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ وی نیکین (Wynecken) کا مدرسہ جو وکرس ڈورف (Wickers Dorf) میں ہے۔ لیٹس (Lietz) ہی کے اُصولوں پر قائم ہے۔ مگر اس میں طلبا کے درمیان جو رشتہ ہے وہ دوستی کا ہے۔ خاندانی زندگی کا سا نہیں ہے۔

(ج) اولڈن والڈ (Oldenwald) کا مدرسہ جس کو پرل وٹس (Prellwitz) نے جاری کیا تھا۔ بادی النظر میں مدارس دیہی کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اخلاقی عنصر پر نہیں بلکہ جمالی عنصر پر زور دیتا ہے۔ بچوں کے احساس حُسن کو بیدار کیا جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے شاعروں، مغنیوں، مصوّروں وغیرہ سے ان کے دل میں محبت پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً گوئٹے، شلر وغیرہ۔ اور ان کو سکھایا جاتا ہے کہ زندگی کی مشکلات کا حل مشاہدہ جمال میں تلاش کریں۔

(د) گاوڈش (Gaudig) کے تتبع میں وکٹر ہنری (Victor Henry) نے ایک مدرسہ قایم کیا ہے جس میں علم کے عنصر پر زور دیا جاتا ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد دماغی نشوونما ہے۔ یہی مقصد ہے جو بیشتر ہندوستانی مدارس میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

(ہ) اگر تعلیم میں مذہبی رُخ پر زور دینے کی مثال ہم سکھنا چاہیں تو ہمیں خود اپنے قدیم مدرسوں کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔ جب سے امام غزالی نے صدائے احتجاج بلند کی تھی ہمارے مدارس میں تعلیم کی ایسی شکل پیش کی جاتی ہے جس میں مذہب کا عنصر غالب ترین ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ان مدرسوں سے کس قسم کے تعلیم یافتہ لوگ نکلتے ہیں۔

یہ جملہ مقاصد (جسمانی اور معاشی خوش حالی، انفرادی اور اجتماعی اخلاق، مذاق صحیح، علم، مذہب) بجائے خود کتنے ہی قابل قدر کیوں نہ ہوں۔ لیکن ان میں سے اگر کسی ایک کو تعلیم کا واحد یا غالب مقصد

مان لیا جائے تو تعلیم یک رخی اور غیر مکمل ہوگی۔ اور مقصد حیات کی تکمیل نہ کر سکیگی۔
غرض تعلیم کے نظریہ کے لیئے یہ سوال نہایت ہی اہم ہے کہ اُن تمام اجزا کی مقابلۃً کیا قدر و قیمت ہے اور ان سب کو کس نسبت سے ملانا چاہیئے۔ اور اس سوال کا جواب بغیر فلسفہ کی مدد کے نہیں دیا جا سکتا۔

تعلیم

لہذا معلوم ہوا کہ فلسفہ انسان کے غایت قصوی کی تعیین کرتا ہے اور اس کو مامور بہ بناتا ہے۔ اب تعلیم کا صحیح نصب العین یہ ہوا کہ اس غایت کو حاصل کرے۔ بقول لے من (LEHMANN) کے تعلیم کا مقصد ہے "بقائے حیات و انسانیت یعنی فرد کی خوش حالی اور ارواح کی مافوق فردیت مشترکہ زندگی" اور اس کا کام ہے" اس مقصد کا حصول"۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد تہذیب و انسانیت کو حاصل کرنا ہے۔
اس میں شک نہیں کہ تعلیم یہیں بس نہیں کرتی۔ اس کا طریقہ عمل تجربی ہے۔ اس کو تجربتہً یہ معلوم کرنا پڑتا ہے کہ یہ مقصد کس طرح اور کس ترتیب سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تعلیم کا نظریہ اور عمل اسی پر مشتمل ہے اور اسی وجہ سے بالعموم نفسیات اور بالخصوص نفسیاتِ اطفال کا مطالعہ تعلیم کے لیئے نہایت ضروری ہے۔
لہذا فی الحال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم ان عملی قواعد کے مجموعہ کا نام ہے جو نفسیات سے مستنبط ہے اور جن کا مقصد یہ ہے کہ رفتہ رفتہ غایت انسانی کو بتدریج حاصل کیا جائے۔ اس کی تعیین کرنا اور ہمیں اس پر مامور کرنا فلسفہ کا کام ہے۔

نظامِ فلسفہ میں تعلیم کی جگہہ

اس تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلسفہ اور تعلیم کا کس قدر قریبی تعلق ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ تعلیم کا نظری رُخ ہے۔ اور تعلیم اسی کا عملی پہلو۔ ایک حکمتِ نظری ہے۔ دوسری اپنی مکمل صورت میں حکمت عملی۔ ان دونوں کے امتزاج سے انسان کمال کو پہونچتا ہے۔ وہی انسان کو پرانے اسطوقی (Stoic) اصطلاح کے بموجب "دانا" بناتا ہے یا اُس معنی میں "حکیم" بناتا ہے جس میں لقمان حکیم تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظام فلسفہ میں تعلیم کی کیا جگہہ ہے۔ کانٹ کے زمانے سے فلسفی اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ تعلیم کے لیئے ایک صحیح نظریہ کی ضرورت ہے بلکہ اُن میں سے بعض نے تو تعلیم کو اس طرح نظام فلسفہ کا ایک جزو لازم قرار دے دیا ہے جس طرح منطق، اخلاقیات اور جمالیات اس کا جزو ہیں۔ میں اس حد تک تو نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن جو کچھ میں کہہ چکا ہوں۔ اس سے یہ صریحی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ فلسفہ اور تعلیم دونوں ایک

دوسرے سے وابستہ ہیں۔ تعلیم کو فلسفہ کے بغیر چارہ نہیں۔ اور فلسفہ کا مطالعہ ایک بے سود شغل ہے اگر وہ حکمت عملی نہ بن جائے۔

تعلیم میں فلسفہ کی جگہہ

پہلا سوال یعنی فلسفہ میں تعلیم کی جگہہ کیا ہے۔ بڑی حد تک ایک نظری بحث ہے۔ لیکن یہ سوال کہ تعلیم میں فلسفہ کی جگہہ کیا ہونا چاہیئے۔ عملی پہلو رکھتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ آیا فلسفہ کی تعلیم کو عام تعلیم کا جزو لاینفک ہونا چاہیئے یا نہیں؟ اور اگر ہونا چاہیئے تو کب سے اور کس حد تک؟ اسکول کی تعلیم کے سلسلے میں اس مسئلہ پر جرمنی میں سخت بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم تعلیم کی مختلف منزلوں کو ذرا وضاحت سے بیان کر دیں۔

(۱) تعلیم کی پہلی منزل۔ ابتدائی مدارس (Volk Schule) ہیں۔ اس منزل میں تعلیم کا مقصد زیادہ تر بعض عملی چیزوں کا سکھانا ہوتا ہے۔ نظری تعلیم نہیں دی جاتی۔ ان کو ہمارے ہاں کے مڈل سکولوں کے مقابل سمجھنا چاہیئے۔

(۲) تعلیم کی دوسری منزل۔ جمناسیم اور اوبر ریال شول Gymnasium abd Ober- RealSchule) جو ہمارے ہاں کے انٹرمیڈیٹ کالج اور بی اے کے معمولی نصاب کے مساوی ہیں۔ اس درجہ پر پہنچ کر بعض زیادہ اونچے مضامین جزو لازم کے طور پر شامل کیئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سارے نصاب پر حاوی نہیں ہوتے۔ یعنی ان کو مقصود بالذات نہیں بنایا جاتا۔ اس تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ اور قابل آدمی پیدا کیئے جائیں۔ جو عملی زندگی کے بڑے بڑے کاروبار انجام دے سکیں۔ ٹھیک ٹھیک کہا جائے تو یہ کہنا چاہیئے کہ اس منزل میں تمام یونیورسٹی کی تعلیم بھی آجاتی ہے (یعنی جو مفہوم یونیورسٹی کی تعلیم کا ہندوستان اور انگلستان میں ہے اور جس میں بی اے (آنرز) اور ایم اے کا نصاب بھی شامل ہے۔)

(۳) تعلیم کی تیسری منزل ہے یونیورسٹی۔ فنون لطیفہ کی اکاڈمی، دینیات کے انسٹی ٹیوٹ، جہاں انسانیت کے مختلف عناصر، علم و حق، جمال و فن، مذہب اور اخلاق کا مطالعہ مقصود بالذات بنالیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بد قسمتی سے اس تعلیمی منزل کے مقابلے کی کوئی چیز موجود نہیں باستثنائے چند فیلوشپ "رفاقت" وغیرہ کے جو بنگال میں قایم کی گئی ہیں یا بعض خانقاہیں یا صوفیوں کے تعلیمی ادارے جو مذہب تک محدود ہیں

پس مذکورہ سوال کا تعلق دراصل دوسری منزل یعنی جمنازیم سے ہے جس کو جرمنی میں سکول کی تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ آیا فلسفہ اس درجہ میں پہنچ کر ایک اختیاری مضمون ہونا چاہیئے یا نہیں بلکہ یہ کہ آیا اس کو ہر طالب علم کی تعلیم کا ایک جزوِ لازم بنایا جائے یا نہیں۔ پرشیا کی حکومت نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ اسے لازمی طور پر نصاب کا جزو ہونا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ سکول کی تعلیم کے اعلیٰ منازل میں فلسفہ کو تعلیم کا جزو لازم بنا دینا چاہیئے۔ نہ صرف علمی لحاظ سے بلکہ عملی اور اخلاقی وجوہات سے بھی۔ دوسرے علوم اور مضامین کا دائرۂ تحقیق محدود ہے اور ان کا تعلق فقط کائنات کے بعض حصوں سے ہے۔ اُن کے ضمن میں قدرتاً ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں، جن کا وہ جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے جستجو کرنے والے دماغ کی تشفی نہیں ہوتی۔ اور طلبِ حق کا جو جوش انسان کے دل میں ہے پورا نہیں ہوتا۔ اور اس کے قوائے علمی کی ان علوم کے ذریعے سے پوری طرح تکمیل نہیں ہوتی، مثلاً طبیعیات یا نفسیات کو لیجئے۔ طبیعیات ہمیں بتاتی ہے کہ مادہ کی مشہود ماہیت کیا ہے؟ اور نفسیات ہمیں بتاتی ہے کہ حیات کی مشہود ماہیت کیا ہے۔ اور نفسیات انسانی نفس کی مشہود ماہیت بتاتی ہے۔ اس محدودیت ہی میں ان علوم کی قوت کا راز نہاں ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں بتاتا کہ ان کے موضوع کی مکمل حقیقت کیا ہے۔ پھر یہ کہ ان میں سے ہر ایک علم اپنے اپنے حلقہ میں مظاہرِ قدرت کے اسباب کی تلاش کرتا ہے وہ ان کے درمیان علت و معلول کا رشتہ معلوم کرتا ہے اور پھر اُن کو قوانین کی شکل میں ترتیب دیتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی یہ دریافت نہیں کرتا کہ خود علت و معلول کے تعلق کے کیا معنی ہیں۔ اور ہمیں اس تصور کو استعمال میں لانے کا کیا حق ہے۔ بالفاظ دیگر یہ علوم اپنے تفحص و جستجو کو اُس کی آخری حدود تک نہیں لے جاتے۔ اور طلبِ علم کو نامکمل چھوڑ دیتے ہیں لیکن اگر طلبِ علم کی صلاحیت کو پوری نشو و نما دینی مقصود ہے تو اس جستجو کو اس کی آخری حد تک لے جانا چاہیئے۔ اس طرح سے طبیعیات فقط مادہ تک حیاتیات اجسام نامیہ تک اور نفسیات نفس تک محدود ہے۔ لیکن یہ سوال کہ مادہ کا حیات کیا تعلق ہے۔ اور حیات نفس سے کس طرح وابستہ ہے۔ اس کا جواب یہ علوم کچھ بھی نہیں دے سکتے۔

یہ تمام سوالات فلسفہ کے اندر آجاتے ہیں۔ اگر یہ طالب علم کے دماغ میں خود بخود پیدا نہ ہوں تو اُستاد کو چاہیئے کہ ان کو اٹھائے تاکہ شاگرد کے قوائے علمی کی تکمیل ہو۔ مگر ان کا جواب سوائے فلسفہ کے کوئی نہیں دے سکتا۔ اس لیئے دماغی ترقی کے لیئے فلسفہ کی کم سے کم ابتدائی واقفیت بہت مفید ہے۔

(۲) اسی طرح اخلاق کے نظریہ سے بھی فلسفہ کی تعلیم ضروری ہے۔ زندگی میں صلاحِ عمل کیلئے نہایت ضروری ہے،

کہ فرض، ذمہ داری، نیکی وغیرہ کا صحیح مفہوم سمجھا جائے، اور جیسا کہ کانٹ نے کہا ہے نیکی (اور ادائے فرض) کے لئے سب سے بڑی ترغیب خود نیکی کا علم ہے۔ بچہ کو موقع دو کہ وہ نیکی کو پہچانے۔ اس کا نیک باتوں اور کاموں سے سابقہ ڈالو۔ اور نیکی کا صحیح اور صریح مفہوم اس کے دل میں پیدا کردو۔ تو معلوم ہوگا کہ اس میں خود ایک ایسی دل فریبی اور کشش ہے۔ اور اس سے روح کو ایسی بلندی حاصل ہوتی ہے جو محض نیکی کے جھوٹے سچے فوائد کے بیان سے حاصل نہیں ہوتی۔

(۳) علاوہ اس کے سکول میں فلسفہ کا مطالعہ ایک عملی نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے۔ طلبا میں سے ایک بہت بڑی تعداد کی تعلیم سکول کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ وہ یونی ورسٹی کے درجہ تک نہیں پہونچتے (جو صحیح معنوں میں صرف جرمنی ہی میں پائی جاتی ہے) جن سوالات کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے وہ شاگردوں کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، خصوصاً وہ جن کا تعلق فلسفۂ اخلاق سے ہے۔ یا ان کے عناصر کی نسبتی قدر و قیمت سے جو مقصد حیات کا جزو ہیں۔ کوئی نظام تعلیم درست نہیں کہلا سکتا۔ جو شاگرد کو ان اہم مسائل کے متعلق بالکل جاہل چھوڑ دے۔ اس لئے مجھے کو نراڈ آئی لرس کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ کہ فلسفہ کو سکول کی اونچی جماعتوں کے نصاب میں لازماً شامل ہونا چاہیئے۔

فلسفہ کے فوائد تعلیم کے لئے

اب میں اس مسئلہ پر آتا ہوں کہ ماہرین تعلیم کی نظر میں فلسفہ کے کیا فوائد ہیں۔ فلسفہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، عالم کی حقیقت انتہائی کا علم ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ بحیثیت مجموعی تمام عالم کی مجموعی اصلیت کیا ہے۔ فلسفہ کی (قدیم زمانہ میں) یہی غایت سمجھی جاتی تھی۔ سقراط نے ایک انقلاب کا ایما کیا تھا۔ اور کانٹ نے وہ انقلاب کر دیا۔ اب فلسفہ عالم کی حقیقت کا علم نہیں رہا۔ بلکہ وہ انسان کی فطرت اصلی کا علم ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کی مخصوص صفات یہ ہیں کلیت اور نہایت۔

فلسفے سے عادت پڑتی ہے بات کے ہر پہلو پر غور کرنے کی۔ امور کی تہ تک پہنچنے کی۔ اور تعمق پیدا ہوتا ہے۔ اور چونکہ فلسفہ اشیا کی توضیح کے لئے وحدت کی تلاش کرتا ہے۔ یعنی کسی ایسی ایک اصل کی جس سے سب کچھ سمجھ میں آجائے۔ (جو اصل کانٹ سے پہلے "کیا ہے" میں ڈھونڈی جاتی تھی اور کانٹ کے بعد "کیا ہونا چاہیئے" میں تلاش کی جاتی ہے) اس لئے اس سے باقاعدہ غور کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ فلسفی کی ہرگز تشفی نہیں ہوتی۔ جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ تمام چیزیں باقاعدہ اور ترتیب منطقی کے مطابق

اپنے اصولوں سے متفرع ہوتی ہیں۔ اور چونکہ اس فلسفہ میں اشیا کی حقیقت تک پہونچنے کی ہر امکانی کوشش کی جاتی ہے اس لیئے اس میں بے جانب داری اور صدق کی ضرورت ہے یعنی تعصب اور پہلے سے قایم کی ہوئی رایوں سے آزاد ہوجانے کی۔ کیونکہ آپ کو یاد ہوگا کہ فلسفے کی ذات میں یہ بات تھی کہ ہم ان سب چیزوں سے چھٹکارا پائیں جو ہم پر باہر سے عاید کی گئی ہیں اور اپنی عقل کی مدد سے چیزوں کی ماہیت کو دریافت کریں پس ضروری ہے کہ فلسفہ بمقابلہ اور تمام علوم کے اُس دماغی عادت کو مستحکم کرے جسے جرمن "واقعیت" کہتے ہیں جس کی بدولت انسان خود کو اپنے موضوع میں جذب کردیتا ہے اور ذاتی خواہشات اور رجحانات کو قطعاً نظر انداز کردیتا ہے۔ وہ صفات کیا ہیں؟

یہ ہیں وہ صفات یعنی استیعاب، تعمق، نظم، واقعیت جو دماغی تعلیم کا عطر ہیں اور معلّم شاگرد کو بہترین تعلیم اس طرح دے سکتا ہے کہ اس میں یہ عادتیں راسخ کردے۔ اُن کو خود معلم، فلسفہ کی بدولت حاصل کرسکتا ہے اور فلسفہ ہی کے ذریعہ سے ان کو اپنے شاگردوں میں پیدا کرسکتا ہے اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوجائے تو گویا اُن کی دماغی ترقی کے لیئے اس نے بہترین خدمت انجام دے دی۔

میں نے بیان کیا ہے کہ فلسفہ انسان کی صحیح اور مکمل غایت کا تعین کرتا ہے اور اس کے حصول کا حکم دیتا ہے۔ اور تعلم اس غایت کو بتدریج پورا کرنے کا نام ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی تعلم کے شرائط کیا ہیں اور وہ کن حالات میں ممکن ہے اس سوال کا مفصل جواب دینا طویل بحث چاہتا ہے اس کے لیئے جماعتوں کی تقسیم نصاب کی تنظیم، اُستادوں کی قابلیت، منہاج تعلیم، طریقہ امتحان وغیرہ پر بحث کرنے کی ضرورت ہے یہ سب نہایت اہم مسائل ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق مفصل تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہے لیکن میں اس جگہ آپ کی توجہ ایک خاص مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جس کی بابت ہندوستان میں بڑی حد تک بے اعتنائی برتی گئی ہے اور جس کے بغیر میرے خیال میں تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا یعنی صحیح تعلیم ایسی ہی تعلیم گاہوں میں ہوسکتی ہے جہاں طلبا کے قیام کا انتظام ہو جہاں طلبا اور اساتذہ اکھٹے رہیں اور ان کی جسمانی، دماغی، اخلاقی، ذوقی اور مذہبی صلاحیتوں کے ارتقا اور نشو و نما کا موقع مل سکے جہاں اساتذہ دن رات موجود رہ کر اس نشو و نما کی نگرانی اور مدد کرسکیں اور جہاں اپنے ہم جنسوں کی صحبت اور دوستانہ مقابلہ سے ہر طالب علم کو اس بات کی ترغیب ہو کہ وہ اپنی قابلیتوں سے کام لے اور ان کو فروغ دے۔ جو قومیں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ہیں اُنھوں نے اس صداقت کو سمجھ لیا ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ

اس تعلیم گاہ کے عظیم الشان بانی نے بھی اس کو سمجھا اور علی گڑھ کو اقامتی یونیورسٹی بنایا۔ علی گڑھ میں تعلیم کے تمام مدارج یعنی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم (یعنی جو مفہوم اس لفظ کا ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے) موجود ہیں پس ماہرین تعلیم کو اپنے تعلیمی نصب العین پورا کرنے کے بہترین مواقع علی گڑھ میں حاصل ہیں۔ کاش ہماری تمام قوتیں اور ہماری قابلیتیں اس کے حصول کے لیئے وقف ہوجاویں! اس لئے میں اس تعلیم گاہ کے سرگروہوں سے صدق دل سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنی کوششوں کو اس ایک مقصد کے لئے وقف کردیں ہمیں چاہیئے کہ ہم علی گڑھ کو صحیح معنوں میں ایک اقامتی یونیورسٹی بناویں۔ تعلیم کے مسئلہ کے ساتھ ہی امتحان کا مسئلہ بھی بخوبی طے ہوجائیگا۔ پھر کسی کو جرأت نہ ہوگی کہ وہ ہمارے نظام امتحانات میں دخل دے سکے۔ ہمارے امتحان بھی ہماری تعلیم کی طرح مکمل ہونگے۔ جس طرح مکمل تعلیم کے معنی ہیں جملہ قابلیتوں کی تربیت اسی طرح مکمل امتحانات کے معنی ہیں ایسا امتحان جو ہر چیز کا امتحان ہو۔ جس طرح مکمل تعلیم ایک طویل اور مسلسل عمل ہے اسی طرح مکمل امتحان ایک طویل اور مسلسل عمل ہوگا۔ اساتذہ وغیرہ جو بچوں کی تعلیم و تربیت کے ضامن ہیں ہر طالب علم کی جسمانی، دماغی، اخلاقی، ذوقی اور مذہبی نشوونما کو نظر میں رکھیں گے۔ اور جماعت میں اور جماعت سے باہر اس کے کام اور مشاغل کی یادداشت رکھیں گے۔ جب اس تعلیم کی ایک منزل ختم ہوگی تو دراصل اس کی ترقی کا انحصار زیادہ تر ان یادداشتوں پر ہوگا جن کی تکمیل کے لئے ایک آخری باقاعدہ امتحان بھی لینا چاہیئے۔ ہمارا امتحان مثل زندگانی کے ایک روزانہ امتحان ہوگا جیسا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ "زندگی امتحان ہے" اور ممتحن بھی ایمانداری کے ساتھ اور تمام حالات کی رعایت رکھ کر امتحان لے گا اور اس ہستی کی تقلید کریگا جو ہم سب کی ممتحن ہے اور جس کا حکم ہے تخلّقوا باخلاق اللہ (خود کو اخلاقِ الٰہی کے ساتھ آراستہ کرو) ضرورت ہے کہ طلباء اور اساتذہ اس حکم کی پیروی کریں۔

اس بات کی جانچ کہ آیا ایک طالب علم اپنی جسمانی، اخلاقی اور دماغی نشوونما کے لحاظ سے ایک خاص جماعت کے قابل ہے یا نہیں، اور یہی صحیح معنوں میں امتحان کا مقصد ہے، آج کل کے نظام امتحان کی طرح نہ ہوگا جو امتحان لینے والے اور دینے والے اور باہر کی دنیا سب کے ساتھ ایک ظلم ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ خود تعلیم کی غایت کا خون کرتا ہے۔ ہمارا امتحان صحیح معنوں میں ایک قابل اعتبار جانچ ہوگی یعنی جس حد تک انسانی جانچ ٹھیک ہوسکتی ہے اس وقت علیگڑھ کی یونیورسٹی کی ڈگریاں انگلستان اور جرمنی کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کی ڈگری کی طرح وقعت رکھینگی اور دنیا ان کے سامنے سر تسلیم خم کریگی اور علی گڑھ کے طالب علم اپنے پر اپنی تعلیم پر اور اپنی تعلیم گاہ پر فخر کرسکیں گے علیگڑھ کے ماہرین تعلیم کی کوششوں کے لیئے اس سے بہتر اور بالاتر انعام اور کیا ہوسکتا ہے؟

نفسیات شباب کا ایک باب

نوجوانوں کا عشق

"یہ جرمنی کے جید فلسفی اور ماہر تعلیمات **ایڈورڈ اشپرانگر** صاحب پروفیسر جامعہ برلن کی معرکۃ الآرا کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ "**نفسیات شباب**" کے نام سے اس سال کے آخر میں اردو اکادمی جامعہ ملیہ کی طرف سے شائع ہوگا۔"

نوجوان کی شاعری کا طرز اداخواہ تقلید کی صورت میں، خواہ مخالفت کی صورت میں، آرٹ کے اُس عام طرز سے متاثر ہوتا ہے جو فی زمانہ اُس کے معاشرتی حلقہ میں مقبول ہو۔ پھر بھی ہم یہ کلیہ قرار دے سکتے ہیں کہ آرٹ کی صنف میں مثلاً تمثیل میں واقعہ بینی[1] سے سچّی شاعرانہ قوت تشکیل کا زیادہ اظہار ہوتا ہے بہ نسبت کمال بینی[2] کے۔ انسانوں اور چیزوں کو تخیل کی مدد سے اُن کی مکمل صورت میں دیکھنا عنفوانِ شباب کے خصوصیات میں سے ہے اور ہر نوجوان میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی آرٹ میں کمال بینی اختیار کرے تو یہ پتا نہیں چل سکتا کہ اُس میں واقعی صناعانہ جدتِ طبع اور قوت احساس ہے یا نہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اور انسانوں کی طرح نوجوان بھی اپنی نفسی زندگی میں کبھی تہ میں ہوتا ہے اور کبھی سطح پر۔ اس لئے وہ ہر چیز میں اور ہر موقعہ پر کمال بینی سے کام نہیں لے سکتا۔ بلکہ صرف اُس وقت جب وہ دنیا کو اپنے نفس کی انتہائی گہرائی سے دیکھتا ہے۔

اب ہمارے پیش نظر دو صورتیں ہیں یا تو ہم یہ سمجھیں کہ یہ کمال بینی نوجوان کی طبیعت کا عام انداز ہے گویا وہ اپنے بہار شباب کی ترنگ میں اپنے آس پاس کی چیزوں اور انسانوں کو بلند، حسین اور

---

[1] REALISM یا NATURALISM آرٹ کی اصطلاح میں اس طرز کو کہتے ہیں جس میں صناع اشیاء کو اسی طرح دیکھتا اور دکھاتا ہے جیسی وہ واقعی ہیں۔

[2] IDEALISM آرٹ میں وہ طرز ہے جس میں صناع اشیاء کو اُن کی مکمل عینی صورت میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔

پُراسرار بنا دیتا ہی۔ یا یہ کہیں کہ اصل میں وہ جمالیاتی کیف کے عالم میں کسی محبوب روح کو کمال آفرینش سمجھ کر اُس کے رنگ میں ڈوب جاتا ہی۔ اس لئے اُسے ساری دنیا حسین اور مکمل نظر آتی ہی۔ اس لئے ہم دونوں باتوں میں سے کسی کے حق میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ جو لوگ دوسری صورت کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے آئندہ زندگی میں جب انسان کسی پر عاشق ہوتا ہی تو یہ کمال بینی کی قوت پھر پیدا ہو جاتی ہی۔ ان کے جواب میں کہا جاسکتا ہی کہ ممکن ہی نوجوانی میں محبت اور آرزو عالمگیر ہوتی ہو۔ لیکن بالغ ہونے کے بعد یہ گھٹ کر محض عشق یا روحانی اتحاد کی آرزو رہ جائے۔ لیکن عام خیال کی پیروی میں ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں نوجوانوں کی کمال بینی کی اصل عشق ہی ہی۔

مناسب ہوگا کہ ہم سب سے پہلے بعض الفاظ کا استعمال معین کریں۔ ہم اپنی نفسیات میں عشق اور شہوت جنسی کو دو جداگانہ چیزیں سمجھتے ہیں اور ہمیں ان دونوں سے صرف اُس حد تک تعلق ہی جس حد تک یہ نفسی کیفیات کی صورت میں ظاہر ہوں۔ ان کی عضویاتی بنیاد سے بحث کرنا ماہرین عضویات اور اطباء کا کام ہی۔ ہمیں اس سے ہرگز انکار نہیں کہ عشق اور شہوت کے احساسات آپس میں بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ ہمارا یہ دعویٰ ہی کہ دونوں کے احساس کا رنگ ایک دوسرے سے بالکل جدا ہی۔ بلکہ یہ کیفیات نفس کے دو مختلف طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

شہوت جنسی کے معنی سے آئندہ باب میں مفصل بحث کی جائے گی۔ یہاں ہم بلا ردّ و قدح اس لفظ کے وسیع ترین معنی جو اسے پہنائے گئے ہیں تسلیم کئے لیتے ہیں۔ ان کی رو سے شہوانی جذبہ اور احساس محض اسی کیفیت کا نام نہیں جو جنسی رغبت کے موضوع کے ساتھ واقعی یا تخیل میں اتصال یا جماع سے پیدا ہوتی ہی۔ بلکہ ہر اُس کیفیت کو کہہ سکتے ہیں جسے جنسی لذت Libidio سے شعوری تعلق ہو بشرطیکہ اس سے حسی لذت پیدا ہوتی ہو۔ اس تعریف کے مطابق شہوت کا احساس ہمیشہ جسمانی یعنی حسی ہیجان پر مبنی ہوتا ہی۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ وہ سب احساسات جن میں جسم کا کوئی حصہ ذریعہ لذت ہو شہوانی ہیں تو اس لفظ کے معنی حد سے زیادہ وسیع ہوجائیں گے۔ کیوں کہ جن اعضا سے جسم کو غذا پہنچتی ہی یا جن کے توسط سے ہم حرکت کرتے ہیں اُن کی حسیات سے ہم ا د خاص قسم کا احساس لذت ہوتا ہی جو شہوانی لذت سے بالکل مختلف ہی۔ لیکن یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ نفسی احساس و جبلت کی وہ "ترکیب" جسے ہم Libidio شہوانی لذت کہتے ہیں اس اعتبار سے

بہت وسیع ہے کہ اس کا اثر اپنے مخصوص عضویاتی نظام تک محدود نہیں رہتا بلکہ انسان کے دوسری نفسی جسمانی ترکیبوں کے نامکمل اجزاء کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

عشق کے احساس کا رنگ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہم فی الحال اختصار کے ساتھ یوں کہہ سکتے ہیں عشق محبت کی وہ صورت ہے جس میں نفسی رنگ غالب ہو اور جس کی اصل جمالیاتی احساس ہو۔ جمالیاتی احساس سے مراد وہ احساس ہے جو کسی واقعی یا خیالی مشہود کے ساتھ روحانی اتحاد پر مبنی ہو اور جس میں جسمانی لذت یا تصرف کی خواہش کا میل نہ ہو۔ ہر جمالیاتی لذت میں شاہد و مشہود کی زندگی میں ایک طرح کا پُراسرار اتحاد واقع ہوتا ہے۔ اگر مشہود ذی روح نہ بھی ہو تو ہمارا تخیل "انتقال احساس" کے عمل سے اُس میں روحانیت کی جھلک پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ روحانی اتحاد صرف اُن چیزوں سے ہو سکتا ہے جو قابل مشاہدہ اور صورت پذیر ہوں۔ جمالیاتی احساس کے لئے (بہ خلاف مذہبی احساس کے) یہ ناگزیر شرط ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ اتحاد (واقعی اشیاء سے بھی) خالص تخیل کے عالم میں ہو اور تصرف، استعمال یا جسمانی لمس کی خواہش اس میں شامل نہ ہو۔

غرض جمالیاتی محبت یا عشق اصل میں کسی انسان سے روحانی اتحاد یا تبادلۂ احساس کا نام ہے جس میں خارجی جسمانی حسن کا مشاہدہ واسطہ کا کام دے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ عشق کبھی کبھی جسمانی علامت کے واسطہ سے بے نیاز بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ارتقائے نفس کی یہ منزل بہت دن کے بعد آتی ہے۔ عنفوان شباب میں عشق کی بنیاد اس لطف و مسرت پر ہوتی ہے جو دوسروں کے جسم کی خوبصورتی، خوش ادائی یا قوت کو دیکھ کر پیدا ہو۔ محض چہرے کے رنگ روپ یا جسم کے سڈول پن سے یہ بات نہیں پیدا ہوتی بلکہ حسین جسم کو حسین روح کا مظہر سمجھنے سے۔ اصل چیز روحانی صورت ہے جس کی جھلک جسم میں نظر آتی ہے۔ بادی النظر میں یہ بات مافوق الطبعیات یا تصوف کی بلند پروازی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم عہد شباب میں اور اس کے بعد بھی جسم کے نظارہ میں روح کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ احساس کی بنیادی صورت ہے جس کی مزید تحلیل نہیں ہو سکتی۔ اسے دوسروں کے نفس کی صورت یا اعمال کے "سمجھنے" سے کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ "سمجھنا" تو توقت و توقف کا ایک فعل ہے لیکن جمالیاتی مشاہدہ محض ایک احساس ہے —— روح سے معمور جسم کے حسن کا۔ اگر ہم فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ سوال کریں کہ جسم و روح کے اس طلسم میں جسے ہم انسان کہتے ہیں کیا چیز ہے جو اُسے حسین بناتی ہے

تو اس کا محض قیاسی جواب ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کے قانون صورت، اس کی فطری ہم آہنگی، اس کے خوش نما تناسب، اس کی کثرت نما وحدت کا جو مشاہدہ ہم چشمِ دل سے بے حواس و آورا لک کے واسطے کے کرتے ہیں وہی حسن ہے۔ جو زندگی اپنے قانون ارتقا کے مطابق بلا کسی رکاوٹ کے نشو و نما پاتی ہے۔ وہ اپنے جسم کے پردہ میں حسین معلوم ہوتی ہے۔

اس کی بصیرت اور واردات کے معاملہ میں نوجوان خاص طور پر ذکی الحس ہوتا ہے کیوں کہ وہ خود ابھی اس سرچشمہ سے قریب ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس بصیرت کا خزانہ اس کا اپنا تخیل ہے۔ اس لئے وہ "انتقال احساس" کے ذریعہ سے اُن چیزوں میں بھی کمال بینی سے کام لیتا ہے جو در اصل اس کی مستحق نہیں ہیں۔ پھر بھی اگر وہ اکیلا ہو تو اس کی زندگی کا یہ پہلو ناتمام رہ جائے۔ اس کے لئے کسی دوسرے سے روحانی اتحاد کی ضرورت ہے اور بظاہر نصب العین کا پیدا ہونا دو مشتاق روحوں کے معنوی وصل پر موقوف ہے۔ جسمانی توالد و تناسل کی روحانی تخلیق بھی اس دوئی کے اصول پر مبنی ہے یہ گویا جوہرِ انوثیت اور جوہرِ رجولیت کا آپس میں ملنا ہے۔ جس سے ہم آگے چل کر مفصل بحث کریں گے۔ یہ حقیقت جسے ہم نے بے نقاب کر دیا ہے۔ یعنی دو روحوں کا عالمِ مشاہدہ میں (جسم کو واسطہ بنا کر) ملنا اور تخیل کے عملِ تولید سے خارجی صورت پذیر نصب العین کا پیدا ہونا ہمیں کائنات کے ایک بہت بڑے راز کا پتا دیتی ہے۔ بغیر اس ذہنی پہلو کے جسمانی تناسل بھی ایک بے معنی چیز معلوم ہوتی ہے۔

یہی مختصر سی ضمنی مافوق الطبیعی بحث اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فطرت کا اصلی منشا اس وقت پورا ہوتا ہے۔ جب روحانی اتحاد اور جسمانی وصل کے اجتماع سے ایک نئے انسان کی تولید کا پراسرار عمل واقع ہو لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ نصب العین کی روحانی تولید بجائے خود اگر اس کے ساتھ جسمانی تولید نہ ہو بے معنی ہے۔ البتہ جسمانی وصل یا جماع بغیر روحانی اتحاد کے ذلیل اور مہمل چیز ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ اس کی غرض جسمانی تولید بھی نہ ہو۔

بہر حال نفسیات شباب کے لئے یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ ارتقائے نفس کے عہد یعنی نوجوانی میں فطرت ان دونوں (عشق اور شہوت) کے احساس کو جدا رکھتی ہے اور جب یہ دونوں کامل پاکیزگی کے ساتھ مل کر ایک عظیم الشان احساس اور عمل تولید کی صورت میں ظاہر ہوں تو سمجھنا چاہئے



کہ انسان کا نفس بالغ ہو گیا ہی۔ نوجوان کے نفس میں عارضی طور پر عشق اور شہوت جنسی کے جذبات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوتے ہیں۔ یہ اس بحث میں اہم ترین قضیہ ہی۔

باب اول میں اپنے فلسفہ کا منہاج بیان کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ کسی نفسی مظہر کی جو صورت میں مدرک کے نفس کو محسوس ہوتی ہی اور جو صورت اس کی منشاء کے اعتبار سے ہوتی ہی دونوں میں مطابقت ہونا ضروری نہیں۔ ممکن ہی کہ داخلی احساس کے بعض دائرے تحت[1] الشعور میں بلحاظ اپنی منشاء کے آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہوں لیکن شعور میں انھیں ایک دوسرے سے مطلق سروکار نہ ہو۔ یہ قول نوجوان کے عشق اور شہوت پر بالکل صادق آتا ہی۔ ایک ایسا زمانہ ہوتا ہی کہ یہ دونوں جذبے بیدار ہو چکتے ہیں لیکن عشق کا موضوع دوسرا ہوتا ہی۔ اور شہوت کا دوسرا۔ زمانہ کے لحاظ سے بھی نوجوان ایک ہی وقت میں دونوں سے انہماک نہیں رکھ سکتا۔ یقیناً یہ علیحدگی بھی ارتقائے نفس کے لئے مصلحت سے خالی نہیں۔

ہم اس کو ذیل کے الفاظ میں مناسب طور سے ادا کر سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں اگر عشق میں شہوت شامل ہوتی تو عشق کامل کا تخیل مٹ جاتا۔ برخلاف اس کے اگر شہوت کو پوری طرح عشق کا تابع بنانے کی کوشش کی جاتی تو کامیابی نہ ہوتی۔ جس سے ثابت ہوتا ہی کہ زیادہ خامی اس عمر میں شہوت ہی کے جذبے میں ہوتی ہی۔ اگر بلوغ کے بعد بھی عشق اور شہوت کا یہ افتراق قائم رہے تو سمجھنا چاہیئے کہ بہ ہیئت کلی شخصیت کا ارتقا رک گیا ہی اور اب یہ بات نفسی بیماری کی علامت ہی۔

"ایک نیم بالغ لڑکی کا روزنامچہ"، جو ۱۹۲۰ء میں وائنا کے "دار[2] الاشاعت تحلیل نفسی" سے شائع ہوا ہی اور ہم جسے نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت مفید سمجھتے ہیں۔ اس میں ہمیں ایک نوجوان خاتون کی تصویر نظر آتی ہی۔ جسے (شہوت کے جذبات نے نہیں بلکہ) شہوت کے مسائل نے سخت عذاب میں ڈال رکھا ہی۔ غالباً اس پر اس چیز کا اثر اس سے زیادہ ہی جتنا عموماً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر ہوتا ہی۔ لیکن یہ محض قیاس ہی اور کتاب سے اس بارہ میں کوئی یقینی نتیجہ نہیں نکلتا۔ بہرحال اگر اس کتاب سے کوئی بات ثابت ہوتی ہی تو وہ عشق اور شہوت کے دائروں کا ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو

SUBCONSCIOUSNESS (۱)

PSYCHOANALYTICHERVERLAG (۲)

ہے۔ اُن دو عورتوں کے متعلق جن سے اس نوجوان لڑکی کو عشق ہے۔ اس کے دل میں شہوانی جذبات کا
شائبہ تک نہیں۔ دوسری طرف شہوت کے معاملے میں بھی خواہشات کا کہیں نام نہیں لیکن شہوت سے متعلقہ
ان باتوں کی دن رات کرید کرتی ہے۔ کتاب محبوب اُستانی کی شان میں ایک عشقیہ غزل پر ختم ہوتی ہے
جو اس عمر کی لڑکیوں کی عام روش ہے۔ غرض عشق کے لئے جنس کی پابندی سے آزاد ہونے کے
ساتھ یہاں عشق اور شہوت کے دائروں کا جدا ہونا بھی صاف نظر آتا ہے۔

البتہ اس عمر میں ایک علامت ایسی ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحت الشعور میں احساس کے
یہ دونوں دائرے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں یہ رشک کا جذبہ ہے جو کبھی کبھی عشق کے ساتھ
ظاہر ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے یہ ممکن ہے کہ اُن میں سے بہت سے مل کر کسی ایک ہی شخص پر عاشق
ہوں۔ عشق کے جمالیاتی پہلو میں رشک کی گنجائش نہیں۔ بھلا کوئی شخص محض اس سبب سے کیوں
حسد کی آگ میں جلنے لگا کہ کوئی دوسرا اس کے جمالیاتی ذوق میں شریک ہے۔ اس لئے جب نوجوانوں کے
عشق کے ساتھ رشک کا پہلو بھی ہو تو صاف ظاہر ہے اُس کی نفس کی گہرائیوں میں کوئی ایسی چیز موجود
ہے جو محض مشاہدہ جمال اور دور سے محبت کرنے پر قانع نہیں۔ سطح کے نیچے خون کھول رہا ہے اور
قبضہ کی خواہش تڑپ رہی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہمیں حق ہے کہ ہم پہلے نوجوانوں کے عشق اور اُس کے اظہار کے طریقوں سے
علیحدہ بحث کریں۔ اس کے بعد نوجوانوں کی شہوانی زندگی پر نظر ڈالیں اور آخر میں عشق اور شہوت کا
تعلق دکھائیں۔ ان تینوں حصوں میں ہماری تحقیق آج کل کے تمدن اور اس میں بھی زیادہ تر جرمن قوم
کے نظام نفسی تک محدود ہے۔ ممکن ہے کہ جنوبی یورپ اور مشرق کے لوگوں کی حالت اس سے مختلف ہو۔

عشق کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ہم اس سے زیادہ حوصلہ نہیں کر سکتے کہ اس معاملہ میں ترکیب
نفسی کی مختلف صورتوں کی طرف اشارہ کر دیں۔ مافوق الطبیعی ملاحظات محض توضیح کے لئے
ہیں۔ یہ مضمون ہی ایسا ہے کہ انسان نظام کائنات پر ایک شاعرانہ نظر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا۔ افلاطون کا
عظیم الشان فلسفہ بڑی حد تک کیف عشق پر مبنی ہے۔

عشق میں اور ماں باپ بھائی بہن کی محبت یا اُس محبت میں جس کی تلقین مذہب عیسوی کرتا ہے
فرق کرنا آسان ہے۔ عشق کی بنیاد نہ اتحاد خون پر ہے اور نہ مذہبی احساس پر جس کی بدولت انسان

دوسرے انسانوں کو یہاں تک کہ بیکسوں اور گنہگاروں کو بھی خدا کی محبت و عبادت میں اپنا شریک کرکے ان کی روحوں اور اپنی روح کو پاک اور برتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ عشق نام ہے کسی حسین چیز کی محبت کا۔ اسے آرٹ یا عین کی محبت کا کلی مرادف نہیں قرار دے سکتے۔ بلکہ ابتدا میں یہ کسی ذی روح حسین کی محبت تک محدود ہے۔ عشق کی ابتدائی منزل یہ ہے کہ کسی انسان کے خوب صورت جسم میں حسن کی جھلک نظر آئے۔ ارتقا کی بلند تر منزل میں عشق خالص روحانی حسن کی محبت بن جاتا ہے اسی زینہ پر افلاطون نے سقراط کی تقلید میں حسن پرست یونانیوں کو چڑھانے کی کوشش کی تھی اور غالباً اگر افلاطون نہ پیدا ہوتا تو نوع انسان کو کبھی یہ زینہ نہ ملتا۔ اسی نے یہ دریافت کیا کہ نصب العین ایک جھلک ہے۔ سرمدی اور غیر مرئی عین کی۔ یونانی لفظ کالوس جس کا ترجمہ حسین کیا جاتا ہے۔ اصل میں اکثر موقعوں پر "عینی" Ideal کے معنی رکھتا ہے۔

کسی حسین جسم کے عشق میں بظاہر انسانی شباب کی ایک جیتی جاگتی تصویر کے مشاہدہ سے مسحور ہوجاتا ہے لیکن اس مشاہدہ میں زیادہ گہری چیزوں کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں اول تو معشوق کی روح کے تناسب اور ہم آہنگی کا احساس اور دوسرے (زبان حال سے) فطرت خلاق کی حمد و ثنا کہ اس نے اس حسین کو پیدا کیا اور اس کا نظام درپردہ یہی مقصد رکھتا ہے۔ کہ حسین صورتیں پیدا کرے۔ غرض عشق کی پہلی ہی منزل میں فطرت کی روحانیت کا ایک احساس خفی اور اس کی محبت موجود ہے۔ معشوق عاشق کے لئے حقیقت کا مظہر بن جاتا ہے۔ عشق کے بربط میں ایک تار مذہبی وجدان کا بھی پوشیدہ ہے۔ اسی کیف کے اثر سے کبھی نوجوان کسی حسین نوجوان پر عاشق ہوجاتا ہے۔ کبھی کسی لڑکے پر، کبھی نوجوان مرد، نوجوان عورت کو چاہتا ہے، کبھی نوجوان عورت نوجوان مرد کو اس عمر میں عشق جنس کے امتیاز کا پابند نہیں۔ یہاں جو وجہ امتیاز ہے اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ عشق کے احساس کے ساتھ معشوق سے بے حد حجاب ہونا لازمی ہے۔ ملاقات اور معانقہ کی خواہش اگر پیدا بھی ہو تو سختی سے دبا دی جاتی ہے۔ انسان برسوں تک دور سے دیکھنے اور دل ہی دل میں سر ہنسنے پر قناعت کرتا ہے۔ اس ذوق کا نظارہ اور اس حجاب کا بہترین مظہر ڈانٹے کی نظم "حیات نو" ہے۔ اس کی نظروں میں بیٹرس Beatrice محض ارضی معشوق نہیں ہے۔ وہ محض اپنے وجود سے روحانی فیض پہنچاتی ہے۔ اس کی آرزو ہی میں اتنی قوت تھی جس کے کیف میں شاعر نے

دنیا کی سب سے بڑی نظم لکھدی۔ گوئٹے کو بڑھاپے میں بھی نوزدہ سالہ اولریکہ فان لیوٹسیو سے اسی طرح کا عشق تھا۔ کہتا ہے۔

"اس کی نظر سورج کی کرنوں کی طرح

اور اس کی سانس نسیم بہار کے مانند

خودی کو جو برف کی سلوں کی مثال

دل کے سرد غاروں میں جم کر رہ گئی تھی

پگھلا کر پانی کر دیتی ہے

خود غرضی اور خود آرائی

اس کے آتے ہی کافور ہو جاتی ہے

یہ سعادت

مجھے نصیب ہوتی ہے جب میں اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں"

روحانی ارتعاش، مجاز کے پردے میں حقیقت کی پرستش، گہرا حجاب، اپنے ناچیز ہونے کی شرم، یہ ہیں خصوصیات عشق کی۔ اس کا موضوع انسان کے پردہ میں سرمدی "حسن" ہے جس نے انسان کو صورت، تناسب اور زندگی بخشی ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہم اس مطلب کو خود افلاطون کے الفاظ میں ادا کریں جس کے نام سے یہ عشق بجا طور پر موسوم ہے۔

"جب وہ عارف، جو عالم عینی کا گہرا مشاہدہ کر چکا ہے، کسی حسن کے دیوتا کے چاند سے چہرے میں حسن حقیقی کا جلوہ دیکھتا ہے۔ یا کسی قد موزوں کی دل فریبی پر نظر ڈالتا ہے تو وہ سارے بدن سے لرز اٹھتا ہے۔ اور اس پر ویسی ہی مقدس ہیبت طاری ہو جاتی ہے جیسی حسن مطلق کے نظارہ سے ہوتی ہے۔ اُس وقت وہ اس نوجوان، اس حدائے حسن کی دل و جان سے عبادت کرتا ہے۔ بلکہ اگر اُسے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ اُسے احمق سمجھیں گے تو وہ اُس کے سامنے قربانی کرتا۔ جس طرح کسی بت یا دیوتا کے سامنے کی جاتی ہے۔ اُس نظارہ کے عالم میں اس پر عجیب و غریب واردات گزرتی ہے۔ اُس کے جسم کا ارتعاش جاتا رہتا ہے۔ اس کی جگہ بے انتہا حرارت پیدا

ہو جاتی ہے اور وہ پسینہ میں ڈوب جاتا ہے۔ حسن کی کرنیں آنکھ کی راہ اس کے وجود میں اُتر جاتی ہیں اور مرغِ روح کے گرد ایک جال سا بنا کر اُس کے بازوؤں کو گرا دیتی ہیں۔ یہ گرمی ساری سختی اور جمود کو جن سے پَروں کے نکلنے میں رکاوٹ تھی پگھلا دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بازوؤں کی جڑیں حرارت سے غذا پا کر پنکھ بن جاتی ہیں اور پنکھ میں پر جم آتے ہیں۔ کیوں کہ روح میں کسی زمانہ میں پر لگے تھے۔ وہ مجسم بال و پر تھی غرض روح گرمی سے کھولنے اور اُبلنے لگتی ہے اور جس طرح بچّوں کے مسوڑوں میں دانت نکلتے وقت گدگدی اور ٹیس ہوتی ہے۔ اسی طرح روح میں بھی پر نکلتے وقت میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے۔ اُسے بخار سا محسوس ہوتا ہے اور تپک اور ٹیس۔ جب کبھی اُسے معشوق کے حسن کا نظارہ نظر آتا ہے۔ اُس کے آرزو کی کلی کھل جاتی ہے حسن کی حرارت سے گرما کر وہ درد سے نجات پاتی ہے اور خوب ہنستی کھیلتی ہے۔ لیکن محبوب سے جدا ہوتے ہی وصل کی پیاسی روح پھر تڑپنے لگتی ہے بازوؤں کی جڑیں سوکھ کر بند ہو جاتی ہیں۔ اس لئے پنکھ حرکت نہیں کر سکتے۔ اب مقید آرزو اور جکڑے ہوئے پروبال نبض کی طرح اُچھلتے ہیں اور زنجیروں کو توڑ کر نکلنا چاہتے ہیں۔ اس لئے روح جس میں ہر طرف سے نشتر چبھ رہے ہیں درد سے بے چین ہو جاتی ہے۔ اگر کسی چیز سے فرحت ہوتی ہے تو معشوق کی یاد سے۔ لذت اور درد کے یوں مل جانے سے روح اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتی ہے نہ رات کو نیند آتی ہے نہ دن کو چین آتا ہے۔ آرزو کی بے تابی کھینچ کر وہاں لے جاتی ہے۔ جہاں حسن کے مالک کو ایک نظر دیکھنے کی اُمید ہو۔ جب روح اُسے دیکھ لیتی ہے اور آرزو کو نکلنے کی راہ مل جاتی ہے تب جا کر قیدیوں کو رہائی اور تازہ ہوا میں سانس لینا نصیب ہوتا ہے۔ روح کانٹوں کی خلش سے نجات پاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے بے پایاں مسرت کے مزے لیتی ہے۔"

آگے چل کر افلاطون جہاں ایک معشوق کے نظارہ کے وقت ایک شریف اور ایک رذیل گھوڑے کی حالت کا ذکر کرتا ہے جو روح کے جوتے میں ساتھ ساتھ جتے ہوئے ہیں، وہاں اصل میں وہ احساس کے اُنھیں مختلف پہلوؤں کو شاعرانہ پیرایہ میں دکھاتا ہے جنھیں ہم نے عشق اور شہوانی خواہش کہا ہے اور ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ افلاطون نے اس علیٰحدگی کو قائم نہیں رکھا ہے، کیوں کہ وہ جس وارداتِ قلب کا نقشہ کھینچ رہا ہے وہ نوجوانوں تک محدود نہیں ہے۔

نوجوانوں کے لئے حسین جسم کی محبت اور آرزو سے زیادہ فطری کوئی جذبۂ زندگی نہیں ہے وہ خلاقِ فطرت کے راز کا خود اپنے اعضاء کے نشو ونما میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اس عمر میں اپنے آپ سے کسی قدر عشق ہونا بھی بالکل فطرت کے مطابق ہے۔ اگر ہم نیٹشے کی ایک اصطلاح استعمال کریں جسے برگسان شیلر اور زمِل نے بھی اختیار کر لیا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس عمر میں قوتِ احساس "حیاتی قدور" سے قریب ترین تعلق رکھتی ہے۔ نوجوانوں میں باہم دوستی کی بنیاد اکثر اسی پر ہوتی ہے کہ ایک نوجوان دوسرے کے پاک حسن کی کشش سے اُس کی روح کا طلب گار ہو کر (ابتدا میں) ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عین حسن کے ماتحت ہم جنسوں کی باہمی کشش اسی طرح عام ہے جس طرح مرد اور عورت کا عشق بلکہ عشق کا یہ رُخ جس کا اکثر شعور نہیں ہوتا فطری درمیانی منزل ہے جس سے نوجوان لڑکیوں اور نوخیز لڑکوں سب کو گزرنا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس قدیم اور جدید عہد کے نوجوانوں کے متعلق جو مواد ہے اُس میں صدہا مثالیں اس طرح کے عشق کی موجود ہیں جو پہلے حسن ظاہری کی بنا پر پیدا ہوا اور پھر رفتہ رفتہ تمام روح پر چھا گیا۔ جسے یہ چیز نظر نہیں آتی۔ اس کی رائے پر تعصب کا غلبہ ہے نوجوانوں کے کھیل اور ورزش میں بھی اگر ہم عشق کے عنصر کو نظر انداز کردیں تو ہم اُسے پوری طرح سمجھنے میں قاصر رہیں گے۔

لیکن اس معاملہ کا ایک المناک پہلو ہے جس سے گہری طبیعت کے لوگوں کو کسی طرح مفر نہیں۔ ہمارے احساسات میں سب سے دردناک یہ تجربہ ہے کہ حسین انسان یعنی قوی، متناسب اور حسین جسم میں اخلاقی اعتبار سے بلند اور پاک روح کا ہونا لازمی نہیں۔ ہمارے نوجوان کو جب یکایک یہ احساس ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اُس کی قوتِ حکم نے غلطی کی تھی۔ جسے اب صحیح کر لینا چاہیئے۔ بلکہ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے اُسے کمینہ پن سے فریب دیا ہے اور اُس تصورِ عالم کی جو اُس کے دل میں تھا بنیادیں تک ہل جاتی ہیں۔ بلکہ خود نصب العین خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ ہم یہاں فطرت کی وکالت نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن یہ ہم کسی طرح نہیں سن سکتے کہ فطرت جھوٹ بولتی ہے۔ جس طرح نوجوانوں کی روح بجائے خود پاک ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کا جسم بھی محض جوانی کی بدولت حسین ہوتا ہے۔ اب فطرت کی اس پاکیزہ صورت میں ماحول کی رکاوٹیں اور موروثی خرابیوں کا دخل بڑھتا جاتا ہے۔ ہمیں ایک طالبہ یاد ہے جس کے چہرہ پر چودہ برس کی عمر تک قدیم یونانی حسن کی شان نظر آتی تھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ بدنما خط و خال نمودار ہونے لگے اور

یہ دیکھ کر دل کانپتا تھا کہ ظاہری حسن باطنی اثرات سے (خالص نفسی اثرات سے جن میں جسمانی اسباب کو بالکل دخل نہ تھا) کس طرح برباد ہورہا تھا۔

نوجوان کے اس طرح فریب کھانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُن کا احساس حسن یک طرفہ ہوتا ہے ابتدا میں ان کی نظر محض خط و خال پر پڑتی ہے، معنوی اداؤں پر نہیں۔ آہستہ آہستہ جب ان میں خود پختگی پیدا ہوتی ہے تب جاکر ان میں اُس حسن کی بصیرت پیدا ہوتی ہے جس میں صورت و معنی کا امتیاز ہو اُس وقت یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جو پہلے اعتبار سے بدشکل ہو۔ دوسرے اعتبار سے حسین نظر آنے لگتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بعض "بدصورت" آدمی جب گفتگو کرتے ہیں اور جب ان کی باطنی حالت اُن کے چہرے کے انداز سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ خوبصورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔

یہ وہ منزلیں ہیں جن سے نوجوانوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ افلاطون نے اس انسانی وحی کو "دعوت" (Banquet) کے لاثانی الفاظ میں بیان کرکے اسے بقائے دوام کی سند دے دی ہے۔ سقراط جیسے ظاہری صورت کے لحاظ سے "سائیٹر" اور باطنی حسن تناسب کے لحاظ سے دیوتا کہنا چاہئے ہمیشہ اس حقیقت اور اس کے برعکس اصول کی مثال سمجھا جائے گا۔ وہ لوگ جن کی سیرت روحانی فضائل سے مالا مال ہے۔ ترقی کی دوسری منزل کا راستہ خودبخود تلاش کرلیتے ہیں۔ وہ نصب العین کو خالص معنوی شکل میں بغیر جسمانی حسن کے واسطہ کے دیکھتے ہیں اور روح کی صورت پہچاننے لگتے ہیں۔ اس طرح خالص روحانی عشق پیدا ہوتا ہے۔ جس میں ذہنی نقطۂ نظر سے تخلیق کی صلاحیت اور زیادہ ہوتی ہے۔ انتقال احساس کے تمہیدی جمالیاتی فعل کے بعد ایک نئے قسم کے ذہنی افعال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جنھیں ہم "سمجھنا" یا دوسرے کی ذات کو فطرت کے ذہنی قوانین اور نظام منشا کے ماتحت دیکھنا کہتے ہیں اور اس کے بعد تیسرا درجہ سمجھ کر ہمدردی کرنا ہے۔ یہ نام ہے دو روحوں کی ہم آہنگی کا جس کی بنیاد جمالیاتی ذوق پر ہے۔ لیکن جس میں اور قدروں کے مشترک احساس کا عنصر بھی شامل ہے۔ محبت جو اب تک محض مشاہدہ جمال تک محدود تھی اب ایک گہرے روحانی اتحاد کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔

یہاں ضرورت ہے کہ ہم ایک خیال کو جس کی طرف افلاطون نے محض خفیف سا اشارہ کیا ہے ذرا تفصیل سے بیان کردیں۔ خالص روحانی عشق کی بنیاد نفس کی دو مختلف صورتوں کے تقابل پر ہے۔ جن میں سے ہر ایک اپنی تکمیل کے لئے دوسری کی محتاج ہے۔ ایک بھولی بھالی، پابند فطرت" لاشعوری

حالت میں نشوونما پانے والی غور و فکر سے آزاد ذات کا دل اس نفس کی طرف کھنچتا ہے جس کے خیالات و احساسات واضح ہو چکے ہیں اور جو جان بوجھ کر اپنی تشکیل آپ کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ انسان جس کی ذات میں اب تک وحدت ہے لیکن جس کا احساس دھندلا ہے۔ اُس کی آرزو کرتا ہے جس کا نفس مختلف شعبوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ مگر جو اپنی ہستی کا شعور رکھتا ہے۔ اس طرح وہ شخص جس کا نفس بالکل پختہ ہو گیا ہے یا کم سے کم مقابلۃً پختہ ہے ایسے شخص کی طرف کھنچتا ہے جس کی دل فریب لاشعوری قوت نمو اب تک فطرت کے دامن میں پوشیدہ ہے۔ نفس کی یہ دونوں صورتیں جن میں ایک سراپا بھولا پن ہے اور دوسری سراسر عقل ہے لیکن سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ مختلف مدارج میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ گویا کائنات کے دو جوہر ہیں۔ جن میں سے ایک کو ہم روحانی جوہر انوثیت اور دوسرے کو روحانی جوہر رجولیت کہہ سکتے ہیں۔ انسان کی تکمیل ان دونوں کے ملنے پر موقوف ہے۔ ہر انسان میں ان دونوں جوہروں کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی ایک عنصر زیادہ ہوتا ہے دوسرا کم۔ جو کم ہوتا ہے اسی کی آرزو دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس روحانی جوہر رجولیت کی پہلی جھلک ایک نوجوان لڑکی کو ایک بالغ عورت میں نظر آئے ایک نوجوان مرد کو ایک بالغ مرد میں اور ایک لڑکے کو ایک نوجوان میں۔ لیکن اصل میں جوہر رجولیت کا مکمل مظہر مرد ہے اور جوہر انوثیت کی عورت (یہاں مرد اور عورت سے کوئی خاص انسان مراد نہیں بلکہ عورت اور مرد کا مثالی نصب العین) اس نقطۂ نظر سے عشق میں ہمیشہ جنس کی دوئی پائی جاتی ہے لیکن جنس کی بنا یہاں جسمانی ساخت کے اختلاف پر نہیں ہے بلکہ نفسی ترکیب کے اختلاف پر۔ اسی خیال کو ہم ایک دوسرے پہلو سے ادا کر سکتے ہیں۔ محبت کا موضوع ہمیشہ کوئی قدر ہوتی ہے۔ جسے ہم کسی انسان میں مجسم دیکھتے ہیں۔ انسانوں میں جو قدر کا سرمایہ ہوتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو وہ جس میں انسان کا ذہن قدر کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرتا ہے اور ان کا شعور رکھتا ہے دوسری وہ جس میں وہ فطری اور لاشعوری حالت میں تشکیلِ سیرت کی ذہنی قوت سے مالا مال ہوتا ہے۔ ایک وہ جس میں اس کی ذہنی قوتیں عقلی اصول پر منقسم ہوتی ہیں اور دوسری وہ جس میں اس کا نفس فطرت کی گود میں وحدت اور ہم آہنگی کی مبارک زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے کی تمنا رکھتی ہیں تاکہ وہ مل کر انسان کی سیرت کو بلند تر اور نصب العین سے قریب تر کر دیں۔ اس لئے بقول افلاطون کے عشق کے یہ دونوں حامل ایک ہی وقت میں غنی بھی ہیں اور محتاج بھی، منعم بھی اور سائل بھی، اثر آفریں بھی اور اثر پذیر بھی۔

اور نوجوان میں تو یہ کیفیت خصوصیت کے ساتھ ہوتی ہے کہ وہ کائنات کی قدر کا ادراک محض اس طرح کر سکتا ہے کہ اُسے محسوس شکل میں کسی شخص کی ذات میں مجسم دیکھے۔ یہاں تک کہ جس اخلاقی قدر کا وہ طالب ہے اُس میں اور اُس انسان میں جو اس قدر کا (دراصل یا محض ہمارے نوجوان کے خیال میں) حامل ہے وہ کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ نصب العین سے اس کی عقیدت اُسی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کہ وہ "اپنے" انسان سے عقیدت رکھے۔ خدا محفوظ رکھے اُس گھڑی سے جب یہ انسان ویسا نہ نکلے جیسا وہ دیکھنے میں معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے نوجوان کی نظر میں کائنات کی پوری عمارت مسمار ہو کر بیٹھ جائے۔ عورتوں میں یہ طرز خیال نوجوانی کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ عورت دنیا کو صرف کسی محبوب ذات کے واسطہ سے سمجھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم مذکورہ بالا تقابل جنسی کی اصطلاح میں کہیں کہ نوجوان کا افراد کو قدور کا مظہر اور مجسمہ سمجھنا انوثیت کی علامت ہے۔ جب انسان پختگی کو پہنچتا ہے تو اس کے خیالات اونچے ہو جاتے ہیں۔ اُسے قدر سے من حیث القدر اور شے سے بنفسہ محبت ہو جاتی ہے اور وہ اُنھیں اپنی جدوجہد کا موضوع اور اپنی ذاتی قدر کا منبع سمجھنے لگتا ہے۔

غرض نوجوان محبت میں قدور کو کسی انسان کی ذات میں محسوس اور مجسم شکل میں دیکھنے کا پابند ہے اور اسی لئے ہم اس کے عشق کو جمالیاتی محبت کہتے ہیں۔ کیوں کہ اگر اس کی نظر کے سامنے سے جسمانی حسن کا حجاب اُٹھ بھی جائے۔ تب بھی وہ اس قید سے آزاد نہیں ہوتا کہ عالم اور عالم گیر قدور کا مظہر اُن چیزوں کو سمجھے جن کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ نوجوان کے نزدیک "عین" عقل و ادراک سے بہت دُور زمان و مکان کے ماورا ہوتا ہے وہ اُس کا قرب اُسی طرح ڈھونڈھتا ہے کہ اس کی جھلک کسی جیتے جاگتے انسان کی ذات میں دیکھے جس سے وہ تبادلۂ احساس کر سکتا ہے۔ جسے کمال بینی کی مدد سے کسی حد تک سمجھ سکتا ہے اور جس سے وہ ہمدردی پیدا کر سکتا ہے وہ عموماً اس عمر میں روحانی بلند پروازی سے ناآشنا ہوتا ہے۔ جس میں انسان وجد کے عالم میں قیدِ صورت سے آزاد ہو کر شاہد معنی کا وصال حاصل کرتا ہے اُس کی حد پرواز تو بس اسی بے خودیٔ عشق تک ہوتی ہے جو کسی حسین انسان کی تصویر کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اُسے تخیل کی مدد سے مکمل اور پُر اسرار بناتی ہے اور اپنی روح کو اس کی روح میں ضم کر دیتی ہے۔ خدا کی یہ دَین کہ انسان واقعیت کی بگڑی ہوئی صورت میں بھی جمالِ الٰہی کا مشاہدہ کرے، عرفان کا یہ آخری درجہ پختہ مغزوں کے لئے مخصوص ہے اور ہم میں سے کون ہے جس کی پختہ مغزی مکمل ہو چکی ہو؟

اس عام بحث کے بعد اب ہم نوجوانوں کے عشق کی مخصوص صورتوں کا ذکر کریں گے۔ جو کچھ کہا جا چکا ہے اُسے مدنظر رکھتے ہوئے کسی کو یہ سُنکر تعجب نہ ہوگا کہ نوجوان کے عشق میں معشوق کے لئے عمر اور جنس کی کوئی قید نہیں۔ اختلاف جنس اس عمر میں عشق کے راستہ میں حائل نہیں ہوتا۔ البتہ اختلاف عمر سے کسی قدر رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ہم نوجوانوں کے عشق کی اس اعتبار سے چار قسمیں کر سکتے ہیں:

(۱) ایک جنس کے ہم عمر لوگوں میں باہم عشق

(۲) ایک جنس اور مختلف عمر کے لوگوں میں باہم عشق

(۳) مختلف جنس کے ہم عمر لوگوں میں باہم عشق

(۴) مختلف جنس اور مختلف عمر کے لوگوں میں باہم عشق

ان سب صورتوں میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ابھی تک شہوت شعوری حالت میں بالکل معدوم ہے۔

ا۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی باہم دوستی خصوصاً اُن کی جن کی طبیعت میں زیادہ گہرائی ہے۔ عام طور پر عشق پر مبنی ہوتی ہے۔ پہلا قدم ایک دوسرے کے جسمانی حسن کی محبت ہے جو ان کے ملانے میں واسطے کا کام دیتی ہے اس کے بعد آہستہ آہستہ روحانی اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ جسے ابتدا میں بجائے ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھنے کے دونوں کی ہم آہنگی کہنا بہتر ہوگا۔ کیوں کہ سمجھنا محض جمالیاتی محبت کا نام نہیں ہے۔ نوجوان جب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اپنی داخلیت پرستی کے سبب سے اپنی نفسی کیفیات کے حدود سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ دوسرے کے نفس میں انھیں وہی چیزیں نظر آتی ہیں جو اُن کی کمال بینی ڈھونڈھتی ہے۔ جرمنی میں "طوفان و تلاطم" کی تحریک کے زمانہ میں اس عجیب نفسی تعلق کے لئے "ہمدردی" کا لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہمدردی وہی ہے جو بے جانے بوجھے کی جائے۔ یہی فرق ہے نوجوانی کی محبت میں اور پختہ عمر لوگوں کی محبت میں۔ نوجوان دوسروں کو اُس طرح نہیں دیکھتا جیسے کہ وہ ہیں بلکہ بہت بڑھا چڑھا کر۔ اور چوں کہ اس بلند پروازی کی قوت خود اپنے نفس سے حاصل ہوتی ہے اس لئے اصل میں وہ اپنے دوست کی ذات میں اس کی خیالی مکمل تصویر نہیں بلکہ خود اپنا مرقع کمال دیکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوست کی واقعی شخصیت کے سمجھنے کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کیوں کہ اُس کے لئے بہت زیادہ پختگی کی ضرورت ہے۔ اگر عشق کی کیفیت کبھی عارضی طور پر زائل ہو جائے تو دوسرے کی واقعی سیرت سے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ انسان اس سے خیر مطلق کی توقع رکھتا ہے

اگر کامل روحانی اتحاد پیدا کرنے میں کامیابی نہ ہو تو طعن و تشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس عمر میں انسان دوستی کی بے انتہا سخت شرطیں مقرر کرتا ہے۔ جسمانی پہلو یعنی بغل گیری کی خواہش کبھی کبھی بہت قوی ہوتی ہے۔ نوجوان لڑکیاں آپس میں معانقہ اور بوس و کنار میں بہت مبالغہ کرتی ہیں (خصوصاً اُس صورت میں جب وہ دوسروں پر یہ جتانا چاہتی ہیں کہ تم اس روحانی اتحاد میں شریک نہیں ہو) لیکن اصل شہوانی خواہش اُبھرنے نہیں پاتی۔ کیوں ان پاک تعلقات کا احترام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ نوجوانوں کی مخصوص صفت ہے۔ ایسی فطرتی حیا کو ترک کردینے کے سبب سے حسین یونانی نوجوان الکی بیادیس (Alcibiades) بالکل بگڑ جاتا ہے۔ کیوں کہ روحانی اتحاد جتنا چاہیے بڑھ جائے عاشق و معشوق ایک دوسرے سے بے حد حجاب رکھتے ہیں۔

اس طرح کے تعلقات کا نتیجہ ہمیشہ دردناک ہوتا ہے۔ کچھ دن کے بعد وہ زمانہ آتا ہے۔ جب ہمارے نوجوانوں کی طبیعت بدل جاتی ہے یا ان میں واقعیت کا احساس بہت بڑھ جاتا ہے۔ خود اپنی سچی شخصیت کے اُبھرنے سے یا دوسرے کے واقعی سیرت کے علم سے، خواہ وہ بذات خود اچھی ہو، اس طرح کی دوستیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بہترین صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مدت تک افسوس ناک بحثا بحثی سخت طعن و تشنیع اور سچائی کا خون کرنے والی جنگ و جدل ہونے کے بعد دوستی آئندہ کے لئے ایک نئی بنیاد پر قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری صورتوں میں بھی روحانی حیثیت سے قطع تعلق ناممکن ہے۔ کیونکہ خود اپنی ذات کے بہترین عناصر سے اس دوستی کی تعمیر ہوئی ہے۔ کامل جدائی کے معنی یہ نہیں کہ انسان اپنی زندگی کے ایک پورے دور اور اپنے سب سے گہرے عقیدہ سے قطع تعلق کرلے۔ اس کے دل میں ایک خاموش آرزو ضرور باقی رہتی ہے۔ سطحی حیثیت سے برتاؤ میں سرد مہری نظر آئے لیکن قلب کی گہرائی میں وہی پرانی آگ بھڑکتی ہے۔ اسی طرح کا تعلق گوئٹے اور یاکوبی (Jakobi) میں تھا۔ ان دونوں کی پرجوش ملاقات نوجوانی کے جنوں خیز زمانہ میں دریائے رائن کے کنارے چاندنی رات میں ہوتی تھی۔ آگے چل کر اُنھیں معلوم ہوا کہ اُن کی طبائع میں بے حد اختلاف ہے پھر بھی اُن کے باہمی تعلقات پوری طرح سے کبھی منقطع نہ ہوسکے۔ بہتّر سال کی عمر میں یاکوبی نے جو آخری خط لکھا ہے اُس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساری عمر ان دونوں کے دل میں نوجوانی کی محبّت کی یاد تازہ رہی۔ وہ نصب العین جس سے انسان کو کبھی عشق رہا ہے ہمیشہ قائم رہتا ہے البتہ

عاشق کی طبیعت میں جیسی تبدیلی ہوتی ہے اس کے لحاظ سے اس نصب العین کا حامل کوئی دوسرا شخص قرار پاتا ہے۔ تاہم پہلے شخص سے جو محبت ہوتی ہے وہ کبھی دل سے دُور نہیں ہوتی۔

۴۔ جس طرح ایک ہی جنس کے ہم عمر نوجوانوں میں دوستی اور عشق میں امتیاز دشوار ہے اسی طرح مختلف جنس کے لوگوں کے باہمی تعلقات میں بھی ان دونوں چیزوں میں مشکل سے فرق کیا جاسکتا ہے وہ خود بھی اس فرق کو نہیں سمجھتے کبھی وہ اپنے باہمی تعلق کو دوستی یا رقابت کہتے ہیں حالانکہ وہ عشق ہوتا ہے اور کبھی وہ ایسے تعلق کو عشق سمجھ لیتے ہیں جو اصل میں دوستی یعنی خیالات اور احساسات کی ہم آہنگی ہے۔ اس ناواقفیت کی سبب سے اکثر سخت تکلیفیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ اصلی محبت کے علامات نہ پہچاننے کی بدولت بڑی المناک صورتیں پیش آتی ہیں۔ لیکن یہ محبت اس عمر میں جس کا ہم ذکر کررہے ہیں نہ ہوتی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ اختلاف جنس سے دوسرے کی نفسی زندگی کی کُرید کرنے کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ دوسرے کے نظام نفسی کا خود اپنے سے مختلف ہونا دل کو محسوس ہوتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا اور یہاں بھی باوجود روزمرہ کے برتاؤ میں انتہائی بھولا پن اور بے تعلقی ہونے کے بے حد حجاب ہوتا ہے۔ ہم یہاں عاشقانہ چھیڑ چھاڑ کا ذکر نہیں کررہے ہیں جن میں سچے عشق کی ظاہری پہلوؤں کی پوری نقل اُتاری جاتی ہے لیکن اس کی روحانی کیفیتوں کا پتا بھی نہیں ہوتا۔ عشق بازی کے محرک بالکل دوسرے جذبات ہوتے ہیں۔ ہماری مراد اس نئی زندگی سے ہے جو ہمارے نوجوان کے رگ وپے میں دوڑ جاتی ہے۔ جب اس کی نظر کو عشق کی روشنی پہلے پہل خیرہ کرتی ہے۔

اس کی بہترین مثال بھی ہمیں فیلکس ڈان کی زندگی میں ملتی ہے۔ چودہ برس کی عمر میں وہ پہلی بار اپنے پڑوس کی ایک تیرہ سال کی لڑکی کو دیکھتا ہے۔ اس کی زندگی میں بالکل انقلاب ہوجاتا ہے۔ اب اس کی خاموش پرستش کا تنہا موضوع یہی لڑکی ہے جسے وہ "ڈڈوسا" کہتا ہے دن میں کئی بار وہ راستہ کاٹ کر اس لڑکی کو دیکھنے جایا کرتا ہے۔ چنانچہ سات برس میں وہ اسے ۲۷۲ بار دیکھتا ہے لیکن اس پورے سات برس میں اُس نے شاذونادر ہی کبھی اُس سے ہمکلام ہونے کی جرأت کی ہے اُن میں آپس میں جو گفتگو ہوئی ہے اس کی کل کائنات معدودے چند الفاظ ہیں۔ اس نے اپنی محبوبہ کو جلنے گلاب کے پھول دیئے ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے باایں ہمہ اُس کے دل کی ملکہ اس کے خوابِ ہستی کی تعبیر جو کچھ ہے وہی لڑکی ہے۔ وہ اپنے گھر میں باقاعدہ "ڈڈوس" کی

پرتش کرتا ہے اس نے بے شمار نظمیں اس موضوع پر لکھی ہیں یہ طویل روحانی محبت اسے ادنیٰ لذات کے قعر میں گرنے سے روکتی ہے۔" یہ شہوانی رغبت نہ تھی (چودہ برس کی عمر میں شہوانی رغبت؟) اور نہ سچا عشق تھا (ورنہ قصہ کا عنوان دوسرا ہوتا بلکہ قصہ بیان کرنے کی نوبت ہی نہ آتی) اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ نکلا کہ میں نے چند ہزار اشعار لکھ ڈالے اور (یہ البتہ قابل قدر بات ہے) میرے لئے اس محبت نے محافظ عفت تعویذ کا کام دیا۔" "فردوس شہوانی خواہشوں سے بالاتر تھی۔ اس آسمانی ملکہ کی طرح جو روشنی کے ہالہ میں بادلوں پر سوار محو پرواز رہتی ہے اور جس سے کہ جسمانی حسن سے تمتع کی خواہش بدترین گناہ ہے یہ ضوفشاں، سین، خاموش، پاک تصویر بھی اتنے سال تک میری زندگی کی فضا پر چھائی رہی۔"

ان عاشقانہ تعلقات کی خصوصیت کو زیادہ نمایاں کرنے کے لئے ہم دونوں جنسوں کے باہمی روابط کی ان منزلوں پر نظر ڈالتے ہیں جو اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔ ان روابط کے نشوونما کی تین منزلیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ اصلی بچپن کے زمانہ میں (یعنی دس برس کی عمر تک) لڑکے لڑکیاں بالکل بے تکلفی سے باہم ملتے جلتے اور ساتھ کھیلتے ہیں۔ البتہ لڑکوں کی طرف سے لڑکیوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے رفیقوں کی قدر زیادہ تر طاقت اور جرأت کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ پھر بھی اختلاف جنس کی باہمی کشش کبھی کبھی اپنا اثر دکھا ہی دیتی ہے۔ اور اس کا اظہار ایک دوسرے کی لطف آمیز خاطرداری اور طفلانہ پرستاری کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسٹینلے نے اس منزل کی جنسیات کا نقشہ اپنی کتاب "لڑکیوں کے دشمن" میں کھینچنے کی کوشش کی ہے لیکن نہ تو اسے جنسیات کے نقطۂ نظر سے کامیابی ہوئی ہے اور نہ شاعری کے لحاظ سے۔ زندگی کے ان چند سالوں کے بعد جو عنفوان شباب سے بہت پہلے گزرتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں عموماً غرور اور حجاب کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں۔ لڑکوں کی نظر میں لڑکیوں کی قدر نہیں ہوتی اور لڑکیاں جن کی جنسی نشوونما لڑکوں سے پہلے ہوتی ہے [illegible] سمجھتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے [illegible] دور رہنا چاہتے ہیں لیکن [illegible] احتراز کی [illegible] مگر [illegible] نظر آتے جوان [illegible] باہم لاشعوری [illegible] اگر [illegible] اس کا اعتراف خود [illegible] ہم جنسوں کے حلقے میں بھی نہیں کرتے [illegible]

ہی لڑکیوں کی موجودگی کا احساس ہوا ان کی حرکات اور سکنات بالکل بدل جاتی ہیں اور اسی طرح لڑکیاں بھی دراصل لڑکوں سے تغافل نہیں برتتیں۔ لڑکے اپنی اکڑ مکڑ سے لڑکیوں پر "رعب گانٹھنا" چاہتے ہیں تو لڑکیاں بھی مصنوعی سنجیدگی اور وقار سے انھیں مرعوب کرنا چاہتی ہیں اور جب ان کی تعداد کافی اور طبیعت موزوں ہوتی ہے تو طعن وتشنیع سے بھی نہیں چوکتیں۔ لیکن اس عمر میں ایک کو دوسرے سے کسی طرح کا ذہنی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ کیوں کہ دونوں تہی دست ہیں۔ چنانچہ اس پہلو سے لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ تعلیم دینے کی تائید میں کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔

بہت سے نوجوانوں میں یہ کیفیت آغاز بلوغ کے بعد بھی بہت دن تک باقی رہتی ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر طبائع دو قسموں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ بعض "شوقین مزاجی" اور "عاشقانہ چھیڑ چھاڑ" کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور بعض پر حجاب اور خاموشی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں داخل ہوتے ہی لڑکوں کا "سینے تننا" ارتقائے نفسی کے لئے کوئی اچھی علامت نہیں۔ اس صورت [illegible] سطحی زندگی بسر کرتے ہیں ان کا وقت، قوت اور روپیہ ظاہری چیزوں میں برباد ہوتا ہے [illegible] طور پر طبقہ نسواں سے ان کی واقفیت ان عورتوں تک محدود ہوتی ہے جن کی ذات اپنی جنس کی [illegible] خصوصیات کی مظہر نہیں ہے۔ ان لوگوں کا لباس کالر نکٹائی سے لے کر چکنے چمڑے کے دستانوں تک فیشن کے لحاظ سے بالکل مکمل ہوتا ہے۔ ان کے بالوں کا پیچ وخم حجامت کے بعد دل سے خراج تحسین وصول کرتا ہے۔ غرض ان کی ہر ادا سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آداب معاشرت کی تمام صورتوں کی "بے ان معنی سمجھے" ہو بہو نقل اتارنے میں کمال رکھتے ہیں۔ یہ نوجوان جوڑے یورپ کے چھوٹے بڑے شہروں میں تفریح گاہوں اور باغوں کی روشوں پر جن سے انھیں خاص انس ہے گل گشت کرتے نظر آتے ہیں۔

ناچ کی تعلیم جو لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ ساتھ دی جاتی ہے بجائے خود کتنی ہی بے ضرر کیوں نہ ہو۔ لڑکوں پر اس کا اثر اچھا نہیں پڑتا۔ کیوں کہ ان کی تمکنت ابھی سے وہ صورت اختیار کر لیتی ہے جس کا وقت اصل میں اس وقت آتا ہے جب انسان خود بھی "کچھ ہو جائے"۔ ہم بہت لوگوں کو جانتے ہیں جو نفسی ارتقا کے بہترین ثمرات سے ناچ کی تعلیم اور ناچ کی عشق بازی کے "مسرت بخش" لمحوں کی بدولت محروم رہ گئے۔ لڑکیوں کے لئے اس میں کم خطرہ ہے بلکہ یہ ان کے حیاتی نشو و نما کا خاص میدان ہے۔

دوسرے قسم کے لڑکوں میں جن پر حجاب اور خودداری کا غلبہ ہوتا ہے اصل میں صنفِ لطیف کی کہیں زیادہ گہری پرستاری پائی جاتی ہے یا تو وہ آئین عصمت کے پردہ میں ایسا چھپتا ہے کہ اپنے خاموش عشق کو مطلق ظاہر نہیں ہونے دیتا یا بے انتہا حجاب کے ساتھ دور سے اپنی معشوقہ کی پرستاری کرتا ہے۔ "چہرے پر حیا کی سرخی لئے ہوئے وہ اپنی نظروں سے اس کا (محبوبہ کا) تعاقب کرتا ہے اور اگر وہ کبھی سلام یا مزاج پرسی کرے تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی"۔ اس روحانی عشق و محبت سے نوجوان میں قوتِ تخلیق پیدا ہوتی ہے اور شہوت مزاجی اور ناچ کی تعلیم سے یہ قوت فنا ہو جاتی ہے۔ جب تک نفس میں محبوب کی تصویر رہتی ہے وہ کیچڑ اور گندگی سے آلودہ نہیں ہونے پاتا۔ اس کی خاموش گہرائیوں میں وہی تخلیق کی قوت ابھرتی ہے۔ اس عقیدہ کا کائنات عینی قدر رکھتی ہے جس کے حصول کی سعی مشکور ہوتی ہے سچے عشق سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو محبت نہیں کر سکتا اس کا عقیدہ بھی استوار نہیں ہو سکتا اور جو شخص اس روحانی سرمایہ کو چھوٹے چھوٹے سکوں کی صورت میں خرچ کر ڈالتا ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں بچتا جس سے کوئی قابل قدر چیز پیدا کی جا سکے۔ اس لحاظ سے نفسی بہار کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس میں انسان کی آئندہ ذہنی ارتقا کی گہرائی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں عنفوان شباب کے ابتدائی حصہ میں اصلی اور سچی محبت نمودار نہیں ہوتی کیوں کہ اول تو اس زمانہ میں انسان اپنے آپ کو ڈھونڈھنے میں بہت مشغول ہوتا ہے۔ دوسرے ابھی تک محض روحانی اتحاد کی آرزو اور کامل جسمانی و ذہنی یگانگت کی تمنائیں باہم اس قدر بعد ہوتا ہے کہ مکمل عشق کی صلاحیت ہی مفقود ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے سچا عشق وہ ہے جس میں انسان اپنی محبوب صفات کے مجموعی خیالی نصب العین سے نہیں بلکہ کسی جیتے جاگتے انسان سے محبت کرتا ہے ایسی محبت جیسی گوئٹے کو لوٹے کیسٹنر Lotte Kestner سے تھی۔ نوجوانوں کی نظروں میں نہیں آتی اس لئے آغاز شباب کا عشق شاذ و نادر ہی اس بلند درجہ پر پہنچتا ہے۔ البتہ سچی دوستی کی بنا اس زمانہ میں پڑ سکتی ہے۔

رجولیت اور نسوانیت (پیشروی اور پیروی) کا فرق جسے تناسلی جنسی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں، ہم عمر نوجوانوں میں بھی تقریباً سب میں تھوڑا بہت نظر آتا ہے۔ لیکن یہ اس سے

بھی زیادہ نمایاں اُس وقت ہوتا ہے جب مختلف عمر کے لوگوں میں باہم عشق ہو۔ اس کی جسمانی بنا ایک حد تک اختلافِ جنسی پر بھی ہو سکتی ہے لیکن اصل میں یہ فرق مختلف عمر کے لوگوں میں اس لئے ہوتا ہے کہ ایک کے نفس میں یک طرفہ جمعیت اور اثر آفرینی ہوتی ہے اور دوسرے کے نفس میں نیم خوابی، بھولاپن اور اثر پذیری پائی جاتی ہے۔

۳۔ جنس ذکور میں عشق کی یہ صورت نوجوان اور لڑکے میں باہم پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عمر والے کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کی کم عمر والے کو ضرورت اور آرزو ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کم عمر والا قوت تخلیق کا وہ خالص فطرتی عنصر رکھتا ہے جس سے زیادہ عمر والا محروم اور اس محرومی سے دل گیر ہے۔

وہ شخص بھی جس نے ابھی عنفوانِ شباب کی منزل میں قدم رکھا ہے ایک لڑکے سے جسے یہ انقلابِ عظیم بہت جلد پیش آنے والا ہے گہرا اُنس رکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ لڑکے کی اس راہ میں حفاظت کے ساتھ رہنمائی کرے۔ اسی کے ساتھ اُس کے دل کے کسی گوشہ میں ایک حسرت ہوتی ہے کہ یہ فطرت کی گود میں کھیلنے والا بچپن یہ فردوس گم شدہ اُسے دوبارہ مل جائے۔ ایک بڑی عمر کا آدمی جس کے سینے میں نوجوانوں کا سا دل ہے لکھتا ہے "ہمیں فطرت کی اس تعلیم سے زندگی کی مردانہ تشکیل میں سبق لینا چاہیئے کہ وہ انسان کو بچہ سے، جو کھیل کود اور خواب دیکھنے میں مصروف رہتا ہے اور کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جاؤں گا، نوجوان بناتی ہے جسے یہ معلوم ہے کہ زندگی کی ہزارہا امکانی صورتوں میں سے اُسے ایک صورت اختیار کرنا ہے، جس کی خاطر وہ اپنے نفس کو تنگ اور محدود کرتا ہے اور جس کی تشکیل میں وہ شعوری احساس ذمہ داری کے ساتھ منہمک رہتا ہے کس قدر دل فروز ہے اس لڑکے کی تشویش جو دفعتہً آنکھ کھول کر دیکھتا ہے کہ آنے والی زندگی میں اس کے بچپن کے خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں جن میں وہ اپنے سر پر تاج شاہی دیکھا کرتا تھا (اور لڑکے کی اس بیداری کو مستحکم اور نتیجہ خیز قوت بنانے کے لئے معلم کی طرف سے انتہائی محبت و شفقت کی ضرورت ہے) یہاں وہ تعلیمی پہلو، وہ باہمی تہذیب و تربیت کی قوت خاص طور سے نمایاں ہے جس کی جھلک ہر عشق میں پائی جاتی ہے۔ گرل پارتسیر (Grill parzer) نے اس پہلو کو تفصیل کے ساتھ اُس خاکہ میں جگہ دی ہے جو اس نے گوئٹے کے فاؤسٹ (حصہ اول) کا تتمہ لکھنے کے لئے بنایا تھا اس میں وہ یہ ثابت کرتے ہوئے

کہ مافوق الانسان بننے کے معنی اپنی خودی کو محدود کرنا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے " میں اُسے (فاوسٹ کو) ایک ایسے لڑکے سے ملاتا جس کے نفس نے ابھی جاگنا شروع کیا ہے اور اُسے اس لڑکے کا معلم اور دوست بنا دیتا "۔ اس عشق کی بھی ایک گہری مافوق الطبیعی بنیاد ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اس کی بدولت فطرت کی بہار کو آدمی کے نفس میں جلوہ گر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ دوسری جانب (لڑکے یا لڑکی کی طرف) سے بھی اسی شدت کے ساتھ ایک بلند تر زندگی کی آرزو ہوتی ہے۔ شارلوٹے بوہلر کے شائع کردہ روزنامچہ میں ایک جگہ ہے " کیوں کوئی بڑا از راہ کرم میری طرف توجہ نہیں کرتا " اگر اس پہلو سے دیکھئے تو عشق تمنا ہے۔ ایک استوار اور پختہ مغز ذات کی، ایک جمال معنوی کی جو محض جسمانی حسن میں ظاہر نہیں ہوتا اور افلاطون کی اصطلاح میں حکمت کہلاتا ہے: ایک نجات دہندہ کی جو ایک بے کس کو جسے کوئی نہیں سمجھتا، سمجھے اور روحانی تنہائی کی قید سے نکالے۔ اکثر نوجوانوں اور ان کے سچے رہنماؤں کے باہمی تعلق میں (جس میں قدیم جرمن جرگوں کے زمانہ سے لے کر موجودہ تحریک شباب تک میں ذہنی پہلو غالب ہے) عشق ہی مضبوط فطرتی رشتہ اتحاد کا کام دیتا ہے۔ اس طرح کا عشق نوجوان لڑکیوں اور بالغ عورتوں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک نئی بات یہ بھی ہوتی ہے کہ لڑکیاں بڑی عورتوں کو فطرت نسواں کے سرّ عظیم کا محرم جان کر اُن کی پرستاری کرتی ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر کرکے بھی ہمیں عورتوں میں آپس کے عشق کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے کہ ان دونوں روزنامچوں میں جو ہمارے پیش نظر ہیں اول سے آخر تک سوانح زندگی کا سب سے اہم موضوع ایک اُستانی کے عشق کی داستان ہے جس میں روحانی مسرت، پرستش، مایوسی اور پھر سبق شوق شروع کرنے کا قصہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ اس طرح کا عشق اُستانیوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا بلکہ صرف اُستادوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے سخت غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والا اس متعصبانہ خیال کا پابند ہے کہ نوجوانی کے عشق کا انحصار محض عضویاتی اختلاف پر ہے حالانکہ اس عمر میں عشق اکثر صورتوں میں محض اُس ولولہ کا نام ہے جو انسان کے دل میں اپنے آپ کو انفرادیت کی قید سے آزاد کرنے کے لئے اُٹھتا ہے وہ (داخلیت کے خلیج کو عبور کرنے کے لئے) پل تلاش کرتا ہے۔ لیکن ایسے پل جو قوس قزح کی مانند ہیں اور اُسے کبھی واقعی انسانوں تک نہیں پہنچا سکتے: " میرے نصیب میں یہی ہے کہ میں ہمیشہ تنہا رہوں، تنہا! ستاروں کی طرح تنہا! انسان

ہمیشہ ستاروں کی طرح تنہا رہتا ہے" ایسے وقت میں تخیل کُل تصویریں پیش کرتا ہے۔ اُن انسانوں کی تصویریں جو زندگی کی تفسیر کر کے اس کے حسن اور دولت کو نمایاں کر سکیں اور جب ان تصویروں سے مایوسی ہوتی ہے تو صرف یہی نہیں کہ تنہائی کا احساس پھر لوٹ آئے بلکہ اکثر انسان کو اپنے آپ سے اور زندگی سے سخت نفرت ہو جاتی ہے۔

جرمنی کی موجودہ تحریک شباب کا ایک اہم عنصر یہی عشق یا ایک دوسرے کی تہذیب و تربیت کی خواہش ہے۔ اس میں مختلف عمر کے لوگوں کے باہمی تعلقات صریحاً اسی بنیادی تعلیمی جذبہ پر مبنی ہیں کہ سب مل کر نصب العین اور اس کے حسن و جمال کی پرستش کریں۔ چھوٹی عمر والوں کو یہاں ایسے لوگ ملتے ہیں جو ان کے طفلانہ مشاہدہ زندگی کی تفسیر اپنی قوت بصیرت سے کر کے ان کی رہنمائی کر سکیں اور ہم عمروں میں بھی یہ رشتۂ اتحاد ہوتا ہے کہ انھوں نے مل کر دنیا کی اصلاح کا خفیہ عہد کیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس تحریک کی بدولت تنہائی کی نتیجہ خیز خلش، مایوس آرزو کی تخلیقی قوت ضائع ہو گئی ہے۔ سقراط جس رنگ میں اُسے افلاطون نے پیش کیا ہے ہمیشہ اس مذہب عشق کا پیغمبر مانا جائے گا۔ خواہ خود اس کے نزدیک یہ محض ایک پیالہ ہو جس میں اُسے "عکسِ رخِ یار" نظر آتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ دردِ دل کے مزے سے آشنا ہے اور اس میں شک نہیں کہ نوجوانوں کے ناکردہ کار حسن میں جو دائمی دل فریبی ہے اُس کا احساس ما فوق الطبیعی واردات کی صورت میں سقراط کو ہو چکا تھا قبل اس کے کہ اُس کا شاگرد افلاطون اس واردات کو اپنی تصوف آمیز شاعرانہ تصنیف "دعوت" میں بقائے دوام کی خلعت پہنائے۔ ہولڈرلین کہتا ہے:

"اے مقدس سقراط تو کس لئے
ہمیشہ اس نوجوان کی پرستش کرتا ہے کیا تجھے کوئی اس سے بہتر چیز نہیں ملتی
کیا سبب ہے کہ محبت بھری نگاہوں سے
تیری آنکھ اُسے یوں دیکھتی ہے جیسے دیوتاؤں کو
ریچ ہی جس کا خیال بلند ترین حقیقت تک پہنچ گیا ہے اُسے زندہ ترین مخلوق کی چاہ ہوتی ہے
جس کی نظروں نے دنیا کو دیکھا ہے وہ شباب کے راز کو سمجھتا ہے
اور حکیموں کا میلان خاطر
حسینوں کی طرف ہی جاتا ہے"

اس طرح کے عشق میں جتنا عمر کا اختلاف ہو اسی نسبت سے اُس میں خالص روحانی محبت اور عرفان کا رنگ گہرا ہوتا ہے۔ جنسی عناصر معدوم ہو جاتے ہیں اور محض جوہرِ رجولیت اور جوہرِ انوثیت کا انتقال، انکشافِ حقیقت کی مخصوص قوتیں، اور روحانی وصل اور روحانی توالد رہ جاتا ہے۔

۴ — دوسری جنس کے معمر لوگوں کی طرف عاشقانہ میلان نوجوان لڑکیوں میں کم عمر میں ہوتا ہے لیکن نوجوان مردوں میں بہت دیر میں جا کر پیدا ہوتا ہے۔ گویا اسی پر جوانی کی نشو و نما ختم ہوتی ہے۔

نوجوان لڑکیوں کا بے چین دل محض استاد ہی پر نہیں آتا (لیکن ابتدا زیادہ تر اسی سے ہوتی ہے) اکثر یہ محبت ایک طرح کا مذہب بن جاتا ہے جس میں پورے درجے کی لڑکیاں مل کر استاد کی پرستش کرتی ہیں اور یہ پرستش تقریباً ایک مہلک مرض کی سی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں کبھی کبھی وحشیانہ مظاہر پرستی کی جھلک نظر آتی ہے اور عجیب مجنونانہ اوہام شامل ہو جاتے ہیں۔ عورتوں میں یہ کیفیت ایک حد تک ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ نسائی روح والی کو اپنی نشو و نما میں معمر مردوں سے جو فیض پہنچتا ہے اس کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے فیض پہنچانے والوں کی ذات سے اُنس ہو جاتا ہے۔ عورت کو جس شخص میں زندگی کی قدریں مجسم نظر آئیں وہ اُس کی ذاتی سیرت کو کلی یا جزوی طور پر نظر انداز کر کے دل و جان سے اسی کی ہو رہتی ہے اگر اس نے کہیں اس جذبات پرستی کو سچا عشق سمجھ لیا تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ سچے عشق کی بنیاد واقعیت پر ہوتی ہے اور یہاں واقعیت کی طرف سے آنکھ بند کر لی گئی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ فطرت نے بار بار دہ عورت کے تخیل کو اس قدر صورت پذیر بنایا ہے تاکہ اُسے قدریں ہمیشہ انسانوں میں مجسم نظر آئیں اور اُسے یہ قوت دی ہے کہ جو اثرات وہ قبول کرتی ہے اُن کی تشکیل کرے اور چپ چاپ نشو و نما پانے دے۔ بنات فطرت کو فطرت کے اس ارادے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اور ساری مصیبتیں جھیلنا پڑتا ہے۔

اس طرح کا علاقہ ایک حد تک باپ بیٹی میں ہوتا ہے اور کسی قدر کجروی کے ساتھ ماں بیٹیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ ہر تنہا اور یک طرفہ ذہن کو اپنی تکمیل کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ متقابل جوہر سے ملے اور اثر پذیر ہو۔ اس لئے کون سے تعجب کی بات ہے اگر نوجوان کو معمر عورتوں سے اس طرح کا تعلق ہو جو محبت تو نہیں لیکن محبت سے بڑھ کر ہے۔ پختہ عمر عورتوں کی روح میں تشکیل و تہذیب کی جو قوت ہوتی ہے اس سے

خصوصیت کے ساتھ نوجوان مرد بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو سطح کے نیچے اپنے آپ سے لڑ رہے ہیں اور اپنی سیرت کی تعمیر میں مشغول ہیں۔ جرمنی کی جلیل القدر شخصیتوں میں مشکل سے کوئی فرد ایسا نکلے گا جس میں وہ بات جس کی سبب سے ہم اس کا احترام کرتے ہیں بغیر اس کے حاصل ہوئی ہو کہ وہ جوہر انوثیت کے کسی مکمل نمونہ کا مشاہدہ کرکے اپنے نفس میں اس کا سا توازن اور تناسب پیدا کرے۔ یہ مکمل جوہر انوثیت گوئٹے کو فراؤ فان اشٹائن میں نظر آیا تھا، شلر کو فراؤ فان کالب میں اور ہولڈرلین کو سوزانا گونٹارڈ میں۔ ہنریئٹے ہرتس کی بدولت پہلے نوجوان ہمبولٹ کی تہذیب و تربیت ہوئی۔ پھر نوجوان شلائرماخر کی۔ مالویڈا فان مئیزن بگ کی محبت سے کچھ عرصہ کے لئے نیٹشے کو تسکین اور اطمینان خاطر نصیب ہوا۔ ان تعلقات میں جوہر امومت کو بھی دخل ہے۔ لیکن یہ بھی عشق ہی ہے۔ ہر چیز میں جس میں اپنی داخلی زندگی کی تشکیل کی آرزو نہاں ہو اس میں نوجوانوں کے عشق کی جھلک موجود ہوتی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس باب کو ختم کریں ایک اور بات کہدینا ضروری ہے۔ اس عشق کی جتنی صورتیں ہیں سب میں محبت کی قوت محرکہ دراصل اس شخص کی واقعی سیرت میں نہیں ہوتی جو معشوق قرار دیا جاتا ہے بلکہ خود اپنی داخلی کیفیات میں۔ یہ نصب العین اپنے ہی نفس کی بہار سے پیدا ہوتے ہیں۔ سچے قدر کو دیکھنے کی صلاحیت ابھی تک پختہ اور استوار نہیں۔ کثرت سے ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ محبت کا جذبہ اٹھتا ہے مجبور ہو کر کوئی ذہین اور کمینہ موصوف ڈھونڈھ لیتا ہے اور اسے تخیل کمال کے نقش و نگار سے مزین کر دیتا ہے۔ شلر کو لارا جیسی نظر آتی تھی اصل میں ویسی نہ تھی اور ہولڈرلین کی ڈیوتیما کے اصلی خطوط میں اس کی سیرت کی وہ شان دکھائی نہیں دیتی جس کی شاعر کے مافوق معشوق سے توقع تھی اور یہ عاشق کی نگہ میں محض معشوق کو نہیں بلکہ سارے عالم کو ایک طلسمی نقاب میں چھپا دیتا ہے۔ اس لئے ایسے آنسو ہیں جب آنکھیں کھلتی ہیں اور واقعیت کا دردناک منظر دکھائی دیتا ہے خصوصاً ان اوقات میں جب خود اپنی کمال بینی کی قوت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ استعارہ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں۔ واقعی انسان محض کپڑے ٹانگنے کے چوبی ڈھانچے ہیں جنھیں نوجوان اپنے تخیل کا زرق برق لباس پہنا دیتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے اکثر نوجوانوں کا یہ طرز عمل ایک مصیبت ہو جاتا ہے گرل پارتسر اپنے فاوسٹ کے ناٹک میں کہتا ہے "ہم اس زمانہ میں

محض اُن تصویروں کے عاشق ہوتے ہیں جو ہمارا تخیل کھینچتا ہے۔ وہ لڑکی جسے ہم اپنے خیال میں چاہتے ہیں۔ اصل میں ایک پردہ تصویر ہے۔ جس پر تخیل نے اپنے نقش و نگار بنائے ہیں اور اپنے رنگ بھر دئیے ہیں۔ میں نے ایک بار کسی کو کہتے ہوئے سنا ہے (یا شاید میں نے خود ہی کہا ہو) کہ میں کسی پر عاشق ہوں مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔ اس سے بڑھ کر سچا اور نوجوان کی خصوصیات کا ظاہر کرنے والا قول میں نے کبھی نہیں سنا۔"

لیکن اس حقیقت سے عشق کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی ہے بلکہ محض نوجوانوں کی ارتقاے نفس کے لئے اس کی اہمیت زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے۔ جس طرح آرٹ کا شوق اور تماشہ گری کی آرزو نفس کو وسعت دیتی ہے اسی طرح عشق اُس میں بلندی پیدا کرتا ہے۔ اگر انسان میں عشق کا احساس نہ ہوتا تو اُسے کبھی خبر نہ ہوتی کہ نصب العین کیا چیز ہے اس روشنی میں ہر چیز کل زندگی اور ساری فطرت حسین نظر آنے لگتی ہے۔ عشق کے پردہ میں ہمارے نفس میں حقیقی خلاق، صورت آفرین، ارتقا طلب قوتیں سرایت کرجاتی ہیں۔ فطرت اور ذہن کی وحدت کا راز نہاں یہاں آشکارا ہوجاتا ہے۔ فطرت کی قوت تخلیق کا طوفان عہد شباب کی نفسی بہار میں ذہنی تخلیق کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ کیا حرج ہے اگر اعیان لطیف (Ideals) ابھی تک دور دراز ستاروں کی طرح سرحد ادراک سے ماورا معلوم ہوتے ہیں۔ وہ گھڑی بھی کبھی کبھی آہی جاتی ہے۔ جب یہ لطیف اعیان واقعیت کے کثیف، مادے کے ساتھ مل کر ایک دیرپا صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ جب یہ وقت آجائے تو بہ قول ارسطو کے بالغ بننے کا عمل ختم ہوجاتا ہے اور بلوغ کی عمر شروع ہوجاتی ہے۔

سید عابد حسین

جرمانیہ کی صنعتی تعلیم

یہ تقریر جناب محمد عمر صاحب بی۔ای ممبر مجلس مہندسین امریکہ و جرمنی نے انجمن مذاکرہ علمیہ حیدرآباد میں کی تھی۔ ہم جناب سید ہاشمی صاحب کے تہ دل سے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہمیں انجمن کی طرف سے اس کے چھاپنے کی اجازت دی ہے۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے سامنے صنعتی تعلیم کے متعلق کچھ عرض کروں ایک ضروری امر عام تعلیم کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صاحبان میں اکثر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کے نام نامی سے واقف ہوں گے۔ اُنھوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ جرمنی کے زمانۂ قیام میں اُن کی ایک پروفیسر سے ہندوستان کی تعلیم کے متعلق گفتگو ہوئی۔ پروفیسر مذکور کو یہ سنکر حیرت ہوئی کہ تعلیم غیر زبان یعنی انگریزی میں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہا کہ اگر میں آپ کو معقول آدمی نہ سمجھتا تو یہ سمجھ لینے میں کوئی تامل نہ ہوتا کہ آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ تقریباً اسی قسم کی گفتگو میرے اکثر احباب سے ہوئی ہے؛ جن میں خاص طور پر قابل ذکر میرے ایک کرم فرما ہیں جو برلن کے صنعتی مدارس کے ڈائرکٹر ہیں۔ اُن کی تقریر کا بھی ماحصل یہی تھا کہ اگر تم کو کبھی صنعتی تعلیم کا موقع ہو تو کوشش کرنا کہ اپنی مادری زبان میں تعلیم ہو۔ میں نے اُن سے اعتراف کیا کہ اس طرح کی صرف دو یونیورسٹیاں ہندوستان میں ہیں۔ ایک جامعہ عثمانیہ اور ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے محترم دوست نواب مسعود جنگ بہادر کا خاص طور سے ذکر کیا۔

حضرات! آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ حیدرآباد میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم ہو گئی ہے جس میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے اور جس کے واسطے سے آپ ہر قسم کی ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک ایک ملک کو نہایت آسانی سے دے سکتے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی نظر بلند اور اپنے خیالات وسیع رکھے اور یونیورسٹی کا صحیح مقصد پیش نظر رکھا تو یہ جامعہ نہ صرف ریاست حیدرآباد کے لئے بلکہ تمام ہندوستان کے لئے باعث فخر اور لائق تقلید ہوگی۔ علاوہ دوسری ترقیوں کے جو اس زمانہ میں

یہاں ہوئی ہیں۔ اس یونیورسٹی کا قیام دورِ عثمانی کی بہترین برکات میں سے ہے جو ہماری تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ قریب زمانہ میں علمی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت اور عملی فنون کی تعلیم کا انتظام بھی اسی اہتمام سے کیا جائے گا۔ کیوں کہ ملک کو اس کی اشد ضرورت ہے اور ہماری ترقی اور مرفہ الحالی کا بہت کچھ دار و مدار انھیں چیزوں کے سیکھنے اور سکھانے پر ہے۔

ایک خاص طبقہ کا خیال ہے کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے اور یہاں صنعتی تعلیم دینی ایسی ضروری نہیں جس قدر بلاد یورپ میں ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ بڑی تعداد ہندوستان کی مردم شماری کی زراعت پیشہ ہے اور جرمنی اور انگلستان کی صنعت پیشہ ہے مگر اس سے صنعت و حرفت کی تعلیم کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے کہ ہندوستان کا زراعت پیشہ طبقہ دنیا میں سب سے زیادہ مفلس ہے یہاں صنعتی تعلیم کی اور زیادہ ضرورت ہے۔

زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس وقت صنعت کا محتاج نہ ہو۔ تمدن کی بنیاد صنعت و حرفت پر ہے۔ اعلیٰ پیشوں میں لیجئے کیا کوئی ڈاکٹر اپنا عمل جراحی بغیر صناع کی مدد کے کرسکتا ہے۔ اگر وہ باریک آلات جراحی جو ایک کاری گر بنا کر دیتا ہے نہ بن سکیں تو قیاس کیجئے کہ کس قدر مخلوق خدا ہلاک ہو۔ اور عمل جراحی نا مکمل رہ جائے۔ پھر ہماری روزمرہ کی ضروریات کو دیکھئے کون سی چیز ہے جس میں صنعت و حرفت کو دخل نہیں۔ کاشتکار کے اگر آلات اچھے ہوں اور ایک طبقہ اہل فن کا صرف اُن کی بہتری کی طرف توجہ کیا کرے تو کس قدر اُن میں ابھی ترقی کی گنجائش ہے۔ یہ صنعت و حرفت ہی کی تعلیم ہے جو ایجادات و اختراعات کا باعث اور تمدن و تہذیب کی ممد و معاون ہوتی ہے۔ پھر غور فرمائیے کہ اس ملک میں صنعت و حرفت کی تعلیم کی کمی کی وجہ سے ایک طرف تو ہم غیر ملک کے اپنے مایحتاج زندگی کے لئے دست نگر ہیں۔ دوسری طرف وہ خام پیداوار جو ہم مشقت سے پیدا کرتے ہیں ہم کو کوڑیوں کے مول اجنبیوں کے ہاتھ فروخت کرنا پڑتی ہے اور اسی چیز کو کارخانہ میں بننے کے بعد روپیوں میں پھر خریدتے ہیں۔

حضرات ! میں آپ لوگوں کی توجہ پھر صنعتی تعلیم کی طرف دلاتا ہوں کہ آپ حیدرآباد کے عمائد ہیں اور جامعہ عثمانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیگر علوم کے ساتھ اس شعبہ میں بھی خاص طور پر توجہ فرمائیے ؎

کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطوں سے بہتر ہے   یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشّائین و اشراقی

جرمانیہ اُن ممتاز ممالک میں ہے جہاں تقریباً سو فی صدی تعلیم یافتہ ہیں۔ یہاں تک کہ گونگے اور بہروں اور اندھوں تک کو تعلیم دے کر کام کا بنا لیا گیا ہے اور یہ معذور بھی اس وقت کسی پر بار نہیں ہیں۔ جنگِ عظیم سے قبل لارڈ رابرٹس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نہ جرمن بیڑے سے ڈرتا ہوں اور نہ اس کی فوج سے بلکہ اس کی تعلیم سے ڈرتا ہوں۔ میرے خیال میں اُس کی وجہ یہی تھی اور ہے کہ اس وقت بھی انگلستان میں کئی فی صدی ان پڑھ مل جائیں گے۔ مگر جرمانیہ میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جو لکھ پڑھ نہ سکے اور جب اس ابتدائی تعلیم کا زمانہ ختم ہوتا ہے تو ہر شخص اپنے متعلقہ پیشہ کے انتخاب میں آزاد ہے اور اُس کی تعلیم اُن اصول پر ہوتی ہے جو اس کی نظر میں ضروری ہیں۔ مثلاً میں تفصیل کے ساتھ صنعتی تعلیم کو لیتا ہوں۔ جو شخص انجینیر بننا چاہتا ہے وہ اپنے مضمون کو پہلے منتخب کرے گا مثلاً برقیات، معدنیات، میکانکی، کیمیاوی فنون، موٹرسازی وغیرہ۔ اُسے ایسے مدارس ثانوی میں جانا ہوگا جو ہمارے کالج کے ہم رتبہ ہیں۔ اس میں انھیں طبعیات کیمیا، ریاضی اور کوئی ایک غیر زبان۔ مثلاً انگریزی، فرنچ، اسپینی، روسی۔ لینی ہوگی۔ جب اُس نے ہمارے ہاں کے بی اے (B A) کے درجے تک کی تعلیم حاصل کرلی تو سب سے پہلے اُسے کسی ایک کارخانہ میں جو اُس کے منتخبہ مضامین سے متعلق ہے ایک سال تک عملی کام کرنا پڑیگا ہر کارخانہ کو سال میں ایک مقررہ تعداد ایسے طلبا کی لینی پڑتی ہے جنھیں (Praktikant) یعنی عملی کام کرنے والے کہتے ہیں۔ یہاں داخل ہونے کے بعد اُنھیں کارخانہ کے مدرسہ میں پڑھنا بھی پڑتا ہے جو ہفتہ میں دس سے بیس گھنٹے تک ہوتا ہے اس میں انھیں ان عملی اصول کے علمی پہلو بتائے جاتے ہیں جن سے آگے چل کر سابقہ پڑے گا۔ مثلاً ایک طالب علم برقیات کا انجینیر بننا چاہتا ہے۔ اگرچہ لوہاری اور نجاری ایسے مضامین ہیں کہ اگر وہ بالکل نہ پڑھے تو بھی وہ انجینیر ہو سکتا ہے۔ مگر چوں کہ مشین سازی میں اس کی ضرورت لازمی ہے اس لئے وہ امدادی مضامین کی طور پر کارخانہ میں پڑھ لیتا ہے۔ ایک طرف عملاً وہ آرہ کشی کرتا ہے اور مدرسہ میں اُسے بتایا جاتا ہے کہ آرہ کے دانت کس لکڑی کے واسطے کتنے زاویہ کے بنانے چاہئیں   یا   ایک ہتوڑا جو نصف پونڈ کا ہے جب ایک آدمی مارتا ہے تو اس کی چوٹ کتنے پاؤنڈ کی ہو جاتی ہے۔ ایک طرف وہ کارخانہ

کے تجربہ خانہ میں لوہے کا تجزیہ کرتا ہے اور اس کی مختلف قوتوں کو ناپتا ہے۔ دوسری طرف عملاً وہ ایک لوہار اور بڑھئی کی طرح کام کرتا ہے۔ پھر اُسے مختلف قسم کی مشینوں پر کام کرایا جاتا ہے کہ وہ خود پرزے ڈھال لے اور انھیں خراد پر اتار کر ٹھیک بٹھا سکے۔ اس طرح اس کی عملی تعلیم کا آغاز بالکل مبتدیوں کی طرح ہوتا ہے۔ سال بھر وہ اسی طرح مختلف شعبوں میں سے گزر کر کارخانہ کے مدرسہ سے سارٹیفکٹ لے کر کسی (Technikum) صنعت خانہ یا (Hochshule) دارالفنون میں جاتا ہے اول الذکر مدارس ٹکنیکل تعلیم کے ثانوی مدارس ہیں اور موخر الذکر اعلیٰ تعلیم کے مدارس بمنزلہ کالج یا یونیورسٹی کے ہیں جن میں ڈاکٹر آف انجنیرنگ تک کی ڈگری حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں طالب علم نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اپنے انجنیرنگ کے کسی خاص شعبہ میں (Specialist) مہارت کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح ایک کان کن کو عملاً کانوں میں جا کر کان کنی کرنی پڑتی ہے اور وہ کدال لے کر اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح ایک مزدور۔ اس زمانہ میں طالب علم کو کچھ پیسے فی گھنٹہ کے حساب سے اُجرت بھی ملتی ہے تاکہ آمد و رفت کا صرفہ کم سے کم اُسے خود نہ دینا پڑے۔ دوسرے خیر حاضر ہونے کی حالت میں اُسے محسوس ہو کہ اس نے کچھ کھویا اور کمانے کی عادت اور اپنی ذات پر بھروسہ اور اعتماد کا احساس اُسے طالب علمی کی حالت سے ہی ہونے لگے۔ پھر یہاں سے فارغ ہو کر طلبہ کالج یا ثانوی مدارس میں تعلیم پانے کے لئے داخل ہو جاتے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ کارخانوں کو ایسی کیا پڑی ہے کہ وہ طلبا کو کچھ وظیفہ کی طور پر بھی دیں اور ایک خاص عملہ استادوں کا رکھیں اور ایک بڑی تعداد مشینوں کی ایسی رکھیں جن پر یہ طلبا تعلیم پائیں، کارخانہ والوں کی تضیع اوقات کریں اور سیکھنے میں سامان خراب کریں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سوائے ہندوستان کے دیگر تمام ممالکِ عالم کے باشندے اسے خوب سمجھتے ہیں کہ افراد کے واسطے وہی چیز مفید ہے جو قوم کے لئے مفید ہے اور قوم، ملک اور حکومت جدا چیزیں نہیں ہیں۔ قوم مجموعہ ہے افراد کا اور قوم کی ترقی ملک اور حکومت کی ترقی ہے وہاں کا ہر متنفس یہ سمجھتا ہے کہ میں ایک جزو ہوں اُس کُل کا جس سے میری قوم مراد ہے۔ اس لئے وہاں کے کارخانے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے علیٰ قدر حیثیت فرض کیا سو طالب علم تیار کر دیئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ سو انجنیر قابل، پیدا ہوئے۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے کارخانہ پر اثر ضرور کبھی نہ کبھی جا کر پڑے گا۔ اس کی

قوم میں اتنے قابل افراد کا اضافہ ہوا اور اس کے کارخانہ کو تقویت ہوئی کہ اُسے ضرورت ہو گی تو کام نااہلوں کے ہاتھ میں سپرد کرنا نہیں پڑے گا۔ بلکہ اُسے قابل اطمینان طلبا مل جائیں گے جن کے کام پر اُسے اطمینان ہے۔ غرض ہر کارخانہ میں آپ کو ایک طالب علموں کا مدرسہ ضرور ملے گا جس میں تھیوری اور پریکٹس یعنی نظری اور عملی کام کی ساتھ ساتھ تعلیم ہوتی ہے۔

یہ جو کچھ انتظام ہے یہ انجنیروں کے لئے ہے مگر چونکہ ہر شخص انجنیر نہیں ہوسکتا اور نہ اتنی استطاعت رکھتا ہے کہ وہ مکمل تعلیم پائے۔ لہذا مستریوں کے واسطے تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ سال میں دو مرتبہ ایک جماعت طلبا کی لی جاتی ہے جو آیندہ چل کر مستری بنیں گے۔ انھیں (Lehrling) کہتے ہیں انھیں بجائے ایک سال عملی کام سیکھنے کے چار سال تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یہ طلبا پرائمری سکولوں سے ہی آجاتے ہیں۔ ان کی عمر ۱۴ سال سے ۱۸ سال تک ہوتی ہے۔ اُن طالب علموں کی عمر جن کا ذکر پہلے آچکا ہے داخلے کے وقت ۱۶ سے بیس تک ہوتی ہے۔ یہ طلبا اُن طالب علموں کے مقابلہ میں ہر شعبہ میں زیادہ دن لگاتے ہیں اور تین سال تک مختلف شعبوں کو طے کرتے جاتے ہیں۔ اس میں انھیں ہفتہ میں سات آٹھ گھنٹے علمی تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری ہے جس میں مستریوں کے واسطے ریاضی عملی اقلیدس و مساحت، نقشہ کشی، طبعیات، کیمیا، علم میکانک، حفظان صحت، انتظام کارخانہ کے اصول کچھ اقتصادیات، جرمن زبان وغیرہ ضروری ہے۔ تین سال کے بعد انھیں ایک ایسی چیز تیار کرنی پڑتی ہے جو ایک اعلیٰ صنعت کا نمونہ ہو۔ یہ بعض اوقات اس قدر نفیس اور اعلیٰ ہوتی ہے کہ بین الاقوامی نمائش میں رکھی جاتی ہے اور انھیں انعام ملتا ہے اس کے بعد طالب علم کا امتحان مجلس تجار کے دو نمایندے آکر لیتے ہیں اور اُسے سند دیتے ہیں۔ اس زمانۂ طالب علمی میں اسے بھی کچھ پیسہ فی گھنٹہ کے حساب سے ملتے رہتے ہیں اور جب اس کے استادوں کی نظروں میں اس کا کام قابل اعتبار ہو جاتا ہے تو کارخانہ کی بعض مصنوعات کے اجزا بھی اُسے بنانے کے لئے دیئے جاتے ہیں جس کی اُجرت اسے فی عدد کے حساب سے ملتی ہے۔ اس طرح اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی محنت رائیگاں نہیں گئی اور جس قدر اُس نے مشقت اور جانفشانی کی ہے اس کا صلہ بھی پایا اور یہ حس پیدا ہوئی کہ وہ آزاد کمانے کے لائق ہے جب ان طالب علموں کو سند مل جاتی ہے تو انھیں اختیار ہوتا ہے کہ خواہ وہ اُسی کارخانہ میں ملازمت کرلیں جہاں انھوں نے تعلیم پائی ہے یا کسی اور کارخانہ میں چلے جائیں۔

یہ طریقۂ تعلیم اگرچہ میں نے زیادہ تفصیل اور غور سے صرف اپنے کارخانہ میں دیکھا ہے جہاں میں نے خود کام سیکھا تھا اور جہاں میں بعد میں ملازم ہو گیا تھا۔ مگر یہی طریقہ دیگر صنعت و حرفت کے شعبوں میں اور کارخانوں میں جاری ہے۔ یعنی ہر کارخانے کے ساتھ اس کی مخصوص صنعت کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ بھی ہوتا ہے جس میں اُس خاص کام کی تکمیل کی غرض سے ایسے مضامین کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ جس کا بلاواسطہ یا بالواسطہ اس مخصوص صنعت سے تعلق ہوتا ہے اور ان مضامین کے لئے علیحدہ طور پر اُستاد رکھے جاتے ہیں اور طلبا تیار کئے جاتے ہیں۔ اس انتظام کے علاوہ مدارس شبینہ (Evening Schools) بھی بکثرت ہیں یہ شہر کی مجلس بلدیہ کے اہتمام میں ہیں ان کی تعلیم ۷ بجے سے رات کے ۹ بجے تک ہوتی ہے۔ ان مدارس میں وہ طالب علم بھی اکثر آتے ہیں جو کسی خاص مضمون میں کمزور ہوں یا زیادہ تر حوصلہ مند مستری آتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ انجنیر کا سارٹیفکٹ حاصل کرلیں انھیں عملی اور علمی تعلیم دی جاتی ہے۔ عمل میں کارخانہ کی تعلیم تو مطلق نہیں ہوتی مگر تجربہ خانہ یعنی Labo ratory کا کام انھیں ضرور سکھایا جاتا ہے۔ اس کی تعلیم کسی کلاس بندی کے اصول پر نہیں ہوتی بلکہ جس طالب علم کا جس مضمون کو جی چاہے انتخاب کرکے داخل ہو جائے۔ اس کی فیس فی مضمون فی میقات Term سات آٹھ شلنگ یعنی چھ رُپئے ہوتے ہیں۔ غیر مستطیع طلبا کی فیس میں معافی یا کمی ہو جاتی ہے۔ میں نے اکثر آدمی ایسے دیکھے ہیں جو ان اسکولوں سے تعلیم پاکر چیف انجنیر اور ڈائرکٹر کے عہدے پر پہنچ گئے ہیں۔

سوائے ہندوستان کے کسی متمدن ملک میں خیراتی ہسپتال نہیں ہیں ہر جگہ فیس دینی پڑتی ہے اور آج کل کا طریقۂ علاج اس قدر گراں ہوتا جاتا ہے کہ معمولی آدمی کی حیثیت نہیں کہ علاج کرا سکے اور پھر خصوصاً اس وقت جب کہ وہ بے روزگار بھی ہو۔ اس لئے متحدہ انشورنس کمپنیاں ایسی ہیں جو ہر طالب علم، ہر ملازم پیشہ سے کچھ حصہ اس کی تنخواہ کا جو بعض وقت مجموعی طور پر دو ڈھائی فی صدی تک پہنچ جاتا ہے لیتی ہیں اور اس فیس کے عوض مفت علاج ڈاکٹر کی فیس، دوا وغیرہ، عمل جراحی کے تمام مصارف ایام بیماری میں کفالت اور بصورت حادثہ پنشن وغیرہ کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اکثر میں نے دیکھا ہے کہ ان انشورنس کمپنیوں کے ایجنٹ کارخانہ میں صرف یہ دیکھتے پھرتے ہیں کہ کوئی مشین یا آلہ ایسے خطرہ کی حالت میں تو نہیں ہے جس سے اندیشہ کسی کی ہلاکت یا ضرر رسانی کا ہو۔ ایسی

مشینیں جہاں سے گرد و غبار یا گیس خارج ہوتی ہیں اور جن سے انسان کی صحت پر مضر اثر پڑنے کا احتمال ہوتا ہے وہاں ایسے نل اور پائپ لگانا ضروری سمجھے جاتے ہیں جن سے وہ گرد و غبار براہ راست ایک محفوظ ظرف میں چلا جائے اور کاریگر کو اپنے مضر اثر سے محفوظ رکھے۔ اگر آپ صنعتی مدارس کی فہرست مضامین دیکھیں تو معلوم ہوگا۔ ان میں اقتصادیات، حفظان صحت، نظام کارخانہ جات، بیمہ برائے کاریگران، حساب کتاب وغیرہ مضامین بھی داخل کورس ہیں۔

جنگ کے بعد سے جرمانیہ میں جس چیز پر خاص طور پر زور دیا جا رہا ہے وہ نوجوانوں کی جسمانی تربیت ہے۔ تمام مدارس میں جسمانی ورزش لازمی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایسے ڈاکٹر اس شعبہ کے ناظم ہیں جنھوں نے جسمانی ورزش میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی ہے۔ طلبا کو مختلف طریقوں سے ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ کھیلوں میں حصہ لیں۔ فوجی قواعد سکھائی جاتی ہے، مکہ بازی، شمشیر زنی، جیو جیٹسو، پستول اور بندوق کا نشانہ لگانا، تیر اندازی، کشتی رانی، وغیرہ۔ سب ان مدارس میں آدمی سیکھ سکتا ہے۔ ان کے مختلف کلب ہوتے ہیں جو ان کی ٹوپیوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

آپ کسی یونیورسٹی یا کالج کے اس ہال میں کھڑے ہو جائیں جہاں ۱۲ بجے کی چھٹی میں سب طلبا آکر جمع ہوتے ہیں۔ آپ کو مختلف رنگوں کی ٹوپیاں سیکڑوں کی تعداد میں نظر آئیں گی۔ ہر طالب علم اپنی مخصوص جماعت میں جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس طرح ایک طرف اگر سرخ ٹوپی والے کھڑے ہیں تو ان کے پاس سبز ٹوپی والے۔ اگر آپ کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر ان کا نظارہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ایک قالین ہے جس پر گوناگوں رنگوں کی گلکاری کی گئی ہے۔ آپ ان طلبا میں تقریباً اکثر طلبا کے سروں پر پٹیاں بندھی دیکھیں گے یا جب یہ آپ کو سلام کرنے کے لئے ٹوپی اتاریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے باریک کٹے ہوئے بالوں میں متعدد تلواروں کے زخم لگے ہوئے ہیں۔ اکثر یہ زخم ان کے گال اور پیشانی پر بھی نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کی جواں مردی اور سپاہیانہ زندگی کا پتا لگتا ہے۔ یہ زخم شمشیر زنی کی مشق میں لگتے ہیں اور یہ مشق ہمیشہ تیز نوکدار تلوار سے کی جاتی ہے۔ ریل میں سفر کرتے ہوئے یا کسی روز گرمی میں آپ کو ایک بڑی جماعت طلبا کی ملے گی جو اپنے استادوں کے ساتھ کسی پرفضا اور دلچسپ مقام پر جا رہے ہیں۔ ان کی پیٹھ پر چمڑے کے بستے بندھے ہوتے ہیں جیسا کہ فوج کے سپاہی اپنی ضروریات کے لئے باندھ لیتے ہیں۔

اس میں ان کا ناشتہ اور ایک گلاس پانی پینے کا ہوتا ہے۔ یہ بچے اور جوان طالب علم ہنستے بولتے کھیلتے کودتے چلے جاتے ہیں۔ صنعتی طلبا اکثر اپنے پروفیسروں کی معیت میں مشہور کارخانہ جات دیکھنے جاتے ہیں ہر چیز کی تشریح کی جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ سفر دور دراز مقامات تک کئے جاتے ہیں ایک ہندوستانی سیاح کو کس قدر رنج ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے طلبا کو دیکھو تو زرد رنگ آنکھیں گڑھوں میں بیٹھی ہوئی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی عمر میں کبھی نہیں ہنستے اگر مکتب اور اسکول کے ہیں تو گویا استاد کی موجودگی کے معنی یہ ہیں کہ انھیں شیر کے پنجرے میں بند کر دیا۔ برخلاف اس کے وہاں کے طلبا نہایت خوش مذاق اور شگفتہ رہتے ہیں۔ اسی جسمانی انحطاط کا اثر ہمارے دماغی قوی پر بھی پڑتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگ کسی طرح ترقی نہیں کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے ہاں گریجویٹ پیدا کرنے کی مشین یعنی یونیورسٹی موجود ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ گریجویٹ کو ہلاک کرنے والی بھی ہے۔

جو حضرات اس وقت قومی کشتی کے ناخدا ہیں میں اُن سے نہایت ادب سے گزارش کرونگا کہ تعلیمات میں جسمانی ورزش اور فنون مردانہ کا رواج دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ آپ مفید کتابوں کا درس میں داخل کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کا طالب علم بعد فراغت تعلیم ایک مریض حیوان ہوا جو نہ کھانا ہضم کر سکتا ہے اور نہ تندرست رہ سکتا ہے تو وہ تعلیم پاکر بھی کسی مصرف کا نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ ملک اور قوم اور سوسائٹی پر ایک بار ہے جس کے وجود سے سب کو تکلیف اور اذیت ہوتی ہے۔ اس لئے قوائے دماغی کی تربیت کے لئے پہلے قوائے جسمانی کی تربیت لازمی ہے۔ یہ اخلاقیات کے ایک ماہر کا قول ہے کہ جو طلبا جسمانی ورزش کرتے ہیں اور کھیل کود میں زیادہ حصہ لیتے ہیں وہ اخلاقاً بہت اچھے ہوتے ہیں۔

جرمن قوم کی خصوصیات میں بعض خصوصیات جنھوں نے میری طبیعت پر زیادہ اثر کیا ہے اُن کی سادہ زندگی کفایت شعاری اور جفاکشی ہیں۔ سادہ زندگی اور صفائی اور کفایت شعاری ان سے زیادہ اگر میں نے کسی قوم میں دیکھی ہے تو وہ جاپانی ہیں۔ مگر جفاکشی میں غالباً جرمن اُن سے بھی بڑھ جائیں گے۔ وہ نہ انگریزوں کی طرح خشک ہیں اور نہ فرانسیسیوں اور آسٹریا والوں کی طرح خفیف الحرکات ہیں۔ ترکوں کی طرح ان میں بردباری اگر ہے تو ان کا سا غرور نہیں ہے۔ کسی نسل اور رنگ سے نفرت نہیں کرتے۔ بہت سادہ غذا اور کم خرچ میں زندگی بسر کر کے بنک میں جاپانیوں

کی طرح کچھ پس انداز رکھنا ہر شخص کا فرض ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ اُن کے سکہ کی قیمت گھٹ گئی تھی ایک عام غربت چھائی ہوئی تھی۔ امیر غریب سب برابر تھے۔ اگرچہ ہر شخص کی جیب میں لاکھوں اور کروڑوں کے نوٹ ہوتے تھے مگر اُس سے اس کی ایک وقت کی خوراک کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر پھر بھی اصول حفظانِ صحت کے ماتحت اُن کی زندگی پاک و صاف تھی۔ ان کا مقولہ تھا کہ غریب رہ کر بھی ہم تندرست زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی اور قوم اس طرح کے اقتصادی چکّر میں آجاتی تو ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاتی۔ میں نے گزشتہ سال بلجیم اور فرانس کی حالت دیکھی جرمنی سے بدرجہا خراب ہے باوجودیکہ ان کا سکہ اتنا نہیں گرا تھا اور نہ وہ جرمنی کی طرح شکست خوردہ تھے۔ مگر گزشتہ تین سال میں جب سے کہ ان کا سکہ مستحکم ہوا اُن کی اقتصادی حالت روز بروز سنبھلتی جا رہی ہے اور اس وقت فرانس اور بلجیم سے ضرور بہتر ہے۔ یہ صرف ان کی جفاکشی کفایت شعاری اور اعلیٰ صنعتی ترقی کا نتیجہ ہے۔

جرمنی کی تعلیمی خصوصیات میں یہ ایک نہایت اہم امر ہے کہ وہاں ہر مضمون کا ماہر (Specialist) ہوتا ہے۔ اس ماہر کو وہی درجہ حاصل ہوتا ہے جیسا کہ پہلے ہمارے یہاں کسی فن کے امام کو ہوتا تھا۔ بعض ایسے مضامین کے ڈاکٹر ہوتے ہیں جو بظاہر ہمارے خیال میں مضحکہ خیز ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر جسمانی ورزش یا ڈاکٹر سٹرک۔ مگر حقیقت الامر یہ ہے کہ ہر دو مضامین اپنی نوعیت میں ایسے ہی اہم ہیں کہ ان پر خاص توجہ کی جائے اور ان کا امام ہو۔ کوئی زندگی کا شعبہ ایسا نہیں جن کی تعلیم نہ ہو۔ مثلاً باورچیوں کا مدرسہ اور خدمت گاروں کا مدرسہ۔ خدمت گاروں کے مدرسہ کے متعلق میں نے خاص طور سے معلوم کیا کہ اس میں کس قسم کی پڑھائی ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کپڑوں کا تہ کرنا، بوٹ پر پالش کرنا اور اُسے احتیاط سے رکھنا، کھانا کھلانا وغیرہ سکھائے جاتے ہیں۔ ۶۰ مارک پورے کورس کی فیس ہے اور چار پانچ ہفتہ میں کورس ختم ہو جاتا ہے۔ کیا کسی کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ خدمت گار بھی سند یافتہ ہوا کریں گے۔ مگر مولانا حالی مرحوم کی پیشین گوئی شاعری یا مبالغہ نہ تھی بلکہ جرمنی کی تعلیم نے ثابت کر دیا کہ اُن کا یہ فرمانا درست تھا ؎

یقیں جانو کہ آئندہ ملے گی درگہوں میں
گر آٹا پیسنے کو چاہیے گی اک پسنہاری

جرمن قوم کی علم دوستی کا اس واقعہ سے بھی پتا لگے گا کہ بعض وقت پروفیسروں کے لکچروں میں مسن اور بوڑھے سفید ڈاڑھی والے اصحاب طلبا کی جماعت میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ صنعتی کالج میں میرے ساتھ ایسے لوگ تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ خود مشہور انجنیر ہیں اور اپنے فن میں صاحب کمال ہیں۔ مگر کسی خاص مضمون جس سے وہ واقف نہ تھے اب اس کا شوق پیدا ہوا اور اسے حاصل کرنے کے لئے انھوں نے طلبا میں نام لکھایا ہے۔ ایسے مسن طلبا بعض اوقات خود یونیورسٹی کے پروفیسر ہوتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ پیر شو بیاموز اور اس سے شرمانا بالکل حماقت ہے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر بالقابہ کی کتاب "علمائے سلف" میں اکثر ایسے واقعات میری نظر سے گزرے۔ سچ ہے کہ جب قومیں ترقی کرتی ہیں تو خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور زوال آتا ہے تو خوبیاں جاتی رہتی ہیں۔ جو محاسن کل تک ہمارے تھے وہ آج ہم کو اجنبیوں میں نظر آتے ہیں۔ اور ہم خود ان سے معرا ہو گئے۔

صنعتی مدارس اور حرفت گاہوں کے اساتذہ ہر وقت تجربات اور تعلیم و تعلم میں مصروف ہیں اور روز نئی نئی ایجادات سے دنیا کو حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ ایک صاحب نے حال میں فولادی چادر تیار کی ہے جو کانچ کی طرح شفاف ہے۔ دو سال ہوئے میں نے ایک جرمن اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک پروفیسر نے کیمیاوی ذریعوں سے سونا بنایا ہے۔ حال میں ایک صاحب نے ایک آلہ بنایا ہے جس سے مچھر، مکھی وغیرہ کے چلنے کی چاپ اچھی طرح سنائی دیتی ہے۔ کوئلہ میں سے ایک صاحب نے تیل نکالا ہے جس سے خیال ہے کہ پٹرول بہت سستا ہو جائے گا۔ لاسلکی نے اس قدر ترقی کی ہے کہ آواز کے ساتھ بولنے والا بھی اب نظر آتا ہے۔ روز ایک نیا انکشاف اور ایجاد ہوتی ہے اور یہ محض برکت ہے اُن تھک کوششوں اور طالب علمانہ ذوق و شوق کی، ہم لوگ یونیورسٹیوں کی سند حاصل کرنا ہی اپنا مقصود تعلیم سمجھتے ہیں اور جب کوئی سند حاصل ہو گئی تو یہ سمجھتے ہیں کہ گویا ہم نے دنیا میں مقصود زندگی حاصل کر لیا۔ حالانکہ سند حاصل کرنے کے بعد کام کرنے کا وقت شروع ہوتا ہے۔

میں یہاں جرمن قوم کی ایک خوبی کو خاص طور سے احسان اور منت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جب کسی طالب علم کا داخلہ کسی کارخانہ میں ہو گیا جو زیادہ مشکل نہیں ہوتا تو اُس کی تمام ساختہ اشیاء اُس کے سامنے رہتی ہیں۔ اُس سے کوئی امر راز نہیں رہتا۔ وہ نہایت ہمدردی

اور دل سوزی سے ہر بات بناتے ہیں۔

میں جس زمانہ میں کارخانہ میں ملازم ہوگیا تھا تو مجھسے اُن میں سے بعض کے ساتھ ماتحتی اور بعض کے ساتھ افسری کے تعلقات تھے۔ میری کمزوری کو خواہ وہ بسلسلہ زبان ہوتی یا فن کے اعتبار سے ہوتی ہر شخص نہایت محبت اور ہمدردی سے رفع کرتا اور ہمیشہ میری مدد کرتا۔ جب کبھی میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوتا تو اکثر یہ مقولہ سننے میں آتا کہ "کوئی اُستاد آسمان سے نہیں گرتا ہے" برخلاف اس کے دیگر اقوام خواہ وہ انگریز ہوں یا ہندوستانی ناواقفوں سے غیر ہمدردی کا رویہ رکھتے ہیں۔ خود مجھے ملازمت دینے سے ہی ظاہر ہے کہ میرے ساتھ ان کا رویہ کس قدر ہمدردانہ تھا۔

حضرات! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے اپنی معزز مجلس میں باریاب فرما کر مفتخر فرمایا اور مجھے موقع دیا کہ اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ خصوصاً میں اپنے مکرم دوست سید ہاشمی صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے آمادہ کیا کہ یہ مضمون تیار کروں۔ اگر حیدرآباد میں جدید طرز کی صنعتی تعلیم کو رواج دینے میں یہ حقیر مضمون کسی حد تک بھی ممد ہو تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت کی حق سے زیادہ قیمت وصول ہوگئی۔

سید محمد عمر

جامعات اسکاتستان

(اسکاٹ لینڈ)

(از جے جی فائف صاحب۔ مترجمہ جناب ناظم حیدرآبادی)

نسل اسکات اپنی علم دوستی کے لئے ہمیشہ مشہور رہی ہے یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ پانسو برس ہوئے اینڈ روز میں پہلی جامعہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اور یہ بھی اسی علم دوستی کی بدولت تھا کہ مرور زمانہ کے ساتھ مختلف جامعات کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں اور بالآخر اس اسکاتی نظام تعلیم کی بنیاد پڑی جو قابل ستائش ہے علم ادب اسکاتستان میں کسی خاص جماعت تک محدود نہیں ہے اسکاتی جامعات نے اپنی تاریخ بنیاد سے امیر و غریب سب کا یکساں طور پر خیر مقدم کیا ہے اسی وجہ سے انھوں نے فرزانہ روزگار لوگ پیدا کئے ان میں سے متعدد اشخاص جاہ و شہرت کی چوٹیوں پر پہنچ گئے۔ لیکن اُن کی ایک کثیر تعداد نے اپنی ہی قوم میں نہایت خاموشی سے کام کیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اپنے ملک اور آیندہ نسل کو جہاں تک ہوسکے نفع پہنچائیں۔ اگر یہ دعوے کیا جائے کہ اسکاتستان کے لئے جو کچھ وہاں کی جامعات نے انجام دیا ہے وہ انگریزوں کی سمجھ سے باہر ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بایں ہمہ آج بہت سے سن رسیدہ اسکات ایسے ملیں گے جو اسکاتی جامعات کے تنزل کو نوحہ خواں ہوں گے ان کے نزدیک جامعات کی اب وہ حیثیت نہیں رہی جو گزشتہ صدی کے اخیر عشرہ سے قبل تھی ممکن ہے کہ ان کا خیال صحیح ہو۔ لیکن وہ بالعموم اس نکتہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ گزشتہ چالیس سال کے اندر دنیا نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق تو ہر چیز میں ترقی ہوئی ہے۔ سائنس نے الٰہیات فلسفہ فن ادب کے میدانوں میں بڑے بڑے ہاتھ مارے ہیں سیاسی حالات تو صحیح معنوں میں انقلاب پاگئے ہیں حتیٰ کہ خانگی زندگی بھی اب کچھ سے کچھ ہوگئی ہے۔

تعلیم کو اگر اُسے مفید ہونا ہے تو زمانہ کا ساتھ دینا چاہیئے بدلے ہوئے حالات کے مطابق ہونا اور نئے نئے مطالبات کو پورا کرنا چاہیئے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے جامعات کی موجودہ حیثیت کو دو مختلف نقاط نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر ہم کسی معقول نتیجہ تک پہنچنا چاہتے ہیں تو کرنا ہی چاہیئے۔ اسکاتی جامعات کی جو حالت آج کل ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ جو

تعلیم وہ دے رہی ہیں اس کے دو مختلف لیکن باہم مربوط رُخ ہیں یعنی تعلیمی اور معاشرتی۔ دراصل کسی جامعہ کے قیام کا منشا اعلیٰ تعلیم کی نشر و اشاعت ہوتا ہے۔ اور کسی نام کے بعد جو حروف مستزاد کئے جاتے ہیں اس سے بجز اس کے اور کوئی مطلب نہیں کہ اس شخص نے کسی خاص نصاب تعلیم میں ایک مقررہ قابلیت حاصل کرلی ہے لیکن اگر ایک جامعہ صرف اسی پر قناعت کرے تو وہ بہت ہی قلیل البضاعت ہوگی اس لئے درس گاہوں سے باہر جو معاشرتی دلچسپیاں پیدا اور مہیا کی جاتی ہیں اُن کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔ دنیا میں بکار آمد ہونے کے لئے انسان کو اس سے وسیع تر معلومات ہونی چاہئے جتنی کہ وہ درسی کتابوں اور درسوں سے حاصل کرتا ہے۔ اس واسطے ایک جامعہ معاشرتی سرگرمیوں کے لئے جتنے مواقع بھی بہم پہونچائے جائیں وہ کم ہیں ایک اتی جامعات کا اندازہ بالعموم شعبہ فنون (فیکلٹی آف آرٹس) سے لگانا چاہئے کیوں کہ یہی شعبہ ہمہ گیر تعلیم دیتا ہے اور دماغی نشو و نما پیدا کرتا ہے۔ طب، دینیات، سائنس کے دیگر شعبے تقریباً سب کے سب کم و بیش مخصوص ہوتے ہیں انھوں نے اپنی اپنی حد تک جو اعلیٰ معیار حاصل کرلیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۱۸۸۹ء تک فنون کے ہر طالب علم کو سات مضمونوں کا ایک ہی نصاب پڑھنا پڑتا تھا کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں دیا جاتا تھا انفرادی مذاق کے لئے صرف یہ رعایت تھی کہ جس ترتیب سے چاہیں مضامین پڑھیں چنانچہ جس کو فنون کی سند حاصل کرنا ہوتی تھی اس کو لاطینی، یونانی، منطق، اخلاق، ریاضیات، فلسفہ طبعی اور انگریزی ادب کے درسوں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ لیکن ۱۸۸۹ء میں کامل اصلاح عمل میں لائی گئی۔ لازمی مضامین لاطینی یا یونانی، منطق یا اخلاق، انگریزی یا تاریخ یا کوئی جدید زبان اور ریاضی یا فلسفۂ طبعی قرار دئے گئے بقیہ مضامین کے انتخاب کا اختیار طلبہ کو دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اور بھی تغیرات عمل میں آئے یہاں تک کہ آج انتخاب و اختیار کی ایک بھول بھلیاں بن گئی ہے۔ بایں ہمہ یہ قرار دیا گیا کہ ہر طالب علم خواہ کوئی نصاب اختیار کرے اس کی بنیاد چار خاص نصابوں پر ہوگی۔ اُن میں سے پہلا تو قدیم نصاب کے لگ بھگ ہے جس میں لازمی مضامین لاطینی یا یونانی "منطق یا اخلاق" اور ریاضی یا فلسفہ طبعی ہیں۔ دوسرا خالصتہً ریاضی ہے جس میں ریاضی، فلسفہ طبعی منطق یا اخلاق اور کوئی ایک غیر ملکی زبان شامل ہے۔ تیسرے میں ضروری مضامین ہیں۔ دو زبانیں ہیں نیز منطق یا اخلاق اور کوئی سائنس ہے اور چوتھے میں متعلم کو تاریخ یا کوئی اور مضمون سیاست مدن، منطق یا اخلاق اور کوئی جدید زبان لینا ہوتا ہے۔ ان لازمی مضامین اور جماعتوں کے متعلق چند جزئی قیود سے قطع نظر کرکے ہر متعلم کو

اختیار رہے کہ اپنے حسب منشار نصاب پورا کرنے کے لئے مضامین کو اختیار کرلے - ہر جامعہ میں پروفیسری اور لکچراری کی کرسیوں کی جو کثیر تعداد ہے اس کی وجہ سے مختلف کورسوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہوگئی ہے اس سبب سے اب ہر متعلم اپنے مذاق اور مفاد کا لحاظ کرکے اپنی آیندہ زندگی کے مشاغل کے بموجب نصاب انتخاب کرسکتا ہے-

ان چاروں نصابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے صرف ایک یعنی پہلے نصاب ہی میں قدیم زبان لازمی ہے- یہی وہ امر ہے جس پر اسکاتی جامعات کے نوحہ خواں زور دیتے ہیں کیونکہ اُن کے دلائل کا انحصار بالکلیہ کلاسک (CLASSIC) کی اہمیت پر ہے ۱۸۸۹ء سے ہر ایم اے لاطینی یا یونانی سے لازماً واقف ہوتا تھا لیکن اب کسی متعلم کو لاطینی تک لینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا - سوال یہ ہے کہ کلاسیکی تعلیم کی یہ کمی کیا کوئی نقص ہے یا دوسرے الفاظ میں) لاطینی اور یونانی پڑھنے والوں کو کیا خاص فائدے حاصل ہوتے ہیں اس میں شک نہیں کہ جس شخص نے کلاسیکی نصاب لیا اس کی نظر بہت وسیع رائے بہت صائب اور مذاق بہت شستہ ہوجاتا ہے- علاوہ ازیں روما جدید یورپ کی ماں ہے اور ہماری زبان کی بنیاد لاطینی ہے اس لئے اپنے سیاسی نظام اپنے قانون اور اپنی زبان کو پوری طور پر سمجھنے کے لئے لاطینی جاننا قریب قریب ضروری ہے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کلاسیکی فاضل ڈو دیکتا قوموں کی زندگی اور ادب پر عبور رکھتا ہے اور اس طرح گویا اس کو ایک خاص نہج پر دماغی تربیت دی گئی ہے جس کی وجہ سے اس میں صحت طلبی کا مادہ پیدا ہوگیا ہے - یہ سب صحیح لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ یہی فوائد دوسرے مضامین مثلاً ریاضیات اور اجتماعیات کے مطالعہ سے پیدا ہوسکیں؟ علاوہ ازیں کیا ان میں سے اکثر ذات تک محدود نہیں رہتے یعنی ان کی قدر و قیمت کیا اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ انفرادی دماغ میں سکون اور اطمینان پیدا کردیتے ہیں ؟

ہم کو کسی وقت بھی اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ زمانہ بدل گیا ہے چالیس برس ہوئے کہ شعبۂ فنون میں انھیں متعلین کی کثرت تھی جو گرجا میں شریک ہونا یعنی دین کی خدمت کرنا چاہتے تھے - لیکن اب متعلین فنون کی کثیر تعداد معلمی کا پیشہ کرتی ہے اور موجودہ معلم کو خصوصی بننا ہی پڑتا ہے - جو شخص سائنس یا جدید زبانیں پڑھنا چاہتا ہے وہ فطرتاً نصاب فنون اختیار کرتا ہے کہ یہی اس کے مقصد کے لئے زیادہ مفید ہے اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ لاطینی کو اس نصاب میں کوئی جگہ نہیں ملتی - حقیقت یہ ہے کہ شعبہ فنون بتدریج مخصوص ہوتا جاتا ہے - آج ممکن ہے کہ ان لوگوں کی تعداد کم ہو جن کو عام تعلیم دی جاتی ہے لیکن ماہرین اور خصوصیین

کی تعداد المضاعف ہوگئی ہے اور آج ماہرین ہی کا دور دورہ ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص ہومر یا سسرو (Cicero, Homer) کو اس آسانی کے ساتھ نہ پڑھ سکے اور نہ لکھ سکے جو ۱۸۸۵ء کے عیسائیوں کا طرۂ امتیاز تھا لیکن اس کے ساتھ ہی موجودہ طلبا سے اس کی توقع بھی نہیں ہے اور پھر جس مضمون میں اس نے مہارت پیدا کی ہے اس میں اس کا علم کچھ کم نہیں ہوتا بالخصوص اگر اس نے سند امتیاز کے ساتھ حاصل کی ہو۔ ریاضی کے معلم کا نقطہ نظر جس نے لاطینی نہیں پڑھی ممکن ہے کہ لاطینی پڑھنے والے کے مقابلہ میں اتنا گہرا نہ ہو۔ لیکن جہاں تک اپنے مضمون کی تعلیم کا تعلق ہے کلاسیکی نہ ہونے سے اس میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا اسکاٹستان میں جو لوگ نصاب فنون لیتے ہیں وہ گویا گرجا اور قانون کے لئے ہی لیتے ہیں اور بالعموم جو متعلین ان پیشوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ لاطینی (اور دینیات کے لئے یونانی) ضرور لیتے ہیں بہت سے آدمی جو اعلیٰ سول سروس کے امتحانوں میں شریک ہوتے ہیں وہ کلاسیک لیتے ہیں اور اب بھی بہت سے متعلین ہیں جو لاطینی اور یونانی یا لاطینی اور کسی اور مضمون میں امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ جہاں تک ایسے متعلین کا تعلق ہے یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا کہ کلاسیکی فضیلت کا معیار کسی طرح بھی اسی معیار سے کم ہے جو ۱۸۸۹ء سے پیشتر تھی یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ آج زیر طیلسانی (انڈر گریجوایٹ) کو داخل ہونے سے پہلے ایک ابتدائی امتحان یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کرنا پڑتا ہے حالاں کہ سابقہ زمانہ میں اس قسم کی کسی قابلیت کی ضرورت نہ تھی - یہ ابتدائی امتحان کوئی معمولی چیز نہیں اور اس کے فائدے اس قدر واضح ہیں کہ کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں' یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ سندی امتحانات روز بروز مشکل ہوتے جاتے ہیں اور کسی خاص مضمون یا مضامین میں ایم اے کی سند امتیازی صرف وہی حاصل کر سکتے ہیں جن کا معیار قابلیت فی الواقع بہت بلند ہو۔ شعبہ فنون کا منشا ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ ایسی عام تعلیم دی جائے جس سے علم انسانی کے مختلف شعبوں سے واقفیت ہو جائے اوپر کہا جا چکا ہے کہ جو معیار قابلیت اس نے آج پیدا کر رکھا ہے وہ کسی طرح اس سے کم نہیں جو چالیس برس پہلے تھا۔ اس کی کمزوری اگر ہے تو صرف یہ کہ بسا اوقات متعلین مضامین کے انتخاب میں خالصتاً افادی بن جاتے ہیں اس پر بھی ان کا جامعی نصاب بالکلیہ ایک طرح نہیں رہ سکتا کیوں کہ نصابوں کی ترکیب ہی کچھ ایسی رکھی گئی ہے جس سے کسی نہ کسی حد تک تنوع قائم رہتا ہے۔

اب ہم اسکاٹی جامعات کو معاشرتی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انگلستان میں جامعی حیات کا یہ پہلو

بہت زبردست ہی - اس کا سبب کچھ تو یہ ہی کہ انگریز اقامت کھیل اور ورزشوں کو پسند کرتے ہیں اور کچھ یہ وجہ ہے کہ وہاں اقامتی نظام اور پبلک مدارس قائم ہیں - معاشرتی حیثیت سے اسکاتی جامعات ہمیشہ کمزور رہتی ہیں - جس کا سبب ایک بڑی حد تک مالی مشکلات ہیں بہت سے اسکاتی متعلمین کو طویل موسمی تعطیلات میں آیندہ تعلیم جاری رکھنے کی غرض سے کچھ نہ کچھ کام تلاش کرنا پڑتا ہی اس لئے وہ ہر اس چیز کو ناپسند کرتے ہیں جو اُن کی تعلیم کو کم سے کم مدت میں ختم ہونے میں حائل ہو - خوش قسمتی سے اب اسکاتی جامعات میں بہت سے وظائف دئے جاتے ہیں جو امدادی اور انعامی دونوں طرح کے ہوتے ہیں اور پھر تعلیمی افسر بھی متعلمین کو مدد دیتے ہیں علاوہ ازیں اندڑو آنجہانی کی فیاضانہ امداد سے اب ہر طالب علم بغیر خودداری کو ٹھیس لگائے ہوئے محض درخواست کرنے پر اپنی فیس وغیرہ کا بیشتر حصّہ کارنیجی ٹرسٹ سے حاصل کرسکتا ہی - یہی طرح مالی مشکلات بہت کچھ کم کر دی گئی ہیں - اقامتی کلبوں کے نہ ہونے سے ظاہر ہی کہ معاشرتی زندگی پھل پھول نہیں سکتی - کیوں کہ جو متعلمین مستقلاً جامعہ میں نہیں رہتے ان کو یا تو کرایہ کے مکانوں میں رہنا پڑتا ہی یا بہت دور سے آنا پڑتا ہے ایسے حالات کے ہوتے ہوئے یہ بالکل ظاہر ہے کہ جامعہ کی معاشرتی دلچسپیاں بہت کچھ کم ہو جائیں - بایں ہمہ جامعی تعلیم کی حقیقی قدر وقیمت کا اندازہ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہی اسی وقت ہوسکتا ہی جب کہ متعلم دوستیاں قائم کرے، تبادلۂ خیالات کرے، دوسرے اشخاص کے نقطۂ نظر معلوم کرے، اور ورزش کھیلوں میں حصّہ لینے کے مہیا کردہ مواقع سے فائدہ اٹھائے - معاملہ فہمی پیدا کرنے اور شہرت حاصل کرنے کی تربیت قبول کرے جامعی انجمنیں بہت مفید ہوتی ہیں ان انجمنوں کے بغیر بقول پروفیسر ریت کے جامعہ محض ایک معبد ہوتی ہی نہ کہ مادر عظمٰی" ۱۹۱۳ء تک اسکاتی جامعات میں معاشرتی اور ورزشی مشاغل کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا تھا اور نہ کسی قسم کی ہمّت افزائی کی جاتی تھی - جنگ کے بعد ملازمت سے علٰحدہ ہو کر جب سینکڑوں طالب علم واپس آئے تو انھوں نے بالکل کایا پلٹ کر دی - یہ لوگ جو جامعات میں آئے تو مدرسہ سے آنے والے بچوں کی طرح نہ تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو فوج کی ملازمت کر چکے تھے اور جن کو اقامت کی قدر وقیمت پر پختہ یقین تھا - یہ سہرا انھیں کے سر ہی کہ انھوں نے اسکاتی جامعات میں یہ خیالات پھیلا دئے جن کے سبب سے ایک زبردست احیائی دور پیدا ہو گیا معاشرتی ادبی، ورزشی، ہر قسم کی انجمنیں قائم ہو گئیں اور جامعی زندگی کا رنگ بہت بہتر ہو گیا - لیکن ضروریات کی پھر بھی کمی تھی اور یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ ان مصلحین کے چلے جانے کے بعد پھر قدیم حالات عود کر آئیں گے اس لئے

حالات کو برقرار رکھنے کی تدابیر اختیار کی گئیں اور تاحال بہت کامیاب رہیں خصوصاً گلوسگو میں اقامتی نظام معاشرتی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے - بایں ہمہ اسکاٹستان میں محال ہے کہ یہ نظام پوری طور پر زندہ کر دیا جائے اگرچہ ملک کے دور دراز حصوں سے آنے والے متعلمین کے لئے اقامتی ہال قائم کر دیے گئے ہیں سینٹ انڈروز - ایڈنبرا اور گلاسگو میں اسی قسم کے اقامت خانے متعلم اور متعلمات دونوں کے لئے موجود ہیں - اور اب یہ مسلم ہو گیا ہے کہ معاشرتی زندگی پر ان کا بہت بڑا اثر ہے۔ بہ حیثیت مجموعی جامعہ کا معاشرتی مرکز انجمن اتحاد ہوتی ہے اور ہر اس شخص کو جو معاشرتی زندگی میں کوئی جگہہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں شریک ہونا پڑتا ہے یہاں پھر مالی مشکلات رونما ہوتی ہیں کوئی اتحاد بغیر سرمایہ کے نہیں چلایا جا سکتا - اور چوں کہ بڑا بلکہ واحد ذریعہ آمدنی صرف ارکین کا چندہ ہی ہوتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ چندہ کی رقم بہت زیادہ ہوگی - اسی وجہ سے بعض لوگ رکنیت سے بالکل ہی باز رہتے ہیں لیکن خوش قسمتی ہے کہ اب اس وقت کو رفع کرنے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں - گلاسگو میں خود طلبا نے ..... پونڈ کا ایک سرمایۂ عافیت قائم کر دیا ہے اس سرمایہ کا مقصد یہ ہو گا کہ اقامت میں سہولت پیدا کرے ورزش کی ترغیب دی جائے اور طلبہ کے لئے ایک جدید اتحاد کی بنیاد ڈالی جائے طالبات کی انجمن اتحاد پہلے ہی سے قائم کر دی گئی ہے اور اب یہ امید کی جاتی ہے کہ آگے چل کر سالانہ اتحادی چندہ صرف چند شلنگ رہ جائے گا - اور اس طرح اتحاد کی رکنیت غریب سے غریب طالب علم کے امکان میں آجائے گی - دیگر جامعات میں بھی اس قسم کی تحریکیں درپیش ہیں - اس قسم کی عافیتی لائحات کا منشا صرف یہ ہے کہ اسکاتی جامعی تعلیم کا توازن درست رہے تاکہ اسکاتی متعلمین نہ صرف لائق و فاضل ہی ہوں بلکہ وہ مہذب بھی ہوں اور حقیقی معنوں میں انسان بھی ہوں اور ان میں وہ وسعت نظر ہو جو اقامت سے ہی پیدا ہو سکتی ہے دنیا میں اس کی زیادہ ضرورت ہے اب تک اسکاتی طلبا زندگی کی دلآویزیاں اور زندگی کی معلومات یا تو خود حاصل کرتے تھے یا گھروں میں سیکھتے تھے لیکن اب بالآخر جامعات نے اس کو محسوس کر لیا ہے کہ انھوں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کہاں تک کوتاہی کی آج اسکاتی جامعات کا منشا یہ ہے کہ وہ اپنے متعلمین کو دماغی، اخلاقی، معاشرتی اور جسمانی ہر طرح کی تعلیم دیں تاکہ اچھے شہری بننے کے مستحق اور اہل ہو سکیں - پس آج کی اسکاتی جامعات کا یہ خاکہ ہے ان کی تعلیم دنیا میں بے نظیر ہے اور تخصیص کی وجہ سے ان کے روایتی بلند پایہ معیار فضیلت میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں آئی ہے - اب وہ زمانہ کی ضروریات کو محسوس کرتی ہیں اور دنیائے جدید کے مطالبات کو پورا کرنے کی سعی کرتی ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا مطمح نظر اب وسیع تر ہو گیا ہے اور انھوں نے اب لطائف زندگی

کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسکاتی جامعات ہمیشہ سے جمہوری معبد رہی ہیں کیونکہ اسکاتستان میں تعلیم کی خواہش ہر طبقہ اور ہر گروہ میں موجود ہے سلطنت کے بعض مشاہیر اسکاتی دیہات ہی نے پیدا کئے ہیں اور اسکاتستان کو معلوم ہے کہ اُن کے لئے کیا قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اسکاتی کفایت شعاری، اسکاتی امنگ اور اسکاتی کارنامے سب کے سب حقیقی ہیں۔ ان کی ہی بدولت اسکاتی تعلیم کو یہ فوقیت حاصل ہے۔ صرف اسکاتستان ہی میں امیرزادے اور غریب زادے ایک ہی بینچ پر بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے سے مساویانہ برتاؤ کرتے ہیں قوم کے ہر طبقہ کے آدمیوں کا خیر مقدم کرنے اور سب کو ایک ہی سے مواقع بہم پہونچانے میں اسکاتی جامعات نہ صرف ملک کے مطالبات کو پورا کر رہی ہیں بلکہ ایک زبردست روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

(از ریویو آف ریویوز)

تعلیم اور ہندو مسلم اتحاد

اب قوت واستبداد کا زمانہ نہیں رہا۔ جارحانہ تبلیغ واشاعت کی حیثیت ایک تاریخی واقعہ سے زیادہ نہیں رہی۔ جہاد و احتساب اور تیغ وسنان کا دور ختم ہوا۔ مذہبی معاملات کو سیاسی ریشہ دوانیوں کی صورت نہیں دی جاتی۔ ہم نے تہذیب و تمدن کے ایک جدید اور برتر دور میں قدم رکھا ہے جس میں اقوام و ملل کے بے معنی مناقشے اور اُن کی مجنونانہ لڑائیوں کو وحشت و بربریت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کے مذہبی تنازعات اور جبر و تعدی میں حصّہ لیتے ہیں۔ تہذیب جدید کی نگاہوں میں نیم وحشی انسانوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں پہلو بہ پہلو مطالعہ، باہمی اختلاط و ارتباط، پند و نصیحت اور علمی حجت و استدلال کے علاوہ اور سب طریقہائے عمل بیکار ہیں۔

جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا کے تمام مذہبی اختلافات بہت جلد مٹ جائیں گے اگر دنیا طوفان نوح کی طرح کے کسی خوفناک سیلاب کی نذر نہ ہوگئی یا کسی زبردست قوت نے حریت خیال اور آزادانہ اختلاط اور ارتباط کی موجودہ تحریک کو روک نہ دیا جس سے سفر و سیاحت کی آسانیاں اور بین الاقوامی بین الملکی، بین الملی اور بین التعلیمی نظام درہم برہم ہوگیا تو پچاس یا سو برس کے عرصے میں نہ مذہبی تعصب رہیگا نہ جنون۔ غیر معقول عقائد اور بے معنی توہمات جو مذہب کے پردے میں رائج ہیں دور ہو جائیں گے۔ یہ صرف آزاد خیالی، تبادلۂ علم، سفر و سیاحت اور باہمی اختلاط و ارتباط کا نتیجہ تھا کہ یورپ کا مذہبی جنون و تعصب ختم ہوا ہماری آیندہ نسلیں جب آج کل کے واقعات پر غور کریں گی تو اپنے آباد اجداد کی وحشت اور بربریت پر تعجب کا اظہار کریں گی یقیناً ہماری موجودہ کارنامے اُن کے لئے کسی طرح سے بھی فخر و مباہات کا موجب نہیں ہو سکیں گے۔

موجودہ حالات میں بھی کوئی معقول اور سمجھدار آدمی ایسا نہیں ہے جو آج کل کے واقعات سے اس نتیجہ پر نہیں پہنچا کہ جدید معیار کی رو سے ہندوستانی تہذیب و تمدن میں نہایت پیچھے واقع ہیں۔ ہماری کیفیت ازمنہ متوسطہ کی سی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ علاوہ ان نقایص کے جو ہماری سیاسی زندگی میں موجود ہیں انگریزی پارلمنٹ صرف اسی بنا پر ہندوستانیوں کو حکومت خود اختیاری میں مزید ترقی دینے سے انکار نہ کر دے بلکہ اس سے قبل جو مراعات دے چکی ہے انھیں بھی واپس لے لے۔ ان افسوسناک واقعات سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں

کہ ہندوستان ابھی بہت دنوں تک سوراج کے قابل نہیں ہوگا بشرطیکہ سوراج سے مراد اپنی ذاتی ذمہ داریوں کا احساس اور اپنے معاملات کو خود طے کر لینے کی صلاحیت ہو۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک ہمارے اندر قومی پختگی پیدا نہیں ہوئی۔ ہماری کیفیت نوخیز بچوں کی سی ہے۔

لہذا وقت ہے کہ ہم لوگ اپنی حالت پر غور کریں اور اپنی تمام تر کوششیں اصلاح ذات میں صرف کریں ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی قوت کو بڑھائیں اور اپنے اندر ایثار و مصالحت کا مادہ پیدا کریں۔ بدقسمتی سے ہماری تمام سرگرمیاں مخالف سمت میں جاری ہیں ہم نے کم از کم دو غیر قومی یونیورسٹیاں قائم کرلی ہیں اور بہت ممکن ہے کہ سکھ، پارسی، اینگلو انڈین اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے متعدد فرقے مثلاً آریہ، غیر برہمن، جینی، شیعہ، قادیانی اور میمنی بھی جداگانہ یونیورسٹیاں قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ان جماعتوں کے متعدد اسکول اور کالج اور دھرم سالے پہلے ہی سے فرقہ وارانہ طرز پر چل رہے ہیں اور انھوں نے ملک کے لئے ایک نہایت ہی بری مثال قائم کر رکھی ہے جسے کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تحریک جیسا کہ ہم آگے چل کر وضاحت سے بیان کریں گے ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اگرچہ لوگ اس میں اس قدر غلو سے کام لے رہے ہیں کہ اب اصلاح کی گنجایش بھی باقی نہیں رہی۔

ہندوستان کی آیندہ بہبودی کے لئے ہم ایک اسکیم پیش کرنا چاہتے ہیں جس کے ہر پہلو پر ہم نہایت تفصیل سے نظر ڈالیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری اس اسکیم پر عمل کرنے سے ہندوستانی بہت جلد اپنی حالت کو درست کر سکتے ہیں۔

ہماری تجویز ہے کہ :۔

(۱) آیندہ فرقہ وارانہ اصول پر کوئی مدرسہ قائم نہ کیا جائے۔

(۲) موجودہ ملّی مدارس میں دوسری قوموں کے لئے جو قوانین، پابندیاں یا موانعات قائم ہیں انھیں دور کر دیا جائے اور اُن کی بجائے ہر طالب علم کے لئے داخلہ عام کر دیا جائے تاکہ وہ بغیر کسی امتیاز یا پابندی کے بلا روک ٹوک آپس میں مل سکیں۔

(۳) بین الملی اصولوں پر نئے مدارس قائم کئے جائیں۔

(۴) ”مخلوط سکولوں“ کی اسکیم کے طرز پر باہمی بین الملی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ مختصر طور پر اس باہمی بین الملی تعلیم (Intercommunal education) کا

ایک خاکہ پیش کر دیں۔ صرف اس سکیم پر عمل کرنے سے تمام وہ نقصانات جو فرقہ وارانہ درس گاہوں سے مترتب ہو رہے ہیں دور ہو جائیں گے۔

فرض کیجئے کہ میں مسلمان ہوں۔ ظاہر ہے کہ پانچ سے بارہ برس کی عمر تک میں اپنے بچہ کو کسی فرقہ وارانہ مدرسہ میں بھیجوں گا اور اگر مجھ میں استطاعت ہو تو میں اس کے لئے کسی ریزیڈنشل درسگاہ کو ترجیح دوں گا یہاں ان مضامین کے علاوہ جو نصاب میں داخل ہیں میرا بچہ ایک نہایت ہی مناسب عمر میں اسلامی عقائد اور اسلامی فرائض کی تعلیم حاصل کرے گا۔ لیکن اگر میری مالی حالت اچھی نہیں یا میرے مکان کے قرب وجوار میں کوئی اسلامی مدرسہ موجود نہیں تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گا کہ اس کو کسی گورنمنٹ اسکول میں بطور ڈے اسکالر داخل کر دوں اور جہاں تک ممکن ہو سکے گھر میں اسلامی دینیات کی تعلیم دوں۔ جہاں اسلامی مدارس موجود نہیں وہاں یہ کام تمام مسلمان خاندانوں کو خود انجام دینا پڑتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سات برس کا یہ زمانہ کبھی اسلامی اور سرکاری مدرسہ میں تقسیم ہو جائے۔ سرکاری مدارس کی تعلیم پر بہت سے اعتراضات کئے جاتے ہیں جو سراسر غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ برعکس اس کے یہ مدارس نہایت مفید ہیں لیکن لوگ اُن سے پورا فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

پھر بارہ برس سے سولہ برس کی عمر کے لئے مجھے اپنے بچے کو کسی خاص ہندو مدرسہ میں جو اس قدر روادار ہو کہ میرے بچے کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرے جیسا کہ ہندو طالب علموں کے ساتھ کیا جاتا ہے بھیج دینا چاہئے۔ اگر ممکن ہو تو یہاں بھی سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ میرا لڑکا دوسرے ہندو لڑکوں کے ساتھ بورڈنگ ہی میں رہے۔ مجھے کوشش کرنا چاہئے کہ میٹرک کے مضامین کے علاوہ جو اس مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں میرا لڑکا پنڈت جی کی مدد سے ناگری اور اشلوک بھی سیکھے اور تھوڑی سی سنسکرت حاصل کر لے تاکہ اگر اس کے دل میں کچھ ادبی ذوق موجود ہو تو آئندہ عمر میں سنسکرت ادب سے مستفیض ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ میرا لڑکا نہ صرف مدرسہ کے کھیلوں میں حصہ لے گا بلکہ کبھا، سندھیا اور ہون میں بھی شریک ہوا کرے گا۔ ممکن ہے وہ ہون یا سندھیا میں عملی حصہ نہ لے لیکن تماشائی کی حیثیت میں تو ضرور اسے دیکھا کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرے اشارے سے یا خود اپنی مرضی سے میرا لڑکا بھجنوں کے گانے میں شریک نہ ہو لیکن اگر اس کا ضمیر اس کی اجازت دے یا بھجنوں کی لطافت اسے اپنی طرف کھینچ لے تو میری رائے میں اس کے ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

برعکس اس کے مجھے اس کو ہدایت کرنا چاہئے کہ وہ مدرسہ کی زندگی سے علیحدہ نہ رہے بلکہ اس کی تمام

سرگرمیوں میں مثلاً کھیل کود، بحث ومناظرہ اور باہمی میل جول میں اسی طرح حصہ لے جیسا کہ وہ کسی اسلامی درس گاہ میں لیتا۔ میری طرف سے اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ جہاں تک ہوسکے ہندو نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ہندو تہذیب سے جس چیز کو چاہے پسند کرلے۔ یہی رویہ ہندو طلبا کا اسلامی درسگاہوں میں ہونا چاہیئے۔ مختصراً یہ کہ جب تک میرا لڑکا اس مدرسہ میں تعلیم پائے اُسے چاہیئے کہ نہایت آزادی اور بے تکلفی سے اس مدرسہ کی اصلی روح کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ یہیں سے میرا لڑکا میٹرک کا امتحان پاس کرےگا اس کے بعد ۱۶ یا ۱۷ برس کی عمر سے لے کر ۱۹ یا ۲۰ برس کی عمر تک اُسے کسی عیسائی یا یورپین مدرسہ میں جو کسی اینگلو انڈین، یورپین یا مشنری سوسائٹی کے ماتحت چل رہا ہو داخل ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ مشن اسکول موجود ہیں۔ ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے اینگلو انڈین اور یورپین مدارس سے بھی جو بڑے بڑے شہروں اور پہاڑوں پر قائم ہیں فائدہ اٹھائیں۔ جن لوگوں کی مالی حالت اچھی ہو وہ اس اسکیم پر نہایت خوبی سے عمل کر سکتے ہیں بہتر یہ ہوگا کہ طالب علم کو کسی اعلیٰ درجہ کے ہندو، یورپین یا مشن اسکول میں بھیجدیا جائے اور وہیں بورڈنگ میں رکھا جائے۔ بہرکیف میرا لڑکا کسی مشن اسکول سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرے گا۔

اب ۱۹ یا ۲۰ سے ۲۱ یا ۲۲ برس کی عمر تک دو سال کے لئے مجھ کو اُسے پھر کسی اسلامی درس گاہ میں بھیجدینا چاہیئے جہاں سے وہ اپنا بی اے کا امتحان پاس کرے گا۔ ظاہر ہے کہ میرے لئے سب سے اچھی جگہ مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہوگی۔ اس اثناء میں میرے لڑکے کے تمام فرقہ وارانہ جذبات قومی تعصب اور مذہبی کٹرپن دور ہوجائے گا اور وہ نہ صرف ہندوستان کا اچھا شہری بلکہ ایک معقول مسلمان بھی ہوگا۔

اگر اُسے مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہو تو وہ اپنی تعلیم کو کسی اسلامی درس گاہ مثلاً علی گڑھ میں جاری رکھ سکتا ہے یا بہت ممکن ہے کہ میں اُسے یورپ یا امریکہ میں بھیجدوں بشرطیکہ مجھ میں اتنی استطاعت بھی ہو۔ ایسے مقامات پر میری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ کسی خاندان میں رہنے کی بجائے بورڈنگ ہی میں رہے تاکہ اُسے یورپین طلبا سے میل جول کا پورا موقعہ ملے۔ یورپ میں تعلیم پانے سے اس کا مطمح نظر بہت زیادہ وسیع ہوجائے گا اور وہ دنیا کا بہترین شہری بن جائے گا۔

ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ اس اسکیم کا ایک ابتدائی خاکہ پیش کردیا ہے۔ ہندوستان کی ہر قوم اور ہر فرد کو چاہیئے کہ اُسے اپنے حالات اور اپنی ضروریات کے ماتحت عمل میں لائے۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ ہماری راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا ہوجائیں گی لیکن اگر ہم ہمت و استقلال سے کام لیں تو یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں جس میں کامیابی حاصل نہ ہو۔ انسان کے دل میں عزم ہونا چاہئے اگر ایسا ہے تو وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ اس مضمون سے بھی ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ پُرجوش ہندوستانی اپنے دل میں ایک زبردست قوت ارادی پیدا کریں۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کے سامنے ایک خیالی دنیا کا تصور پیش کیا جائے۔

خود راقم الحروف کو اپنی تعلیمی زندگی سے اس قسم کی اسکیم کے نہایت درجہ سہل الحصول اور قابلِ عمل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ راقم الحروف نے اسی اسکیم کے ماتحت بہت سے مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے۔ یوں بھی بہت سے ہندو اور مسلمان طالب علم موجود ہیں جنھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے مختلف دور مختلف درسگاہوں میں پورے کئے ہیں۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ایک مسلمان باپ کو اس اسکیم پر کس طرح عمل کرنا چاہئے۔ ہندوستان کی دوسری قوموں سکھ، عیسائی، ہندو اور پارسیوں کو بھی اسی طرح اپنی ضرورت کے مطابق اس میں لینا چاہئے، یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس اسکیم کا محض ایک خاکہ ہے۔ لیکن ہمارے رہنمایانِ تعلیم بھی اس امر کو تسلیم کریں گے کہ ہندوستانی قومیت کے ارتقا اور باہمی اتحاد و اتفاق کے لئے اس سے زیادہ مفید اور کوئی طرزِ عمل نہیں۔

اس اسکیم کی ترتیب میں ہم نے وحدت فی الکثرت کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔

یہ باہمی بین الملی تعلیم جن اصولوں پر مبنی ہے اور اس کے سامنے جو پروگرام ہے اس کے خلاف بہت سے اعتراضات کئے جاسکتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ سب سے پہلے ہم ان بڑے بڑے اعتراضات کا جواب عرض کریں جو موجودہ حالات میں پیدا ہوسکتے ہیں اور جن کی معقولیت میں کسی کو شبہ نہیں اول ہم اپنے سیاسی مخالفین کی غلط فہمیوں اور اُن کے خدشات سے بحث کریں گے پھر ہم ہندوستان کی مختلف قوموں کے ان عام خیالات اور مغالطوں پر نظر ڈالیں گے جو فرقہ وارانہ تعلیم کی ضرورت کے متعلق اُن کے دلوں میں جاگزین ہیں۔

غالباً ہم پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ باہمی اتحاد و اتفاق کے لئے ہم نے تعلیمی ذرائع کو سیاسی ذرائع پر ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ بہت سے لوگ جو کونسلوں کے اندر یا باہر ملک کے سیاسی گرداب میں الجھ گئے ہیں اور بہت سے لوگ جن کی یہ خواہش ہے کہ جس قدر جلد ہوسکے سیاسی طاقت حاصل کرلیں قدرتاً یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری تمام تکالیف کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم ایک غیر قوم کے غلام ہیں

لہٰذا اگر سیاسی طاقت حاصل کر لی جائے تو تمام حالات خود بخود درست ہو جائیں گے ۔ بالفاظ دیگر ہمیں صرف سیاسیات کی فکر کرنی چاہئے تعلیمی، معاشرتی، ملی اور معاشی معاملات آپ سے آپ ٹھیک ہو جائیں گے ۔لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح ؟ ابتدا ہی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیاسی طاقت کو حاصل کرنے والے کون ہیں ؟ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری سیاسی زندگی کے تمام نقائص اور ہمارے موجودہ لڑائی جھگڑے صرف اس شیطانی غیر ملکی حکومت کے پیدا کردہ ہیں ۔اس سے نجات حاصل ہو گئی تو سب کچھ ہو جائے گا ۔ سیاسی طاقت کے بغیر ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے ۔ہم نہایت پُر زور الفاظ میں کہنا چاہتے ہیں کہ یہ محض ایک سیاسی فریب ہے جس کو یہ لوگ صرف اپنی اغراض کے لئے شہرت دے رہے ہیں ۔ دنیا کے تمام تاریخی اور نفسیاتی اور دوسرے سنجیدہ واقعات اس کے خلاف ہیں لیکن یہ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیمی، بین الملی، بین المعاشرتی اور مذہبی اصلاح کا انتظار کون کرے اس چیز کے لئے تو دو ایک دن نہیں بلکہ صدیوں کی ضرورت ہے ۔لہٰذا جس طرح بھی ممکن ہو سب سے پہلے حکومت خود اختیاری حاصل کر لینی چاہئے ۔ اس کے بعد ان معاملات کی اصلاح ہو جائے گی ۔ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے خیالات واقعات کے بالکل خلاف ہیں ۔ سیاسی طاقت، حکومت یا سوراج تعلیمی اور معاشرتی ترقی، معاشی اور سائنٹیفک فروغ، باہمی اتحاد، متفقہ عمل، تجارتی صلاحیت اور سب سے زیادہ افراد کے اندر جماعتی ذمہ داریوں کے احساس کا نتیجہ ہے ان کا سبب نہیں ۔قوموں کی ذہانت اور قابلیت، ان کی تہذیب و تمدن، محنت اور دیانت، رواداری اور عصبیت، مصالحت پسندی اور اتحاد و اتفاق ایثار و قوت، احساس ذات اور ضبط نفس سے قوت اور خوش حالی پیدا ہوا کرتی ہے، قوت اور خوش حالی سے یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنٹیفک علم، ٹکنیکل مہارت، مدافعانہ اوزار اور آلات حرب آج کل بھی سیاسی طاقت کے لئے ایسے ہی ضروری ہیں جیسا کہ زمانہ گزشتہ میں تھے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ جو طاقت اس طرح حاصل کی جاتی ہے اس سے اکثر انتشار و انحطاط عیش و عشرت، سستی اور آرام طلبی اور تشدد و استبداد پیدا ہوتا ہے ۔ دنیا کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے خالی نہیں ۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محض سیاسی مجادلوں اور مراعات سے وہ بہت جلد منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے اور جن کی یہ رائے ہے کہ کسی قوم کی ترقی اور خوش حالی کے لئے سیاسی استقلال ضروری ہے ہم اُن سے

درخواست کریں گے کہ وہ پارسی قوم کی حالت پر نظر ڈالیں ہم جاپان کی مثال پیش نہیں کرتے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ بمبئی تک تشریف لے جائیے اور اس قوم کے حالات سے سبق اندوز ہونے کی کوشش کیجئے بلکہ ہماری رائے میں تو اس کی بھی ضرورت نہیں اس لئے کہ پارسی تقریباً ہندوستان کے ہر شہر میں موجود ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی قوم موجود ہے جو پارسیوں سے زیادہ خوشحال، ذی عزت، صلح جو قابل، مستعد اور متمول ہو؟ جہاں تک سیاسی قوت کی عدم موجودگی اور ایک دوسری قوم کی غلامی کا تعلق ہے ہماری اور اُن کی حالت ایک سی ہے بلکہ کہنا تو یہ چاہیئے کہ ہم سے بھی بُری ہے اس لئے کہ وہ یہاں تارکین وطن کی حیثیت میں رہتے ہیں۔ ہم اپنے ہندو اور مسلمان اہل وطن سے درخواست کریں گے کہ وہ پارسیوں کی مثال سے سبق لینے کی کوشش کریں اور ہر معاملہ میں اُنھیں کے نقش قدم پر چلیں۔

پارسیوں کے علاوہ ہم دنیا کی ایک اور قوم کی مثال پیش کر سکتے ہیں جس نے نہ صرف سیاسی طاقت اور سوراج بلکہ کسی وطن کے بغیر دنیا میں غیر معمولی ترقی اور اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ لوگوں نے اُن کی حکومت اور سوراج ان کا وطن اور گھر بار سب کچھ چھین لیا اور ایک عرصہ تک ان پر انتہائی ظلم و ستم ہوتے رہے ہیں باایں ہمہ آج یہودی دنیا کے سب سے زیادہ خوش حال، ترقی یافتہ، امن پسند اور روشن خیال باشندے ہیں۔ لارڈ ریڈنگ جو ہندوستان پر حکومت کر سکتا تھا یہودی ہے۔ مسٹر مانٹیگو جنھوں نے ہندوستانیوں کے سامنے حکومت خود اختیاری کے چند ٹکڑے پھینک دئے تاکہ وہ درندوں کی طرح اُن پر لڑیں یہودی تھے۔ غیر معمولی دولت اور فارغ البالی کے علاوہ دنیا میں ہر جگہ یہودیوں کی عزت کی جاتی ہے اور انھیں فخر ہے کہ وہ دنیا کے ہر گوشہ میں آباد ہیں۔ مشرق و مغرب اور قدیم و جدید دنیا میں کوئی جگہ اُن سے خالی نہیں۔ انگلستان، جرمنی، روس، ہندوستان، فلسطین اور ٹرکی میں سب کہیں اُن کی آبادی ہے۔ صرف مانچسٹر ہی میں چالیس ہزار یہودی ہیں۔ اُنھوں نے پوری دنیا کو اپنا گھر بنا لیا ہے۔ غالباً گھر سے بے گھر ہو کر وہ کسی قوم سے بُرے نہیں رہے۔ اگر سوراج کے بغیر ترقی اور فارغ البالی ناممکن ہے تو پارسیوں اور یہودیوں کو یہ دولت اور عزت کیسے میسر آئی؟

ہمارا یہ مطلب نہیں کہ سیاست ایک بیکار چیز ہے لیکن یقیناً اُسے اس قدر اہمیت حاصل نہیں جیسا کہ ہمارے نام نہاد رہنماؤں کا خیال ہے۔ علاوہ ازیں سوال یہ نہیں کہ کونسا طریق عمل بہتر ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ کون طریق مفید ہے۔ اپنی جگہہ پر سیاست نہایت مفید اور اچھی چیز ہے لیکن ہم اس کے مخالف ہیں کہ

کہ اس کے سامنے ہر چیز کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ خیال کہ یہ صرف انگریزی حکومت ہی جو بحیثیت مجموعی ہندوستانیوں میں نفاق وتعصب اور جہالت کا بیج بو رہی ہے تاکہ وہ "نفاق پیدا کرو اور حکومت کرو" کے رائج الوقت اصول پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھے سراسر غلط ہے۔ ہماری رائے میں یہ ایک ایسا ذلیل اور کمینہ الزام ہے جس کی واقعات مطلق تائید نہیں کرتے۔ ممکن ہے چند سرکاری افسروں سے اس قسم کی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہوں لیکن وہ انسان ہیں فرشتے نہیں۔ ایسے موقعوں پر سیاسی احتجاج اور مجاہدے بیشک جائز ہیں۔ اس خیال میں بھی حقیقت کا ایک شائبہ موجود ہے کہ چونکہ ہندوستان کی حکومت ایک غیر قوم کے ہاتھ میں ہے جس نے تمام تر ذمہ داریاں اپنے سر لے لی ہیں لہذا ہندوستانیوں میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ وہ اپنی حالت درست کر سکیں لیکن گذارش یہ ہے کہ اب تو کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرے گا کہ ہندوستانی ناقابل ہیں اور ان کی یہی ناقابلیت اُن کی غلامی کا باعث ہوئی۔ گویا ہندوستانیوں کی ناقابلیت نتیجہ ہے ایک غیر حکومت کی موجودگی کا اور ایک غیر حکومت کی موجودگی نتیجہ ہے ہندوستانیوں کی ناقابلیت کا۔ اندریں حالات سوال یہ ہے کہ ہمارے لئے کونسا طرزِ عمل سب سے بہتر اور مفید ہے تاکہ موجودہ خرابیوں کا انسداد کامیابی سے ہو سکے۔

جو لوگ بغیر کسی سوچ سمجھ کے اس بات کے لئے مضطرب ہیں کہ سب سے زیادہ سریع الاثر ذرائع اختیار کئے جائیں ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کامیابی کی راہ دیر آید درست آید کے اصول میں مضمر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اس بنیادی خرابی کی طرف توجہ کرنا چاہیئے جو ہماری تمام تکالیف اور پریشانیوں کی جڑ ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ آگے چل کر ہمیں انتشار اور پراگندگی سے نجات ملے گی بلکہ ہم اپنی حالت کو ٹھیک کر سکیں گے اور کونسلوں یا اسکولوں میں ضروری قابلیت پیدا کریں گے۔ ناممکن ہے کہ جمہوریت پسند انگریزی قوم اور اُس کی آئینی حکومت ہماری اُن کوششوں کو ہمدردی کی نظر سے نہ دیکھے۔

ہمیں اپنی سیاسی خرابیوں کی سب سے بڑی علت کو دور کرنے کے لئے اپنی تمام تر توجہ تعلیمی پراپیگنڈے پر رکھنی چاہیئے۔ اور اس کے لئے باہمی بین الملی تعلیم کے اس پروگرام پر عمل کرنا چاہیئے جس کی طرف ہم اشارہ کر آئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم نے اپنی تعلیم کے اس پہلو کو نظر انداز ہی نہیں کر دیا بلکہ اب تک

جو کوشش کی اس کی مخالف سمت میں کی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنی قومی زندگی کے ان عوارض کا بھی خیال رکھنا چاہئے جو سراسر ہماری اصلی مرض کا نتیجہ ہیں۔ ان عوارض سے چند دنوں کے لئے کو نسلوں اور کانگریس میں کام کرنے سے نجات مل سکتی ہو لیکن ہمیں اپنے اصلی مرض کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے اور اسی کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اگرچہ اس کا علاج کسی قدر طویل اور دقت طلب ہی کیوں نہ ہو۔

اب ہم اپنے سیاسی دوستوں سے رخصت ہوتے ہیں اور دوسرے اعتراضات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جو لوگ اس وقت قومی مدارس کو چلا رہے ہیں وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تمام امتیازات کو دور کر دیا گیا اور دوسری قوموں کے طالب علموں اور پروفیسروں کے لئے ایک سی آسانیاں پیدا کر دی گئیں تو کچھ عرصے میں ان کی تعداد ہم سے بھی جن کے خرچ پر اس قسم کے مدارس چل رہے ہیں بڑھ جائے گی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہیں گے کہ اگر مسلم یونیورسٹی پر ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا تو اس سے اس کی امتیازی حیثیت کا خاتمہ ہو جائے گا اور جس بنا پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی وہی باطل ہو جائے گی۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اول تو ایسا ہونا ناممکن ہو دوسرے اس قسم کے متعصبانہ امتیازات اور علحدگی ہمارے تعلیمی اصولوں کے مخالف ہو علاوہ ازیں اس وقت کو یوں بھی دور کیا جا سکتا ہے کہ دوسری قوم کے طالب علموں اور پروفیسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ ۲۵ یا ۳۰ یا تمام دوسری قوموں کے لئے ۴۰ یا ۵۰ سے کم فی صدی کا تناسب مقرر کر دیا جائے۔ اس سے منتظمین اور ارباب حل و عقد کے علاوہ اصلی جماعت کو ۶۰ فی صدی کی کثرت حاصل ہو جائے گی۔ کیمبرج اور دوسری انگریزی درس گاہوں میں بھی ہندوستانیوں کی کثرت کو روکنے کے لئے یہ امر قانوناً متعین کر دیا گیا ہو کہ ہر درس گاہ میں زیادہ سے زیادہ کس قدر ہندوستانی طالب علم داخل ہوں۔ اس سے ہر جگہ ہندی عنصر کے غلبہ کا انسداد ہو گیا ہو۔

جو لوگ نہایت جوش اور سرگرمی سے قومی مدارس کی بنا و ترتیب، ان کے نظم و نسق اور شہرت و ترقی میں حصہ لے رہے ہیں ان کے اعتراضات کا جواب یہ ہو کہ قومی مدارس کے وجود کے حقیقی اور غیر حقیقی محرکات ذیل کی چند باتوں میں سے کسی ایک پر مبنی ہو سکتے ہیں:-

(۱) مذہبی کٹرپن اور جنون و تعصب۔

(۲) مقابلہ، رشک و حسد اور رقابت۔

(۴) امداد ذات، کفایت بالذات اور خود اختیاری کا خیال

عام لوگوں کی ذہنی کیفیت یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے ماتحت انگریزی تعلیم ضروری ہے نہ کوئی شخص اس سے کنارہ کشی کر سکتا ہے نہ اس کے بغیر موجودہ حکومت کے ماتحت عزت کی زندگی ممکن ہے ان کا خیال ہے کہ سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کرنے سے جہاں خالص دنیوی تعلیم دی جاتی ہے اور جن کی سب سے پہلے بنا رکھی گئی تھی، لڑکے مذہب کے بارے میں بددل اور بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جن مسلمان لڑکوں نے سرکاری مدارس یا کالجوں میں تعلیم پائی ہے نہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں نہ نماز ادا کرتے ہیں۔ وہ ڈاڑھی منڈاتے ہیں، عماموں اور پاجاموں کے بجائے انگریزی لباس پہنتے ہیں اور پردہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مسلمان لڑکیاں جنھوں نے مشن اسکولوں میں تعلیم پائی ہے اکثر پردہ ترک کر دیتی ہیں اور عیسائی مبلغین کے ہاں جنھوں نے اول اول اس قسم کے مدارس قائم کئے پناہ لیتی ہیں۔ جن لڑکوں اور لڑکیوں نے اس قسم کی تعلیم پائی ہے وہ اپنے مذہبی احکام کے خلاف زبردست غفلت اور بری بری بے اعتدالیوں کے مرتکب ہوتی ہیں۔ قدیم وضع کے پکے مسلمان جب اس قسم کی باتوں کو سنتے ہیں تو تھرا اٹھتے ہیں۔ بےشک اس زمانہ میں انگریزی تعلیم ضروری ہے لیکن اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو سارے مسلمان کرسٹان اور نصاریٰ ہو جائیں گے۔ قدرتاً ان کے دل میں اس قسم کی خالص دنیوی تعلیم کے خلاف جس کو حکومت اور عیسائی جماعتوں نے رواج دیا ہے شدید نفرت اور حقارت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کا علاج مشکل نہیں۔ کیوں نہ اسلامی مدارس کھولے جاویں جہاں انگریزی تعلیم کے پہلو بہ پہلو دینیات اور قرآن کی تعلیم دی جائے اور اس طرح لڑکوں کو اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔ مشن اسکولوں کی موجودگی سے اس خیال کو مزید تقویت پہنچتی ہے اگر ان مدارس میں انجیل اور عیسائی دینیات کی تعلیم ہو سکتی ہے تو اسلامی مدارس میں بھی مذہبی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو سرکاری مدارس یا مشن اسکولوں میں کیوں بھیجیں جہاں کی تعلیم سے ان میں انگریزیت اور نصرانیت پیدا ہوتی ہے اور وہ پردہ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ ان کے طرز پر اسلامی مدارس قائم کریں اور ان میں نماز و قرآن، لمبی لمبی ڈاڑھیوں اور ڈھیلے پاجاموں کو رواج دیں۔ گویا اسلام کے اصولوں اور اس کے فرائض کی ادائگی کا پورا پورا انتظام کریں۔ جب عیسائی تبلیغی انجمنوں نے اپنے مدارس قائم کر رکھے ہیں تو ہم بھی اسلامی

مدارس قائم کریں گے۔ کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کے یتیم بچے اور بچیاں عیسائی یتیم خانوں اور مشن اسکولوں میں مارے مارے پھریں؟ ضرورت صرف ہمت کی ہے۔ اگر اس غرض کے لئے ایک انجمن قائم ہو جائے تو سارا کام نکل آئے۔ جاہل مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات اور عیسائیوں کے تبلیغی پروپیگنڈا کے خلاف ان کی نفرت و حقارت کے جذبات بھڑکا کر چند ہزار روپیہ جمع کر لینا کچھ مشکل بات نہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں ساری قوم کو یقین آجاتا ہے کہ قومی مدارس اور مذہبی تعلیم ہی ان کی خرابیوں کا واحد علاج ہیں۔ اگر اس تحریک میں کوئی نواب یا رئیس شریک ہو جائے تو پھر لاکھوں روپیہ جمع ہو جاتا ہے اور فوراً ایک اسلامی اسکول یا کالج قائم کر دیا جاتا ہے اور تھوڑے ہی دنوں میں کوئی سر سید مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھ دیتا ہے جس کی شہرت سے سارا ملک گونج اٹھتا ہے۔ کچھ لوگ خانصاحب ہو جاتے ہیں اور کچھ خان بہادر بعض کو آنریبل کا خطاب ملتا ہے اور آخر کار یہ ثابت ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کی نگاہوں میں عزت و وقار حاصل کرنے کے لئے بھی یہ ایک اچھا ذریعہ ہے۔

رفتہ رفتہ ان شاندار کامرانیوں اور قیمتی خیالات کا شہرہ ہندوؤں یا غالباً کسی آریہ تک پہنچتا ہے اس کی ذہنی کیفیت بھی ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ مسلمانوں کی۔ وہ کہتا ہے میری قوم کیوں پیچھے رہ جائے؟ کیا انگریزی حکومت کے ماتحت ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم عربی، فارسی، اردو اور اس قسم کی دوسری غلامانہ چیزوں سے جو اسلامی حکومت کی بدولت ہندوستان میں آئی ہیں آزادی حاصل کریں؟ کیا ہندوؤں کی حیثیت مسلمانوں سے کم ہے اور کیا سنسکرت تمام یورپین زبانوں کی ماں نہیں! جب ہندوؤں کے جذبات پیار (؟) کے بھڑک اٹھتے ہیں تو لاہور سے ایک نہایت فصیح البیان لالہ آتا ہے اور سہارنپور میں نہایت زور و شور سے اس طرح تقریر کرتا ہے "حضرات میں نے دیکھا ہے کہ ہندو لڑکے مسلمانوں کے مکتب میں میاں جی کے پاس جاتے ہیں اور بجائے اوم کے اپنا سبق بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرتے ہیں میرے بھائیو یہ نہایت شرم کی بات ہے (اب لالہ جی رونا شروع کر دیتے ہیں) بھائیو ہندو پتر اور پتریاں مشن اسکولوں میں جاتی ہیں اور سب سے پہلے انجیل کا سبق پڑھتی ہیں۔ کتنے ہندو یتیم بچے ہیں جو عیسائیوں کے ہاں چلے گئے ہیں۔ کیا میری آریہ جاتی کو ان باتوں پر شرم نہ آئے گی؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو قوم اب سات سمندر سے پار آنے والے فرنگیوں کے ہاتھوں خراب ہوگی۔ گویا مسلمانوں کے ہاتھوں ہمیں اب تک کوئی نقصان ہی نہیں پہنچا۔ میرے بھائیو کیا تم اسی طرح خواب غفلت میں سوتے رہو گے۔

اور اپنا فرض ادا نہیں کروگے ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہندو جاتی دنیا سے ناپید ہو جائے؟ حیف ہو
اگر ہمیں اب بھی شرم نہ آئے ۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں قومیت کے بہترین اصولوں پر ایک اینگلو
ویدک یا ڈی اے وی کالج قائم ہو جاتا ہے!۔

ہمارا خیال ہے کہ ہمارے قومی مدارس کی تہ میں جس قسم کی ذہنیت کام کر رہی ہے اس کو ذہن نشین
کرنے کے لئے ہمیں اور زیادہ مثالوں کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں، ان مدارس کا انحصار مذہبی
جذبات اور باہمی رقابت پر ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اس بارے میں ہمارے تمام دلائل غلط فہمی
پر مبنی ہیں اس لئے کہ تعلیم یافتہ جماعت نے مذہب کے متعلق جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ سرکاری سکولوں
میں تعلیم پانے کا نتیجہ نہیں بلکہ جدید تعلیم اور جدید سائنس اور فلسفہ کا اثر ہے ۔ اس معاملہ میں سکھ، ہندو
مسلمان ہر اسکول کی حالت ایک سی ہے ۔ ایک طالب علم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے وہ بھی
نماز میں ایسی ہی غفلت برتتا ہے جیسا کہ کسی گورنمنٹ کالج کا طالب علم ۔ یہاں کے طلباء بھی اسی طرح
ڈاڑھی منڈاتے ہیں اور ہیٹ اور سوٹ پہنتے ہیں ۔ ہر وہ شخص جو اسلامی مدارس کے اندرونی حالات
سے واقف ہے خوب جانتا ہے کہ نماز اور دینیات کی لازمی پابندی اور اُن کے فوائد کا وعظ انگریزیت
کے حامیوں کے لئے کہاں تک مؤثر ہوتا ہے ۔ بعینہٖ یہی کیفیت ڈی اے وی کالج سناتن دھرم کالج اور
دوسری ہندو درس گاہوں کے طالب علموں کی ہے ۔ وہ لوگ بھی اپنے چوکے اور چوٹی اور چھوت کو ترک
کر دیتے ہیں اور میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں ۔ دھوتی کو چھوڑ کر کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں اور
چھوت چھات کو بیکار سمجھتے ہیں ۔ تعدادِ ازدواج اور برہم چاریہ کے متعلق اُن کے خیالات
بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ کسی سرکاری یا مشن کالج کے طالب علم کے ۔ یہ لوگ بھی بیوہ عورتوں کے
کے نکاح کی حمایت کرتے ہیں اور تعدادِ ازدواج کو پسند نہیں کرتے ۔ راقم الحروف کو خالصہ کالج امرتسر کے
ایک سکھ ڈگری یافتہ کا حال معلوم ہے جس کو محض تعلیمی قابلیت کی بنا پر یورپ میں مزید تعلیم حاصل کرنے
کے لئے اپنی قوم سے وظیفہ ملتا تھا ۔ جوں ہی اُس نے تعلیم سے فراغت حاصل کی ۔ اس نے اپنی ڈاڑھی
کو خیرباد کہا، جرمنوں کی طرح بال ترشوائے اور پگڑی کو ٹیمز (Thames) کی نذر کر دیا
دوسری مرتبہ جو راقم الحروف نے اُسے دیکھا تو پہچان نہیں سکا۔

ابھی چند روز ہوئے ایک اسلامی زنانہ مدرسہ کے بوڑھے شریف مہتمم نے ایک مسلمان اُستانی

سے پوچھا "کیا تم قرآن پڑھ سکتی ہو" وہ تعلیم یافتہ خاتون براہ راست جواب دینے کی بجائے کہنے لگی "محض طوطے کی طرح قرآن مجید کو رٹ لینے سے فائدہ ؟" یہ سُن کر اس قدیم الخیال بزرگ کو بے حد صدمہ ہوا حالاں کہ ہر گریجویٹ کے نزدیک خواہ اس کا تعلق کسی ملک اور کسی قوم سے ہو مسلمان خاتون کا یہ جواب نہایت صحیح اور معقول تھا۔ دراصل یہ نتیجہ ہے موجودہ آزاد و لبرل تعلیم کا، ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ ہر ملک کی یہی حالت ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قدیم مذہبی تعصب اور تنگ نظری قائم رکھیں تو اس کی یہی ایک صورت ہے کہ آپ اپنے بچوں کو تعلیم نہ دلوائیں۔ یہ دقت کسی خاص مدرسہ میں پیش نہیں آتی خواہ وہ سرکاری ہو یا قومی بلکہ جدید تعلیم اور زمانہ کی علمی، اور ذہنی ترقی ہی کا یہ تقاضا ہے کہ ہمیں اس قسم کی دشواریاں پیش آئیں۔

لہٰذا اس کا علاج قومی کیا کسی مدرسہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنے لڑکے کو گھر میں بند رکھیے رات دن اس کی حفاظت کیجیے۔ نہ اخبار پڑھنے کی اجازت دیجیے نہ جدید ادب کی۔ اُسے کسی مدرسہ میں داخل نہ کرائیے، جدید دنیا اور اس کے مضر اثرات سے بالکل علیحدہ رکھنے کی کوشش کیجیے اور جہاں تک ہو سکے قدیم مذہبی عقاید اور تعصب کی تعلیم دیجیے۔ شاید اس سے آپ اپنے پرانے خیالات میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ کا بچہ محض احمق رہ جائے گا اسی وجہ سے محض مذہب کی بنا پر قومی مدارس کا قائم کرنا ایک بے کار عذر ہے۔

قومی مدارس کا ایک دوسرا محرک مقابلہ اور باہمی رقابت ہے۔ مقابلہ کے متعلق دنیا میں ہر شخص مختلف رائے رکھتا ہے۔ بہت سے وسیع الخیال آدمی مقابلہ کو مضر اور زبون سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اس کے بجائے اشتراک سے کام لینا چاہیئے۔ رشک البتہ مقابلہ کا ایک اچھا اور مستحسن پہلو ہے۔ بہر کیف اس امر پر سب متفق ہیں کہ قوموں کے اندر جارحانہ مقابلہ اور باہمی رقابت ہندوستانی قومیت کے لئے نہایت درجہ مضر اور دنیا کے بین الاقوامی تخیلات کے جن کا اب ہر جگہ دور دورہ ہے سراسر منافی ہیں۔ علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو باہمی حسد و رقابت، معمولی مقابلوں اور فرقہ وارانہ جھگڑوں میں کیوں ضائع کریں۔ اس سے ہمیں جو فائدہ پہنچتا ہے وہ نقصان سے بہت کم ہے۔ ہمارے سامنے اس سے زیادہ ضروری کام موجود ہیں۔ اگر ہمیں مقابلہ ہی کی ہوس ہے تو اہل مغرب ہی کا کیوں نہ کریں جس میں کچھ فائدہ بھی ہے۔ لیکن کیا ہم میں اتنی جرأت موجود ہے اور

ہمت پڑتی ہے کہ ہم ایسا کرسکیں؟

جہاں تک دوسری قوموں کے جارحانہ مقابلہ کے خلاف بقائے ذات اور قومی مفاد کی محافظت کا عذر پیش کیا جاتا ہے ہم یہ کہنے کی جرأت کریں گے کہ آپ کو ڈنڈے اور لاٹھی کے خلاف جسمانی حفاظت حاصل ہے اور ایک طاقتور حکومت کے ماتحت جیسی کہ انگریزی حکومت ہے آپ کو خاص خاص حالات میں تجارتی حفاظت بھی حاصل ہوسکتی ہے لیکن محافظت کے بہانے سے علمی اور ذہنی معاملات میں دوسروں سے ہمیں علیحدہ رہنے کی کوشش کرنا گویا اپنی علمی اور ذہنی قابلیتوں کا خاتمہ کرنا ہے۔ کسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تعلیمی معاملات میں اس قسم کی محافظت قائم کرے اس لئے کہ تعلیم ایک قسم کی ذہنی قوت ہے۔ اگر آپ کے عقائد اور مراسم و رواج سب سے اچھے ہیں اور ان میں کوئی قوت موجود ہے تو آپ اس سے کیوں گھبراتے ہیں کہ یہ دوسروں کے عقائد اور رسم و رواج سے جو آپ کے نزدیک نہایت پست واقع ہوئے ہیں مٹنے نہ پائیں؟ کیوں نہ آپ دوسروں کو قائل کردیں اور ان پر غلبہ حاصل کریں آپ باہمی ربط و ضبط، تصادم، موازنہ اور مقابلہ سے کیوں ڈرتے ہیں؟ بہتر ذہنی قوتیں اور بہتر تخیلات ضرور کامیاب رہیں گے۔ برعکس اس کے اگر آپ کا مذہب، آپ کا فلسفہ اور آپ کا طریق زندگی حقیقتاً پست واقع ہوئے ہیں اور آپ تنگ نظر ہیں تو یہ انتہا درجہ کی حماقت ہے کہ آپ دوسروں سے ربط و ضبط پیدا نہ کریں۔ اس ضرب المثل کو یاد رکھئے کہ جب تک اونٹ پہاڑ کی اوٹ میں نہیں آتا ہے وہ اپنے آپ کو دنیا کی ہر چیز سے بڑا سمجھتا ہے۔

ابھی ایک اور محرک باقی ہے جو قومی مدارس کے قیام میں مدد دیتا ہے۔ یہ محرک اگرچہ ہر طرح سے بجا اور درست ہے لیکن خود بانیان مدارس بھی اس کی صحیح ماہیت کو نہیں سمجھتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے تعلیمی معاملات میں ذاتی صلاحیت، خودمختاری اور استقلال پیدا کریں لیکن یہ چیزیں علیحدگی اور رقابت سے بالکل مختلف ہیں۔ بیشک ذاتی نشو و نما اور تربیت کی غرض سے کسی قوم کا تعلیم کی نظم و تربیت اور اس کے قیام و ترویج کو اپنے ہاتھ میں لینا تاکہ وہ دوسروں پر بھروسہ نہ کرے ایک ایسا مقصد ہے جس کی معقولیت سے ہمیں انکار نہیں لیکن یہ مقصد اس وسیع الخیالی سے بھی پورا ہوسکتا ہے جس کو ہم نے اپنے باہمی بین الملی تعلیمی نظام میں پیش نظر رکھا ہے۔ اگر تعلیمی معاملات میں ایک دفعہ ذاتی امداد اور استقلال کا اصول تسلیم

کر لیا جائے تو خدشہ ہے کہ اس کے ناجائز استعمال سے ہر شخص اور ہر قوم اپنے لئے ایک جداگانہ درس گاہ کا مطالبہ کرے گی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس اصول کو عمل میں لانے سے پیشتر اس پر کچھ حدود قائم کر دی جائیں ورنہ ہندوستانیوں کے نفاق و انتشار میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا اور ہندوستانی قوم کے نشو ونما کی ساری امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔

مغرب کی ذہین اقوام نے طالب علموں اور پروفیسروں کے باہمی تبادلہ کا ایک نظام قائم کر رکھا ہے۔ وہ دوسری یونیورسٹیوں اور دوسری قوموں کے قابل پروفیسروں کے لئے اعزازی تنخواہیں مقرر کرتی ہیں۔ اٹلی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ، جرمنی اور جاپان اور انگلستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان باوجود غیر معمولی مسافت کے اس قسم کے تعلقات قائم ہیں۔ بظاہر کوئی معقول وجہ ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس قسم کا تعلیمی تبادلہ غیر مفید ثابت ہوگا۔

ممکن ہے ہمارے باہمی بین الملی تعلیمی نظام پر یہ الزام بھی عاید کیا جائے کہ اس طرح نہ کوئی ہندو رہیگا نہ مسلمان۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر مذاہب کے باہمی تصادم اور موازنہ اور آزادانہ تحقیق اور تدقیق اور ایک دوسرے سے ربط وضبط کا نتیجہ یہی ہے تو آپ کو کہاں سے یہ حق پہنچتا ہے کہ آپ اپنی نئی نسل کے ضمیر پر خواہ مخواہ کچھ قیود عاید کر دیں۔ اس قسم کی تشکیک کوئی بری چیز نہیں۔ مولانا روم کہتے ہیں ؎

نہ ہندو نے مسلمانم نہ من گبرم نہ من ترسا
چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم

اور ظاہر ہے کہ مولانا روم نہ ہندوؤں میں رہتے تھے نہ فرنگیوں میں بلکہ وہ تو اسلامی دنیا کے قلب میں پیدا ہوئے تھے۔ صاف بات یہ ہے کہ ہم مذہبی تنگ نظری اور جنون و تعصب کے بیحد مخالف ہیں۔ ہم باہمی اختلافات اور فرقہ وارانہ حسیات کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں انھیں بڑھانا نہیں چاہتے۔ ہم ایک دوسرے سے میل جول اور اتحاد و اتفاق، اشتراک و تعاون اور مصالحت

وآہنگی کے حامی ہیں اور نفرت اور علیحدگی، انتشار و پراگندگی اور جنگ اور تعصب کے دشمن ہیں۔ اگر مذہبی تعصبات ہمارے راستہ میں حائل ہوں گے تو ہماری یہ خواہش ہوگی کہ اُن سے جس قدر جلدی نجات مل سکے بہتر ہے۔

ہندوستان کے اصلی باشندے اور اچھوت ذاتیں، مستبد اور کافر آریہ، فاتح اور ملکیش مسلمان، مکار عیسائی، غاصب فرنگی اور تارک وطن زرتشتی سب ہندوستان کے فائدے کرتے ہیں۔ یہ ایک امر واقعی ہے جسے ہر شخص کو تسلیم کرلینا چاہیئے۔ ہر ایک کو یہ کہنے کا حق حاصل ہو کہ میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور یہیں رہوں گا۔ ہندوستان میں آیندہ صرف امن و مصالحت باہمی رواداری، آزادانہ اختلاط اور وحدت فی الکثرت ہی کے اصول کامیاب ہوں گے ہم اکبر اعظم اور پریزیڈنٹ ولسن کے طرز عمل کے حامی ہیں، اورنگ زیب اور قیصر ولیم کی روش کو پسند نہیں کرتے۔

ہم ہندوستان کو سب سے زیادہ پست اور غلامانہ ملک کی بجائے (باہمی لڑائی جھگڑوں، ذات پات کے تعصبات اور مذہبی اور نسلی مناقشوں سے ہماری یہ حالت ہوگئی ہے) امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ کی طرح جہاں بہت سی مغربی نسلیں باہم مل رہی ہیں ایک متحدہ ملک دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس لئے کہ ہندوستان میں آریہ، شامی، عربی، ایرانی تاتاری اور یورپین گویا مغرب و مشرق کی سب تہذیبیں باہم مل کر ایک ہوجائیں گی۔ یہاں دنیا کا بلند سے بلند فلسفہ اور اس کے بلند سے بلند تخیلات اور مذاہب و اخلاق کے باہمی امتزاج سے ریاست ہائے متحدہ ہی ایک بلند تر قوم پیدا ہوگی۔ ایسی قوم جس کی نظیر آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوئی۔ بے شک ہندوستان ہی میں سب سے پہلے مستقبل کی صحیح بین الاقوامی سیاست اور سچی عالمگیریت پیدا ہوگی۔

ہم ایک ناقابل اختتام وقت تک تمام ان لوگوں سے بحث کرسکتے ہیں جو ہمارا نقطۂ نظر نہیں سمجھتے۔ اگر وہ وسیع الخیالی اور کشادہ دلی کی دولت سے محروم ہیں اور تعصب و نادانی نے اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے تو ہم کوشش کریں گے کہ جس قدر جلدی ہوسکے ان خرابیوں کو دور کردیا جائے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ مضمون ایسے تنگ نظر اور کوتاہ بیں انسانوں کے لئے نہیں لکھا گیا۔ ہم

اُن کے متعلق شاعر کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں۔

اگر تم میں کوئی ایسا آدمی موجود تو اُسے خوب اچھی طرح سے پہچان لو۔ اس کے لئے شاعر کے جذبات کبھی جوش میں نہیں آئیں گے گو اس کا خطاب بلند ہو اور اس کا مقام اونچا ہو اور اس کی دولت کی کوئی انتہا نہ ہو۔ باوجود ان خطابات اور طاقت کے اور اس لئے کہ اس احمق انسان نے اپنی تمام قوتیں اپنی ذات کے لئے صرف کردیں شہرت اس سے کنارہ کش ہو جائے گی اور وہ دہری موت مرے گا۔ اس کا بے معنی اور حقیر جسم پھر اس خاک میں مل جائے گا جس سے وہ پیدا ہوا تھا۔ نہ کوئی اس کے لئے روئیگا اور نہ کوئی اس کی عزت کرے گا اور نہ کوئی اس کی یاد میں ترانہ ریز ہوگا۔"

سید محمد یوسف

تعلیمی تجربات

ایک "مدرسۂ جدید" بلجیم میں

میرا ارادہ ہے کہ "تعلیم" کے صفحات میں ایک نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ("Une ecole nouvelle en Belge") "بلجیم میں ایک مدرسہ جدید" کا ترجمہ باقساط شائع کروں۔

اصل کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، فرانسیسی میں ہے لیکن اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے میں نے اپنے ترجمے میں دونوں نسخوں سے مدد لی ہے۔ البتہ جہاں اردو الفاظ کا صحیح مطلب سمجھانے کے لئے ضرورت پڑی ہے، ہاں فرانسیسی کے بجائے انگریزی لفظ خطوط وحدانی میں لکھ دیا ہے تاکہ ناظرین کو اس کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

یہ کتاب بلجیم کے ایک نہایت مشہور معلم اور ماہر تعلیم اے فاریاڈی واسکونسلو (A Faria de Vasconcellos) نے لکھی ہے اور اس میں انہوں نے اس مدرسہ کے مفصل حالات بیان کئے ہیں جو اس نے یورپ کی جنگ عظیم سے پیشتر قائم کیا تھا اور اس کو جنگ ہی کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ اول یہ حالات اس نے لیکچروں کی شکل میں جینوا کے مشہور تعلیمی ادارہ انسٹی ٹیوت روسو کے سامنے بیان کئے تھے۔ لیکن بعد میں ان کو کتاب کی شکل میں مرتب کرکے چھپوا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کتاب میں تخاطب کی شان پائی جاتی ہے، جیسے کوئی براہ راست ہم سے باتیں کر رہا ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ اس طرز اظہار کی وجہ سے کتاب کا مضمون زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آئیگا۔

اس مدرسہ کے قابل بانی کی کوشش یہ تھی کہ اس میں ان تمام اصولوں اور نظریوں کو عملی جامہ پہنایا جائے جو "تعلیم جدید" میں مضمر ہیں۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ تمام خیالات محض ہوائی نہیں بلکہ بہت قابل قدر عملی اہمیت رکھتے ہیں اور اگر ہم ان پر کاربند ہوں تو طلبا کی تربیت اور تعلیم بہت زیادہ مکمل اور قابل اطمینان طریقے سے ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ضمناً یہ معلوم ہوگا کہ وہ اصول کیا ہیں جو

موجودہ زمانے کی صحیح تعلیم کا طرۂ امتیاز ہیں۔ لیکن سب سے بڑا فائدہ اس کتاب کے مطالعہ کا یہ ہے کہ اس سے ان عملی مسائل پر روشنی پڑے گی جن سے اُستادوں کو آئے دن سروکار رہتا ہے اور جن پر زیادہ ضخیم اور ٹھوس تعلیمی کتابیں روشنی نہیں ڈالتیں کیونکہ وہ بالعموم اُصولوں اور نظریوں سے بحث کرتی ہیں۔ اور غریب اُستاد جو روزمرہ کی تعلیمی مشکلات سے تنگ آجاتا ہے ان پر غور کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کر سکتا۔ اس لیئے میرا خیال ہے کہ یہ کتاب خاص طور پر سکول کے استادوں کو اپیل کریگی۔

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ کتاب اس قسم کی ہے جیسی تعلیم پر پُرانی درسی کتابیں ہوتی تھیں جن کو ("Manuals of method") کہتے ہیں جن میں ہر موقع کے لیئے ایک ہدایت، اور ہر مضمون کے ہر حصّہ کے لیئے ایک صاف اور صریح طریقہ تعلیم دیا ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے ٹریننگ سکولوں اور کالجوں کے ہدایت یافتہ اُستادوں کا طریقہ عمل تیلی کے بیل جیسا ہو جاتا ہے۔ ان کی جدّت خیال، آزادی عمل، قوتِ فکر سب سلب ہو جاتی ہے۔ نہیں، اس کتاب میں تعلیمی نظریوں اور طریقوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھا گیا ہے۔ یعنی ہر طریقہ تعلیم کو بتاتے ہوئے یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ کس نظریہ یا عام اُصول کے ماتحت ہے اور ساتھ ہی ہر عام اُصول کو عملی کسوٹی پر جانچا گیا ہے تاکہ اس کی صحت اور صداقت کا یقین ہو سکے۔ اور یہی نقطہ نظر ہے جو ہمیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ یعنی عملی جزئیات میں اُصول کی کارفرمائی دیکھیں اور انھیں عملی جزئیات کے مشاہدہ اور مُطالعہ سے اُصول کو اخذ کریں۔ تعلیمی ترقی اس طریقۂ عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔

اِس کتاب پر جنیوا ایک نہایت مشہور مصنف اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر اڈولف فیریر Dr Adolphe Ferriere) نے ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں اُنھوں نے، علاوہ اس کتاب کی تعریف کرنے کے "مدرسہ جدید" کا مطلب سمجھایا ہے۔ یہ اصطلاح (L'Ecole Nouvelle) غالباً اُنھوں نے ہی تعلیمی مباحثوں میں رائج کی ہے اور وہ خود ایک ادارہ کے مہتمم ہیں جس کا نام (International Bureau of New Schools) ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام مدرسوں کو اشتراک عمل اور تبادلہ خیال کا موقع دیا جائے جو چند بنیادی اُصولوں کے ماتحت، اپنی اپنی روشنی کے مطابق، تعلیم کے طریقوں میں نیک مفید اور دور رس انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر تیس شرائط یا خصوصیات پیش کی ہیں جن میں سے (ان کے خیال کے مطابق) کم از کم پندرہ ہر اس اسکول میں

ہونی چاہئیں جس کو ان کا ادارہ "مدرسہ جدید" ماننے کے لیئے تیار ہوگا۔ اِن میں سے بعض زیادہ اہم شرائط یہ ہیں :۔

(۱) مدرسہ جدید کو ایک "تعلیمی معمل" ہونا چاہیئے یعنی اس میں نئے تعلیمی طریقوں اور اصولوں کی جانچ کرنی چاہیئے کہ آیا وہ اس قابل ہیں کہ عام تعلیمی نظام میں منسلک ہوسکیں یا نہیں۔ اس طرح سے "مدرسہ جدید" دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری مدارس کے لیئے پیش رو کا کام دیتا ہے اور اپنے تجربوں کے ذریعے اُن کو فائدہ پہونچاتا ہے۔

(۲) مدرسہ جدید میں طلبا کی رہایش کا انتظام ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک طلبا سکول کی پڑھائی کے علاوہ باقی وقت بھی تعلیمی اثرات کے اندر بسر نہ کریں ان کی تربیت مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس پر زور محض اس وجہ سے دیا جاتا ہے کہ اکثر اوقات گھر کے اثرات بچے کی تربیت میں معین نہیں ہوتے بلکہ اس پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔

(۳) مدرسہ جدید میں "دست کاری" (ہاتھ سے کام کرنا) مقررہ نصاب کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ طلبا کو کسی خاص پیشے کے لیئے تیار کیا جائے بلکہ یہ کہ وہ تمام معاشرتی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوں جو ہاتھ کا کام کرنے سے ہوتے ہیں۔ اس میں نجاری، کاشت کاری، جانوروں کی نگہداشت شامل ہیں۔

(۴) طلبا کو بہت سے اپنے پسند کیئے ہوئے مشاغل کے لیئے وقت دیا جاتا ہے۔ اور اُن کو کھُلی ہوا کی زندگی سے پوری طرح فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ اس لیئے سیاحت اور خیمہ زنی سکول کے باقاعدہ مشاغل میں شامل ہیں۔

(۵) مدرسہ جدید میں تعلیم کا انحصار خود طالب علم کی اپنی محنت، جستجو اور تجربہ پر ہے۔ اُستاد کا کام ہر چیز کو "بتانا" نہیں ہے۔ بلکہ طلبا کو مشکلات سے عہدہ برآ ہونے میں مدد دینا ہے۔

(۶) مدرسہ جدید میں طلبا کو فرداً فرداً، علٰحدہ علٰحدہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس میں وہ اپنی جدّت، اختراع اور اختلاف طبائع کو ظاہر کرسکیں۔ اس کے بعد وہ مل کر ایک دوسرے کے مطالعہ اور تفتیش و تحقیق سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

(۷) مدرسہ جدید میں ایک وقت میں بہت سے مضامین کا مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ توجہ کو چند مضامین پر

مجتمع رکھا جاتا ہے۔ دل چسپی کے لیئے طریقۂ تعلیم اور مطالعہ میں تبدیلی اور تنوع پیدا کیا جاتا ہے۔

(۸) ضبط و انتظام کے لیئے طلبا کی ایک "جمہوری حکومت" قایم کی جاتی ہے جس کے ذریعے وہ خود اپنے مسائل اور جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مدرسہ جدید میں استاد کی جبری حکومت بے محل ہے۔

(۹) طلبا میں مختلف قسم کے معاشرتی فرایض اور خدمات تقسیم کی جاتی ہیں تاکہ ان میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ ایک خاص جماعت کے فرد ہیں اور اس شرکت کی وجہ سے ان پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

(۱۰) سزا اور انعام ڈرانے اور تحریص کے لیئے استعمال نہیں کیئے جاتے۔ سزا اس لیئے دی جاتی ہے کہ آیندہ کے لیئے بچہ زیادہ عمدہ کام کرکے دکھائے نہ کہ استاد کا غصہ دور کرنے کے لیئے۔ اور انعام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جن بچوں کی طبیعت میں "تخلیق" کا مادہ ہے انھیں اس کے نشو و نما کا موقع دیا جاتا ہے۔

(۱۱) بچوں میں مقابلہ اور مسابقت کا انتہائی جذبہ پیدا نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ اشتراک عمل کو روکتا ہے۔ اس لیئے ان کے کام کا مقابلہ زیادہ تر ان کے اپنے پچھلے کام سے کیا جاتا ہے نہ کہ دوسروں کے کام سے۔

(۱۲) مدرسہ جدید کا ایک ایسا ماحول ہونا چاہیئے جو حُسن سے معمور ہو، جو اپنے گرد و نواح کی خوبصورتی، دست کاری کی تعلیم وغیرہ کے ذریعے اُن میں احساس حُسن کو بیدار کرے۔

ان شرائط کو پڑھ کر پہلا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نہایت صاف اور صریح چیزیں ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے مدرسوں کی تعلیم اور اُس کے نظام زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی شرط یا اُصول ایسا نہیں جس کو ہم بالعموم نظر انداز نہیں کرتے یا عملاً اس کے بالکل مخالف نہیں ہوتے۔ بلجیم کے اس "مدرسہ جدید" کا حال پڑھ کر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ کس طرح ایک اُستاد جو واقعاً بچوں کی مکمل اور صحیح تربیت کا خواہاں ہو، ان اُصولوں پر عمل کرکے مدرسہ کو صحیح معنوں میں ایک خوش گوار، مفید اور اخلاقی ماحول بنا سکتا ہے اور ان کی زندگی میں ان تمام عناصر اور صلاحیتوں کی ہم آہنگ تربیت کرسکتا ہے جو آیندہ چل کر ان کو دنیا میں درکار ہونگے۔

ہم ڈاکٹر اڈولف فیریر کے نہایت شکرگزار ہیں کہ انھوں نے بکمال فیاضی ہمیں اس کتاب کا

(جس کے مالک وہ ہیں) ترجمہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی، لیکن نہایت قابلِ غور کتاب " Transformons L'ecole " (مدرسے میں انقلاب) کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت دی۔ انشاء اللہ اس کتاب کا ترجمہ بھی موزوں وقت پر ہدیۂ ناظرین ہوگا اور وہ اندازہ لگا سکیں گے کہ زیادہ ترقی یافتہ یعنی تعلیمی نقطۂ نظر سے ترقی یافتہ ممالک میں فلسفۂ تعلیم اور منہاجِ تعلیم نے کس درجہ ترقی کی ہے۔

بابِ اوّل

ماحول۔ جسمانی تعلیم

مجھے سب سے پہلے روسو انسٹی ٹیوٹ (Institute Rousseau) کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ آج کل کی صورتِ حال کا خیال کرتے ہوئے میرے استقبال کا مجھ پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اگرچہ جنگ کی مصیبت چھ مہینے سے جاری ہے لیکن مجھے مشکل سے یقین آتا ہے کہ میں بلجیم (Belgium سے دُور اپنے سکول سے جُدا، آپ لوگوں کے درمیان ہوں جن لوگوں نے بلجیم میں بچوں کی تعلیم کا کام اپنے ذمے رکھا تھا ان کے لیئے یہ حادثہ بہت جانکاہ ہے۔ کیونکہ ان کی تمام اُمیدیں باہمی معاہدوں اور بین الاقوامی مسائل کے پُرامن فیصلے پر لگی ہوئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ امن وامان کی محبت اور معاہدوں کا احترام ایک اٹل چیز ہے۔ اور اُنھوں نے ان کو حُبِّ وطن کی تعلیم کی بنیاد قرار دے رکھا تھا۔ اُنھوں نے بچّوں کو سکھایا تھا کہ سادگی اور صفائی کے ساتھ اپنے وطن سے محبّت کرو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہم سب ایک مشترک وطن میں حصّہ دار ہیں۔ ہم کہتے تھے کہ یہ وطن بہت وسیع ہے، اس کی حدود دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن کس قدر زندہ اور جیتا جاگتا ہے یہ ملک جو "انسانیت" کا ملک ہے جو تمام قوموں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے، جہاں ہر قوم اپنی مخصوص فطرت کے مطابق کام کرتی ہے تاکہ ہم سب آزادانہ طور پر زیادہ مستحکم اخوت، بھلائی اور انصاف کی جانب بڑھے چلیں! ہم ان کو سمجھاتے تھے کہ پہلے زمانہ کی طرح اب انسان کا رویہ دوسرے انسانوں کی جانب بھیڑیئے کا سا نہیں رہا۔ چونکہ اب وہ ترقی کے کارناموں اور

حسن وخوبی کے امکانات کی دولت اس کے ہاتھ آگئی ہے۔ وہ زیادہ بلند چیزوں کی جانب نظر اٹھا سکتا ہے اور روح کی بیش بہا قدروں کو حاصل کرنے کے لیے خود کو وقف کر سکتا ہے۔ لیکن حال کے واقعات نے گویا ہمیں جھٹلا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں آج آپ صاحبان کے درمیان موجود ہوں۔ لیکن ہمارا ایمان متزلزل نہیں ہوا، کیونکہ انسانیت کی روح انسانوں اور قوموں سے بلند ہے اور قایم رہنے والی ہے۔ باوجود تمام خوفناک واقعات اور مظالم کے، وہ سدا روشن مشعل جو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے ہوئے ہمارے رستے کو منور کرتی ہے گل نہیں ہوگی۔ اگر یہ تمام باتیں ہمیں دوبارہ پیش آئیں، تو بلجیم پھر یہی طریقۂ عمل اختیار کریگا اور بلجیم کے اُستاد پھر اپنے شاگردوں سے کہیں گے: "خطرہ کی اس گھڑی میں کسی چیز سے خوف نہ کھاؤ۔ انسان پر، اس کی فطرتی دیانتداری پر اور اس کی روز افزوں نیکی پر اپنا عقیدہ قایم رکھو۔" بلجیم کا طرز عمل اس قدر عمدہ اور شریفانہ اسی وجہ سے ہے کہ اُس کو انسان کی نیکی پر ایمان ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی نجات کے لیئے کوشش کرنا رائگاں نہیں جاتا۔ اِس نے اُن اخلاقی قوتوں کے اجتماع کی مثال قایم کردی ہے جن کے حصول کی تمنا ابتدائے عالم سے انسان کو رہی ہے۔ اس نے روحانی زندگی کے مشترک ترکے کو محفوظ اور قایم رکھا ہے۔ بلجیم کے نوجوانوں کی صلح پسند تعلیم نے، جیسا کہ ظاہر ہے، اُن کی قوت مدافعت کو کمزور نہیں کیا۔ نہیں، برعکس اس کے چونکہ اس تعلیم نے اس شرف انسانی کا اعزاز اور رتبہ ہمارے ذہن نشیں کیا ہے جو انسان میں ہے ہم بالکل نڈر ہو کر ان قدیم مظالم کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے ہیں جو سرحد کی دوسری جانب کی جنگی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔

سکول کا قیام

اب میں اس لکچر کے اصلی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں یعنی بلجیم میں ایک "مدرسہ جدید"۔ میرے خیال میں بہت زیادہ اچھا ہوتا اگر آپ بچشم خود اس سکول کو دیکھ سکتے کیونکہ مدرسہ کا صحیح حال اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب اُس کو کام کرتے ہوئے دیکھا جائے۔ لیکن اپنے بیان کو واضح کرنے کے لیئے میں اکثر سکول میگزین میں سے، جو خود طلبا نکالتے تھے، بعض باتیں نقل کرونگا۔ اس میں وہ اپنے مشاغل کا حال بیان کرتے ہیں، طریقہ تعلیم پر بحث کرتے ہیں، ٹرم کے بڑے بڑے واقعات کا ذکر کرتے ہیں اور اپنی سیاحتوں، قابلِ ذکر تجربوں اور مباحثوں وغیرہ کا حال لکھتے ہیں۔ اس سے آپ کو سکول کے مشاغل کا حال معلوم ہو جائے گا۔ اور بہت حد تک خود طلبا کی زبانی معلوم ہوگا کہ ہم اپنا کام کس طرح کرتے تھے۔

سکول اکتوبر ۱۹۱۲ء میں قایم ہوا تھا اور جس وقت اس کو بند کرنا پڑا ہم تیسرے سال کے آغاز کا امید اور اطمینان کے ساتھ انتظار کر رہے تھے، یہ پہلا مدرسہ جدید تھا جو بلجیم کے دیہات میں جاری کیا گیا اس نے یقیناً ایک اہم ضرورت کو پورا کیا، کیونکہ شروع ہی سے اس میں لوگوں نے ایک شفقت آمیز دلچسپی کا اظہار کیا جو اس کی ترقی کے لیئے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ شروع میں نو۹ طالب علم تھے لیکن ڈیڑھ ہی سال میں پچیس طالب علم ہو گئے تھے۔ جب تک مناسب عمارت تعمیر نہ ہوئی تھی، مجھے پرانی عمارت کو بڑھانا پڑا تاکہ ۱۹۱۴ء میں ان نئے طلبا، کو داخل کر سکوں جن کا نام گزشتہ سال ایسٹر کی چھٹیوں میں لکھا جا چکا تھا۔

میں نے بلجیم میں مدرسہ جدید قائم کرنے کا ارادہ کسی قدر پس و پیش کرنے کے بعد کیا۔ بلجیم میں مذہبی اور سیاسی مخالفتوں کی سختی کی وجہ سے تعلیمی مسائل پر بہت تلخ مزاجی سے بحث کی جاتی ہے۔ ممکن تھا کہ ایک ایسی سکیم کو پورا کرنے کی کوشش لوگوں کو محال معلوم ہوئی ہو یعنی ایک ایسے مدرسے کا قیام جو فرقہ وارانہ مخالفت سے بالاتر ہو۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ ایک وسیع "انسانی" بنیاد پر تعلیم دینے کی کوشش ہو، ایسی تعلیم جو ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب کے خلاف ہو۔

ہماری خواہش تھی کہ ہم پورے طور پر اس خیال کی تکمیل کریں کہ مدرسہ بچے کے لیئے ہونا چاہیئے "افادیت"[1] کی روز افزوں قوتوں کے درمیان اپنی "عینیت"[2] کو ظاہر کرنے اور یہ دکھانے کے لیئے کہ سکول کا اصلی مقصد وسیع ترین معنوں میں تربیت دینا ہے۔ ہم نے "مربیوں" کی ایک انجمن قایم کی جو ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جن کی زندگی اور کارنامے ہمارے مقاصد کی ضمانت کر سکیں۔

اساتذہ کا تقرر جو کہ ہمیشہ ایک نازک اور مشکل معاملہ ہوتا ہے نہایت عمدہ طریقے سے طے ہوا۔ میں نے دوستوں کا ایک ایسا گروہ جمع کر لیا جن کی دانشمندی، وفاداری اور نفسیات اطفال کے علم کی وجہ سے میں سکول کا پروگرام عمل میں لا سکا۔ بیرجس (Bierges)، کے استادوں کی جماعت میں سترہ اشخاص تھے جن میں دو کاریگر، ایک لوہار، ایک نجار شامل تھے ان کا ذکر آگے آئیگا۔

جائے قیام

مدرسے کے لیئے مناسب جائے قیام کا انتخاب بہت اہم مسئلہ ہے۔ گبرل کمپرے (Gabriel Compayré

نے ایک کتاب میں جو انھوں نے میرے اس تعلیمی تجربہ کے متعلق لکھی ہے، بہت ٹھیک کہا ہے کہ مدرسہ جدید کی کامیابی کی پہلی شرط ایک مناسب محل وقوع کا انتخاب ہے۔ ہمارا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ ہم برابان Brabant میں ہیں جہاں کی زمین کھلی ہوئی ہے۔ ڈائل (Dyle) کی وادی جو ہمارے نیچے ہے اور درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں جو ہمارے قرب وجوار میں ہیں ایک نہایت خوبصورت مرقع بناتی ہیں۔ ہم ایسے شاندار منظر پر تو فخر نہیں کر سکتے جیسا کہ سوئٹزرلینڈ کا ہے جہاں آج کل اتنے بہت بلجیم کے لوگ ایک مصیبت ناک زمانے کے بعد اپنی قوت اور امیدوں کی پرورش کر رہے ہیں لیکن بیرجس کا محل وقوع اس قدر پرسکون، آرام دہ اور خوش گوار ہے کہ وہاں کی ہر چیز سے دماغی سکون، خوش مزاجی، پر امن محنت اور زندگی کی خوشی مترشح ہے۔ یہ چیزیں بچہ پر بہت عمدہ اثر ڈالتی ہیں جو ان کی جسمانی اور دماغی ترقی کے لیئے موزوں ہے۔ چوں کہ یہاں کی زندگی خوش اور بشاش ہے، اس لیئے دماغ پرسکون رہتا ہے اور اس سے اپنی پرورش کے لیئے غذا حاصل کرتا ہے۔

یہ کاشتکاری علاقہ ہے۔ اس لیئے بچے بخوبی مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ سائنس کو زراعت میں کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے گردبڑے بڑے عمدہ کھیت ہیں۔ قریب ہی گمبلو (Gambloux) ہے جہاں کا زراعتی کالج جائز طور پر یورپ کے بہترین کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ملک کے بعض بڑے بڑے صنعت وحرفت کے مرکز بھی ہیں ان کی وجہ سے ہم اکثر اور باقاعدہ طور پر کانوں اور کارخانوں کا معائنہ کرسکتے ہیں۔ اور کام اور کام کرنے والوں کے اس وسیع نظام کا علم حاصل کرسکتے ہیں جس کا اظہار بلجیم کے مشہور سنگ تراش (Constantin Meunier) نے نہایت موثر طریقے سے اپنے سنگ مرمر کے عظیم الشان مجسمے میں کیا ہے جس میں اس نے محنت، جرأت، ایثار اور صبر کے ساتھ مفید کام کرنے کا نقشہ دکھایا ہے۔ میں اپنے آیندہ لکچر میں ان معائنوں کا حال بیان کرونگا اور بتاؤنگا کہ ان کے لیئے طلبا کس طرح تیاری اور انتظام کرتے ہیں۔

مزید برآں کیونکہ ہم برسلز (Brussels) کے قریب ہیں اور وہاں تک ریل کے سفر میں صرف پون گھنٹہ لگتا ہے اس لیئے سکول ان تمام باتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو ایک بڑے شہر میں ہوتی ہیں۔ ہم باقاعدگی کے ساتھ عجائب خانوں اور تصویروں اور مجسموں کی بڑی بڑی نمائشوں میں شریک ہوسکتے ہیں۔ فنون لطیفہ کی ترقی سے باخبر رہ سکتے ہیں۔ موسیقی کے جلسوں میں جاسکتے ہیں۔ اور تعلیمی

لحاظ سے مفید ناٹکوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان تھیٹروں (Malınecs) کو جو فرانس کے مستند ناٹکوں اور غیر ملک کے بڑے بڑے ڈراما نویسوں کی تصانیف کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ ناٹک گویا ادب کا ایک عملی نصاب ہیں اور اپنے اپنے مضامین پر طلبا کے خیالات کو زیادہ صاف اور مستحکم بناتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم بعض اونچی جماعتوں کے طلبا کو یونیورسٹی لے جاتے ہیں تاکہ وہ ایسے لکچر سنیں جو اُن کی سکول کی پڑھائی کو صاف اور واضح تر کردیں۔ مثلاً ہفتہ کے روز شام کو پانچ بجے برسلز کی نئی یونیورسٹی میں مشرق اقصیٰ کے آرٹ پر لکچر ہوا کرتے تھے۔ ہمارے کئی طالب علم ان لکچروں میں شریک ہوئے۔ چونکہ ہمارے ہاں اس وقت انھیں ملکوں کی تاریخ اور جغرافیہ پڑھایا جا رہا تھا۔

ان تفصیلی امور سے آپ صاحبان کو معلوم ہوگیا ہے کہ مدرسہ کا محل وقوع نہایت درجہ اہم چیز ہے۔ دیہات کی زندگی کا لازماً یہ مقصد نہیں کہ زندگی تنہائی میں بسر ہو یا ٹالسٹائے (Tolstoy) کی طرح ان بڑے بڑے تعلیمی فوائد کو ترک کردیا جائے جو بڑے شہروں سے حاصل ہوتے ہیں۔ میں اس امر پہ زور دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں بہت سے ایسے لوگوں سے ملا ہوں جن کا خیال ہے کہ قدرتی مناظر کی طرف یہ رجوع، جو مدارس جدید کی تحریک میں مضمر ہے اس لیئے قابل قدر ہے کہ ان میں کسی خاص تصوّف اور تنہائی کی شان پائی جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہروں کی متعدی شیطنت سے چھٹکارا ہے جو پھیلتی جاتی ہے۔ یہ یقیناً اچھی بات ہے کہ بچوں کی پرورش دیہات میں کی جائے۔ لیکن بچوں کو ان مفید اثرات سے محروم رکھنا جو شہروں کی زندگی سے حاصل ہوتے ہیں قابل افسوس بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ سکول کو کسی بڑے مرکز سے بہت دُور قایم رکھنا ایک صریح غلطی ہے۔ کیونکہ سکول کبھی بذات خود کافی و شافی نہیں ہوسکتا خصوصاً جب چودہ پندرہ برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عمر کے طلباء موجود ہوں۔

علاوہ اس کے ایک اور فائدہ جس کو یاد رکھنا چاہیئے یہ ہے کہ ایسی جگہوں پر پروفیسروں اور مقرروں کو بُلانے کا انتظام ہوسکتا ہے اور اس کے ذریعے مدرسے کے علمی مشاغل کو ترقی دینا ممکن ہے۔ اس لیئے میرے نزدیک بہترین تجویز یہی ہے کہ اپنے جدید مدارس کو دیہات میں قایم کرو لیکن وہ کسی بڑے شہر سے بہت دور نہ ہوں۔

سکول کی عمارت

بیرحس کے مدرسے میں ایک مکان طلباء کے رہنے کے لیئے ہے۔ دو علیحدہ عمارتیں پڑھائی کے لئے

ایک کھیت اور بہت سی متعلق عمارات ان کے گرد باغ چمن اور قابل کاشت زمین ہے۔ یہ تمام زمین قریب چودہ ایکڑ کے ہے اور ہماری تمام ضروریات کے لیئے کافی ہے۔

بورڈنگ ہاؤس میں سونے اور کھانے کے لیئے کمرے ہیں ڈرائنگ روم ہے اور غسل خانے۔ یہ گویا ایک گھر ہے جہاں گھر کی سی زندگی بسر ہوتی ہے۔ یہ بالکل خاموش اور پرسکون جگہ ہے اور آمد و رفت کے اس مسلسل شور و غل سے آزاد جو ان سکولوں میں ہوتا ہے جہاں پڑھائی اور رہنے کے کمرے ایک ہی عمارت میں ہوتے ہیں۔

میرے خیال میں یہ علیحدگی بالکل لازمی ہے نہ صرف تقسیم عمل کے نقطۂ نظر سے جو اس طرح ہو سکتی ہے بلکہ اس لیئے بھی کہ اس علیحدگی کی وجہ سے اس تمام انتظام میں گھر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر مدرسہ بہت چھوٹا ہو تو اس مکمل علیحدگی کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے لیکن میری رائے میں جوں ہی طالب علموں کی تعداد بیس یا تیس سے زیادہ ہو یہ علیحدگی لازمی ہو جاتی ہے۔ اس میں بے شمار فوائد ہیں۔ نظم و انتظام صفائی، جگہ، نقل و حرکت کی آزادی، اطمینان غرض ہر لحاظ سے مفید ہے۔ کیونکہ معاشرتی زندگی میں ہمیشہ جزوی اختلافات، چھوٹی چھوٹی دقتیں پیدا ہوتی ہیں جو ماحول کی کش مکش کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس لیئے بچے کو گھر کے خوش گوار سکون میں پناہ حاصل کرتے خوشی ہوتی ہے۔

پڑھائی کی دو عمارتوں میں سے ایک خاص طور پر کارخانے Workshop ، آرٹ کے کمرے اور معملوں (Laboratories) کے لیئے مخصوص ہے۔ دو کمرے لوہار اور بڑھئی کے کام کے لیئے ہیں۔ ایک معمل فزکس اور کیمسٹری کے لیئے۔ جلد بندی، گتے کے کام اور ڈھالنے اور نقشہ کشی کے لیئے علیحدہ علیحدہ کمرے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی مختلف قسم کے کاموں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا مناسب ہے۔ اگر ہم اپنے طلباء کو بالکل آزادی دیتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں پڑھیں تو ہمیں اس بات کا انتظام کرنا چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کے کام میں مداخلت نہ کریں۔ اگر کارخانے اور آرٹ کے کمرے پڑھائی کے کمروں سے علیحدہ اور دور رہوں، جیسے وہ ہیرجس میں ہیں، تو طلباء اپنے اپنے شغل کو جاری رکھ سکتے ہیں اور ان کے کام سے ان طلباء کے مطالعہ میں خلل نہیں پڑیگا جن کو اپنے کام کے لیئے خاموشی، سکون اور مجتمع توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر چاروں طرف بچوں کا غل ہو جو دست کاری میں مصروف ہیں تو توجہ کی یک سوئی مشکل ہو جاتی ہے۔

دوسری عمارت ہمارے احاطہ کے پرلے سرے پر ہے اور رہنے کے مکان سے کئی منٹ کی فاصلے پر ہے۔ اس میں چار پڑھائی کے کمرے ہیں۔ ایک آرٹ کا کمرہ، ایک معمل مطالعہ فطرت (Natural Science) کے لیئے [خوردبین سے کام، چیر پھاڑ، ذخیرے Collections اور بری اور بحری جانوروں کا چڑیا خانہ (Terrariums and acquariums] عمارت کے گرد باغ اور جنگل اور کاشت کی زمین ہے۔

غرض ہمارے طالب علم نہایت فرحت افزا گرد و نواح میں رہتے ہیں۔ تازہ ہوا، کھلی جگہ، آزادی و روشنی یہ بہترین ماحول ہے جس کی وجہ سے قوت اور صحت میں خود بخود بے تکان ترقی ہوتی ہے۔ دیہاتی زندگی کے اس عمدہ اثر کو باقاعدہ جسمانی تعلیم کے ذریعے مستحکم کیا جاتا ہے۔

حفظِ صحت

تربیت جسمانی کے لیئے سب سے زیادہ ضروری چیز باقاعدگی ہے جس کی مدد سے جسم کی خوبصورتی اور طاقت زیادہ ہو جاتی ہے۔

(ا) سب سے پہلے نیند کو لیجئے۔ بچے عمر اور موسم کے لحاظ سے ۹ گھنٹے روزانہ سے ۱۱ گھنٹے تک سوتے ہیں۔ سونے کے کمرے فراخ ہیں اور تمام سال ہر موسم میں لڑکے کھڑکیاں کھول کر سوتے ہیں۔ لیکن اس میں کسی قسم کا خطرہ نہیں کیونکہ ہمارے ہاں کمروں کو گرم رکھنے کا انتظام ہے اور گرم پانی کے نلوں (Radiators) کے ذریعے کمرے خشک اور گرم رکھتے ہیں۔ علاوہ بریں بچوں کو سردی برداشت کرنے کی اس قدر عادت ہو گئی ہے کہ گزشتہ جاڑے میں ان میں سے سب خیموں میں سوئے باوجود یکہ رات کو خوب پالا پڑتا تھا۔ جن لوگوں کو رفتہ رفتہ اس کی عادت پڑ جاتی ہے اُن کو اس سے زیادہ کوئی خوشی نہیں ہو سکتی کہ وہ خیمہ میں رات بسر کریں۔ اس میں رومان (romance) اور بہادری کا عنصر ہے۔

ہمارے ہاں ہر کمرے میں چار یا پانچ بستر ہوتے ہیں اور ہر کمرہ میں چھوٹے اور بڑے طالب علم اکھٹے رہتے ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے ان کے ماحول میں باہمی تعلقات زیادہ خوش گوار ہو جاتے ہیں۔ دیواروں کو تصویروں اور نقوش (engravings) سے سجایا

جاتا ہے جو کمرے میں رہنے والے طالب علم خود بناتے ہیں یا منتخب کرتے ہیں گرمی کے زمانے میں کھانے کے بعد ہمیشہ قیلولہ کا معمول ہے۔ جب بلوغ اور جسمانی نشوونما کا زمانہ ہو تو بچے کو دن میں کچھ وقت آرام کے لئے ضرور ملنا چاہیئے۔ اس عادت کی وجہ سے سیدھا چلنے میں آسانی ہوتی ہے۔

(ب) دن میں پانچ وقت کھانا ہوتا ہے۔ کیونکہ علاوہ کھانے کے معمولی اوقات کے دس بجے ایک ہلکا لنچ دیا جاتا ہے رات کے کھانے پر گوشت نہیں دیا جاتا۔ صرف انڈے، دودھ کی چیزیں اور نباتی غذا ہوتی ہے۔ ہم کسی قسم کی شراب استعمال نہیں کرتے کھانے کی زیادہ تر چیزیں ہماری ہی زمین میں طلباء کی محنت سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ خود زمین بوتے ہیں، کھاد ڈالتے ہیں، بیج پھیلاتے ہیں اور فصل کاٹتے ہیں۔ اور خود ہی جانوروں کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں جن میں گائیں مرغیاں، خرگوش، کبوتر اور سور وغیرہ شامل ہیں۔

طلباء نے ایک "انجمن امداد باہمی Co-operative Society" قایم کر رکھی ہے۔ یہ سوسائٹی نہایت سنجیدگی کے ساتھ کاروباری طریقے سے مدرسے کی زمین کو استعمال کر رہی ہے۔ ہم انڈے دودھ اور مکھن اسی سے خریدتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک بڑے "کمرۂ طعام" کے بجائے دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے کھانے میں گھر کا سا لطف ہے۔ اسی خیال سے ہم نے ان میں چھوٹی چھوٹی میزیں رکھی ہیں جن پر چھ یا آٹھ طالب علم کھانا کھا سکتے ہیں۔ کھانے کے دوران میں گفتگو آزادی کے ساتھ ہوتی ہے اور بچے خود کھانا اپنی پلیٹوں میں نکالتے ہیں۔ یہ آزادی لازمی ہے کیونکہ اسی طرح وہ اپنی آزادی سے ٹھیک طور پر فائدہ اٹھانا سیکھ سکتے ہیں۔ اور ان کو کھانے کے عمدہ آداب کی تعلیم ہوتی ہے۔ علاوہ بریں اسی طرح یہ وقت ہنسی خوشی سے گزر جاتا ہے۔ طبیعت بحال رہتی ہے اور ہضم میں آسانی ہوتی ہے۔

(ج) سوائے اس حالت کے جب ڈاکٹر ممانعت کر دے، لڑکے تمام سال صبح کو ٹھنڈے پانی میں نہاتے ہیں جب موسم معتدل ہو جاتا ہے تو سکول کے تالاب سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مفید ورزش تیسرے پہر کو کی جاتی ہے۔ پانی سے نکل کر طلباء کچھ دیر تک قریب کے میدان میں ننگے ہو کر دھوپ کا غسل کرتے ہیں وہ دن میں کئی دفعہ منہ ہاتھ دھوتے ہیں اور شام کو سونے سے پہلے زیادہ اہتمام کے ساتھ صفائی

کی جاتی ہے۔ مُنہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے جاتے ہیں، اور دانت صاف کیئے جاتے ہیں۔ اس معمول سے صفائی اور حفظ صحت کی عادتیں پڑ جاتی ہیں۔

(د) مزید برآں، تربیت جسمانی، حواس کی تندرستی اور مکان کی صفائی وغیرہ کے متعلق عملی سبق دیئے جاتے ہیں جو مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں ان سبقوں سے جو ہمارا ڈاکٹر ہر ہفتے دیتا ہے طلبار کو وہ اُصول زیادہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتے ہیں جو ایک صحت مند اور طاقت ور زندگی کے لیئے ضروری ہیں ان کو ان اُصول پر کاربند ہونے کا طریقہ بھی آجاتا ہے۔ میں ضمنًا یہ ذکر بھی کردوں کہ طلبا ہی میں سے ہمیشہ ایک طالب علم "ڈاکٹر" بنتا ہے۔ اس عہدہ سے نہ صرف ایج، اخوت اور ذمہ داری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ اس بات کا موقع ملتا ہے کہ جو باتیں حفظانِ صحت کے سبق میں سیکھی ہیں اُن کو عمل میں لایا جائے۔

"فرسٹ ایڈ" (First aid) کے افسر کو طلباء اپنے میں سے ایک ماہ کے لیئے مقرر کرتے ہیں۔ اسے ہر قسم کی چوٹوں اور بیماریوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ سکول کے دواخانہ کا صدر ہوتا ہے اور حفظانِ صحت کے لیئے مختلف ذرائع اختیار کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس کام کو کرنے کے لیئے علاوہ مختلف قسم کی بیماریوں کو شناخت کرنے کی قابلیت کے اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کا علاج دوائیں اور مرہم پٹی کرنے کا طریقہ وغیرہ معلوم ہو۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا ڈاکٹر اور جمناسٹک کا اُستاد، جو ڈاکٹری بھی جانتا ہے، بچوں کی جسمانی نشوونما کی اچھی طرح غور و پرداخت کرتے ہیں۔ ہر طالب علم کا ایک "نقشہ" (record) سکول میں موجود رہتا ہے جس میں اس کا وزن، قد، سینہ کا محیط اور چوڑائی اور اُس کی اعصابی حالت اور حواس کی کیفیت درج ہوتی ہے۔ ہر بچے کے متعلق یہ تفصیلی اطلاع باقاعدہ اس کے والدین کو بھیجی جاتی ہے۔

تربیتِ جسمانی

کئی بار کھانا، کافی عرصہ سونا، نہانا، تازہ ہوا، کُھلی جگہ، روشنی، صفائی، حفظ صحت یہ تمام چیزیں ہمارے طلبار کی زندگی کو حسبت و چالاک بناتی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے جسمانی تربیت کے پورے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا اثرات کے علاوہ، جو جسم کی قوت بڑھاتے ہیں، ہمارے ہاں کھیلوں، ورزش

ہوا خوری، تفریح، سیاحت، کاشت کاری اور مختلف پیشوں کو سیکھنے کا انتظام ہے۔ ان میں سے ہر ایک شغل مختلف جسمانی قابلیتوں اور طاقتوں اور اخلاقی اور علمی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے لیکن وہ سب کے سب ایک ہی مقصد کے لیئے کوشاں ہیں یعنی بچے کو ایک مکمل (integral) انسان بنانا۔ ہم ان مختلف مشاغل پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

اوّل۔ کھیل کود ضروری ہے۔ بچے کو کھیلنے کی خواہش فطرتاً ہوتی ہے۔ اس لیئے اس کو کھیلنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ کھیل کی خواہش جسمانی اور اخلاقی صحت کی علامت ہے۔ اِس لیئے مختلف قسم کے کھیل ہمارے پروگرام کا ایک ضروری جزو ہیں۔ وہ مطالعہ اور علمی مشاغل میں جان ڈال دیتے ہیں۔ اور طلباء کو مفید تجربات حاصل کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ وہ ان کو زندگی کی آنے والی منزلوں کے لیئے تیار کرتے ہیں اس کو اپنی قوتوں کا مفید ترین استعمال سکھاتے ہیں۔ گرد وپیش کی دنیا سے ان کا تعلق پیدا کرکے اس میں خود شناسی کی عادت ڈالتے ہیں۔ ان سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہوشیاری مستعدی اور جرأت بڑھتی ہے۔ علاوہ آزاد کھیلوں کے، جن میں بچے جس طرح چاہیں کھیل سکتے ہیں، ہم باقاعدہ مشترک کھیلوں مثلاً ٹینس، فٹ بال وغیرہ پر بھی زور دیتے ہیں۔ کیونکہ ان سے امداد باہمی، ارتباط اور ضبطِ نفس کا سبق ملتا ہے۔ اور کھیلنے والوں کو اس بات کی عادت پڑ جاتی ہے کہ وہ ایک مقصد مشترک یعنی اپنی پارٹی کی کامیابی کے لیئے جدوجہد کریں اور ایک مقررہ قانون یعنی کھیل کے قواعد کو تسلیم کریں۔

چھوٹے بچے اپنی عمر کے موافق کھیل کھیلتے ہیں۔ مثلاً قیدی کا گھیرا (Prisoner's base) آنکھ مچولی اور بہت سے کھیل جو خود اُن کو سوجھتے ہیں۔ بعض ایسے کھیل جن میں پُھرتی کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً گیند پکنا، بہت مفید ہوتے ہیں۔ وہ دوڑ بھی کرتے ہیں۔ بڑی اور اوسط عمر کے طلبا ہاکی، فٹ بال، باسکٹ بال وغیرہ کھیلتے ہیں۔ جاڑے میں ہم ایسے کھیل کھیلتے ہیں جن میں زیادہ تیزی اور قوت درکار ہے۔ لیکن گرمی کے کھیل قدرتاً ہلکے ہوتے ہیں۔ ٹینس اس موسم کے لیئے خاص طور پر موزوں ہے۔

ہر ہفتے بڑے طلبا اپنے اور چھوٹے طلباء کے کھیلوں کے لیئے ایک امپائر کا انتخاب کرتے ہیں جو وہ جھگڑے فیصل کرتا ہے اور اس طرح ان کا جذبۂ انصاف نشوونما پاتا ہے۔ ان میں ضبطِ نفس اور مدارات

پیدا ہوتی ہے جو مل جل کر زندگی بسر کرنے کے لیئے نہایت ضروری ہے۔

یہ خاص طور پر ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ بڑے طلبا نے، اجتماعی زندگی کی ضرورت کے لحاظ سے جو ابتدائے بلوغ میں بچّوں کی خصوصیت ہوتی ہے، اپنے کھیلوں کے کلب بنائیے ہیں اور اس کے قاعدے قائم کیئے ہیں۔

منگل اور جمعہ کے روز تیسرے پہر کو بچے جمناسٹک ماسٹر کی نگرانی میں اپنے بچاؤ کے مختلف طریقے سیکھتے ہیں۔ مثلاً تلوار چلانا، مکہ بازی، فرانسیسی مکہ بازی، دوڑ، کود وغیرہ۔ ان کھیلوں سے بدن میں لچک، ہمت، اطمینانِ قلب اور قوت پیدا ہوتی ہے ان میں صرف بڑے لڑکے شریک ہوتے ہیں۔ علاوہ ان کھیلوں کے ہمارے نوجوان طلبا، چہل قدمی اور تفریحوں کے وقت بوئے سکاؤٹس کے کھیلوں اور کسرتوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس خیمہ زنی کا مکمل سامان موجود ہے۔ جس میں تین بڑے بڑے خیمے اور کھانے پکانے کے برتن وغیرہ شامل ہیں۔ اس لیئے ہم ان خوشیوں، غیر متوقع باتوں اور فی البدیہہ تجربات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو آزاد، کھلی ہوا کی زندگی کے لیئے موزوں ہیں۔ ہمارے طلبار اپنے "خیمہ کلب" کے علاوہ، بلجیم کے خیمہ کلب کے ممبر بھی ہیں۔

اگر ہمارے تعلیم کے طریقوں کا اور علم حاصل کرنے میں ان کے عملی اطلاق کا خیال کیا جائے، اور جدّت، ہوشیاری اور شخصی حوصلہ کی صفات کا جو ان کے استعمال کے لیئے ضروری ہیں، ساتھ ہی اگر یہ خیال کیا جائے کہ جہاں تک ہو سکتا ہے ہم اپنے طلبار کے لیئے مکمل ترین زندگی بسر کرنے کا اہتمام کرتے ہیں جس میں مناسب ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں، جس میں فیاضی، وفاداری اور انسانیت کے عناصر ہیں اور جس سے صریحًا قابلِ اطمینان نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ اگر یہ لحاظ رکھا جائے کہ ہمارے نصاب میں کھیل کود اور دستکاریاں شامل ہیں اور ہم اُن کو بہت اہمیت دیتے ہیں تو بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا اثر بیڈن پول (Baden Powell) کے عمدہ نظام سے زیادہ وسیع اور پائدار ہے۔ بلجیم کے ایک چیف سکاؤٹ نے، جو ہمیں بلجیم کی "بوائے سکاؤٹ ایسوسی ایشن" میں شرکت کی دعوت دینے آیا تھا، اِس بات کو بخوشی تسلیم کیا۔ اور ہمارے سکول کی زندگی کے نظام اور مشاغل کا معائنہ کرنے کے بعد یہ کہا کہ تمہارے ہاں سکاؤٹس کی زندگی کا مکمل ترین نظام موجود ہے۔ دراصل اس سکول کی تمام زندگی میں ایک مسلسل اور مستقل نظام ہے جو سکاؤٹس کے نصب العین سے

ہم آہنگ ہے۔ لیکن اس نے سکاؤٹس کی وردی کو اختیار نہیں کیا۔ علاوہ بریں وہ ان رجحانات سے محفوظ رہا ہے جن کی وجہ سے (اگرچہ وہ خوش قسمتی سے بہت کم ہیں) کبھی کبھی سکاؤٹس کی تحریک بعض خاص مقاصد کے لیئے استعمال کی جاتی ہے مثلاً عسکریت (mil itarism) قومیت یا کسی اور قسم کا سیاسی یا مذہبی تعصب۔

دوم جسمانی ورزش۔ ہفتہ میں دو بار ایک نوجوان ڈاکٹر کراتا ہے جو اس بارے میں بہت جوشیلا ہے۔ اس کے بدن کی لچک اور سڈول پن اس کی طاقت اور اس کی قوت مدافعت اس کے سسٹم کی (جو لنگ، ملر اور ہبارٹ سسٹم پر مبنی ہے) بہترین سفارش ہے۔ جسمانی نقطۂ نظر سے اس سسٹم کا مقصد یہ ہے کہ اعصاب اور اعصاب کے مجموعوں کو مناسب ورزشوں کے ذریعے مضبوط کرے۔

علاوہ جسمانی ورزشوں کے، جن میں سانس کی ورزشیں سب سے مقدم ہیں، کیوں کہ وہ تمام طلبا کے لیئے یکساں طور پر موزوں ہیں، ہم بعض ورزشیں طلبا کو علیحدہ علیحدہ بھی کراتے ہیں۔ ان کا مقصد صریحی طور پر اصلاحی (therapeutic) ہے اور یہ ہر طالب علم کی عمر، جسم اور اس کی مخصوص نشوونما کا علیحدہ علیحدہ لحاظ رکھتی ہیں۔ بعض صورتوں میں عجیب وغریب نتائج مترتب ہوئے ہیں ایک لڑکا سولہ برس کا ہمارے ہاں داخل ہوا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی اس قدر خمیدہ تھی کہ برسلز کے سرجن نے اس کے لیئے ایک خاص قسم کی دھات کی صدری (orthopaedic jacket) تجویز کی تھی جو گویا ایک سچ مچ کا خود ہے جو جسم کو ایک فولاد کی چادر میں قید رکھتا ہے۔ لیکن چند ہی ماہ بعد بغیر کسی خاص آلات کے استعمال کے، صرف اعصاب کی اپنی قدرتی کوشش سے جن کو خاص ورزشوں کے ذریعے اکسایا گیا تھا، اس کی کمر تقریباً بالکل سیدھی ہو گئی۔

یہ تمام ورزشیں کھلی ہوا میں سکھائی جاتی ہیں۔ اور طلبا حتی الامکان کمر تک ننگے رہتے ہیں ان حالات میں ورزش سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن جسمانی ورزش صرف مقررہ ورزشوں پر ہی تمام نہیں ہو جاتی۔ وہ تو صرف ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بچوں کے لیئے بالکل ایک ناقابل فہم چیز بن جائے، محض ایک تھکانے والا، جبریہ کام جس کا مقصد ان کی سمجھ میں نہ آسکتا ہو۔ بلکہ میں یہ کہنے کے لیئے تیار ہوں کہ بچوں سے محض کسرت کی خاطر کسرت کرانا اتنا ہی غیر مفید ہے جتنا ان کو پڑھنے یا حساب کی خاطر پڑھانا اور جمع تفریق کرانا۔

جب جسمانی تربیت ایک معمول بن جائے تو وہ لازماً یک طرفہ، مصنوعی، ناقابل فہم وقبول اور بے جا طور پر مجرّد (abstract) ہو جاتی ہے اس سے تکان اور دل برداشتگی پیدا ہوتی ہے اور کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے جسمانی مشاغل ہیں جن میں قدرتی اور عملی طور سے شگفتہ نقل وحرکت کا موقع ملتا ہے۔ ان میں بچے کو اس لیئے دلچسپی ہوتی ہے کہ ان کے ذریعے وہ اپنے مشاغل کا آزادانہ اظہار کرتا ہے۔ ایسے مواقع کھیل کود، بھاگ دوڑ، نجاری اور لوہار کے کام میں ملتے ہیں یہ مشاغل جو بچے کی زندگی کی فطری ضروریات کو ظاہر کرتے ہیں چودہ پندرہ برس سے کم عمر کے بچوں کے لیئے جسمانی تربیت کے بہترین نظام سے زیادہ قابل ترجیح ہیں۔ اس عمر کے بعد، جسمانی تربیت جو باقاعدہ ورزشوں کے ایک منتظم مجموعہ کی شکل میں ہو حقیقی طور پر مفید ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اب وہ نہ صرف جسم کی نمو کے لیئے مفید ہے بلکہ دماغ کی تربیت کے لیئے بھی۔ اس لیئے ہم بڑی عمر کے طلباء کے سامنے جسمانی تربیت کا نظریہ بھی بیان کرتے ہیں تاکہ وہ ہر حرکت کا مقصد سمجھ سکیں۔

چھوٹے بچے اپنی مرضی کے مطابق اُچھلتے کودتے ہیں۔ درخت پر چڑھتے ہیں۔ تیرتے ہیں اور باغبانی کرتے ہیں۔ باقاعدہ ورزشوں میں وہ صرف چند ہی منٹ کے لیئے شریک ہوتے ہیں اور اس عرصے میں انھیں بعض آسان تر ورزشیں سکھائی جاتی ہیں۔

سوم، ہم متعدد بار ہَوا خوری اور سیر (outing) اور سیاحت (excursion) کے لیئے باہر جاتے ہیں۔ کارخانوں، عجائب خانوں، تاریخی یادگاروں اور حُسن فطرت کے مناظر کا معائنہ کرتے ہیں۔ کبھی پیدل جاتے ہیں، کبھی بائیسکل پر، کبھی ریل میں۔ ہر موسم میں یہی معمول ہے۔ ہفتہ میں دوبار، خاص کر جاڑے کے زمانے میں جب کھیتوں میں کچھ کام نہیں ہوتا، ہم عموماً تیسرے پہر کا تمام وقت سیر میں صرف کرتے ہیں۔ علاوہ بریں دو ہفتہ میں ایک دفعہ ہم ایک پورا دن سیاحت میں بسر کرتے ہیں۔ بہار اور گرمی کے زمانے میں تمام طلباء سوائے بہت کم عمر کے بچوں کے، ہفتہ کو بعد دوپہر اپنے اپنے خیمے لے کر روانہ ہوتے ہیں۔ اور پیدل یا بائیسکل پر کسی خوش نما مقام پر جاتے ہیں اور وہاں خیمہ لگا دیتے ہیں۔ اتوار کو چھوٹے طلباء کے ساتھ ہم ریل کے ذریعے وہاں پہونچ جاتے ہیں تمام علاقے میں گھومتے ہیں اور شام کو واپس آجاتے ہیں۔

ہر تیسرے مہینہ ہم ایک زیادہ بڑی سیاحت کرتے ہیں جس میں پانچ دن صرف ہوتے ہیں۔ اس کا

مقصد یہ ہوتا ہے کہ سکول کی پڑھائی کو وہاں عملی طور پر جاری رکھا جائے۔ اس طرح ہم تمام بلجیم میں گھوم چکے ہیں۔

سکول کا سال تمام ہونے پر جب پڑھائی ختم ہو جاتی ہے ہم دو تین ہفتے کا ایک زیادہ بڑا سفر کرتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں ہم بلجیم کے ساحل پر گئے تھے اور آبنائے عبور کر کے ڈوور (Dover) تک پہنچے۔ اس سے پہلے سال لکسمبرگ (Luxemburg) کی گرینڈ ڈچی (Grand Duchy) نے ہمیں کھینچ بلایا تھا۔ ہم وہاں خوب گھومے۔ خیموں میں رہے، اپنا کھانا خود پکایا، جنگلوں میں ندیوں کے کنارے، فطرت کی وسیع فضا میں غرض ہر جگہ ہر قسم کے تجربات حاصل کیئے۔ اور واقعی خوشیوں اور تخیل کی شاعرانہ خوشیوں، دونوں سے لطف اندوز ہوئے۔ جیسے ایک آئیڈیل (ideal) کی تلاش میں سرگرداں ہوں! یہ سیاحتیں کیسی سبق آموز، کیسی جذبات سے بھری ہوتی ہیں! ارتباط امداد باہمی، اپچ، عملیت، صبر، برداشت، چستی، خوشی، خوش مزاجی، آرٹ، سائنس غرض تمام چیزوں کا بچوں کو تجربہ ہوتا ہے یا عادت پڑتی ہے۔

مستقبل کے لیئے اور زیادہ وسیع تجویزیں پیش نظر تھیں ہمارا خیال تھا کہ پہلے جرمنی، انگلستان، بلجیم اور فرانس کے صنعتی مرکزوں کا مطالعہ کرتے کیونکہ ان کا آپس میں مقابلہ کرنے سے ہمارے طلباء کو بہت فائدہ ہوتا ہے اس کے بعد گرمی کی چھٹیوں میں مشرق کا لمبا سفر کرتے۔ مراکو، الجیریا، ٹیونس، فلسطین اور مصر دیکھتے اور ٹرکی، یونان یا اٹلی کے راستے سے واپس آتے تاکہ بچوں کی دلچسپی پرانی تہذیبوں کی دل کش یادگاروں کی جانب مائل ہو۔ اگرچہ پرانے زمانے کے رسم و رواج، پرانا آرٹ، تاریخ اور شاعری ہم سے مختلف تھے لیکن یہ سب گزری ہوئی چیزیں بہت پر اثر طریقے سے زندہ کی جا سکتی ہیں جب ہم ان جگہوں کو دیکھیں جہاں ہمارے روحانی آباؤ اجداد رہتے تھے، مصیبتیں جھیلتے تھے اور گاتے تھے۔ کیونکہ جو لوگ کفایت شعاری سے سفر کرنا جانتے ہیں اور خیموں میں رہ سکتے ہیں (آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے پاس خیمہ زنی کا پورا سامان موجود ہے) ان کے لیئے یہ سبق آموز سیاحی بہت کم خرچ ہوتی ہے۔

خواجہ غلام السیّدین

ایک معلم کے تجربات

ہندوستانی مدرسوں میں ایک جماعت تو ان متبرک ہستیوں کی ہے جن کے جوش ٹھنڈے ہو چکے۔ جو اب خواب ترقی کے بجائے سکون و یاس سے ہم آغوش رہتے ہیں اور پُرجوش نوجوانوں کی اُمیدوں اور کوششوں پر مایوسانہ ہنستے ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو بہت سے کوچوں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد اس غریب نواز پیشہ کو مجبوراً اپنا مستقر بناتے ہیں۔ یہ حضرات اگر ٹریننگ بھی پاس کرتے ہیں تو محض ترقی اور عمدہ گریڈ کی خاطر۔ اور مستقل ہوتے ہی جدید تعلیمی تصانیف کا مطالعہ تو درکنار۔ حاصل شدہ علم پر عمل یا غور کرنا ایک فعل عبث سمجھتے ہیں۔ رہا تیسرا طبقہ (جن کی طرف اس مضمون کا روئے سخن ہے) اس کے افراد خواہ کسی عمر یا لیاقت کے ہوں۔ غالباً اس پیشہ کی اہمیت اور غیر معمولی ذمہ داریوں سے باخبر ہیں یا اگر نہیں ہیں تو جلد ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے معلّمی کو اپنا مقصدِ زندگی اور نصب العین صرف گزر اوقات کے لیئے نہیں بنایا یقیناً بہت سی تکالیف اور قربانیاں برداشت کرنے کے لیئے تیار ہو جائیں گے تاکہ ملک و قوم کا مستقبل بہتر ہو۔ اور ان کا مشن واقعی مفید اور کامیاب ثابت ہو گا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فرائض کی اہمیت اور کام کی عظمت تنخواہ کی مقدار پر منحصر نہیں۔ خواہ ناواقف پبلک ان کی ان تھک کوششوں کو نہ سراہے اور افسران محکمہ ان کی ہمّت شکنی کریں۔ لیکن آیندہ نسلوں سے خراجِ تحسین وصول کرنے کی اُمید اور شاید وہ خوشی جو محض کوشش کرنے میں پنہاں ہے اور جس سے ذوقِ عمل نہ رکھنے والے محروم ہیں۔ اُن کو تعمیری کام میں مشغول رکھیگی۔

اگر یہ حضرات اپنے ملک کی مسموم تحریکوں اور تباہ کن اثرات کا مُطالعہ سرسری طور پر بھی کرتے رہیں تو ان کے شاگردوں کو فرقہ دارانہ تعصب سے آزاد ہونا چاہیئے اور اخوت باہمی ہمدردی حب وطن و ایثار کا زندہ نمونہ۔ مانا کہ مضامین کے طریقۂ تعلیم کو ایسا رنگ دیا جا سکتا ہے کہ طلبہ آپس میں برادرانہ محبت قایم کر لیں۔ واقعات حاضرہ پر ایسا تبصرہ بھی ممکن ہے کہ سامعین میں قیام امن اور رواداری کی رُوح پیدا ہو جائے مگر ان سب سے زیادہ مؤثر ہمارے اُستادوں کا طرزِ زندگی ہو سکتا ہے۔ معلّموں

کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مقررہ اوقات کے علاوہ بھی بلاارادہ ان کی زندگی کا اثر طلبہ پر پڑتا رہتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اُستادوں کی طرز معاشرت سکول کے علاوہ اوقات میں بھی تعلیمی مقاصد کی پابند ہو اور نیک نیتی اور خوش اعتقادی سے اس تمدنی تعلیم کی مہم کو سر کیا جائے۔ اخلاقی تعلیم و تربیت جس کے ضابطوں اور اُصولوں پر دُنیا متفق نظر نہیں آتی ہماری توجہ کی محتاج ہے۔ ناممکن الحصول نظریوں اور بین الاقوامی مسئلوں کو چھوڑ کر اپنے ملک کی فوری ضروریات پر غور فرمائیے کون نہیں جانتا کہ اسراف اور خودنمائی نے ہمیں نہ صرف اقتصادی غلامی میں مبتلا کیا ہے بلکہ ہمارے اخلاق کو بھی کمزور کر دیا ہے؟۔

کیا مغربی تہذیب کی اندھی تقلید اور عمدہ پرانی روایات اور معیاروں کے ترک کرنے نے نئی نسلوں میں ریا، خودغرضی اور بے ادبی کے مہلک جراثیم نہیں پیدا کر دیئے خیالات اور ارادوں کی پستی شاید پہلے بھی موجود تھی لیکن دورِ جدید میں صاحبانِ فکر کو معلوم ہے کہ یہ پستی انتہا کو پہونچ چکی ہے۔ کیا ان سب امور کی ذمہ داری غریب مولویوں کے سر ڈالی جا سکتی ہے؟۔

امتحان کا خوف کورس کی خرابیاں مفید مضامین کا نہ ہونا۔ انہی اسباب سے ہمارے شاگردوں میں لیاقت جدّتِ طبع خوداعتمادی اور مفید دماغی عادات پیدا نہیں ہو سکتی ہیں۔ یہی حساب اور لکھنا پڑھنا دُنیا کے تقریباً ہر مدرسہ میں رائج ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ ہمارے بچے طوطے کی طرح علم حاصل کرتے ہیں اور دوسری قوموں کے نونہال بلا کے ذہین اور طباع نکلتے ہیں بے شک ایک مغربی اُستاد کو ایسی فضا میسر ہے جس میں اس کی جدّتوں اور کوششوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ وہاں پبلک نہ صرف بہت سے اعلیٰ قسم کے مدرسے اپنی جیب سے چلاتی ہے بلکہ غریب سے غریب مزدور بھی اپنی اولاد کو بہترین تعلیم دلانا اور اس مقصد کے لئے تکالیف اُٹھانا۔ اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔ اِن کی اپنی حکومت ہے۔ جبریہ تعلیم کا قانون جاری ہے آپ و ہُوا بھی بہتر ہے۔ مگر یہ عام فوائد محض بے اثر ہوتے (اور اب سے سَو سال پیشتر بھی موجود تھے) ۔ اور ان کا کچھ نتیجہ بھی نہ ہوتا اگر صاحبانِ دولت و حکومت کا احساس اور اُستادوں کے تجربے اور اصلاح کی اَن تھک کوششیں متفق نہ ہو جاتیں۔ پبلک مدرسوں کو روپیہ یا سرکاری اقتدار نہیں چلاتا بلکہ ان کی مخصوص روایات اور لائق احترام خصوصیات، اب ذرا غور سے اپنے مدرسوں کی خصوصیات پر نظر ڈالیئے جن کے لئے آپ پبلک کے اعزاز اور امداد کے متمنّی ہیں۔

بارہ سال کی مُخرّب صحت و اخلاق تعلیم کے بعد آپ کا شاگرد اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔

سرکار اور اُس کے کمیشن کوئی خاص تریاق دریافت نہیں کر سکے پبلک کو آپ اپنا حامی جب ہی بنا سکتے ہیں جب کہ غیر معمولی کوشش کر کے اس کی بیماری کا علاج کریں۔ نہ صرف امتحان کے نقطۂ نظر سے اپنے کام کو لایق تعریف بنائیے بلکہ اپنی قابلیت اور تفکر کا بہترین استعمال کر کے اپنی درس گاہ کو ترقی یعنی مفید ترقی کا ضامن اور پائدار خوبیوں کا مرکز ثابت کیجیے۔

حسبِ ذیل باتیں ممکن العمل ہیں۔ اُن کی تفصیل اس لیے نہیں کی گئی کہ ارباب عمل کو صرف اشارات کی ضرورت ہے۔ ایک خصوصیت ان اشارات کی جن پر تجربتاً عمل کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ کورس اور امتحان کی جکڑ بندیوں کے باوجود مدرّسین ان کو عمل میں لا سکتے ہیں۔ تھوڑی سی تکلیف اور گرم جوشی سے انشاء اللہ بہتر نتائج مرتب ہو سکتے ہیں اور تنگ نظر افسروں کو بھی شکایت پیدا نہ ہوگی۔

ا۔ عام مشورے۔ (۱) بچوں کی ظاہری و باطنی صفائی کا مطالعہ مضر اثرات کے خلاف خود نمونہ بننا اور ہدایت دینا اور دوسرے اچھے لڑکوں سے مدد لینا لیکن اس طرح کہ بُروں بھلوں کی جتھہ بندی نہ ہونے پائے۔ ایک کمرہ میں صفائی جسم و لباس کا مختصر سامان جمع رکھا جائے اور اُس کو حسب ضرورت کام میں لایا جائے۔ عموماً ڈاکٹری معائنہ میں اُستاد کا مشاہدہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

(۲) علاوہ انگریزی اور دیسی کھیلوں کے جن میں کمزور جسم کے لڑکے کم حصّہ لیتے ہیں۔ ایسی سادہ ورزشیں کرانا جن سے سینہ کمر اور کندھے سیدھے اور درست رہیں۔ سانس کی ورزشیں۔ سکاؤٹس کے کھیل اور نظموں کو گانے کے ساتھ ساتھ بچوں سے ہاتھ پاؤں کی آزادانہ حرکتیں کرانا مفید ہیں۔ بدن کے توازن قایم رکھنے، بدن توڑنے اور بالعموم حواس قایم رکھنے کی مشقیں صرف ماہرین کی توجہ کے لایق ہیں۔

(۳) بچّوں کو خوش و خرم رکھنے کی وہ سب تدابیر جن کو ہم لوگ اپنے بچپن میں ترسا کیے۔ مثلاً محنت طلب اور غیر دل چسپ کام کے بعد آرام کرنا یا قصہ گوئی۔ بشرط امکان ہلکا ناشتہ بالکل آزادانہ کھیل کود۔ سزا اور خوف کے ذریعے حکومت کرنے کے بجائے عقل اور محبّت سے بچّوں کو اپنا بنانا۔

ب۔ دل چسپ مضامین (۱) باغبانی اور مطالعۂ فطرت: ان مضامین کو امتحانی قیود اور طریقہ

تعلیم کی روایات اکثر غیر دلچسپ بنا دیتی ہیں اور کہیں کہیں عمدہ سامان نہ ہونے کے باعث ان کو حذف ہی کر دیا گیا ہے۔ شوق جستجو عالمِ رنگ و بُو سے حظ حاصل کرنے کی خواہش اور اشیا کا ذخیرہ فراہم کرنے کا شوق بچّہ میں فطرت نے یقیناً اس لیئے ودیعت کیا ہے کہ مذاق کی تربیت ہو۔ ہر خوبصورت اور مفید چیز کا احترام دل میں پیدا ہو۔ بچّہ قوانین قدرت کی قدر کرے اور اُن کی خلاق و رزاق حضرت رساں سمجھنے لگے۔ اور اگر طالب علم کا رجحان مذہبی ہے جیسا کہ ہم اہلِ مشرق کا دعوٰی ہے تو خالق کو اُس کی صنعت کے ذریعے پہچانے۔ پس اُستادوں پر کتنا زبردست الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی اُمنگوں اور شوقوں کو امتحان پر قربان کر دیتے ہیں یا دیگر مضامین پر زیادہ محنت کرانے کے لیئے اُس کی قوت مشاہدہ و حظ روحانی کی عملی تربیت پر قطعاً توجّہ نہیں کرتے۔ یہ صفات زیادہ تر عملی باغبانی۔ جانوروں کی پرورش اور نقّاشی مُصوّری اور ہاتھ کے کاموں وغیرہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر عمر کے بچّوں سے پھول، پودوں اور بے ضرر حیوانات کا مُطالعہ اور پرورش کرائی جائے امتحان کے سوال خود بخود آپ کی غیر معمولی محنت کے بغیر حل ہو جائیں گے۔

(۲) ہاتھ کی تربیت ہمارے مدرسوں میں صرف کاپی پنسل سے شکل اور اصطلاحی مشقوں کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ موسمی چیزوں کی نقّاشی اور تصویر کشی اور رنگنے۔ مٹی۔ روئی۔ اون لکڑی وغیرہ کے ذریعہ ان کی نقل بنانا تضیع اوقات بلکہ خلاف مذہب تک سمجھا جاتا ہے۔ غالباً ایک طرف اُستادوں کی بدمذاقی اور لاعلمی اور دوسری طرف حُکّام و سِلاک کی عدم توجہی فنون لطیفہ کی اس ابتدائی تعلیم میں حارج ہیں لیکن پرجوش اساتذہ کتابوں کے مطالعہ سے اور اپنے شہر کے اہلِ فن کی شاگردی کر کے ان تمام مشکلات کو رفع کر دینگے کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ مٹی (پنڈول، ریت، ملتانی۔ کھریا) ردّی کاغذ، پھونس، موتی اور تار کی کارآمد چیزیں اور کھلونے بنانے یا بچّوں سے سکول کے بعد بنوانے کے لیئے اُستاد میں کسی غیر معمولی مہارت کی ضرورت نہیں۔ ہم سب بچپن میں ضرور کچھ نہ کچھ بنایا بگاڑا کرتے تھے۔ بچوں کے ساتھ بچّہ بن جائیے۔ پھر دیکھئے کہ آپ کے شاگرد آپ کے ساتھ کس قدر مانوس ہو جاتے ہیں اور مدرسہ کو بجائے قید خانہ سمجھنے کے حقیقی معنوں میں "اپنی درس گاہ" بناتے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح

اگر کاغذوں کے پھول کھلونے وغیرہ بنوا کر مدرسہ کی عمارت کی آرائش کی جائے تو بہت مفید ثابت ہوگا اور آئندہ شاگرد تعلیم سے فارغ ہو کر صرف نوکریوں ہی کو ذریعۂ معاش نہ سمجھیں گے

قوم اور ملک کی تہذیب میں جو اضافہ صحیح مذاق پیدا کرنے اور نئی نسل کو ہاتھ کے کاموں کا شوق دلانے سے ہو سکتا ہے اس کا احساس ابھی ہم میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس بات پر بار بار زور دینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے طریقۂ تعلیم میں محض کتابوں اور حافظہ کے استعمال کو حد سے زیادہ اہمیّت دینا بہت مُضر ثابت ہوا ہے۔ پڑھنے اور اس سے زیادہ سوچنے کا امکان جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ آنکھوں کے علاوہ دیگر حواس کی نہ صرف شروع سے تربیت ہو بلکہ روزانہ نصابی تعلیم میں بھی ہاتھ پاؤں کان ناک وغیرہ سے مدد لے کر احساسات کو زیادہ پائدار، دماغ کو زیادہ کشادہ، اور شاگرد کی مختلف کوششوں کو زیادہ دلچسپ بنایا جائے۔ اِس کی چند عملی مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۳) تاریخ جغرافیہ۔ اِن مضامین کو زندہ اور دلچسپ بنانے کی سخت ضرورت ہے چونکہ چھوٹے بچّے غیر زبان کی کتابیں نہیں پڑھ سکتے۔ اور اُردو میں دلچسپ اور باتصویر کتب کم یاب ہیں اس لیئے اُستاد کو بڑی تصاویر قصص اور سیر و سیاحت کے حالات سے مدد لینی چاہیئے۔ درس کی کتابوں میں سے چھوٹی اور عمدہ تصویروں کو بڑا کر کے ان کے متعلق تخیّل کی مدد سے ایسے قصّے تیار ہو سکتے ہیں جن کا ڈراما تیار کیا جا سکے۔ غیر قوموں کے بچّوں کے کھیل، تعلیمی خصوصیّات مشابہتوں اور اختلافات کا مطالعہ مفید اور دلچسپ ثابت ہوا ہے۔ نقشہ کے سکھانے میں کمرہ اور کھیل کے میدان کا خاکہ تو کھینچا ہی جاتا ہے لیکن جانوروں اور درختوں کے خاکوں سے بھی مدد لینی چاہیئے اور بہت جلد اپنے شہر یا گاؤں کے سروے کی نقشہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ردّی کاغذ اور مٹّی کا گلوب بنوا کر اُس پر خشکی تری آباد وغیر آباد علاقوں اور طبعی خصوصیات کی تقسیم کرائیے تاکہ دُنیا کا عام جغرافیۂ طبعی اُصولوں کی مثالیں دے کر پڑھایا جائے اور یہ کام صرف بڑے درجوں ہی کے لیئے مخصوص نہ کیا جائے۔ تاریخ میں عموماً کتبوں سکّوں اور قدیم نسخوں کا مطالعہ یا انکی تصویریں لینا بچوں کی لیاقت سے بالاتر سمجھا جاتا ہے حالانکہ تجربہ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ طلبا کو ایک محقق کی طرح لطف

آسکتا ہے اگر ان کی قوت متخیلہ اور ڈرامہ کے شوق کو مناسب طریقہ سے کام میں لایا جائے
دراصل ان دونوں مضامین میں دستی یا عملی کام کی کمی اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنا کہ طلبہ
کے شوق جستجو کو ایک نصابی کتاب کے اندر محدود کر دینا۔ مگر اچھی اور غیر درسی کتب جن میں سیاحت
رسوم، معاشرت ارتقائے تہذیب وغیرہ کا بالتصویر بیان ہو۔ ہماری زبان میں فی الحال بہت
کم ہیں۔ اس لیئے ایک طرف تو اُستاد کو ان کتابوں کی کمی پوری کرنی چاہیئے اور دوسری
طرف طلبہ میں عملی کام کرنے کے فطرتی شوق کی کافی رہ نمائی کرنی چاہیئے۔ فی زمانہ ماہرین
نفسیات ان دونوں مضامین کی تعلیم میں اس پہلو پر زور دیتے ہیں کیونکہ ان سے رواداری۔
کشادہ دلی غیروں سے مروّت اور وسعتِ نظر، طلبہ کی خصلت کا جزو بن جاتے ہیں۔
اگر ہم بھی اپنے طرز تعلیم میں دوسرے مذہبوں اور تہذیبوں کے حالات اور گزشتہ اختلافات
کو ایسے لباس میں پیش کریں جس سے آئندہ کے لیئے امن اور سکون کی بنیاد پڑے تو ملک
کی فضا بہت کچھ صاف ہو جائے۔

۳۔ غیر دلچسپ نصابی مضامین ۔ (۱) مادری زبان ۔تعلیم کے نئے طریقوں کا مناسب
استعمال تو درکنار عموماً (باستثنائے چند) اُردو کی تعلیم کو ایک غیر تربیت یافتہ فارسی داں
کے سپرد کر دیا جاتا ہے' الفاظ کے معانی رٹوا دینا، اور خط کی اصلاح کر دینا، بس ان دو امور کے
علاوہ ان سے کسی جدّت یا مفید طریقہ تعلیم کی اُمید رکھنا عبث ہے۔ اس لیئے چھوٹی جماعتوں ہی
سے خوش خط، اور ٹرینڈ حضرات کو اُردو کی تعلیم پر لگانا چاہیئے۔ کم سے کم وقت میں بہترین
نتائج حاصل کرنے کے لیئے اُردو کے جدید قاعدوں (مثلاً سجاد مرزا صاحب انجمن ترقی اُردو
خلیفہ عماد الدین و میکلین کے قاعدوں) سے مدد لینی چاہیئے اور بہت سے نقشوں اور کاغذ کے
ٹکڑوں کے ذریعہ حروف کی شکلیں اور ان کی نئی آوازیں مرکبات میں سمجھانی چاہئے۔
تجربہ بتاتا ہے کہ "دیکھتے ہی لفظ کو زبان سے ادا کرنا" جسے انگریزی میں "Look & Say"
(method) کہتے ہیں دو اور سہ حرفی مرکبات تک موزوں ہے۔ اس کے بعد ہجّے کر کے
لفظ نکالنا ۴ اور ۵ حرفی مرکبات میں کام آئیگا۔ مگر اعراب سے روشناسی حروف پر عبور حاصل
کرنے کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے زیادہ استعمال میں آنے والے حروف کے دو حرفی اور

سہ حرفی مرکبات اکثر تصاویر کی مدد سے ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں مثلاً پان، کان وغیرہ۔

عام طور پر بدخطی کی شکایت بڑھتی جا رہی ہے۔ اُستادوں نے محض تختی اور وصلی کو اس کا علاج سمجھ رکھا ہے حالانکہ قلم سنبھالنے اور بنانے۔ گول، آڑا، بیضاوی سیدھا خط کھینچنے اور ہاتھ کو ایک مقام پر مناسب وقت تک جمانے کی مشکلات سب سے پہلے ان کی توجہ کی محتاج تھیں تار، موٹے تاگے، اور گتے کی شکلیں۔ مختلف دائروں کی مشق کے لئے مفید ہیں۔ جیسے قلم سے ریت کی سطح پر لکھنا۔ چاک یا کوئلہ سے نوک اور موٹائی نکالنا۔ نرم گندھی ہوئی مٹی میں چاقو کی مدد سے اُبھرے حروف بنانا اور کاغذ یا ٹین کے حروف کی خالی جگہ (Stencils) میں رنگ بھرنا۔ ایسی ابتدائی مشقیں ہیں کہ جن سے بچّہ کو دلچسپی بھی ہوگی اور وہ خوشخطی میں خوب ترقی کرے گا۔ مگر اس امر کا خیال رہے کہ الفاظ صرف ایسے لکھائے اور پڑھائے جائیں جن کے معانی کو اس کا دماغ قبول کر چکا ہے ان کو دلچسپ جملوں میں استعمال کرانا تعلیم ادب کی پہلی منزل سمجھئے۔

(۲) ادبِ اُردو: مولوی محمد اسماعیل مرحوم اور دارالاشاعت لاہور کے معاونین نے بچوں کے لیئے مناسب نظم و نثر کا کچھ ذخیرہ تیار کیا ہے لیکن یہ نہ کافی ہے اور نہ بہترین۔

انگریزی پرائمرز کی تُک بندیاں اور ہم وزن الفاظ کا پر لطف سلسلہ دیکھ کر اُردو میں چھوٹی چھوٹی، بچوں کے کام کی نظموں اور پہیلیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں ہمارے بچے دوسرے تیسرے درجہ ہی سے قافیہ اور وزن سے آشنا نہ ہو جائیں اُستاد اور شاگرد کی ابتدائی غلطیاں معاف ہو سکتی ہیں بشرطیکہ اُستاد کو اپنی مادری زبان کے ادب کا ذوق اور اس سے لطف حاصل کرنے کا شوق ہے۔ نثر میں انشاء پردازی کے جدید نکات پر انگریزی سکھانے والی کتب (مثلاً Lynch کی "Dalton Assignments" اور Nelson's English Spoken and Written) سے مفید اشارات مل سکتے ہیں اگر ان سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا جا سکے تو ہر اُستاد اپنے تخیل سے کام لے کر بچوں کو ایسے مضامین بتا سکتا ہے جو ان کے ذاتی تجربات اور جذبات سے متعلق ہوں اگر ان کو بچپن سے عمدہ نمونوں کے مطالعہ کا موقع ملا ہے اور از خود اظہار کی خواہش موجود ہے تو بچے یقیناً ایسی چیزیں لکھ سکتے

ہیں جو اپنے خلوص اور بے ساختگی کی وجہ سے پڑھنے والوں پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتیں اسی طرح ان کی تخلیقی قوت کو بیدار کرنے کے لیئے آدھی کہانی سُنا کر اُس کو مکمل کرانا یا ایک مختصر خلاصہ کو مشرح کرنا مفید ہے۔ بے جان اشیاء کی آپ بیتی لکھوانے کے تجربات بھی کیئے گئے ہیں لیکن جب اس قسم کی تحریروں کے لیئے باقاعدہ تیاری نہیں کرائی جاتی اور طریقۂ تعلیم بے جان اور غیر دلچسپ ہوتا ہے تو لڑکوں کے مضامین میں عام طور پر دو باتوں کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔

(۱) مشاہدات میں خلوص اور واقفیت کا نہ ہونا۔

(۲) بیان میں اثر اور شگفتگی کا نہ پایا جانا۔

اِس کی بہت سی وجوہات ہیں پہلی شکایت کی وجہ یہ ہے کہ بچوں کے لیئے عام مطالعہ اور واقفیت کی غیر درسی کتابیں بہت کم ہیں۔ محض کہانیاں ہی کافی نہیں ہو سکتیں۔ جغرافیہ اور سائنس کے دل پزیر بیان۔ ہاتھ سے کھلونے اور چیزیں بنانے کے طریقے۔ پُرانے زمانے کے ملکوں اور قوموں کے حالات۔ تہواروں اور تعطیلوں کے قصے، مشاہیر عالم کے سوانح، ڈراما، مکالمے وغیرہ اُردو زبان میں ابھی وجود ہی میں نہیں آئے۔

خوبیٔ اظہار پیدا کرنے کے لیئے ان جدّتوں کا رواج ضروری ہے جن سے مغرب کے اساتذہ مدد لے رہے ہیں۔ جملوں میں الفاظ کی مختلف نشستوں کے ذریعہ ان کا پورا مفہوم سمجھنا۔ ایک لفظ کے ہم معنی الفاظ کا استعمال۔ فقروں کو مختصر یا مفصّل کرنا۔ حذف کردہ الفاظ کی تلاش کرانا۔ بڑے درجوں میں غریب، متروک، مشتق، بے محاورہ الفاظ پر بحث۔ یقیناً کارآمد طریقے ہیں یہ تو روزمرّہ کو مستند بنانے کی بحث تھی۔ اعلیٰ اُردو ادب کے نمونوں کو گاہے گاہے جماعت کے سامنے پیش کرنا نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن انتخاب میں بچوں کے ذوق اور دلچسپی کا عنصر غالب رہے اور اپنی قسم کی بہترین چیز انتخاب کی جائے۔ نظم یا دیگر ادبی مضامین کی تعلیم کی بابت مجھے اپنا تجربہ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اکثر معانی و مطالب کو پس پشت ڈالنا ہی حقیقی لطف اندوزی کے لیئے ضروری ہوتا ہے۔ محض معانی کے لیئے اشارات، مناسب طریقۂ ادا اور سادہ الفاظ میں خلاصہ بیان کرنا کافی ہوتے ہیں عمدہ ادب اپنی قدر خود کراتا ہے اصل مطلب طالب علم نو کیا شاید خود لکھنے والا بھی بیان نہ کر سکے دوسرے ابتدائی درجوں کے بچے مل کر اور

اُستاد کی زیرِ نگرانی ہونہار سہ سے تیسرے مہینے ایک میگزین شائع کر سکتے ہیں۔ اس سے بچوں کی اصلی لیاقت کا اظہار ہوگا۔ اور اظہار کر کے اور سینئر مدرسہ کی کوششوں کی کامیابی یا ناکامیابی کو ظاہر کر سکتے ہیں۔

(۳) انگریزی کی ابتدائی تعلیم۔ اگرچہ ٹریننگ کالجوں کی عنایت سے نئے طریقہائے تعلیم کا رواج ہو چکا ہے اور کورانہ تقلید کو پسند بھی نہیں کیا جاتا۔ مگر ہندوستانی بچوں کے لیئے مادری زبان کی طرح انگریزی کی دلچسپ اور مفید کتب بھی ناکافی ہیں۔ اگر ہر استاد اس ماہ کے لیئے اسباق مختلف پیراؤں میں سے ضروری الفاظ کیلئے ترتیب دیا کرے تو غالباً بہت سی غلطیوں سے بچ سکیگا کیونکہ کوئی قاعدہ اور کوئی پیرایہ نقص سے بری نہیں۔ انگریزی خوشخطی ٹوٹ پھوٹ کی بری عادتوں کے باعث آسان ہے۔ اگر ابتدا میں حروف کو ملا شوشہ لگائے ورنہ ترچھا لکھا جائے اور تختہ سیاہ، سیلیٹ اور زرد کاغذ پر اتارا جائے تو یقیناً کئی کئی سال تک خوشخطی کی بار بار مشق طلبا کے لیئے ضروری نہ رہیگی۔ SCRIPT (چھاپہ) کا عکس لینا بدخطی کا عمدہ علاج ہے۔
انگریزی میں چونکہ اُردو کی طرح حروف کی شکلیں مرکبات میں نہیں بدلتیں بلکہ تلفظ میں اکثر فرق آجاتا ہے اس لیئے بولنے کی مشق شروع ہی سے ہونی چاہیئے اس کے بعد پڑھنے پر اور آخر میں املا پر زور دیا جاتا ہے۔ چونکہ ایک غیر زبان کی تحصیل ہمارے لیئے کارآمد ہے اس کے سکھانے میں جدتیں کرنا یا اہلِ مغرب سے سبق لینا ہرگز عبث نہیں مگر اس زبان کو مادری زبان کے ساتھ ساتھ پانچ چھے سال کی عمر سے شروع کرا دینا اس کو حد سے زیادہ اہمیت دینا ہے اور غالباً اپنی قدرتی زبان اور دیگر مفید علوم کی حق تلفی۔ یہ بھی خیال ہے کہ چھوٹے بچوں کو پڑھانے میں عموماً صحیح تلفظ اور محاوراتِ جدیدہ سے ناواقف مرد ہرگز اس معلمہ کی ہمسری نہیں کر سکتے جس سے بچے فطرتاً مانوس ہوں اور جوان کی مشکلات کے حل کرنے میں مہارت رکھتی ہو۔ اور شاید اسی باعث چھوٹے دماغوں سے بمقابلہ مرد کے کہیں زیادہ کام لے سکتی ہو۔

(۴) حساب۔ سب سے زیادہ خشک مضمون ہے اور بہت مشکل سے دلچسپ بنایا جاتا ہے اس کا روزانہ کاروبار سے تعلق پیدا کرنا ابتدا میں زیادہ مفید ثابت نہ ہوگا۔ لیکن بچوں کو کسی سوال یا قاعدہ کا مقصد سمجھانے اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ مدرسہ کی

عمارت۔ میدان باغ اور فرنیچر کی ناپ و قیمت کا اندازہ لگایا جائے مرمت اور صفائی سفیدی وغیرہ کے سلسلہ میں بھی حساب کی ضرورت ہوتی ہے۔ طلبہ اس میں خوب حصہ لیتے ہیں روزانہ اخراجات بل، ماہانہ بجٹ، سیر سیاحت کے خرچ کا تخمینہ وغیرہ درجہ ۳ و ۴ کے طلبہ کے لیئے مناسب ہوگا۔ سکاؤٹنگ میں فاصلوں اور بدن کی پیمایش اور اس کا استعمال بہت دلچسپ ہے۔ اپنے مختلف کپڑوں کے لیئے تخمینہ خرچ، لکڑی و گتے کے دستی کام میں سامان مطلوبہ کی مقدار۔ روزانہ کی حاضریاں اور ماہانہ اوسط نکالنا سب کو حساب کی تعلیم میں شامل کرنا ممکن ہے مدرسہ کی دوکان واقعی اور فرضی دونوں حالتوں میں مفید ہے۔ بچے خود تصاویر اور نمونوں کو جمع کرکے دوکان کو سجا لیتے ہیں۔
اپنے گھر کی ضروریات کا اندازہ لگانا یا مکان کی تعمیر کا "کھیل" کھلایا جا سکتا ہے۔ گاہے گاہے اصلی دوکانوں کو اور دیگر کاروبار متعلقہ ضروریات زندگی مثلاً منڈی، چنگی، ٹھیکہ داران کا دفتر وغیرہ کو دکھا دینا چاہیئے تاکہ بچوں کے کھیلوں میں واقعیت کی جھلک پیدا ہو جائے۔ ایک مفید مشق جس کی اہمیت موجودہ حالات میں بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ ہے کہ دی ہوئی رقم سے ایک خاص شے مثلاً خوراک یا لباس کی کوئی چیز کس طرح خریدیں کہ اس رقم میں بہترین سودا ہو سکے۔ اکثر مدرس اپنے شاگردوں کو ہفتہ میں ایک دن اس لیئے دیتے ہیں کہ وہ حساب کے ان سوالات کو جماعت میں پیش کریں جو مدرسہ سے باہر مکان یا بازار میں ان کے مشاہدہ میں آئے ہوں۔
کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ بڑے درجوں کے طلبہ بلک اور سرکاری محکموں کے دفاتر میں کبھی کبھی سالانہ آمد و خرچ کا مطالعہ کیوں نہ کیا کریں۔ ٹیکس لگانے کی مشق بڑی دلچسپ ہے اور بڑے درجہ میں بنک کو فرضی طریقہ پر چلانے سے سود و کمیشن اور کٹوتی وغیرہ کی مشکلات آسان ہو جائینگی۔ گنتی سکھانے کے لیئے پوسٹ مین کا کھیل۔ کمرہ میں داخل ہونے سے پیشتر اپنے نمبر کو دروازہ پر کھٹ کھٹانا۔ تاش کے کھیل سے بہتر ہے۔ البتہ اُستادوں کو ابتدا ہی سے چند ایک امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

(۱) تیلیوں، گٹھوں اور دانوں وغیرہ کا استعمال ضروری نہیں کہ ہر طالب علم کے لیئے مناسب ہو۔ چند پراگندہ دماغ تو اس شے پر زیادہ متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی تعداد پر دھیان نہیں دیتے پس خالی ہندسوں اور نقطوں کی اہمیت نہ فراموش کی جائے۔

(۲) موٹے ہندسے اور خوش خط رنگین حروف کافی مقدار میں لڑکوں کے پیش نظر رہنے چاہئیں خراب ہندسے لکھنے کا باعث اکثر کوئی نقش اول ہی ہوتا ہے۔

(۳) سوال کو سمجھنے پر کم از کم اتنا ہی زور دینا چاہیئے کہ جتنا اُن کے حل پر۔

(۴) جمع و ضرب کے پہاڑوں کو رٹاتے وقت ان کا عملی اور مفید استعمال کھیل وغیرہ میں ضرور کرایا جائے۔

(۵) پھُرتی سے جواب نکالنے کی قدر کی جائے۔

(۶) باقاعدہ اور صاف عمل کو حساب کی مستقل خصوصیت بنائی جائے۔

اب تک میں نے ان طریقوں کو بلا کسی خاص تشریح کے بیان کیا جو فرداً فرداً ہر مضمون کی کامیابی کے لیئے مفید اور ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ میدان اتنا وسیع ہے کہ مجبوراً بہت سی پیش پا اُفتادہ حقیقتوں کو چھوڑنا پڑا۔ اب چند اُمور نفسیاتی نقطۂ نظر سے اور پیش کرتا ہوں کیونکہ ان کا اثر تقریباً سب مضامین کی تعلیم پر پڑتا ہے اور وہ آج کل ماہرین تعلیم کی توجہ کا مرکز ہیں۔

(۱) بچوں پر انفرادی توجہ۔ یعنی ہر مضمون کی تعلیم میں نہ صرف مختلف بچوں کی دماغی تبدیلیوں کو نظر غور سے جانچنا اور بے توجہی اور دماغی کمزوری غیر معمولی ذہانت وغیرہ کے اسباب کی غیر وقت میں تلاش کرنا بلکہ نہایت کمزور اور نہایت ہوشیار طلباء کو ان کی قوت طلب کے مطابق ایسے کام میں لگانا کہ تضیع اوقات نہ ہو۔

(۲) اکثر ہوشیار بچے کمزور ساتھیوں کو اُستاد کے ایما یا اپنی ہمدردی کے جوش میں پڑھاتے ہیں اور اُن کی طرز تعلیم کو اُستاد معمولی رہنمائی کے بعد بہتر بھی بنا سکتا ہے۔ مگر صرف یہی ایک علاج نہیں بلکہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ تمام جماعت کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں حسب ضرورت و مصلحت تقسیم کر دیا جائے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ معمولی لیاقت کے طلبہ بھی جتھوں میں منقسم ہو کر کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ بے شک ہم ابھی اہلِ مغرب کی طرح بچوں کو پوری آزادی نہیں دے سکتے۔ مگر تیس بتیس انسانی بھیڑوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا سراسر ظلم ہے۔

(۳) اگر بچوں کے باہمی برتاؤ کا مدرسہ میں اور باہر مشاہدہ کیا جائے تو اس سے موجودہ نظامِ تعلیم اور مساعی کی کامیابی اور ناکامی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے لیئے بچوں کی ذہنیت تیار کرنے کے

لیے اتادبی ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ چال چلن کی عمدگی، رواداری، ادب، حیا، محنت، جفاکشی وغیرہ صفات محمودہ کا حصول محض قسمت پر چھوڑ دینا سخت نادانی ہے۔ ٹریننگ کالج کے محققین جہاں عمر و ذہنیت کی لحاظ سے مختلف مضامین کا مناسب نصاب تیار کرنے میں کوشاں ہیں وہاں ان کو چاہیے کہ اساتذہ کی رہ نمائی کے لیئے ان تدبیروں پر بھی غور کریں جن کی مدد سے بچے نہ صرف بری حرکتوں اور مخرب اخلاق امور سے پاک رہیں۔ بلکہ کارآمد، روادار اور راہنما شہری بن سکیں۔ اس مشکل کا حل غالباً مشرقی و اسلامی مشاہیر کے ہاں موجود ہے۔ مگر اہل امریکہ نے بھی اپنے مدرسوں میں ایسے مشاغل کا رواج دیا ہے۔ جو زندگی کے اصلی مراحل سے مشابہ ہیں اور لڑکوں کو بدی کے بجائے اچھی سیدھی راہ پر چلنے کا عادی بناتے ہیں۔

بچوں کی خانگی اور مدرسہ کی زندگی میں ربط پیدا کر کے ایک کے تجربات اور شوقوں سے دوسری جگہ فائدہ اٹھایا جائے تو سرپرستوں کو مدرسہ سے دلچسپی و عملی ہمدردی پیدا ہوگی اور طریقہ تعلیم کی جدتیں استادوں میں مسرت اور سکون قلب کا باعث ہونگی۔

(۳) کھلی ہوا میں بغیر ساز و سامان کے تعلیم دینا۔ مطالعہ فطرت میں، جغرافیہ میں، علم جمادات و حیوانات میں، موسموں کے مطالعہ میں ادب کی تعلیم میں دن بدن زیادہ مفید اور موزوں ثابت ہوتا جاتا ہے۔ اس سے صحت بہتر ہوتی ہے، سادہ زندگی کی قدر پیدا ہوتی ہے اور بچوں کو صحیح ڈسپلن سیکھنے اور مل جل کر کام کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

(۴) اپنے مدرسہ کو دن بدن زیادہ خوبیوں اور کام کی باتوں سے متصف بنانے کے لیئے استادوں کو جدید تعلیمی ادب اور تجربات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ باہمی بحث و مباحثہ اور ترمیم کی ضرورت ہے۔ اور پھر تجاویز کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کی۔ ایک ماہر تعلیم کی تو قطعی رائے ہے کہ استادوں کو اپنے ارتقائے دماغی اور کام کو کماحقہ انجام دینے کے لیئے، تمام زندہ علوم و مسائل کی مبتدیات سے باخبر ہونا مناسب ہے۔ یعنی ان کو سیاسیات، معاشرت، سائنس اور اقتصادیات کے ان اہم اور بڑے بڑے مسائل کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے جن کا تعلق تعلیم سے ہو اور جو تعلیم پر اثر ڈالیں۔ تاکہ حسب ضرورت زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی کام میں اصلاح ہو سکے اور جب ان کے شاگرد ان کے زیر اثر تربیت پاکر دنیا میں جائیں تو وہ اس کے مسائل کو سمجھنے اور

ان کو حل کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ تعلیم کا انحصار تمام و کمال استادوں کی شخصیت پر ہے
اور جب تک وہ اپنے کام کی عظمت کو نہ سمجھیں اور خود کو اس کی تکمیل کے قابل نہ بنا لینگے مدرسہ استادوں
اور طلبا دونوں کے لیے وقت گزارنے کی ایک جگہ ہوگی جہاں وہ طوعاً و کرہاً ایک دوسرے کے ساتھ
رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر شوق خدمت اور اپنے نفس میں محاسن کی تحصیل کر کے استادوں نے اپنی
شخصیت اور وجاہت کو منتظم کر لیا، تو وہ قوم کی تعمیر نو میں نہایت قابل قدر حصہ لے سکینگے اور دنیا
قوم بھی ان کو عزت اور وجاہت کا وہ مرتبہ دیگی کہ جس کا وہ خود کو مستحق بنا لینگے۔

حکومت خود اختیاری کے تجربات
حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت میں

نفسیات کی جدید ترین تحقیقات کی بناء پر ایڈمنڈ ہومز (Edmond Holmes) نے

"ہر کام کے وقت کام اچھا
اور کھیل کے وقت کھیل زیبا"

کے قدیم مگر مقبول عام اصول کو مردود اور قابل تغیر قرار دیا ہے وہ کہتا ہے کہ :-

"کام کرتے ہوئے کھیلو اور کھیلتے ہوئے کام کرو"

اِس کا مطلب یہ ہے کہ کام میں مہارتِ تامہ حاصل کرو تاکہ تمھاری دل چسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ کام تمھیں کھیل جیسا لطف دے اور تمھارا کھیل اس قدر مفید اور کارآمد ہو کہ اُسے کام کہا جا سکے۔

کارل گروس (Karl Groos) نے جو نظریہ کھیل کا پیش کیا ہے اور میکڈوگل (McDougall) نے اس نظریہ کی جو تاویل کی ہے اس نے کام اور کھیل کے مابہ الامتیاز کو قریب قریب مٹا دیا ہے۔ اُن کے نزدیک ہر وہ کام کھیل ہے جس میں دل چسپی کی بناء پر لطف حاصل ہو اور کسی قسم کا جبر و اکراہ اس باب میں ہم پر نہ ہو۔

اِس مسئلہ نے طریقۂ تعلیم میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے ایک اُستاد سے آج کل یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مضمون میں طلباء کے واسطے گوناگوں دل چسپیاں پیدا کر کے اُس کو اتنا دل چسپ اور لطف انگیز بنا دے کہ وہ اُس میں پوری دل چسپی کے ساتھ منہمک ہو جائیں۔

تعلیم مضامین سے گزر کر ضبط مدرسہ میں بھی اس نظریہ کو آزمایا جا رہا ہے۔ اس صورت میں اُس نے "سیلف گورنمنٹ" کی شکل اختیار کی ہے۔ جس کا تجربہ اوّل اوّل مسٹر سمپسن (Simpson) نے انگلستان میں کیا تھا۔

اِس کا خیال مسٹر ہومر لین (Homer Lane) کے اُس تجربہ سے پیدا ہوا جو جارج کی "جمہوریت صغیر" کی بناء پر صاحب موصوف نے کیا تھا اس کی ابتدا یوں ہوئی۔

قانونِ اطفال مجریہ ۱۹۱۸ء کی رُو سے ایک عاقل اور دُور اندیش جج نے چودہ سال اور اُس سے کچھ اوپر کے نوعمر مجرموں کو مسٹر ہومرلین کے حوالہ کیا۔ اس نے ان کی تربیت کا انتظام کیا ایک محیّر العقل خصوصیت اس اسکیم کی یہ تھی کہ وہ بچے کسی موضوعہ قانون یا بیرونی ضبط و تادیب کے ماتحت نہ تھے صرف اُن کے اپنے بنائے ہوئے قوانین تھے جن کی اُن کو مدّ بعت کرنی پڑتی تھی وہ اپنے معاملات میں بالکل آزاد اور خود مختار تھے۔

ہومرلین کا خیال تھا کہ صغر سنی کے جرائم بدطینتی یا بدی کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ وہ قویٰ جو خالقِ حقیقی نے بچّوں میں ودیعت کیئے ہیں جب اُن سے مناسب کام نہیں لیئے جاتے تو نقصان دہ اور غیر آئینی حرکات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اس لیئے اُن جرائم کا اندفاع فطری قوائے کے دبانے سے ممکن نہیں بلکہ اُن کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن کو قوت کے صَرف کرنے کے عمدہ طریقے اور مناسب محل استعمال بتائے جائیں ہومرلین کے تجربہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچے جن کی اصلاح سے والدین مایوس ہو چکے تھے اور جو گلیوں اور کوچوں کی آفت بنے ہوئے تھے دیانت داری اور محنت سے کام کرنے والے بن گئے اُن کو کام کرنے کے لیئے مجبور کرنا تو کجا معمولی طور پر بھی یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ وہ کام کریں البتہ یہ انتظام تھا کہ جو کام کر کے روزی نہ کماتے تھے اُن کو دوسروں کی خیرات پر گزارہ کر کے انتہائی ذلت کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔

جب خود مختاری اور ذمّہ داری سالہا سال کے خراب شدہ بچّوں کو راہِ راست پر لانے میں مفید ثابت ہوئی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ عام طور پر ضبط مدرسہ میں یہ اکسیر ثابت نہ ہو۔ کیونکہ جب وضع قوانین میں ہر طالب علم کا انفرادی حصّہ ہوگا تو اُن پر عمل کرنا ہر بچہ اپنا اپنا فرض سمجھیگا۔

یہ خیالات تھے جو میں ٹریننگ کالج سے لے کر آیا تھا اور عزم راسخ تھا کہ ان کا تجربہ کرونگا لیکن دورانِ ٹریننگ کے اکثر اچھے اچھے ارادے سکول کی چار دیواری میں قدم رکھنے کے بعد پورے نہیں ہوا کرتے۔ چنانچہ مجھے مہینوں بھول کر بھی اس کا خیال نہ آیا لیکن جب جماعت میں کتابوں کی چوری کی وبا پھیلی اور ہر روز شکایات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہ آیا تو خیال ہوا کہ شاید یہی طریقہ کارگر ہو۔ عالم مایوسی میں اس تجربہ کو شروع کیا گیا لیکن نتائج واقعی حیرت انگیز اور تعجب خیز تھے۔

علاوہ اس کے چند اور دقتیں بھی مجھے محسوس ہو رہی تھیں جن کا حل ضروری تھا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اُن کو رفع کیا جائے۔

تقریباً ہر مدرسے میں یہ طریقہ ہے کہ جماعت میں سے ایک طالب علم مانیٹر مقرر کیا جاتا ہے۔ بعض مرتبہ اُستاد محض ایک گھنٹہ کے لیئے نہیں بلکہ کئی کئی گھنٹوں تک جماعت میں نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی اُس کا نمائندہ جماعت میں نہ رہے تو ضبط خراب ہو جاتا ہے وہ طلبا نہ خود کام کرتے ہیں اور نہ اپنے شور و شغب سے برابر کی جماعتوں کو کام کرنے دیتے ہیں۔ اس خرابی کو رفع کرنے کے لیئے مانیٹر مقرر کیئے جاتے ہیں۔

سب سے بڑی مشکل تو مانیٹر کے انتخاب میں پیش آتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جماعت کا بہترین لڑکا اپنے ہم جماعتوں کو قابو میں رکھنے کا اہل نہیں ہوتا برخلاف اس کے جماعت کا شریر ترین لڑکا اس کا اہل ہوتا ہے کیونکہ لڑکے اُس سے ڈرتے ہیں۔ علاوہ بریں جواب دہی اور ذمہ داری اُس کی عادات کی اکثر اصلاح بھی کر دیتی ہے لیکن اگر وہ صرف شریر نہ ہو بلکہ بد بھی ہو تو زمام اختیار اُس کے ہاتھ میں دینے سے جماعت میں خرابی اور ابتری کا اندیشہ دوچند ہو جاتا ہے۔ دوسرا نقص مونیٹوریل سسٹم میں یہ ہے کہ خود مانیٹر کو بہت پریشانی اُٹھانی پڑتی ہے علاوہ اس کے روک ٹوک یا شکایت پر شریر طلبا اُس کے دشمن بن جاتے ہیں اُس کی تعلیم میں بہت ہرج واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت سے کاموں کا واحد ذمہ دار ہوتا ہے۔ چاک اُسے لانا پڑتا ہے۔ ڈسٹر اور نقشہ کے سٹینڈ کی موجودگی کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ جماعت کی تختۂ حاضری اور سکول کی حاضری کے بورڈ پر اُسے حاضری بھرنی پڑتی ہے کمرہ کے فرنیچر کی نگہداشت اُس کا فرض ہوتا ہے ان فرائض کی انجام دہی میں اس کا بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے سمجھدار طلباء مانیٹر بننے سے بچتے ہیں۔ بعض اساتذہ نے اس عقدہ کا یہ حل سوچا ہے کہ وہ ہر ہفتہ نیا مانیٹر بدل دیتے ہیں۔ اس طرح جماعت کا ہر لڑکا باری باری مانیٹری کے فرائض انجام دیتا رہتا ہے لیکن یہ طریقہ بھی چند وجوہ سے قابل پذیرائی نہیں۔ کیونکہ ہر طالب علم تو مانیٹری کا اہل نہیں ہوتا۔ اغلب نہیں یقینی ہے کہ جماعت میں چند شریر اور بد لڑکے ایسے نکل آئیں کہ جن کی ذات سے جماعت کو نقصان پہونچے۔ کیونکہ مانیٹر کا ضرور جماعت پر کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے۔ اُس کو اختیارات بھی دیئے جاتے ہیں۔ اکثر مرتبہ اُستاد کو اُس کی حمایت بھی کرنی پڑتی ہے۔ جماعت کو مجبوراً بھی کرنا پڑتا ہے کہ اُس کا کہا مانیں اور ایک گونہ اُس کی تعظیم کریں۔ اس بنا پر جماعت میں ایک ہفتہ نہیں کئی ہفتے نظام شاہی کا اندیشہ ہوتا ہے۔

متذکرۂ بالا خرابیوں کی اصلاح کے علاوہ ایک اور نہایت مفید مقصد بھی میرے پیش نظر تھا۔ من جملہ اور مقاصد کے تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ ہم کو کش مکش حیات کے لیئے بوجہ اتم تیار کرے اور ہم کو اس قابل بنائے کہ جتنے مواقع بھی ہمیں زندگی میں پیش آئیں ہم اُن سے باحسن وجوہ عہدہ برآ ہو سکیں۔ سیلف گورنمنٹ کی سکیم سے مجھے حسب ذیل فرید فوائد مترتب ہوتے نظر آئے۔

(۱) موجودہ زمانے میں جب کہ ملک کا ہر آدمی سوراجیہ کے واسطے چیخ رہا ہے سب سے ضروری یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ نئی نسل میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ اپنا بہترین نمایندہ منتخب کر سکیں وہ رائے دینے کی اہمیت کو محسوس کریں۔ جب طلبا کے شروع سے ہی یہ ذہن نشین کیا جائیگا تو اُمید ہے کہ وہ آیندہ زندگی میں سمجھ دار ذمہ دار اور قابل اعتبار شہری بن سکیں گے۔

(۲) جو لوگ منتخب ہونگے وہ سیکھینگے کہ نمایندگی کے کیا معنی اور فرایض ہیں۔ اور اُمید ہو سکتی ہے کہ اگر وہ اس تربیت کے بعد آیندہ زندگی میں پبلک کے نمایندے منتخب ہوئے تو بہتر اور زیادہ ذمہ دار نمایندے ثابت ہونگے۔

(۳) تقسیم کار کے زرّیں اُصول کو طلبا اچھی طرح سے عملی طور پر سمجھ سکینگے اور آیندہ زندگی میں فائدہ اُٹھا سکیں گے۔

(۴) اِس صورت میں تعلیم کا مفہوم محض چند کتابوں کا پڑھانا نہ ہوگا بلکہ وہ اپنے وسیع ترین معنی میں تعلیم کہلائی جا سکے گی۔

اِن مختصر مقاصد و فوائد کے بعد میں اپنی سکیم کا ایک مختصر سا خاکہ نذرِ ناظرین کرتا ہوں۔ میں نے چار محکمے قائم کیئے۔

(۱) حفظانِ صحت

(۲) پولیس

(۳) خفیہ پولیس

(۴) تعلیم

سوائے خفیہ پولیس کے ہر محکمہ میں دو ممبر بذریعہ آرا منتخب کیئے گئے۔ ممبروں کے علاوہ ایک جج بذریعہ راؤں کے منتخب کیا اور دوسرا خود نامزد کیا۔ یہ نامزدگی محض شرطِ احتیاط تھی کیونکہ لڑکے بہرحال

لڑکے ہیں ممکن ہے کہ وہ نادانی یا بے جا طرفداری سے نا اہل یا شریر ممبر کو منتخب کرلیں۔ نامزدگی سے اِس صورت کی ممکن خرابیوں کا سدِّباب مقصود تھا۔ علاوہ بریں یہ انتظام عارضی تھا اور آیندہ چل کر تمام تر تقرر انتخاب پر منحصر ہو سکتا ہے۔ ہر محکمہ کا صدر کلاس ٹیچر ہوتا تھا اور اُس کا فیصلہ ہر حالت میں آخری فیصلہ قرار دیا جاتا تھا۔ (بشرطیکہ اس کو اس طرح قطعی فیصلہ دینے کی ضرورت آپڑے)

فرائض:۔

(۱) پولیس کا فرض تھا کہ وہ کمرے کے تمام سامان کی حفاظت کرے نقصان کرنے والوں کی رپورٹ جج سے کرے، شرارت اور شور وشغب کی روک تھام کرے۔ چاک ڈسٹر اور دیگر ضروریات کی بہم رسانی کرے۔ مجرموں کی دیکھ بھال کرے۔ اُن پر فردِ جرم لگا کر ججوں کے سامنے مع ثبوت جرم پیش کرے لیکن کسی حالت میں اُن کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ خود سزا دے۔

(۲) حفظانِ صحت۔ کمرہ کی صفائی، مُضرِ صحت اسباب کا تدارک، طلبا کو مناسب ورزشِ جسمانی کی ترغیب۔

(۳) تعلیم۔ کمزور طلبا کی تعلیمی حالت کی دیکھ بھال اُن کی ضروریات کا اندازہ کرنا۔ خود امداد دینا اور اُن کی کمزوری رفع کرنے کی تدابیر سوچنا اور ان تدابیر کو اُستاد کے سامنے پیش کرنا۔

(۴) خفیہ پولیس۔ اس محکمہ میں انتخاب سے کام نہیں لیا گیا بلکہ میں نے خود نہایت ہی خفیہ طریق سے دو لڑکوں کو نامزد کیا۔ یہاں تک احتیاط برتی گئی کہ اُن دونوں میں سے بھی ایک کو دوسرے کی نامزدگی کا حال معلوم نہیں ہوا۔ نامزدگی کے اخفا میں علاوہ اور مصلحتوں کے ایک مصلحت یہ بھی مدِ نظر تھی کہ وہ آزادی سے بغیر اس اندیشہ کے کسی کی رنجش کا موجب ہو رہے ہیں کام کرسکیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اس محکمہ ہی کو پسند نہ کریں۔ لیکن یہ اس تجربہ کا کوئی لازمی جزو نہیں۔ بلکہ جن حالات میں اِس سکول میں سیلف گورنمنٹ کا تجربہ طلبا میں شروع کیا گیا اُن کی وجہ سے یہ اس کا جُزو بن گیا تھا۔

یہ امر خاص طور سے ملحوظِ خاطر رکھا گیا کہ ایسے شریر ترین لڑکوں کو نامزد کیا جائے جو بد طینت نہ ہوں کیونکہ "ولی را ولی می شناسد" کے مطابق شریر ہی شرارتوں کا پتہ چلا سکتا ہے۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ سرکش سے سرکش اور شریر سے شریر لڑکے کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اُستاد کا معتمد علیہ ہے تو وہ خود اپنے عیوب

صاف صاف بتا دیا کرتا ہے اور اس طرح بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ ان سے حلفیہ اقرار لیا گیا کہ وہ جھوٹی رپورٹیں نہ کرینگے اور رپورٹ پیش کرنے میں ذاتی اغراض اور بغض وعناد سے کام نہ لینگے۔ اُن کا فرض تھا کہ خفیہ مجلسوں اور پرائیویٹ گفتگو کا حال معلوم کرکے رپورٹ کیا کریں۔

جج جملہ اُمور و قضایا کا فیصلہ کرتے تھے اور ہر محکمہ کے ممبر (سوائے خفیہ پولیس کے) ان کی اجازت اور مشورہ سے کام کرتے تھے۔ ان دونوں کو اجازت تھی کہ وہ خود اپنی مرضی سے ایک سراغ رساں مقرر کرلیں جو اُن کو خبر بھی پہونچاتا ہے لیکن محکمہ خفیہ پولیس کا اُن سے کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ جملہ انتخابات ہر ٹرم کے شروع میں ہوتے تھے۔ لیکن یہ امر ضروری نہیں کہ جو طالب علم ایک دفعہ انتخاب میں آجائے وہ دوبارہ منتخب نہ ہوسکے۔

تین ماہ کے بعد جو نتائج اس سے مرتب ہوئے وہ فی الحقیقت بالکل خلافِ توقع اور حیرت انگیز تھے۔ میری غیر حاضری میں جماعت میں حد درجہ کا امن اور خاموشی رہتی تھی۔ لڑائی جھگڑے کی واردتیں یک قلم بند ہوگئیں۔ اِس کے بعد چوری کی شکایت شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی تھی۔ طلبا میں باہمی ہمدردی، اخوت اور یگانگت پیدا ہوگئی۔ میری عدم موجودگی میں تعلیمی مانیٹر کمزور بھائیوں کو اسباق یاد کراتے رہتے تھے۔ طلبا کی اخلاقی حالت کے متعلق میری اپنی واقفیت بدرجہا صحیح اور زیادہ ہوگئی۔ کلاس کا "ٹون" اعلیٰ ہو گیا۔

ممکن ہے کہ یہ کامیابی مجھے اس وجہ سے حاصل ہوئی ہو کہ میں اس جماعت یعنی نویں کا انچارج ماسٹر تھا۔ اور اکثر طلبا سمجھدار تھے لیکن چھوٹی جماعتوں میں بھی میرا خیال ہے کہ یہ سکیم کامیاب ثابت ہوگی کیونکہ بہرحال پانچ سات سمجھدار بچے چھوٹی جماعت میں بھی نکل آئیں گے۔

یہ ایک تجربہ تھا جو ہدیۂ ناظرین کیا گیا اُمید ہے کہ بہتر دماغ اس سے زیادہ مفید سکیم سوچ سکیں گے یا مناسب ترمیم و تنسیخ کرکے اسی کو زیادہ موثر اور کارآمد بنا سکیں گے۔ اس کے پیش کرنے سے بحث کا چھیڑنا مقصد ہے۔ میں مشکور ہونگا اگر قارئین کرام میں سے بعض اصحاب اس پر غور و خوض فرمائیں مناسب ترمیم کریں اور اپنے تجربوں کو دوسروں تک پہونچائیں۔

سید اشفاق حسین

اقتباسات

ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بیکاری

مسٹر ایم فروسٹ جنیوا کے رسالے Vox studentium (طالبِ علم کی آواز) میں لکھتے ہیں :-

"... آرٹ اور سائنس کے گریجوایٹ اور بی اے فیل سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بیکار ہیں اُن کے خاندان والے اس موہوم امید میں رہتے ہیں کہ وہ کسی دن اُن کی کفالت کر سکیں گے۔ اُنھوں نے ہر طرح کی تکلفیں اٹھائی ہیں تاکہ نوجوان اپنی تعلیم کو مکمل کر سکے۔ لیکن اس تعلیم یافتہ نوجوان کی بازار میں کوئی مانگ اور قیمت نہیں اور وہ کسی قسم کی کمائی نہیں کر سکتے۔ وہ محض اس قابل ہوتا ہے کہ کلرک ہو جائے لیکن ایسے کلرکوں کی مانگ جنھوں نے کوئی خاص کام نہ سیکھا ہو محدود ہے۔ حال ہی میں ایک کلکٹر ضلع نے بیان کیا تھا کہ اُس کے یہاں ۹۲ بی اے پاس طلبا کے نام امیدواری میں درج تھے جو ۳۵ روپیے ماہوار کی ملازمت چاہتے تھے لیکن تمام جگہیں بھری جا چکی تھیں اور اُن کے لئے کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ ناقابلِ اطمینان حالت بہت سی باتوں کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ نصابِ تعلیم کو الزام دیتے ہیں کہ وہ ملک کی ضروریات کے لئے مناسب نہیں اور صنعتی تعلیم کی ترقی پر زور دیتے ہیں مثلاً انجنیری، نجاری، پارچہ بافی اور دھات کے کام کی تعلیم۔ لیکن ملک کے مخصوص حالات کی وجہ سے یہ نہایت مشکل ہے۔ جہاں صدیوں سے ہر قسم کی دستکاریاں اور پیشے ذات کی بنا پر منقسم ہوں وہاں کسی قسم کی صنعت و حرفت مثلاً پارچہ بافی کو بطور خود جاری کرنے میں یہ دقت حائل ہو گی کہ پارچہ بافوں کی تمام برادری سے مقابلہ کرنا پڑیگا جو نہ صرف اپنی ساکھ قائم کر چکے ہیں بلکہ معیارِ زندگی پست ہونے کی وجہ سے اتنے کم خرچ میں چیز بنا سکتے ہیں کہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ لوگ اُن کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یورپ اور امریکہ میں اس امر کے خلاف کوئی رکاوٹ نہیں۔ جو نوجوان چاہے حجام یا سبزی فروش یا معمار بن سکتا ہے لیکن یہاں ذات کی قیود کی وجہ سے اس کو پیشے کے انتخاب میں زیادہ آزادی نہیں مل سکتی۔ وہ مقامی ضروریات کا بھی پابند ہوتا ہے۔ ایک یورپ کا شخص جس ملک میں چاہے کھانا

کھا سکتا ہے اس کو اپنے مذاق کے مطابق کھانا مل جائے گا۔ لیکن ہم مشکل سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان میں اکثر لوگ کس درجہ پابند ہوتے ہیں کہ وہ ایسی جگہ رہیں جہاں اُن کو اپنی خوراک ٹھیک طریقے سے تیار کی ہوئی اور اپنی ہی ذات کے لوگوں کی پکائی مل سکے۔

علاوہ بریں شاید ہندوستانی طالب علم میں وراثتاً ایک ایسا فلسفہ زندگی ودیعت کیا گیا ہے جو اس کے راستہ میں حائل ہے۔ ایک قسم کی تقدیر پرستی، جمود، ہمت کا ہار بیٹھنا جو اس پر مغربی لوگوں کی نسبت زیادہ جلدی حاوی ہو جاتے ہیں۔ "جس نے ہمت ہار دی وہ سب کچھ کھو بیٹھا" اکثر خاندانوں کے افلاس کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ ان میں قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے اور قوت تسخیر اور فعالیت کم! شاید یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند میں شمالی ہند کا زیادہ مستقل مزاج اور ہمت والا مسلمان سوداگر تجارت پر جلد قبضہ کر لیتا ہے ... یہ سب واقعات الم ناک ہیں لیکن ہمیں ان تکلیف دہ اور کٹھن واقعات سے دوچار ہونا چاہیئے کیوں کہ جب مختلف ممالک کے طلبا ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو ان میں باہمی ہمدردی اور امداد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس سے تمام دنیا کے طلبا کی اخوت کا احساس مستحکم ہو کر ان کو آگے بڑھنے کے عزم میں مدد دیتا ہے۔

روس میں علمی مزدوروں کی حالت

(Intellectual workers in Rusia)

مسٹر ایچ ۔جی ۔سٹیونز (H G. St. euens) انگلستان سے "روس کے علمی مزدوروں کی حالت" کے متعلق لکھتے ہیں :۔

سوویٹ روس اور باقی ممالک کے اور تمام اختلافات کی طرح علمی مزدوروں کی حالت کا اختلاف بھی وہاں کے نظام معاشرت کی وجہ سے ہے۔ ۱۹۱۷ء کا انقلاب بدیہی طور پر مزدوروں اور کاشتکاروں کی بغاوت تھی اس نظام معاشرت کے برخلاف جو زار کے عہد میں قائم تھا اور جب انقلاب میں کامیابی ہوئی تو وہ تمام نشانات مٹا دیئے گئے۔ جو اس عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ نئے حکمرانوں نے اس اصول پر عمل کیا کہ "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارے خلاف ہے" اور ہر شخص کو مع "علمی مزدوروں" کے اسی معیار پر جانچا کہ وہ کہاں تک ان کے خلاف یا موافق ہے۔ عہد زار کے ہر قسم اور ہر مرتبہ کے اہل علم کا یہ خیال تھا

(زیادہ تر پیشہ ور اور صنعت و حرفت والوں کا اور بالعموم ماہرین سائنس اور ماہرین تعلیم اور ماہرین فنون لطیفہ) کا کہ ان کا تمام مستقبل نظام قدیم کے ساتھ وابستہ تھا اور اب وہ تباہ ہو جائے گا۔ اس لئے انھوں نے عہد جدید کی انتہائی مخالفت کی اور جب اس کو فتح ہوئی تو ان میں سے بہت سے وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جا بسے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کو ایک بڑی مشکل سے دوچار ہونا پڑا۔ علمی کام کرنے والوں کی مخالفت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ پیشہ ور کاری گر اور قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں تعلیم یافتہ کام کرنے والوں کی بہت کمی واقع ہو گئی۔ انقلاب اور اس کے بعد کی خانہ جنگی، جنگ کے دوران میں حکومت کا ہاتھ سے کام کرنے والوں مزدوروں پر انحصار اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کوشش کہ تمام "مزدوروں" کو خواہ وہ ہاتھ کا کام کرتے ہوں یا دماغی ایک ہی تنخواہ ملنی چاہیئے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے حالت بہت نازک ہو گئی تھی لیکن خانہ جنگی کا زمانہ ختم ہونے پر جب اقتصادی پالیسی کا اجرا ہوا تو حکومت کا رویہ علمی مزدوروں بلکہ تمام پیشہ وروں کی جانب بہت کچھ تبدیل ہو گیا۔ یہ نہیں کہ ایک دم ان کی حالت بہت بہتر ہو گئی بلکہ یہ کہ تعمیر و ترقی کا جو زمانہ آرہا تھا اس کی وجہ سے لازماً ان کی حالت بہتر ہونی شروع ہو گئی۔ ۲۱ سنہ ء تک مختلف پیشوں کے لئے نئے کاریگروں کو یوں ہی غیر منتظم طریق سے تعلیم دی جاتی تھی۔ علاوہ بریں چونکہ تمام قوت جنگ میں صرف ہو رہی تھی اس لئے تعلیم خصوصاً اعلیٰ تعلیم کی جانب سے بے پروائی تھی ریاست کے دیگر شعبوں کی طرح سے تعلیمی خرچ بھی نئی کرنسی کے اجرا کے ذریعے سے پورا کیا جاتا تھا اور اس کی مالی حالت خراب تھی۔ ان تمام حالات کی وجہ سے ۲۱ سنہ ء سے ۲۴ سنہ ء تک طلبا نے خود نہایت تندہی سے یہ کوشش کی کہ اپنی تعلیمی حالت کو بہتر بنائیں۔ تعلیمی شوق نے جوان سوویٹ نوجوانوں میں بہت زور پر تھا بے شمار نو عمر مردوں اور عورتوں کو جو کارخانوں یا فوج میں کام کر رہے تھے۔ طالب علم بنا دیا اور تعلیم گاہوں میں تعداد گنجائش سے کہیں زیادہ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ نئی اقتصادی پالیسی کے ضمن میں مالی اور اقتصادی ضروریات کی وجہ سے تعلیم کے بجٹ میں بہت تخفیف کرنی پڑی اور اسی وجہ سے ان سالوں میں تعلیمی پالیسی میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ایک طرف کوشش تھی کہ تعلیمی مطالبہ پورا کیا جائے اور دوسری طرف خرچ کو بجٹ کی گنجایش کے اندر رکھنا تھا۔ چوں کہ اسی زمانے میں تعلیمی تجربوں اور طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں ترمیم کا زور تھا اس لئے ہر قسم کی تعلیم گاہوں میں ایک بدنظمی اور ہنگامہ تھا۔

سوائے چند مخصوص شعبوں کے مثلاً "مزدوروں کی فیکلٹی"۔

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ زمانہ دراصل تجربہ اور تعمیر کا زمانہ تھا۔ اس قسم کا زمانۂ انقلاب کہیں بھی امن اور خاموشی سے نہیں گزرتا اور اس میں تو خاص طور پر ہر شعبہ زندگی میں نہایت مہتم بالشان مسائل حل طلب تھے۔ خصوصاً پرانی تعلیم اور طریقہ تعلیم کے خلاف جو ردعمل ہوا۔ کیوں کہ وہ ایک زوال پذیر اور پست زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی وجہ سے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم دونوں میں نئے راستوں کی تلاش میں بے شمار تجربے کئے گئے۔

طالب علموں کی حالت اس زمانے میں ایسی ہی خراب تھی جیسی یورپ کے دوسرے ممالک میں۔ تعلیمی سہولتوں کا انحصار اس وقت تک تمام تر معاشرتی معیاروں پر تھا۔ زیادہ تر نوجوان مرد اور عورتیں جو پڑھتی تھیں مزدوروں کی جماعت سے تھیں اور ان کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک اپنی تعلیم کو باطمینان قلب جاری رکھ سکیں۔ لکچروں کے کمروں اور معملوں میں اس قدر ہجوم تھا کہ سائنس کا عملی کام اور یکسوئی سے مطالعہ بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ بعض مقامات پر صورت حال اور بھی زیادہ نازک ہو گئی تھی کیونکہ وہاں رہنے کے لئے جگہ نہ تھی۔ کسی مضمون کی تعلیم کے لئے بھی سامان اور آلات کافی نہ تھے اور پھر یہ کہ تعلیم کا تسلسل بار بار ٹوٹ جاتا تھا کیونکہ طلبا کی کثرت کی وجہ سے کئی مرتبہ طلبا کی تعداد میں کمی کرنی پڑی خصوصاً سنہ ۲۴ء میں جب بہت سے طلبا کو اسی وجہ سے خارج کرنا پڑا۔ اس زمانے کے طلبا کی زندگی شہری چڑیوں کی سی تھی جو علم کے دسترخوان سے ریزے چنتے تھے اور نہایت افلاس کی حالت میں رہتے تھے۔

وہ زمانہ بھی ختم ہو گیا اور سنہ ۲۴ء سے جوں جوں تعلیمی بجٹ میں اضافہ ہوا نصاب اور طریقہ تعلیم میں کسی قدر تعین اور استقلال پیدا ہوا، مقررہ تعداد نئے طلبا کی داخل کی گئی اور ان کی اقتصادی حالت کو سنبھالنے کے لئے حسب ضرورت وظائف دیئے گئے جو ان کی مزدوری کی اجرت کے برابر تھے، طلبا کی حالت سال بسال بہتر ہوتی گئی۔ تعلیمی سہولتوں میں معاشرتی حیثیت کا لحاظ اب تک رکھا جاتا ہے لیکن "علمی مزدوروں" کے بچوں کے لئے اب زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ جوں جوں اقتصادی حالت بہتر ہوتی جائے گی، طلبا کی حالت جو بعض اعتبار سے اب بھی دوسرے ملکوں کے طلبا سے بہتر ہے (مثلاً وظائف، اختصاصی تعلیم، تعلیم کے ختم پر ملازمت ملنے کا یقین وغیرہ) ضرور اور زیادہ بہتر ہو جائے گی۔ کیونکہ سوویٹ کارکن ہیں اب بھی یہی خیال ہے کہ تعلیم اور خصوصاً پیشوں کی اور صنعتی تعلیم نئے نظام معاشرت

کی بنیاد رہی۔

اور ۱۹۲۱ء سے پیشہ ور جماعتوں کا کیا حال ہے؟ . .. . برخلاف ماہرین صنعت وغیرہ کے بہت عرصے تک تعلیمی کام کرنے والوں کی تنخواہ سب پیشوں سے کم رہی اور ۱۹۲۴ء میں ان کی آمدنی بہت سے ہاتھ کا کام کرنے والوں سے کم تھی (۱۹۲۵ء کے شروع میں "انجمن کارکنان تعلیمی" کے اجلاس میں زینو دیف نے کہا تھا کہ استادوں کی جماعت ہی روس کی اصلی مزدور جماعت ہے) معلموں کے بعض خاص طبقوں کو اس وجہ سے بھی بہت نقصان پہنچا کہ علوم قدیم نصاب سے نکال دیئے گئے اور تمام معلموں اور استادوں کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ سیاسی مضامین میں امتحان پاس کریں۔ ....

تاہم بحیثیت مجموعی "علمی مزدوروں" کی اور ماہرین صنعت وحرفت کی حالت بہت سنور گئی ہے کیوں کہ وہ اس عام ترقی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو اقتصادی حالت میں ہوئی ایسے مزدوروں کی مانگ اس تعداد سے زیادہ ہے جو مختلف قسم کی تعلیم گاہیں بہم پہنچا سکتی ہیں اور ابھی چند سال تک کم رہے گی۔ بیکاری صرف اس طبقہ میں ہے جو سودیٹ کے نقطہ نظر سے ناکارہ ہے (مثلاً علوم قدیم کے پروفیسر) یا وہ جو کھلم کھلا سودیٹ کی مخالفت کرتے ہیں اور اس سے اتحاد عمل نہیں کرتے۔ سائنس کی نظری تحقیقات کی اب پہلے جیسی حالت ہوگئی ہے بلکہ علم آثار قدیمہ اور مختلف سیاسی اور معاشرتی علوم کی تحقیقات حکمیہ میں سودیٹ کی حکومت یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ وہ بہت سی حکومتوں سے زیادہ مستعد اور روشن خیال ہے۔ استادوں کی پوزیشن بھی بہت بہتر ہوگئی ہے۔ معاشرتی حیثیت کا فرق اب بھی موجود ہے اور جوں جوں ہم معاشرتی اور "انسانی" علوم کی طرف بڑھتے ہیں یہ امتیاز زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے۔ لیکن بہت سے لحاظ سے علمی مزدوروں نے قومی زندگی میں اپنی جائز حیثیت قائم کرلی ہے اور اگرچہ ان کا مستقبل بہت کچھ آئین اقتصادی پر منحصر ہے پھر بھی وہ اتنا روشن ضرور ہے (اور شاید زیادہ امید افزا) جیسا یورپ کے دوسرے ممالک میں۔ کیونکہ وہاں علم اور علمی تحصیلات کی بہت قدر ہے خصوصاً جب ان کو تمام سوسائٹی کے فائدہ کے لئے استعمال کیا جائے۔

(از VOX STUDENTIUM)

یونیورسٹی کا فرض

پروفیسر الفریڈ زمرن Alfred Zimmern اپنے مضمون "یونیورسٹیاں اور بین الاقوامی تحریک" میں لکھتے ہیں۔

یونیورسٹیاں دو مقاصد کے لئے ہیں جن میں سے پہلا مقصد تہذیب قومی ہے میں کسی بین الاقوامی یونیورسٹی پر ایمان نہیں رکھتا۔ ایک معنی میں تو تمام بڑی یونیورسٹیاں بین الاقوامی ہیں کیوں کہ وہاں مختلف قوموں کے طالب علم پڑھتے ہیں لیکن در اصل یونیورسٹی وہ تعلیم گاہ ہے جہاں انگریز صحیح معنوں میں اور زیادہ انگریز بن جائے ایک جرمن زیادہ جرمن بن جائے۔ جہاں ادب اور فنون لطیفہ جو اس قوم کی تہذیب میں بہترین ہوں پھلتے پھولتے ہیں دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ "قومیت" کی پرورش گاہیں ہیں اور اس "شخصیت" کی جو قومیت کے اظہار سے پیدا ہوتی ہے۔ "قومیت" کے صرف یہی معنی ہیں کہ "شخصیت" کو مکمل ترین فروغ دیا جائے۔ تاریخ کے سب سے بڑے شاعر اور آرٹسٹ بین الاقوامی اشخاص نہ تھے جو قومیت سے علٰحدہ اور بلند تر ہوتے بلکہ وہ لوگ تھے جن کی شخصیت سے ان کی اپنی قومیت اور اپنے ملک کے مخصوص جوہر کا اظہار ہوتا تھا بے شک قومیت میں تہذیب کا عنصر دقت پیدا کرتا ہے۔ اگر سب لوگ ایک سے ہوتے، اگر شیکسپیر کا سمجھنا ایک فرانسیسی کے لئے بھی ایسا ہی آسان ہوتا جیسا ایک انگریز کے لئے تو کتنی آسانی ہوتی۔ اسی طرح اگر ہم سب بے جان ہوتے تو کتنی سہولت ہوتی! کوشش کی کمی سے تمام مسائل طے ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے یونیورسٹیوں کا مقصد اول۔ قومیت کی مکمل ترین اور عمدہ ترین تربیت کے لئے ایک ذریعہ ہونا اور جس قدر زیادہ ہم قومیت کو اپنی مخصوص تہذیب کا ہم معنی سمجھیں گے اسی قدر لوگ اس کے لئے کم جنگ و جدل کریں گے اور وہ غیر سیاسی سمجھی جائے گی۔ قومی شخصیت کا ارتقا ادب اور موسیقی اور فنون لطیفہ میں ہوتا ہے نہ کہ تجارتی اعداد و شمار کی ترقی اور جھنڈے ہلانے میں!

یونیورسٹی کا دوسرا بڑا کام یہ ہے کہ وہ مل جل کر تمام شعبوں میں تلاش حق کرے اور اسی سلسلہ میں ان بین الاقوامی مسائل کے متعلق تلاش حق کرے جو ہمارے لئے اس قدر پریشان کن ہیں لیکن اس کی تلاش میں ہمیں صرف عالم خارجی ہی پر نظر نہ ڈالنی چاہیئے بلکہ بالخصوص اس عالم داخلی پر جو انسانی روح کی دنیا ہے ہمیں سائنس کے ضبط اور حق پرستی کو نفسیات اور مختلف قوموں کے طبائع، سیرت اور فلسفہ زندگی کے مطالعہ میں استعمال کرنا چاہیئے ہمیں کبھی عقل سلیم سے خوف زدہ نہ ہونا چاہیئے کیوں کہ یہی چیز در اصل انسان اور بہائم میں مابہ الامتیاز ہے۔ بعض نام نہاد فلسفیوں کی یہ تعلیم ہے کہ ہیجان

ہی سب سے زیادہ اہم چیز ہے لیکن عقل ہیجان سے زیادہ بڑی چیز ہے کیوں کہ ہیجان بھی اس میں شامل ہے ...... جذبات جو عقل کے تابع نہیں ہوتے بہت آسانی سے تباہی کا باعث ہو جاتے ہیں ہمیں اپنی امید کو عقل انسانی کی کوشش اور استقلال سے وابستہ رکھنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا بحیثیت طالب علموں کے یہ کام ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں جو گزشتہ نسل حل نہیں کر سکی۔ ہم زیادہ امیدوں کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ باوجود ہر قسم کی مشکلات کے جنگ نے بہت کچھ کوڑا کرکٹ دور کر دیا ہے اور لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ دنیا کے نصف لوگ ایسے ہیں جن کی عادتیں جنگ سے پہلے پختہ ہو چکی ہیں اور وہ اب نہیں بدل سکتیں۔ لیکن ہمارے نوجوان طلبا اتنے نوعمر ہیں اور اتنے پختہ عمر بھی کہ یہ سمجھ سکیں کہ مختلف نسلوں اور تہذیبوں کے امتزاج اور ربط سے نہایت مہتم بالشان مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور یہ یقین رکھیں کہ انسان ہی کی وجہ سے وہ پیدا ہوئے ہیں اور وہی ان کو حل کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ اس قوت سے منسلک رہیں جو انسانی بھی ہے اور الٰہی بھی یعنی قوت عقل جب، وہ محبت اور ہمدردی کے دوش بدوش کام کرے۔

رسالہ وکوس سٹوڈینٹم اپنے مقالہ "اپنی یونیورسٹیوں پر نظر رکھو" میں لکھتا ہے :۔

ہمیں "اصلاح یونیورسٹی" کی تحریک سے مطلب نہیں۔ یہ بات زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ ہمیں ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے سے قبل ایک امتحان پاس کرنا ہے یا دس لیکن ہم اس امر کی جانب سے نہ بے پروا ہو سکتے نہ ہونا چاہیئے کہ ہماری یونیورسٹیاں اپنے مقدس فرض یعنی مکمل انسانی شخصیت کی تربیت کو پورا کر رہی ہیں یا نہیں۔ ہم خاموش نہیں رہ سکتے جب ہم یہ دیکھیں کہ یونیورسٹی محض پیشہ ورانہ تعلیم کا مدرسہ بن گئی ہے، اس پر محض "افادیت" کی روح حاوی ہو گئی ہے اور وہ اس بھیڑ چال سے مغلوب ہو گئی ہے جو اس زمانہ کا شیوہ ہے اور اس بات کا یقیناً اندیشہ ہے۔ دنیا میں ہر جگہ کمینہ مقاصد قومی تہذیب کے اعلیٰ مرکزوں میں راہ پا رہے ہیں اور ان کی فطرت کو بدل دینا چاہتے ہیں۔

"انجمن طلبائے اقوام" کے اجلاس الماؤ (Elmau) میں اس خطرہ کو سب نے شدت سے

محسوس کیا اور ۲۸ قوموں کے نمائندے اس کے خلاف ہم آواز تھے ۔ ان کو اپنے مقصد کے صحیح ہونے پر ایمان تھا اور انھوں نے اپنے خیالات کو اس طرح پیش کیا ۔

(۱) اپنی قوم اور تمام دنیا کی خدمت کا جذبہ یونیورسٹی کی تعلیم کی بنیاد اور غرض ہونا چاہیئے نہ کہ صرف ذاتی فائدہ ۔

(۲) ہماری یونیورسٹیوں میں ایک زیادہ وسیع بین الاقوامی نقطۂ نظر پیدا ہونا چاہیئے ۔

(۳) یونیورسٹیوں کو سیاسی اثر اور نگرانی سے حتی الامکان آزاد ہونا چاہیئے ۔

(۴) تعلیم مکمل نہیں ہوسکتی جب تک اس میں آرٹ کے طبعی میلان اور صلاحیت کی مکمل پرورش کے لئے انتظام نہ ہو ۔

(۵) تعلیم مکمل نہیں ہوسکتی جب تک وہ انسان کی روحانی صلاحیتوں اور فطرت کی نشوونما کے لئے مواقع بہم نہ پہنچائے ۔

(۶) طلبا کی جسمانی صحت کی درستی کے لئے پہلے سے زیادہ اہتمام کی ضرورت ہے ۔

(۷) بہت سی یونیورسٹیوں میں عورتوں کے خلاف جو بندشیں اور رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوجانی چاہئیں تاکہ سب کے حقوق بلا لحاظ اختلاف صنف کے مساوی ہوجائیں ۔

(۸) یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کا امکان ان سب لوگوں کے لئے ہونا چاہیئے جو اس سے فائدہ اٹھا سکیں ۔

(۹) ہر منتظم قومی جماعت کو اختیار ہونا چاہیئے کہ اپنی مادری زبان میں اپنی سائنس اور تہذیب کو ترقی دے ۔

بزمِ معلّمین

علم الاطفال

رفیقو! بھائیو!! رسالۂ "تعلیم" علمی بحثوں کے لئے جاری ہوا ہے۔ اس میں زیادہ تر ایسے مضمون ہوں گے جن میں تعلیم کی حد کے اندر علمی باتوں کی چھان بین کی جائے گی۔ مگر اس رسالہ کے چلانے والوں کا جی چاہتا ہے کہ اس کا ایک حصّہ یعنی چند صفحے خاص اس کام کے لئے رکھے جائیں کہ مدرسوں کے معلم چاہے وہ چھوٹے سے دیہاتی مدرسے میں ہوں یا بڑی بھاری یونیورسٹی میں۔ آپس میں بے تکلفی سے بات چیت کرسکیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان صفحوں میں اِدھر اُدھر کی گپ شپ یا خالی خولی ہنسی مذاق کی باتیں ہوں گی۔ یہ باتیں بھی ضروری ہیں خصوصاً معلّموں کے لئے جن کے مزاج میں دن بھر لڑکوں سے مغز مارتے مارتے خشکی پیدا ہو جاتی ہے مگر ان کا یہاں موقع نہیں۔ یہاں کام کی باتیں ہوں گی مگر عالمانہ انداز میں نہیں جسے دیکھ کر ہم آپ جیسے بھلے آدمی ڈر جائیں بلکہ سہل زبان اور سیدھے سادے طرز میں۔

یہ باتیں بھی علمی ہوں گی کیوں کہ خدا نہ کرے ہم آپ کچھ بے علم تو ہیں نہیں۔ یہ جاہلوں کا خیال ہے کہ ہمیں روزمرّہ کا کام چلانے کے لئے علم کی ضرورت نہیں۔ بھلا کوئی اُن سے پوچھے کہ علم ہے کیا چیز؟ یہی نہ کہ جو باتیں ہم دیکھتے سنتے ہیں انھیں اچھی طرح جانچیں، پرکھیں اور قاعدے سلیقے اور ترتیب کے ساتھ بیان کردیں پھر بھلا علم کے بغیر دنیا میں کوئی کام اور خصوصاً پڑھانے کا کام کیسے چل سکتا ہے؟ مگر علم علم میں بھی فرق ہے۔ کوئی علم پہاڑ کی طرح بھاری ہوتا ہے، کوئی بادل کی طرح ہلکا۔ یہ فلسفہ تعلیم یا تعلیمات یا نفسیات کے علم جن کی بحث اس رسالہ میں بھری پڑی ہے اپنی جگہ پر ضرور اچھے ہوں گے۔ مگر ان کا سمجھنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم آپ بھی "تعلیم" کے ان ثقیل مضمونوں کو پڑھیں گے ضرور کیوں کہ آخر دام دیئے ہیں مگر کبھی فرصت کے وقت سانس روک کے، آنکھیں پھاڑ کے اور سر کھجا کھجا

ہمارے ان صفحوں میں کسی ایسے علم کی بات چیت ہونا چاہیئے جو ہر پڑھے لکھے آدمی کی سمجھ میں آسانی سے آجائے تاکہ جب رسالہ پہنچے تو ہم آپ جلدی سے پتہ کا کاغذ پھاڑ کے جلدی جلدی ورق اُلٹ کے ان صفحوں کو نکالیں اور کھلے دل سے مزے لے لے کے پڑھیں۔

بھلا بوجھئے تو یہ علم کون سا ہے۔ یہ وہی علم ہے جس کی ہمیں اور آپ کو ہر وقت ضرورت پڑتی ہے یعنی بچوں کا علم۔ اگر کوئی رعب دار عربی کا نام رکھنا ہو تو علم الاطفال کہہ دیجئے۔ اس کی اور فلسفہ تعلیم کی حد کہیں کہیں ملتی ہے۔ مگر اُس بھاگوان علم میں بہت سی ایسی مشکل چیزیں ہیں جن سے بچّوں کے علم کو زیادہ تعلق نہیں جیسے تعلیم کا تعلق فلسفہ اور دوسرے علموں سے تعلیم کے مقصد کی چھان بین اچھی بُری تعلیم کے پرکھنے کی علمی کسوٹی۔ یہ مطلب نہیں کہ بچوں کے علم کے لئے یہ باتیں بےکار ہیں بلکہ کہنا ہے کہ یہ علم خود ان جھمیلوں میں نہیں پڑتا بلکہ جب ضرورت آن پڑتی ہے تو فلسفہ جاننے والوں سے کہتا ہے کہ حضرت چنیں چناں کو چھوڑ کر جو آپ کی چھان بین کا نتیجہ ہو وہ مجھے آسان لفظوں میں بتا دیجئے۔ اسی طرح دوسرے علموں سے بھی ہمارا بچوں کا علم محصول مانگا کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنی گرہ میں تو کچھ رکھتا نہیں۔ بس کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لے کر بھان متی کی طرح اپنا کنبہ جوڑ لیتا ہے۔ اس علم میں جن باتوں کی بحث کی جاتی ہے اُنھیں ہم نیچے لکھتے ہیں :-

سب سے پہلے تو دین ایمان کی باتیں۔ مسلمانوں کے لئے اللہ، رسول کا ذکر۔ دوسرے مذہب کے لوگوں کے لئے اُن کے دین کے پیشواؤں کے حالات اور اُن کے اچھے اچھے قول آج کل ہمارے ملک کے مدرسوں میں جو پڑھائی ہوتی ہے اُس میں اس چیز کی بڑی کمی ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ تعلیم پھلتی پھولتی نہیں۔ یاد رکھئے کہ تعلیم بچہ کی زندگی کے کسی ایک حصہ کو سدھارنے کا نام نہیں بلکہ اس کے سارے جسم اور ساری روح کی اصلاح کا نام ہے اور اس طرح کا سدھار، اس طرح کی اصلاح اگر ہو سکتی ہے تو مذہب کے ذریعہ سے۔ تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، سائنس یہ سب بڑے کام کی چیزیں ہیں مگر یہ فقط دماغ کو روشن کرتی ہیں۔ دل میں نہیں بیٹھتیں اور جو بات دل کو نہ لگے وہ اوپر کی سطح کو صاف کر سکتی ہے اندر کی گہرائی میں روشنی نہیں پہنچا سکتی۔ یہ تاثیر صرف مذہب میں ہے یا اخلاق میں یعنی نیک عادتوں اور نیک کاموں کے ذکر میں۔ سچّا معلم وہی ہے جو اپنے مذہب کی جڑوں کو جانتا ہے اور اُن سے محبت رکھتا ہے جو نیک لوگوں کی زندگی اور اُن کی نصیحتوں سے واقف ہے۔ وہی بچّوں کے دل میں نیکی کو

اُبھار سکتا ہے اور اُن میں اچھے بھاؤ پیدا کر سکتا ہے۔

اس کے بعد بچوں کی طبیعت، اُن کی عادتوں اور خصلتوں کا علم۔ اس کا نام عالم لوگوں نے نفسیات طفلی رکھا ہے۔ آپ اگر ذرا سا غور کریں تو دیکھیں گے کہ بچوں کے مزاج نہ پہچاننے سے پڑھانے والا کیسی مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ اُسے نہیں معلوم کہ بچہ ایک وقت میں کتنا سبق یاد کر سکتا ہے اور اُس کی یاد کی قوت کو بڑھانے کا کیا طریقہ ہے۔ وہ بڑی محنت سے سبق پڑھاتا ہے مگر بچے دھیان نہیں دیتے۔ دوسرے دن پوچھو تو سب کورے۔ اگر وہ یہ جانتا کہ دھیان یا توجہ کیا چیز ہے اور اسے آدمی کس طرح سبق کی طرف پھیر سکتا ہے تو یہ مصیبت کاہے کو ہوتی۔ اسی طرح تیز بچوں اور کودن بچوں میں فرق نہ کرنے سے بڑی دشواری ہوتی ہے۔ پھر یہ پہچاننا بھی بڑا ضروری ہے کون سا بچہ کس چیز سے زیادہ لگاؤ رکھتا ہے۔ بچوں کی یاد، دھیان، تیزی اور طبیعت کے لگاؤ کے بارے میں قابل اور تجربہ کار لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا جاننا پڑھانے والے کے لئے بہت ضروری ہے

تیسری چیز جو بچوں کے علم میں شامل ہے تعلیم کا طریقہ اور مدرسہ کا انتظام ہے۔ پڑھانے والے جانتے ہیں کہ ہر مضمون کے پڑھانے سے جبھی فائدہ ہوتا ہے کہ اس کا مطلب بچہ کے ذہن نشین ہو جائے یعنی من میں اُتر جائے۔ اس کے لئے ایک تو اُستاد کو یہ چاہیئے کہ جو مضمون وہ پڑھاتا ہے اسے خود خوب اچھی طرح پڑھے۔ دوسرے وہ پڑھانے کا طریقہ یعنی مشکل باتوں کو سہل انداز میں پیش کرنا لڑکوں کو اپنے مضمون سے شوق دلانا، زیادہ ضروری باتوں پر زور دینا اور کم ضروری باتوں کو چھوڑ دینا سیکھے۔ اسی طرح جماعت میں ادب قاعدہ رکھنا، شریر لڑکوں کو مارے پیٹے بغیر ٹھیک کرنا دبو لڑکوں کی ہمت بڑھانا، لڑکوں کے آپس کے جھگڑوں کا چکانا، پڑھائی کے گھنٹے مقرر کرنا، مضمونوں کی تقسیم ان گھنٹوں میں مقرر کرنا بھی مشکل کام ہے۔ ان سب باتوں کی بحث تعلیمات میں ہوتی ہے اور بچوں کا علم اس علم سے ضروری باتیں لے لیتا ہے۔

چوتھی چیز جس کی طرف ہمارے ملک میں بہت کم توجہ کی جاتی ہے وہ حفظانِ صحت ہے یعنی اُن باتوں کا علم جن پر عمل کرنا تندرستی کے لئے ضروری ہے۔ ہم لوگوں کی نادانی کا یہ حال ہے کہ موٹی موٹی باتیں بھی نہیں جانتے۔ ہم میں سے کچھ ایسے ہیں جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ صاف ہوا، صاف پانی، ستھرا اور ڈھیلا لباس اور ہلکی غذا ہماری صحت کے لئے بہت ضروری چیزیں ہیں اور

جو اس سے واقف بھی ہیں وہ ان چیزوں کو مہیا کرنے کی ترکیبیں اچھی طرح نہیں جانتے۔ اگر مدرسے کے معلم حفظانِ صحت کے اصولوں سے واقف ہوں تو وہ نہ صرف مدرسے کی صفائی اور مدرسے کے بچّوں کی صحت کا خیال رکھیں گے بلکہ اپنے گاؤں یا اپنے محلّے کے لوگوں کو بھی اپنی معلومات سے فائدہ پہنچاتے رہیں گے اور اُن کی بدولت ساری قوم کی زندگی صاف ستھری اور تندرست ہو جائیگی۔

اسی طرح معلم کو بعض باتیں طب یعنی دوا علاج کے علم کی جاننا چاہیئیں۔ اس علم کی ایک شاخ ہے جس میں نفس یعنی من کی بیماریوں کا ذکر ہوتا ہے۔ مدرسے میں جتنے بچے پڑھتے ہیں سب کا دل اور دماغ بھلا چنگا نہیں ہوتا بلکہ بعضوں میں عجیب عجیب طرح کی کمزوریاں اور بیماریاں ہوتی ہیں اگر پڑھانے والا ان سے واقف نہیں ہے تو وہ چاہے کتنی کوشش کرے۔ ان بچوں کو پڑھا نہیں سکتا جب لڑکے جوان ہونے لگتے ہیں تو اُن کی طبیعت میں وحشت اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے جس کی سبب سے وہ کبھی کبھی آوارگی اور بُری بُری باتیں سیکھ جاتے ہیں۔ نوجوانوں کی طبیعت میں جو تبدیلی ہوتی ہے اُس کا بھید استاد کو ضرور جاننا چاہیئے تاکہ وہ ضرورت کے وقت اُن کو سلامتی کی راہ دکھا سکے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب معلم خدانخواستہ علی گڑھ اور بنارس کے طبی کالجوں میں جو سرکار نے ہمارا دل بہلانے کے لئے کھول دیئے ہیں پڑھ کر طبیب اور وید ہو جائیں اور یہ معلم لڑکوں کی ساری بیماریوں کا خود علاج کرنے لگیں تاکہ ناحق ہزاروں کا خون ہو جائے بلکہ ہمارے نزدیک انھیں طب سے صرف اتنی واقفیت چاہیئے کہ لڑکوں کو احتیاط کے ضروری اصول بتا سکیں اور اُن کی حالت سچ سچ کے طبیبوں کو سمجھا سکیں۔

ان باتوں کو جو ہم اوپر کہہ چکے ہیں غالباً سب لوگ مان لیں گے۔ لیکن جب ہم یہ کہیں گے کہ معلموں کو تھوڑا سا قانون بھی جاننا چاہیئے تو بہت سے سمجھیں گے کہ ہم مذاق کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جاننا چاہیئے کہ یورپ کے ملکوں میں بچّوں کے لئے خاص قانون ہوتے ہیں اور خاص عدالتیں یا جن میں ان کی کم سنی اور نادانی کا خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے قانون اگرچہ اس معاملہ میں بہت ناقص ہیں پھر بھی اس میں اس کا تھوڑا بہت لحاظ ہوتا ہے۔ بچّوں کے معاملہ میں ماں باپ کو اور اُستادوں کو خاص حقوق حاصل ہیں مگر بہت سے استاد انھیں جانتے تک نہیں۔

ایک اور چیز کی سخت ضرورت ہے جس کا ہمارے ملک میں ابھی بہت کم چرچا ہے۔ دوسرے

ملکوں میں مثلاً جرمنی میں جرائم پیشہ لوگوں، شرابیوں، دیوانوں کے بچوں کی تعلیم اور نگرانی کا بہت اچھا انتظام ہے اور سرکار کی طرف سے خاص دفتر اس کام کے لئے کھولے گئے ہیں۔ ان دفتروں میں سچی ہمدردی رکھنے والے لوگ جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، ایسے بچوں کو اُن کے ماں باپ سے جدا کرکے اس طرح رکھتے ہیں اور اُن کے پڑھانے کا ایسا اچھا انتظام کرتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کے بُرے اثرات سے پاک ہو جاتے ہیں اور بجائے گنڈے یا شہدے بننے کے بھلے آدمی بن جاتے ہیں۔

یہ سب ضروری باتیں جو بچوں کے علم میں شامل ہیں معلموں کو جاننا لازمی ہیں کیا اچھا ہوتا اگر کوئی انھیں ایک کتاب میں اکٹھا کرکے چھاپ دیتا۔ افسوس ہے کہ ہماری زبان میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے۔ پھر اب کون سی ترکیب کی جائے کہ ہم آپ یہ چیزیں آسانی سے سیکھ لیں؟ یہ تو ممکن نہیں کہ ہم ان سب علموں کی جن کا ذکر ہو چکا ہے موٹی موٹی کتابیں پڑھیں اور ان میں سے اپنے کام کی باتیں ڈھونڈھ کر نکالیں۔ ہم میں سے تھوڑے شاید ایسا کر سکیں مگر بہت سے نہیں کر سکتے۔ یہ بھی مشکل ہے کہ سب کے سب کوئی دوسری زبان مثلاً جرمن زبان پڑھ لیں تاکہ اس میں جو کتابیں بچوں کے علم پر ہیں انھیں پڑھ سکیں۔ تو پھر اب یہ گتھی کیسے سلجھے؟

ہماری رائے یہ ہے کہ ہر شخص جو ان علموں میں سے کسی علم کا ماہر ہے ہم لوگوں کی خاطر رسالہ "تعلیم" کے ان صفحات میں اپنے علم کے اصول یا اپنے ذاتی تجربے عام فہم گفتگو کے انداز میں بیان کر دیا کرے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہی باتیں چن کر بیان کرے جن کا جاننا معلموں کے لئے ضروری ہے جو لوگ ہماری اس درخواست کو منظور کریں گے اُن کے ہم سب یعنی "تعلیم" کے اڈیٹر اور ہماری تعلیمی برادری کے سب رکن خواہ وہ دیہاتی مدرسوں میں پڑھاتے ہوں یا یونیورسٹی میں تہ دل سے شکرگزار ہوں گے۔ اس بات کی ہم پھر یاد دہانی کئے دیتے ہیں کہ زبان بالکل بے تکلف اور عام فہم ہونا چاہئیے۔ کمزور اور نا مکمل مضامین شکریہ کے ساتھ واپس کر دئیے جائیں گے۔

(ع)

تصویر کا تاریک رُخ

اگر آپ اعلیٰ درجہ کے مدرسین کو چھوڑ کر عام مدرسین کی حالت کو بغور ملاحظہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ بیچارے نہایت ہی مسکین اور جفاکش مزدور ہیں جن کی حالت بہت قابل رحم ہے۔ ان کے لباس اور چہرے سے لاپروائی اور غربت ٹپکتی ہے وہ اکثر اپنی بے ڈھنگی روش اور کمانہ لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔ سوسائٹی کے عام کاروبار میں ان کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ لوگوں کے مجمعوں میں وہ بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان کے مشاغل اکثر غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ جب ان ہی میں سے بہت سے افراد جب تک وہ اس پیشہ میں داخل نہ ہوئے تھے ۔ خوش دل اور خوش باش نوجوان تھے وہ کیا اثرات ہیں جن کی وجہ سے مدرسی اختیار کرنے کے چند ہی سال بعد ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان کے چہروں پر خوشی اور صحت کی جگہ غم اور غصہ کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں اور ان کے رویہ سے مردہ دلی اور بیچارگی ظاہر ہوتی ہے؟ ان کے ساتھی جو دوسرے پیشوں میں شامل ہوئے تھے اب بھی خوش اور زندہ دل نظر آتے ہیں دنیا کے کام کاج میں ان کا حصہ ہے۔ سوسائٹی کی زندگی میں وہ شریک ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسی میں ایسے افسردہ کن حالات کیا ہیں جنھوں نے ان بیچاروں کی زندگی کو ایک حد تک نکما کر دیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں ان اسباب پر بحث کروں جو مدرس کی جسمانی صحت۔ عالی حالت اور ذہنی ترقی پر برا اثر ڈالتے ہیں :۔

۱۔ شروع شروع میں نئے مدرس کو بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ نئے اسباق کی تیاری کرنا۔ مدرسہ میں چار پانچ گھنٹہ سبق پڑھانا۔ طلبا کے کام کی نگرانی اور ان کے مضامین کو صحیح کرنا۔ کھیلوں میں شرکت اور ان کے انتظامات کو دیکھنا وغیرہ وغیرہ ایسے فرائض ہیں کہ ان میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے اور مدرس کو اپنے سر و پا تک کی خبر نہیں رہتی۔ اگر آپ جماعت کے کمرہ میں اس کو دیکھیں تو ہمیشہ مصروف پائیں گے۔ اس کی زبان کبھی بند نہیں ہوتی وہ کبھی ایک طرف جاتا ہے

کبھی دوسری طرف۔ کبھی لڑکوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کبھی تختہ سیاہ کی طرف دوڑتا ہے۔ طلبا کی کاپیوں کو صحیح کرتے ہوئے بیچارہ ایک ایک غلطی کو نہایت جانفشانی سے درست کرتا ہے۔ کبھی بے معنی عبارت کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کبھی الفاظ کو ادل بدل کر فقروں کو بامعنی بناتا ہے کاپی کا ہر ایک صفحہ مدرس کے قلم کی سرخ روشنائی سے لہو لہان نظر آتا ہے علاوہ ازیں بعض نئے مدرس تعلیم دینے کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ طلبا کو کام کرانے کی بجائے وہ خود ہی ان کے بجائے سارا کام کر دیں۔ چنانچہ وہ خود بہت محنت کرتے ہیں۔ ایک جماعت میں گھنٹہ بھر نہایت ہی جوش و خروش سے تقریر فرماتے ہیں۔ مطالب بیان کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوسرے گھنٹہ میں بھی یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور اکثر گھنٹوں یہی مصروفیت رہتی ہے۔ مدرسہ کے باہر بھی اکثر اوقات اس کا شغل یہی ہوتا ہے کہ طلبا کو پڑھائے۔ کیونکہ قلیل تنخواہ میں اس کا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ خارجی اوقات میں بچوں کو پڑھا کر وہ اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ کر لیتا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام دن رات میں اسے کوئی وقت ایسا نہیں ملتا کہ وہ اپنی ذات کی فکر کرے اور ریاضت جسمانی کے لئے کوئی وقت نکالے تاکہ صحت درست رہے لوگوں سے ملے جلے تاکہ ان کے حالات سے واقف ہو اور ان کے خیالات سے فائدہ اٹھائے۔ اخبار اور کتب کا مطالعہ کرے تاکہ اس کے علم میں اضافہ ہو اور زمانہ کی ترقی اور رفتار و حالات سے آگاہ رہے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اگرچہ بعض اوقات مدرسین کو فرصت کا وقت بھی ملتا ہے لیکن وہ ایسے لوگوں میں کام کرتے ہیں جن کی صحبت سے انہیں بہت کم فائدہ پہنچتا ہے اور زیادہ تر ایسے مقاموں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جہاں باہر کی خبر مشکل سے پہنچتی ہے وہاں نہ اخبار ملتے ہیں اور نہ کوئی لائبریری ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ان فرصت کے اوقات سے بھی جو میسر آتے ہیں پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ شہروں میں جہاں کسی حد تک یہ اسباب مہیا ہیں ان کو گذر اوقات کرنے کے لئے مدرسہ کے علاوہ بہت کام کرنا پڑتا ہے شہری زندگی زیادہ مہنگی ہوتی ہے اس لئے مدرسین کو اپنی قلیل تنخواہ میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کے لیے در در بچے پڑھانے کے لیے جانا ہوتا ہے اور گاؤں میں جہاں کچھ فرصت ہوتی ہے اس قسم کے اسباب موجود نہیں ہوتے اور ان کا وقت لاپروائی اور بیکاری کی نذر ہوتا ہے۔

۲۔ مدرسین سال بسال عموماً ایک ہی جماعت کو ایک مقررہ کتاب پڑھاتے رہتے ہیں۔ اور اس میں انہیں کوئی اعلیٰ قسم کا دماغی کام کرنا نہیں پڑتا۔ اور اگر ایک مضمون کی تکرار کرتے رہنے سے بالفرض ہر

طبیعت میں نفرت اور بد مزگی پیدا نہ بھی ہو تو یہ ضرور ہے کہ مدرسین کو اس مضمون میں ذرا بھی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ بچوں کو تعلیم دینے میں بعض خاص خاص باتوں کی تکرار بھی لازمی ہوتی ہے۔ کیونکہ بچوں کا علم محدود اور واقفیت بہت کم ہوتی ہے اور چونکہ ایسا کرنے میں مدرسین شاذ ہی کسی جدت کو دخل دیتے ہیں اس لیے ان کی ذہنی نشوونما رک جاتی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو باتیں مدرسین کو دہرانی پڑتی ہیں وہ ان کے لیے بہت آسان اور پیش پا افتادہ ہوتی ہیں اور وہ غلطی سے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بچوں کے لیے بھی وہ ایسی ہی آسان ہیں۔ چنانچہ اگر بچے ان کے مطالب کو سمجھنے میں دیر کریں یا کچھ دن کے بعد بھول جائیں تو وہ اسے ان کی بے توجہی پر محمول کرنے لگتے ہیں اور خود غصہ کرتے ہیں اور بچوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔ ایسا کرتے رہنے سے کچھ دنوں کے بعد ان کے چہرے پر غصہ اور ناراضگی کی ایک مستقل شکن پڑ جاتی ہے ؛ جس سے نہ صرف ان کی صورت ڈراونی بن جاتی ہے بلکہ ان کی جسمانی اور دماغی صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

۳۔ اس کے علاوہ مدرسین کو زیادہ تر انہیں الفاظ اور مطالب کی تشریح کرنی پڑتی ہے جن سے وہ بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ ان تشریحات میں انہیں کوئی خاص ذہنی کاوش کرنی نہیں پڑتی اور رفتہ رفتہ انہیں ذہنی سستی کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے وہ دماغی محنت سے کترانے لگتے ہیں۔ اپنی واقفیت اور علم کے پرانے، زنگ آلود سرمایہ پر زندگی بسر کرتے ہیں اور عموماً ایک ہی پامال راستے پر پڑ جاتے ہیں اور یہ عادت ایسی پختہ ہو جاتی ہے کہ اپنے ہمسروں میں بھی ان کا طریق بیان وہی رہتا ہے اور وہ ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جو بچوں کے مناسب حال ہوتی ہیں۔ چونکہ بچوں میں سدا ان کی بات مانی جاتی ہے اس لیے عادتاً وہ اپنی ہی بات منوانی چاہتے ہیں۔ لیکن یہ تحکم برابر کے لوگوں میں کب چل سکتا ہے اور خصوصاً جب کہ دنیا کے عام معاملات میں ان کی رائے صائب بھی نہیں ہوتی ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان معاملات کا ان کو تجربہ نہیں ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایک رائے نہایت وثوق کے ساتھ دیتا ہے اور لوگ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں تو وہ اکثر خود ہی لوگوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مدرسین جو مدرسہ میں ہمیشہ آمنّا وصدّقنا کی آوازیں سننے کے عادی ہوتے ہیں جب باہر مخالفت اور استہزا کا رنگ دیکھتے ہیں تو خود ہی کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ جس سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ مدرسہ میں تو بچوں ہی کا ساتھ ہوتا ہے۔ اپنے سے بہتر یا زیادہ تجربہ کار لوگوں سے مدرسہ کے باہر ہی واسطہ پڑ سکتا ہے اور مندرجہ بالا

وجوہ کی بنا پر مدرسین سوسائٹی میں زیادہ آمدورفت نہیں رکھتے۔ اس لیے اکثر ان کی باتوں میں وہ پختگی نہیں پائی جاتی جو دنیا کے کاروبار میں اپنے ہمسروں کے درمیان کام کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ لوگ کہتے ہیں کہ معلمی شریف ترین "پیشہ" ہے مگر نہایت ہی گھاٹے کا "بیوپار" ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس کاروبار سے کام کرنے والے کی گذر اوقات بھی اچھی طرح نہ ہو سکے تو شرافت ایسے کاروبار سے اُٹھ جاتی ہے:۔

آنکہ شیراں راکند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج!

مدرسین کی تنخواہیں عموماً ایسی قلیل ہوتی ہیں کہ ان کا گذارہ بہت مشکل سے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسہ کے باہر بھی اکثر مدرسین کو استادی کرنی پڑتی ہے اور وہ فرصت کا وقت اپنی جسمانی اور ذہنی بہتری کے لیے صرف نہیں کر سکتے اور ہمیشہ کی احتیاج سے پریشان حالی انکے چہروں پر برسنے لگتی ہے۔

ہمارے ملک کی موجودہ تعلیم گورنمنٹ کی طرف سے رائج کی گئی ہے اور چونکہ یہ گورنمنٹ غیروں کی ہے اس لیئے لوگ مدرسین کو گورنمنٹ کا ملازم سمجھتے ہیں جو ان کے خیر خواہ نہیں بلکہ سرکار کے ایجنٹ ہیں۔ گورنمنٹ نے مدرسین کی تنخواہیں بہت تھوڑی مقرر کی ہیں۔ اس لیے بھی انہیں ذلیل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا معیار یہی ہے کہ سرکاری کام کی قدر کا اندازہ اس کی تنخواہ ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مدرسین کو سرکار نے جو کچھ بھی دیا ہے وہ اپنے نفع کے لیے بلکہ لوگوں کی بہبودی کی خاطر دیا ہے۔ بہرحال نتیجہ یہ ہے کہ لوگ مدرسین کو اپنے ساتھ نہیں سمجھتے۔ بلکہ تھوڑی سی تنخواہ پانے والا گھٹیا درجہ کا ملازم خیال کرتے ہیں۔ پھر لوگوں کو اس تعلیم کی چنداں قدر بھی نہیں ہے جو یہ مدرسین دیتے ہیں۔ چنانچہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک صاحب تعلیم سے فارغ ہو کر پروفیسر مقرر ہوئے۔ اپنے گاؤں میں پہنچے۔ گاؤں کے ایک بوڑھے نے پوچھا میاں نوکر ہو گئے؟ انھوں نے کہا جی ہاں۔ کیا نوکر ہوئے؟ کہا پروفیسر ہو گیا ہوں۔ بوڑھے نے پوچھا پروفیسر کسے کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بڑے مدرسے میں پڑھانے والے کو کہتے ہیں۔ بوڑھے نے کہا ہائے قسمت کیا پٹواری بھی نہ ہو سکے؟

اب ایک طرف تو مدرس کی تنخواہ قلیل اور دوسری طرف لوگوں کی قدردانی کا یہ حال۔ نہ پیسہ کہ گھر میں بیٹھ کر زندگی بسر کریں اور نہ سوسائٹی میں عزت کہ غربت کے باوجود لوگوں کی نظروں میں قدرو منزلت ہو۔

اس پر ستم یہ کہ بہت سے ساتھی جو ہم سبق تھے اور ہمیشہ تعلیم میں پیچھے رہتے تھے وہ بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر مقرر ہو گئے۔ اس غربت اور ذلت میں بیچارے نے لوگوں سے ملنا چھوڑا۔ ایک گوشہ اختیار کیا اور فارغ وقت میں بھی طلبا کو پڑھانا شروع کیا اور اس طرح گذر اوقات کی صورت نکالی۔ مگر سوسائٹی سے علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے کام کے نہ رہے۔ نہ کوئی علمی اور معاشرتی دلچسپیاں ہیں نہ دل لگی کے اسباب وہ ہی بچوں کے ساتھ سر مارنا رہ گیا!

۵۔ ہندوستان میں لڑکے اور لڑکی کی جلد از جلد شادی کرنا ماں باپ کا بہت ہی اہم فرض خیال کیا جاتا ہے۔ وہ جتنی جلد اس فرض سے سبکدوش ہوں۔ بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر جب بیٹا "نوکر" بھی ہو جائے تو کیوں دیر کی جائے۔ چنانچہ شادی بہت جلد ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ غریب لوگوں کے اولاد بہت جلد جلد ہوتی ہے۔ مدرس کیا کم غریب ہے کہ اس پر خدا کی رحمت نہ ہو! ۔ اب مدرس کو اپنی آمدنی بڑھانے کی اور زیادہ فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ آمدنی بڑھانے کا سب سے زیادہ آسان اور زود اثر طریقہ یہی ہے کہ بچوں کو پڑھائے۔ چنانچہ تمام وقت اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ اور لازماً اس کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔

۶۔ تنخواہوں کی قلت کے ساتھ ساتھ اور بھی خطرات لگے رہتے ہیں۔ سرکاری نوکری میں تنخواہ اگر کم ہے تو ہو مگر موسمی تعطیلات سے پہلے جواب ملنے کا ڈر نہیں ہوتا۔ کچھ مدت کے بعد معینہ گریڈ میں سالانہ ترقی کے بعد پھر نئے سرے سے ملازمت کی تلاش نہیں کرنی پڑتی۔ مگر پرائیوٹ سکولوں میں یہ سب خطرے بھی رہتے ہیں۔ مینیجر صاحب کی خفگی۔ ممبروں کی ناراضگی۔ نتیجہ کی خرابی۔ تعداد طلبا کی کمی۔ سرکاری گرانٹ کا کم ہو جانا۔ انسپکٹر صاحب کی نارضامندی غرض کہ بیشمار اندیشے ہیں جو اس کا خون خشک کئے دیتے ہیں۔ اگر ان سب خطرات کے باوجود اُستاد کامیاب بھی ہو جائے تو پرائیوٹ سکولوں کی غیر معین آمدنی کی وجہ سے مستقبل کی بابت بے اطمینانی رہتی ہے۔

۷۔ یہ کون نہیں مانتا کہ ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں نے مدرسین کی اور ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ لیکن یہ ضرور کہا جائیگا کہ ان تعلیم گاہوں میں استادوں کی شخصیت کی تربیت بہت کم کی گئی ہے۔ عموماً ہر ایک شخص کو ایک ہی سانچہ میں ڈھالا جاتا ہے۔ ان مدرسوں کا نظام اکثر کچھ فوجی طرز کا ہوتا ہے۔ خیال اور عمل کی آزادی بہت کم دیجاتی ہے۔ وہاں کبھی کوئی طریق تعلیم مرغوب ہوتا ہے۔ کبھی کوئی۔ اور اسی کو رواج دینے کی کوشش کی جاتی ہے خواہ اساتذہ کی طبیعت اور

قابلیت اور مقامی حالات میں کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی طریقہ تعلیم بھی مدرس کا اپنا نہ ہوا بلکہ جس طریقہ کی سرکار سے ہدایت ہوئی وہی اختیار کر لیا۔ انسپکٹر صاحبان کی ہدایات کا بھی ایسا ہی اثر ہوتا ہے آج ایک تحریر رائج ہے تو کل دوسری۔ مدرس کی اپنی پسند اور ترجیح کو کوئی نہیں پوچھتا۔ وہ تو حکم کا پابند ہے اسے کبھی سوچنے اور غور کرنے کی تکلیف ہی نہیں دی گئی۔ نارمل اسکولوں اور ٹریننگ کالجوں میں خاص طریقے ایسے تبلائے گئے ہیں ان کی پوری پوری پیروی کرائی گئی ہے۔ اور بس۔ اس نے نہ ان کے مقصد کو سمجھا اور نہ خود کسی طریق تعلیم کی بنا ڈالی یا اس کو آزمایا اور نہ قومی عادات و اخلاق اور ملکی رسم و رواج پر غور کیا کہ وہ فیصلہ کر سکے کہ ہمارے مناسب حال کیا چیز ہو گی۔ جس طرح ٹریننگ کالج میں وہ حکم کے ماتحت کام کرتا تھا اسی طرح اب بھی اسے انسپکٹر صاحب کی منشا کے مطابق چلنے میں عافیت اور ترقی دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ ایک لکیر کا فقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ اول تو لایق۔ من چلے اور حوصلہ مند نوجوان اس پیشے میں داخل ہونے سے پرہیز کرتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص معلمی کی اہمیت اور شرافت کو محسوس کرتے ہوئے اس میں داخل بھی ہو جاتا ہے تو اکثر چند ہی سال میں اس کی حالت ان اسباب کے زیر اثر دگرگوں ہو جاتی ہے اس کی صحت تباہ۔ مالی حالت خراب اور ذہنی ترقی مسدود ہو جاتی ہے ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ بچوں کی عمدہ تعلیم اور تربیت کے ذریعہ قوم کا مستقبل شاندار بن سکتا ہے۔ لیکن اگر ہمارے پیشہ کی حالت یہی رہی کہ چند دن کے بعد اپنی ہی صورت بگڑ جاتی ہے تو قوم کے مستقبل کی ذمہ داری لینا بے معنی ہے!

سید تجمل حسین

شذرات

تعارف

اس رسالہ کی شان نزول یہ ہے:-

دسمبر ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اور اس اجلاس میں صدر کانفرنس اور صدر استقبالیہ کمیٹی نے محض عام اصولوں کے بیان کرنے اور مسلمانوں کی حالت زار پر افسوس کرنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ اپنے تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں اور اپنی مشکلات کو حل کرنے اور نظام تعلیم کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے مناسب وسائل اختیار کریں۔ صدر استقبالیہ کمیٹی نے صاف طور پر بتایا اور صدر کانفرنس نے تسلیم کیا کہ کانفرنس کا محض "تبلیغی دور" ختم ہو گیا ہے۔ اب چنداں ضرورت نہیں کہ کانفرنس مسلمانوں کو تعلیم کی جانب راغب کرے کیونکہ واقعات کی یورش اور زمانہ کی رفتار نے ایک حد تک اس بارے میں ان کی آنکھیں کھول دی ہیں اور انہوں نے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے مدارس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ اور جوں جوں یہ تعلیم گاہیں زیادہ ہوں گی طلبا کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ اس لیے کانفرنس اپنا یہ ابتدائی فرض پورا کر چکی۔ اب صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ کانفرنس خود فن تعلیم اور تعلیمی مسائل کے جانب اپنی توجہ کو راغب کرے۔ تعلیم پر لوگوں کو آمادہ کرنے کے بعد اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس تعلیم کو اس قابل بنائے کہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں اور ان انفرادی اور قومی مقاصد کی تکمیل ہو جو ہمارے نصب العین میں شامل ہیں۔ ہر شخص کو اس بات کا احساس ہے کہ موجودہ تعلیم ان ضروریات کو پورا نہیں کرتی۔ اس سے نہ کسب معاش میں مدد ملتی ہے نہ ذاتی یا قومی تمدن اور تہذیب کی نشر و اشاعت اور اصلاح میں۔ لیکن ہندوستان کی حالت، سیاسی اور بعض دیگر وجوہ سے ایسی ہو گئی ہے کہ کوئی شخص اور کوئی جماعت ان اہم کاموں کی جانب راغب نہیں ہوتی جو ملک اور قوم کی تعمیر میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں سیاسیات کی ہنگامہ خیز دلچسپیاں نہ صرف ان لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں جو اپنی وجاہت اور

قابلیت کے لحاظ سے واقعی سیاسی کام کے لیے موزوں ہیں بلکہ ان لوگوں کو بھی مسحور کر لیتی ہیں جو فطرتاً علم کی خدمت اور تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف علم و تعلیم کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ سیاسیات کے میدان میں نا اہلوں کی تگ و دو سے ملک کی سیاسی حالت بھی بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ محض ایک مثال ہے اس انتشار کی جو ہمارے ملک میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً پیدا ہو گیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے کسی قسم کی معقول تقسیم عمل ناممکن ہے۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ماہر تعلیم بھی بنے، سیاسی لیڈر بھی بنے، ادیب بھی سمجھا جائے اور اگر ہو سکے تو مذہب اور معاشرت کے مسائل میں بھی ماہر خصوصی تسلیم کیا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ محض ایک منتشر قوت ہو کر رہ جاتا ہے اور باوجود علمی قابلیت کے کوئی پائدار کام نہیں کر سکتا برخلاف اس کے زیادہ منتظم ملکوں مثلاً یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں ہر قابل شخص عام اور وسیع تعلیم پانے کے بعد کسی خاص شعبہ میں انتہائی تعلیم حاصل کر کے اس میں مہارت پیدا کرتا ہے اور پھر اسی شعبہ علم کی ترقی اور اصلاح کے لیئے خود کو وقف کر دیتا ہے۔ اس کو بے جا نام و نمود کی تلاش نہیں ہوتی۔ لیکن ملک کے حسن مذاق کی وجہ سے شہرت خود اس کے دروازہ پر آ کر دستک دیتی ہے کیونکہ ان ممالک میں ایک اچھا ادیب ہونا، یا ماہر تعلیم ہونا یا سائنس داں ہونا کم از کم اتنا ہی باعث عزت ہے جتنا سیاسی لیڈر یا حکومت کا اعلیٰ ملازم ہونا۔

یہ تمام خیالات بالکل اس طرح سے کانفرنس میں ظاہر نہیں کیے گئے۔ لیکن ان کا ایک مبہم سا احساس لوگوں میں ضرور تھا۔ اس وجہ سے مندرجہ ذیل ریزولیوشن بغیر کسی مخالفت کے پاس ہوا:۔

صدر صاحبان کانفرنس و استقبالیہ کمیٹی نے اپنے خطبات صدارت میں جو وجوہ بیان کیے ہیں ان کے لحاظ سے تجویز کیا جاتا ہے کہ یہ کانفرنس ماہرین فن تعلیم کی ایک کمیٹی قائم کرے تاکہ

(۱) وہ ہندوستان کے تعلیمی مسائل کا مطالعہ کرے، بالخصوص مسلمانوں کی ضروریات کے اعتبار سے۔

(۲) وقتاً فوقتاً اپنے مطالعہ اور تحقیقات کے نتائج کو شائع کرے۔

اور (۳) ان کو مناسب مشوروں اور تجاویز کی شکل میں تعلیمی مرکزوں اور حکام صیغہ تعلیم کے سامنے پیش کرے۔

اس کمیٹی کو اختیار ہوگا کہ وہ ایسے اصحاب کو اپنا ممبر بنائے جو اس قسم کے کام کے لیئے موزوں ہوں اور دیگر مناسب انتظامات کرے حسب ذیل حضرات اس کمیٹی کے ممبر قرار پائے اور ان کو اختیار دیا گیا

کہ موجودہ تعداد کے دو ثلث تک اور ممبر اپنی تجویز سے اضافہ کرے۔

۱- عبداللہ یوسف علی صاحب	۱۰- ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی
۲- مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب شیروانی	۱۱- مولوی سید سلیمان ندوی صاحب
۳- صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب	۱۲- سید محمد یوسف صاحب
۴- سید راس مسعود صاحب	۱۳- شیخ سر عبدالقادر صاحب
۵- ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب	۱۴- سید بشیر حسین صاحب زیدی
۶- ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب	۱۵- ڈاکٹر قاسم علی صاحب منصوری
۷- ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب	۱۶- مولوی عبدالحق صاحب
۸- ڈاکٹر شفاعت احمد خانصاحب	۱۷- ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب
۹- شیخ نور الٰہی صاحب	۱۸- خواجہ غلام السیدین

اس کمیٹی کے چند باقاعدہ اور بے قاعدہ اجلاس علی گڑھ میں ہوئے جن میں اس کے پروگرام کے متعلق غور کیا گیا اور کافی بحث و مباحثہ کے بعد مندرجہ ذیل دستور العمل فی الحال اس کے لئے کافی سمجھا گیا:-

۱- کمیٹی فن تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مستند کتابیں بذریعہ تصنیف، تالیف اور ترجمہ تیار کرائے اور ان کو کانفرنس کی طرف سے یا کانفرنس کی امداد سے شائع کرائے۔ مختلف مباحث و موضوع کا فیصلہ اور تعین کمیٹی کرے گی۔

۲- ایک سہ ماہی رسالہ "تعلیم" جاری کیا جائے جس میں تعلیمی مسائل کے متعلق نظری اور عملی نقطہ نظر سے مضامین لکھے جائیں۔ جن تعلیمی مسائل میں اختلاف رائے ہے ان کے متعلق تبادلہ خیال کیا جائے اور اس ملک میں یا دوسرے ممالک میں جو تعلیمی تجربات کیئے جارہے ہیں۔ ان کی اشاعت ہو تا کہ استاد ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہوسکیں۔

۳- یہ کمیٹی کانفرنس کے لیئے ایک مجلس شوریٰ کا کام کرے اور ان مسائل کے متعلق جو کانفرنس اس کے سپرد کرے اپنی رائے سے کانفرنس اور عام پبلک کو مطلع کرے۔

اس اجلاس میں کمیٹی میں حسب ذیل حضرات کا اضافہ کیا گیا۔ شیخ عبداللہ صاحب۔ شیخ فیروز الدین

مراد صاحب - سید تجمل حسین صاحب - خلیل احمد مراد صاحب - سید حامد علی صاحب - حبیب الرحمٰن صاحب - مولوی طفیل احمد صاحب - وحید الحق صاحب - میر ولایت حسین صاحب

ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وسط جون تک کوئی کارروائی نہیں ہو سکی کیونکہ اس وقت تک کانفرنس کی کمیٹی کا اجلاس نہ ہوا تھا اور بجٹ میں روپیہ منظور ہونا باقی تھا۔ جون میں کانفرنس کمیٹی نے ایک رقم اس مقصد کے لیے منظور کر دی۔ چنانچہ تعلیمی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ مدّ اول کی تحت میں روپیہ اور روقت کی کمی کا خیال رکھتے ہوئے، اس سال صرف دو کتابیں تیار کرائی جائیں جن میں سے ایک اردو کے طریقہ تعلیم پر ہو کیونکہ یہ ایک نہایت اہم موضوع ہے اور اس پر کسی قسم کی اچھی یا بری کتاب موجود نہیں ۔ تجویز یہ ہے کہ اس میں اردو کی تعلیم کے مختلف مباحث اور مختلف پہلوؤں پر مختلف ماہرین فن سے مستند مضامین لکھائے جائیں اور اس طرح ایک قابل قدر مجموعہ تیار ہو جائے۔ اس لیے جو صاحبان اس سے دلچسپی رکھتے ہوں ان سے درخواست ہے کہ وہ "تعلیم" کے کسی اڈیٹر سے خط و کتابت کریں۔ مضامین کے لیے کانفرنس کی طرف سے اجرت دی جائے گی۔

دوسری کتاب، جس کے متعلق ابھی قطعی فیصلہ نہیں کیا گیا یا تو ہندوستان کے کسی اہم تعلیمی مسئلہ کے متعلق ہوگی یا یورپ کی کسی مستند تعلیمی کتاب کا ترجمہ۔

مدّ دوم کی تعمیل میں یہ سہ ماہی رسالہ جاری کیا گیا ہے جو آج ناظرین کے سامنے پیش ہے۔

رسالہ کے مقاصد یا پالیسی کے متعلق کوئی تفصیلی بیان ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے مقاصد تفصیل کے ساتھ اس پراسپکٹس میں بیان کر دیئے گئے ہیں جو رسالہ کے ساتھ ملفوف ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ہم کس معیار کا رسالہ نکالنا چاہتے ہیں۔ اور ہماری خواہش ہے کہ اس میں مستند اور بلند پایہ تعلیمی مضامین کے ساتھ ساتھ اس قسم کے عام فہم، دلچسپ اور مفید مضامین بھی ہوں جو اُستادوں اور والدین میں مقبول ہو سکیں۔ کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ اس ذریعہ سے "تعلیم" کا حلقۂ اثر وسیع ہو، لوگوں میں تعلیمی خیالات کا پرچار ہو اور رفتہ رفتہ ان کو ان اہم تعلیمی مسائل سے دلچسپی پیدا ہو جائے جو ممکن ہے ان کو فی الحال خشک معلوم ہوتے ہوں لیکن جن کے سمجھنے پر ملک کی تعلیمی ترقی کا انحصار ہے صرف یہ کافی نہیں کہ چند ماہرین تعلیم اور تعلیم یافتہ لوگ ان کو سمجھ لیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو

ان کی اہمیت کا احساس ہو اور ان سے دل بستگی پیدا ہو۔ کیونکہ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ساری قوم اس کی پشت وپناہ نہ ہو اور ان اصولوں اور نتائج پر کاربند ہونے کی کوشش نہ کرے جن کو ماہرین فن نے اپنے مطالعہ اور تحقیق سے بے نقاب کیا ہے۔

اس وجہ سے ہم نے رسالہ "تعلیم" میں ایک شعبہ ایسے مضامین کے لیے وقف کر دیا ہے جو استادوں اور والدین کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوں گے اور ان کو عملی طور پر اُن کی مشکلات کے حل میں مدد دیں گے "بزم معلمین" کے عنوان کے ضمن میں تعلیمی اصولوں اور طریقوں کو سلیس اور دلچسپ طریقے سے بیان کیا جائے گا "تعلیمی تجربات" کے ضمن میں ان مدارس کا حال بیان کیا جائے گا جو ہندوستان میں یا دیگر ممالک میں قائم کیے گئے ہیں اور جن میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ نئے تعلیمی اصولوں اور طریقوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اسی سلسلہ میں سب سے پہلے "دہلی کے مدرسہ جدید" کا حال باقساط درج کیا جائے گا۔ اور اس کے بعد بہت سے ہندوستانی اور بیرونی ممالک کے مدرسوں اور تعلیمی تجربوں کا حال ہدیہ ناظرین ہوگا۔ جینوا کے "مدارس جدید کے بین الاقوامی ادارہ" نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس قسم کے حالات ہم کو بھیجتا رہے گا۔ ہماری ہندوستان کے مدرسوں اور ماہرین تعلیم سے درخواست ہے کہ وہ بھی اپنے اہم اور قابل قدر تجربوں کا حال منضبط کر کے ہمارے پاس بھیجیں تاکہ ان کے تجربات کی کامیابی اور ناکامی سے دوسرے اساتذہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

رسالہ کی "پالیسی" کے سلسلہ میں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ جس طرح کانفرنس کی تعلیمی کمیٹی (جو گویا اس رسالہ کی سرپرست اور نگراں پالیسی ہے) ایک نہایت نمایندہ جماعت ہے جس میں مختلف خیال کے اصحاب شریک ہیں۔ اسی طرح رسالہ کا میدان بھی بہت وسیع ہے۔ ہم کسی خاص نظریہ تعلیم یا طریقہ تعلیم کے حامی نہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے صفحات میں ہر قسم کے معقول اور سنجیدہ خیالات کو جگہ دیں خواہ ان میں کتنا ہی باہمی اختلاف ہو۔ تاکہ خیالات کے اس تبادلہ اور تصادم سے ہم حقیقت کے قریب تر ہوتے جائیں اور کچھ عرصہ کے بعد تعلیم کے بنیادی اور اصولی مسائل کے متعلق ایک حد تک اتفاق رائے ہو سکے۔ جزوی اختلافات البتہ قائم رہیں گے اور قائم رہنے چاہئیں۔

ایک ایسے کام کے لیے جو قومی یا تعلیمی ہو، مدد دینے والوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں۔ کیونکہ یہ امداد دراصل ادائے فرض ہے۔ تاہم خاص طور پر ہم اس قابل قدر امداد اور دلچسپی کا اعتراف

کرتے ہیں جو اس رسالہ کے سلسلے میں ہمارے محترم بزرگ علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب نے ظاہر کی۔ اور بیگم عطیہ فیضی کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے تعلیم نسوان کے سلسلہ میں خود بھی مضامین لکھنے کا وعدہ کیا ہے اور دوسری تعلیم یافتہ خواتین سے بھی اس اہم موضوع پر مضمون دلانے کا وعدہ کیا ہے لیکن ان کا اور سب حضرات کا (جو اس رسالہ میں دلچسپی لیں گے) اصل شکریہ وہ کامیابی ہوگی جو اس کو ان کی کوششوں کی وجہ سے انشاء اللہ حاصل ہوگی۔

مس میو کی کتاب (Mother India) نے تقریباً وہی شہرت حاصل کرلی ہے جو شیطان کی غیر مطبوعہ تصانیف کو حاصل ہے۔ انگلستان کے متعصب اخبارات و رسائل تو اس کتاب کے ہر حرف پر ایمان لے آئے ہیں اور اس کے مضامین کی اشاعت کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن بعض جن میں تعصب کم ہے یا جو اس کے اظہار میں احتیاط کرتے ہیں وہ تنقیدی نظر ڈال کر اس کے چند حصوں کو رد کرتے ہیں اور چند کو قبول۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے اس کتاب کا کوئی حرف صحیح نہیں اگر ایسا ہوتا تو اس قدر خطرناک نتائج بھی نہ پیدا ہوتے۔ "دروغ راستی آمیز" شیطان کے سب سے قوی حربوں میں سے ہے۔ مگر ہماری رائے میں اس کتاب کے صحیح حصوں کو بھی اس کے حوالہ سے نقل نہیں کرنا چاہیئے بلکہ جن ذرائع سے ان کا صحیح ہونا ثابت ہو خود اُن ذرائع کو ماخذ قرار دینا چاہیئے۔

لندن ٹائمز کے تعلیمی ضمیمہ میں ایک صاحب نے جو مس میو کے دام فریب میں گرفتار ہونے سے بچ گئے ہیں اُن کی کتاب کے بعض حصوں کی تردید کی ہے لیکن اُن کی رائے میں ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق جو کچھ ان خاتون نے لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ اُن کے بیان کو نقطہ آغاز قرار دے کر مضمون نگار صاحب نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم میں جو مشکلات حائل ہیں اُن کا ذکر کرتے ہوئے مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں کہ پردے کے سبب سے تعلیم دینے کے لیے عورتوں کا ہونا ضروری ہے مگر صورت یہ ہے کہ ایسی عورتیں ڈھونڈے نہیں ملتیں جو دیہات میں رہ کر مدرسی کے فرائض انجام دیں۔ کیونکہ ایک عورت کے اس طرح اجنبی مقام پر تنہا رہنے سے بدنامی کا خوف ہے علاوہ اس کے یوں بھی نوکری کرنے سے لوگوں کی نظر میں عورتوں کی ذلت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بوڑھے مولوی

اور بوڑھے پنڈت پڑھانے کے لیے نوکر رکھے جاتے ہیں جو پڑھانے سے اسی قدر معذور ہیں جتنے بوڑھے طوطے پڑھنے سے۔

نتیجہ یہ ہے کہ باوجود لڑکیوں کی تعلیم پر کثیر رقم صرف کرنے کے کامیابی بہت کم ہوتی ہے۔ مثلاً پنجاب کی تعلیمی رپورٹ بابت ۱۹۲۵-۲۶ء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل اسکولوں میں ۵۲۶۰۷ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایسی جنھوں نے اسی تعلیم سے کچھ فائدہ اٹھایا ہے اور معمولی نوشت و خواند کی قابلیت رکھتی ہیں صرف ۲۳۸۱ ہیں۔ اونچی تعلیم کی تحصیل تو صرف معدودے چند لڑکیاں کرتی ہیں۔ چنانچہ سال زیر رپورٹ میں انٹرنس پاس کرنے والی لڑکیوں کی تعداد صرف ۴۸ ہے۔

ہم مضمون نگار صاحب کو بعض دوسری شکایات کی طرف توجہ دلاتے ہیں جن تک ان کی نظر نہیں پہنچی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انگریزی مدرسوں کی طرح لڑکیوں کے مدرسوں میں بھی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لیے لوگ اپنی لڑکیوں کو ان مدرسوں میں نہیں بھیجنا چاہتے۔ لڑکوں کے لیے تو ہندوستانیوں نے خدا جانے کس طرح یہ گوارا کر لیا ہے کہ انھیں ان تعلیم گاہوں میں بھیجیں جو محض قوائے دماغی کو تھوڑا بہت ابھارتی ہیں لیکن روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کو بالکل دبا دیتی ہیں۔ لڑکیوں کے لیے وہ ایسی تعلیم پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ سرکاری مدرسوں کی طرف سے جن میں ایک طرح کی دفتری شان پائی جاتی ہے۔ صنف نسواں کو اسی قدر وحشت ہوتی ہے جتنی پولس سے یا عدالتوں سے۔

اس کا علاج ہمارے خیال میں یہ ہے کہ دیہات میں خود وہاں کے لوگوں کی کوشش سے لڑکیوں کے مدارس قائم ہوں جن میں وہیں کے شریف گھرانوں کی عورتیں تعلیم دیں۔ حکومت اگر اس قدر ایثار رکھتی ہے کہ ایسے کاموں میں مدد دے جن میں اس کا اثر براہ راست نہ ہوگا تو اسے ادھر توجہ کرنا چاہیے۔

گلڈ ہال لندن میں انجمن اقوام کی طرف سے بین الاقوامی مجلس جامعات کا جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس کے صدر برلن کے ہر پروفیسر [illegible] تھے۔ لارڈ پرسی وزیر تعلیم نے افتتاحی تقریر کی جس میں اس بات پر زور دیا کہ مدرسے کے لڑکوں میں انجمن اقوام کے خیالات کی تبلیغ کی جائے کیونکہ بچے آپس میں کوئی عداوت نہیں رکھتے۔ انھوں نے فرمایا کہ بین الاقوامی اتحاد نے حال میں بہت ترقی کی ہے گو [illegible] اس کے صرف معاون ہوتی [illegible] پہلے جو مشاورت کے جلسے ہوا کرتے تھے ان میں [illegible] اختلافات کو [illegible] کی کوشش کی جاتی تھی اس لیے [illegible] مضمون تھا اب عملی اور بنیادی چیزوں پر بحث ہوتی ہے [illegible] نتیجہ میں [illegible] زیادہ [illegible]

ہوتی ہے لیکن حرف شکایت درمیان میں آنا سچی صلح کی تمہید ہے۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ لارڈ پرسی اور ان کے ہم خیال ان باتوں سے کسے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ یورپ کے لوگ تو اپنی آنکھوں سے آیندہ لڑائیوں کی تیاریاں دیکھ رہے ہیں اس لیے اُن کو اس گفتگو کی حقیقت معلوم ہے۔ البتہ اگر اہل ایشیا کو تھپک کر سلانا مقصود ہے تو دوسری بات ہے۔ پھر بھی مدرسوں میں اس نام نہاد بین الاقوامی انجمن کی تبلیغ کرنا تعلیمی نقطۂ نظر سے بہت خطرناک چیز ہے۔ بیشک بچوں میں فطرتی طور پر قومی عداوت کا مادّہ نہیں ہوتا مگر اسی کے ساتھ اُن میں ریاکاری بھی نہیں ہوتی جو سب سے مہلک روحانی مرض ہے۔ مدرسہ کے بچّے جب ایک طرف یہ گیت سنیں گے کہ ساری دنیا میں امن ہے اور سب انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور دوسری طرف اپنے ملک میں مشین گنیں اور جنگی جہاز بنتے ہوئے دیکھیں گے اور کمزور قوموں کے مٹانے کی تیاریاں دیکھیں گے یا جب اُنھیں اخباروں کے ذریعہ سے انجمن کے اندرونی مفسدات ومناقشات کی خبر ملے گی تو اُن کے دل پر کیا اثر ہوگا۔ لڑکوں میں تبلیغ کرنے سے پہلے کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مفید نتائج الفاظ نہیں اعمال سے حاصل ہوتے ہیں۔

لندن میں اگست کے مہینے میں مانٹیسوری صاحبہ اپنے طریقۂ تعلیم پر لیکچر دے رہی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے طریقے کے دو اہم عناصر بتائے جن سے بہترین نتائج حاصل ہوسکتے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اشیا کے علم کے ساتھ اُن کے استعمال پر بھی زور دیا جائے ورنہ صرف یہی نہیں کہ قوائے علمی اور عملی میں ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی بلکہ خود علم دھندلا اور نامکمل رہتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ بچوں سے اس طرح کام لیا جائے کہ اُن میں اپنے افعال پر غور کرنے کی عادت اور احتیاط وسلیقہ پیدا ہو۔

بیشک یہ دونوں چیزیں بہت ضروری اور مفید ہیں لیکن دونوں کا فائدہ ایک خاص حد تک ہے جس سے تجاوز کرنے کے بعد نقصان کا اندیشہ ہے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کا ادراک ہم حواس خمسہ کے ذریعہ سے کرسکتے ہیں اُن کا علم بغیر مشاہدے اور استعمال کے علم ہی نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن جو چیزیں معقول اور ذہنی وجود رکھتی ہیں مثلاً اخلاقی یا منطقی اصول اُن کی تشریح محسوس چیزوں کے ذریعہ سے کرنے سے اُن کا بالکل غلط تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح مانٹیسوری کے دوسرے پہلو میں یعنی اپنے افعال پر سرِ وقت نظر کرنا۔ اگر زیادتی کی جائے تو فطری تیزی اور روانی کے دب جانے اور تکلف اور بناوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جو علاوہ جمالیاتی نقطہ نظر کے تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی کوئی اچھی چیز نہیں۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر اجلاس اس سال مدراس میں قرار پایا ہے۔ اور شیخ سر عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا اس کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ مقام اور صدر دونوں کا انتخاب ہماری رائے میں ہمہ وجوہ موزوں ہے۔ مدراس اس سال مختلف قسم کی قومی مجلسوں کا مرکز ہے۔ اور امید ہے کہ وہاں اس سال ملک کے صاحبان فکر کا ایک عمدہ اجتماع ہوگا اور تبادلۂ خیالات کا نہایت اچھا موقع ملیگا۔ شیخ صاحب کی تعلیمی خدمات اور ادبی قابلیت اور اُن کی سلامت پسندی مسلّم ہیں۔ اور ان صفات کی وجہ سے ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے عہدہ کی خدمات کو باحسن وجوہ انجام دینگے۔ اور اس بات کا خیال رکھیں گے کہ حالات حاضرہ میں سلامت پسندی کے ساتھ ساتھ ایک پُرزور اور منتظم تعلیمی جدّوجہد درکار ہے۔ اور کانفرنس کو ایسے عملی مشاغل اپنے ہاتھ میں لینے چاہئیں جو مسلمانوں کی تعلیم کی اصلاح اور ترقی کے لیئے مفید ہوں۔ محض درخواستوں اور بددعاؤں کے رزولیوشن پاس کرنا کانفرنس کی شان کے شایاں نہیں۔ اس کو ایک ایسا مرکز بنانے کی ضرورت ہے جو تمام ملک کے لیئے اصلاح اور تعلیمی ارتقا کا سرچشمہ ثابت ہو۔

ہم نے اعلان کیا تھا کہ رسالہ کا پہلا نمبر آغاز اکتوبر میں شائع ہو جائیگا لیکن ابتدائے کار کی دقّتیں توقع سے زیادہ نکلیں اور ہمیں رسالہ کا اجرا ملتوی کرنا پڑا۔

منجملہ اور دقّتوں کے ایک یہ بھی تھی کہ رسالہ کے مجوّزہ نام "تعلیم" پر قانونی گرفت کی گئی کیونکہ لاہور کے ایک تعلیمی اخبار کا بھی یہی نام ہے۔ مجبورًا ہمیں رسالہ کا نام "تعلیم و تربیت" رکھنا پڑا تاکہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو اور ہمارے ہم عصر "تعلیم" کو شکایت نہ رہے۔ موجودہ نام کسی قدر طویل ہے مگر پہلے نام سے زیادہ جامع ہے۔ اس لیئے ہمیں امید ہے کہ قارئینِ کرام کو زیادہ شکایت نہ ہوگی۔

انشاء اللہ آیندہ رسالہ پابندی سے جنوری، اپریل، جولائی، اور اکتوبر میں نکلا کریگا۔

اڈیٹر

کمیٹی ماہرین تعلیم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

کا

سہ ماہی رسالہ

تعلیم و تربیت

زیرِ ادارت

ڈاکٹر سید ظفر الحسن پی ایچ ڈی ڈی فل   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

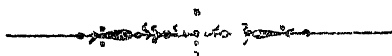
خواجہ غلام السیدین بی اے، ایم ای ڈی

قیمت سالانہ ۵؍   ششماہی ۳؍

تعلیم و تربیت

جلد (۱) | اپریل سنہ ۱۹۲۸ء مطابق شوال سنہ ۱۳۴۶ھ | نمبر (۲)

فہرست مضامین



مضامین خاص

مشرق و مغرب کے اہم تعلیمی مسائل

ہمارے محترم دوست مسٹر عبداللہ یوسف علی نے "انڈیا اینڈ یورپ" (ہندوستان اور یورپ) کے نام سے حال میں ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے مضمون ذیل اسی کتاب کے ایک نہایت پر مغز باب کا ترجمہ ہے۔ ہم اُن کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہم کو اس کی اشاعت کی اجازت دی۔ (اڈیٹر)

کایا پلٹ اور نئے نئے فتنے

دورِ حاضرہ کی ہنگامہ آرائیوں میں اگر کوئی چیز مختلف قسم کے مسائل کو حل کر سکتی ہے تو وہ صرف تعلیم ہے، ایسی تعلیم جو زمانہ کی جدید ذہنیت کے مطابق اور اصلاح یافتہ ہو، استعارۃً نہیں بلکہ واقعتاً جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کی تاریخ میں ایک جدید دور شروع ہو گیا ہے۔ جنگ عظیم نے نہ صرف ایسی متعدد سلطنتوں کو تباہ کر دیا جو قوی اور مستحکم سمجھی جاتی تھیں بلکہ اس نے انسانی زندگی اور انسانی دماغ کے ان عظیم الشان نظامات کو بھی درہم برہم کر دیا ہے جو فطرت انسانی کی ناقابل تغیر بنیاد پر مبنی سمجھے جاتے تھے۔ نہ سیاسیات میں کوئی اصول ایسا رہا ہے جو شک و شبہ سے محفوظ ہو اور نہ حیاتِ اجتماعیہ کی کوئی روایات ایسی ہیں جو مستحکم ہوں نہ فنون و ادبیات کا کوئی شعبہ ایسا ہے جو اس نئے فتنہ کے صدمہ سے متاثر نہ ہوا ہو نہ مذہبی خیالات کا کوئی ایسا گوشہ ہے جس پر مخالفانہ حملے نہ کیے گئے ہوں۔ وہی جوش و خروش جس نے قوم پرستی کو گویا ایک مذہب بنا رکھا تھا ایک ردعمل کی وجہ سے اب بین الاقوامیت کی طرف رجوع ہو گیا ہے۔ لیکن کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ بین الاقوامیت سے کیا مراد ہے اور اسے کیونکر حاصل کیا جائے! اس کا اثر یہاں تک ہوا ہے کہ علوم سائنس بھی اس کے زبردست حملے سے متاثر ہوئے ہیں چنانچہ اب ایٹم (ذرہ) کی حیثیت بھی مسلمہ نہیں رہی اور آئین سٹائین (Einstein) کے نظریۂ اضافیت نے نیوٹن (Newton) کے نظام شمسی کی بنیادوں تک کو ہلا دیا ہے۔ بیشک یہ سب کچھ براہِ راست جنگ ہی کی وجہ سے نہیں ہوا، ان کے جراثیم پیشتر ہی سے

فضا میں موجود تھے جن کو اس عالمگیر ہلچل نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا، کمزور تحریکیں قوّت پکڑ گئیں معاشرتی افادہ گاہوں (Institutions) کے متزلزل ہو جانے سے جو شکایات اور نوخیز فتنے زیر زمیں تھے وہ مستحکم ہو کر رونما ہو گئے ہیں چنانچہ خود جنگ عظیم اس کی ایک علامت اور مظاہرہ تھا۔

جدید بنیادوں کی ضرورت اس انتشار اور بے ترتیبی میں راستہ کیسے ملے؟ پرانی چوبیں جو کار آمد اور مضبوط تھیں مٹی طنابوں کے بوجھ اٹھا سکتی تھیں مگر یہ چوبیں تو نذرِ خاک ہو چکیں اب نئی پود کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں اس کو تربیت دینے کے لئے ازسرِ نو ابتدا کرنی پڑے گی۔ نئی بنیادوں کو بہت احتیاط اور غور و خوض کے ساتھ قائم کرنا اور نئی جڑوں کو ہوشیاری کے ساتھ جانا ہوگا۔

نوخیز نسلیں مناسب ہوگا کہ ہم اپنے لئے ایک غایت کو ابتدا ہی سے متعین کرلیں تاکہ اسی اعتبار سے تعلیم کے طریقے اور مضامین متعین کر سکیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک نظام قائم کر سکیں۔ تعلیم بالغان کا بہترین مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ بچوں کی تعلیم کے لئے ایک صحیح راہ پیدا کی جائے، میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ پختہ عمر لوگوں کی زندگی کو سنوارنا بجائے خود ایک غایت ہے لیکن جو عملی تغیرات جوانوں کی تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں وہ اتنے دوررس اور پائدار نہیں ہوتے جتنے وہ تغیرات ہیں جن کی ہم اپنے بچوں کی تعلیم سے توقع رکھتے ہیں۔ اس لئے ہماری تعلیم کا مخصوص منتہائے نظر یہی نوخیز نسلیں ہیں۔

مسائل جن کا سامنا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی نوخیز نسلوں کے لئے کیا چاہتے ہیں؟ کیا ہم انھیں عمدہ شہری بنانا چاہتے ہیں؟ اگر یہ درست ہے تو ہمارا عمدہ شہری سے کیا مقصد ہے؟ کچھ لوگ کامل قومیت پر زور دیں گے اور بعض کہیں گے کہ اس سے مقصود مختلف اقوام کی بین الاقوامیت ہے، اگر یہ بھی نہیں تو کیا ہمارا یہ مقصد ہے کہ اجتماعی زندگی کے لئے خوش معاشر افراد طیار ہوں؟ مگر اس مقصد کو بھی اشتراکیئین کچھ اور مفہوم پہنائیں گے اور اجتماعین کچھ اور۔

کچھ ایسا اندازہ کر سکتا ہوں یہ ان سے مختلف ہوں گی جو بڑے پیمانے پر صنعت کے قائل ہیں یا گھریلو صنعتوں اور دستکاری، فنون وغیرہ پر زور دیتے ہیں - پھر یہ کہ طریقۂ تعلیم کیا اختیار کیا جائے گا؟ آیا بچوں کو آزاد کر دیا جائے گا کہ جو تعلیم چاہیں حاصل کرلیں اور چاہیں تو بالکل ہی تعلیم نہ حاصل کریں؟ آیا ان کو فرداً فرداً تعلیم دی جائے گی یا اجتماعاً؟ آیا علم اتنا ہی وقیع ہے جتنی سیرت اور تعمیر سیرت کے لئے ہم کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں؟ آیا اظہار جذبات کی آزادی دینا بطور خود بھی کوئی غایت ہے؟ مضامین کیا کیا ہونا چاہئیں؟ آیا ہم بعض بچوں کو ادبیات کی تعلیم دیں بعض کو تمدنیات کی بعض کو حرفت تجارت کی بعض کو کھیتوں میں کام کرنے کی اور بعض کو کارخانوں مزرعہ جات و کانوں اور کانوں میں کام کرنے کی؟ تاریخ یا سائنس پڑھانے کا کیا طریقہ ہوگا؟ تاریخ سائنس اور فنون کی تعلیم سب طلباء کو دی جائے گی یا چند کو؟ اور طریقۂ تعلیم کیا ہوگا؟ آیا تاریخ کی حیثیت محض علمی ہوگی یا وہ رہنمائے سیرت قرار پائے گی؟ آیا وہ جمالیاتی حس کی تشفی کے لئے محض ادب کی شکل میں ہوگی یا قومی و مذہبی تقویت و عصبیت کا آلہ ہوگی؟ ہم کیونکر ایک ایسا نظام قائم کر سکتے ہیں جس کے ذریعہ سے مدارس قائم ہوں اور ان کا نظم و نسق ان کی تربیت، اور ان کا اشتراک باہمی عمل میں آئے؟ والدین، اساتذہ اور طلبہ کے تعلقات کیسے رہیں گے؟ ابتدائی اور ثانوی مدارس کالج جامعات اور تحقیقاتی اداروں کا باہمی تعلق کیا ہوگا؟ نیز گورنمنٹ یا ریاستہائے متحدہ کے پیچیدہ نظام حکومت کے مقابلہ میں تعصبات و بہکے مقامی حکام یا انطامات خانگی کی کیا حیثیت ہوگی؟ یہ تمام امور ان مسائل میں سے صرف چند ہیں جن سے ہم کو ایک عمومی نظام تعلیم بناتے وقت دو چار ہونا پڑیگا دراصل میں اس محدود مقالہ میں ان تمام امور کا احاطہ کرنے کی کوشش کروں تو بڑی نادانی ہوگی۔ میں صرف چند ایسے متضاد امور پر بحث و تمحیص کروں گا جو یورپ اور ہندوستان کے سرگرم مسائل کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں تاکہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ ہم ایک دوسرے کی کس حد تک مدد کر سکتے ہیں -

ہندوستان کے سرگرم مسائل
فرقہ وارانہ تعلیم

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں تعلیم سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل توجہ طلب ہیں، مگر ان میں سے چند ایسے ہیں جو خاص اہمیت رکھتے ہیں اور جن پر فوری غور کرنے کی ضرورت ہے ان میں سے اہم ترین مسئلہ فرقہ وارانہ تعلیم کا ہے، چند ہی سال گزرے کہ فرقہ وارانہ تعلیم کا بہت زور ہو گیا تھا اور نہ صرف فرقہ وارانہ مدارس اور کالج بلکہ فرقہ وارانہ یونیورسٹیاں بھی بہت جوش و خروش کے ساتھ قائم کی گئیں لیکن اس کے بعد بہت کچھ مایوسی اور ہمت شکنی ہوئی اور معلوم ہوا کہ فرقہ وارانہ تعلیم پر زیادہ زور دینے سے مذہبی تفرقوں کا استحکام اور پختگی ہوتی ہے، یہی تفرقہ آگے بڑھ کر معاشرتی زندگی تک پہنچتا ہے اور رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے نیز سیاسی معاملات میں تلخی پیدا کر کے سیاسی ترقی کو روک دیتا ہے۔ لیکن ایک ایسی صورت میں جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف حریفانہ طور پر صف آرا ہوں اور نہ صرف علیحدہ علیحدہ مذہبی احساس رکھتے ہوں بلکہ نسلی اور اقتصادی، اور معاشرتی حیثیت سے بھی اختلاف کا احساس ہو اور اپنی تعداد اور وسائل قوت کے اعتبار سے بھی باہم مدمقابل نہ ہو سکتے ہوں، تو ان کے درمیان متعدد مفاہمتیں اور سمجھوتے قائم کرنے پڑیں گے۔

چونکہ حُسن قسمت سے غیر فرقہ وارانہ مدارس حکومت کی جانب سے قائم ہیں اس وجہ سے یہ ممکن ہے کہ قومی تعمیر کو صدمہ پہونچائے بغیر فریقانہ مدارس کا ایک محدود پیمانہ پر تجربہ کیا جائے مگر گورنمنٹ کے قائم کردہ مدارس کو مذہبیت اور روحانیت سے کوئی سروکار نہیں ہے اور روز بروز یہ عیاں ہوتا جا رہا ہے کہ سرکاری مدارس کی غیر جانبدارانہ نوعیت ہماری سوسائٹی کے استحکام اور قومی اخلاق کی بنیادوں کو کمزور کر رہی ہے، یہ سچ ہے کہ اخلاقی تعلیم کو بطور ایک قائم مقام کے پیش کیا گیا ہے لیکن کوئی قطعی اطمینان بخش صورت ابھی تک معلوم نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے حالات موجودہ میں مسئلہ تعلیم کا حل غالباً اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جدا جدا، مذہبی تعلیم کا نظام قائم کیا جائے جس میں فرقہ وارانہ اختلافات

حتیٰ الامکان گھٹا دئے جائیں اور مذہب کو ایک ایسی قوت کی حیثیت سے پیش کیا جائے جو بجائے فرقہ وارانہ اختلافات کے ایک عالمگیر رواداری اور اخوت پیدا کرتا ہے۔

ب۔ تعلیم قدیم بمقابلہ تعلیم جدید | قدیم و جدید تعلیموں کی ازلی کشمکش نے ہندوستان میں ایک خاص صورت اختیار کر لی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک قدیم تعلیم سے عربی اور فارسی علوم مراد ہیں اور ہندوؤں میں سنسکرت ۔ ہندو اور مسلمان طلبہ کی ایک معقول تعداد جس کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کی توقع ہے (بالعموم یورپ میں جاکر) قدیم علوم سے لاطینی اور یونانی مراد لیتے ہیں، ان متعدد قدیم زبانوں کے مقابلہ میں دوسری طرف انگریزی زبان ہے اور ہندوستان کی کئی جدید دیسی زبانیں جن میں سے کم از کم نو یا دس میں ادب کا ایک معقول اور وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ ان تمام قدیم زبانوں کے مطالبات اور حقوق کو مقام اور افراد کے لحاظ سے طے کرنا ہے اب تک تو انگریزی زبان ہی حکومت کی تمام تعلیم گاہوں میں اعلیٰ تعلیم کا واسطہ رہی ہے لیکن گزشتہ چند سال سے کسی دیسی زبان کا ذریعہ تعلیم قرار دیا جانا عملی سیاست کا ایک مسئلہ بن گیا ہے چنانچہ ریاست حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو واسطۂ تعلیم قرار دیا ہے۔ پھر مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم میں بھی اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا قدیم اور روایاتی طریقہ جو سالہا سال سے جاری ہے اس کو قائم رکھا جائے یا جدید مغربی طریقۂ تعلیم کو رائج کیا جائے جس میں تنقیدی پہلو غالب ہو۔ اعلیٰ تنقید نسل اور مذہب کے سوالات یقیناً پیدا کر دیتی ہے خصوصاً جب اس کا تعلق عربی اور سنسکرت کی سی مقدس زبانوں سے ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سوال بہ نسبت دوسرے ممالک کے ہندوستان میں زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے اس کی آخری حل تک ہماری رسائی اسی وقت ہو سکے گی جبکہ صوبوں کی تقسیم زبان کے اعتبار سے ہو جائے گی اور ہندو مسلمانوں کا باہمی اتحاد اس حد تک پہونچ جائے گا کہ دونوں تہذیبوں کا مطالعہ اعلیٰ تعلیم کا ایک جزو لازم قرار دیا جائے۔

ج- ادبی تعلیم بمقابلہ عملی تعلیم

کاری گروں اور کاروباری لوگوں میں تعلیم کے ہونے سے ایک دوسرا اہم عملی سوال پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ تعلیم اس وقت تک محض ادبی اور اعلیٰ پیشہ ور طبقوں تک محدود رہی ہے اسی لئے اس تعلیم کی نوعیت بھی زیادہ تر ادبی ہی رہی۔ لیکن اب جوں جوں تعلیم معاشرتی اعتبار سے نیچے کے طبقوں میں پھیلتی جاتی ہے ادبی تعلیم ناموزوں اور خلاف اقتضائے زمانہ ہوتی جاتی ہے۔ ایسے ہائی سکول اور مڈل سکول بہت کم ہیں۔ جو عملی تعلیم دیتے ہوں اور مفید فنون سکھا کر عوام الناس کی فنّی معلومات اور مہارت میں اضافہ کریں حال ہی میں ایک کمیشن نے (سر طامس ہالینڈ کا کمیشن) صنعتی تعلیم کے مسئلہ کا بغور مطالعہ کیا ہے لیکن میں جس مسئلہ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں وہ صرف صنعتی تعلیم کا نہیں ہے، بلکہ یہ کہ ہر قسم کی تعلیم کو مع اعلیٰ تعلیم کے زیادہ عملی رجحان دینے کی ضرورت ہے جس قسم کی اقتصادی تعلیم یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے وہ اس قدر نظری ہوتی ہے کہ اس سے ہندوستانی زندگی کے اصلی مسائل کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ علم کو ان چیزوں سے مربوط ہونا چاہیئے جو متعلم خود دیکھ سکے اور جن کی وہ جانچ کر سکے۔ یہ اصول فلسفہ تک میں مفید ہوتا ہے اگرچہ اس کا تعلق تصوّراتِ مجردہ سے ہے۔ چونکہ ہماری فطرت میں از خود نظری رجحان زیادہ ہے اس لئے ہندوستان کی تعلیم میں عملی رجحان کی اور ممالک سے زیادہ ضرورت ہے۔

د- وسعت نظر بمقابلہ تنگ نظری

میں کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان میں تمام اعلیٰ تعلیم زیادہ تر انگریزی زبان میں ہوتی ہے چنانچہ تاریخ کی تعلیم بھی انگریزی نقطۂ نظر سے دی جاتی ہے اگرچہ ہماری معلومات انگریزی تاریخ کی نسبت کافی وسیع بلکہ عمیق ہوتی ہیں (گو یہ ضروری نہیں کہ وہ پُر مغز بھی ہوں) لیکن یورپ اور امریکہ کی تاریخ سے ہم بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قابل افسوس یہ بات ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ کا جو علم ہے وہ عموماً یک طرفہ اور مسخ شدہ ہوتا ہے اس بارے میں اگرچہ حال میں ایک زبردست ردعمل شروع ہوا ہے لیکن جو لوگ اس سوال کے

غیر جانبداری سے غور کرنا چاہتے ہیں وہ اس حجت پر پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکتے یعنی ایک غلطی دوسری غلطی کا جواز نہیں ہو سکتی۔ اور اگر بحث تاریخ کے متعلق یہی تنگ نظری قائم رہی تو اس سے نہ تو ذہنی معلومات کو ترقی ہو سکتی ہے اور نہ صحت نظر پیدا ہو سکتی ہے اب جو غلطی شروع ہوئی ہے وہ ایک دوسری سمت سے ہے اور گزشتہ غلطی سے بھی کچھ بدتر ہے۔ چونکہ ہندوستان سلطنتِ برطانیہ کا ایک حصہ ہے اس لئے اس کو سلطنت کے دوسرے حصوں کے متعلق بھی باخبر ہونا چاہیئے مگر اس حیثیت سے بھی ہماری تعلیم ناقص قرار پاتی ہے۔ ایشیا کے دوسرے ملکوں کے لحاظ سے تو یہ کوتاہی اور بھی قابلِ تاسف ہے۔ اس سوال کا حل صرف یہی ہے کہ ہندوستان بیرونی دنیا کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لے اور بیرونی دنیا ہندوستان کے معاملات میں زیادہ ہمدردانہ اور زیادہ گہری دلچسپی کا اظہار کرے۔

۳۔ سائنس کے خلاف ردعمل اور ابتدائی دور کے خواب

ہندوستان میں تعلیم کے متعلق سب سے آخری موضوع جو میں ظاہر کروں گا وہ سوراج کی تحریک سے پیدا ہوا ہے۔ ہندوستان کے ہر ترقی پسند مرد اور عورت کا یہی مقصد ہے ہندوستان کو روز افزوں آزادی ملے۔ لیکن اس تحریک نے عجیب و غریب صورتیں اختیار کرلی ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا [illegible] قومی مدرسے اور کالج جو بغیر کافی سرمایہ و تنظیم کے قائم کئے گئے تھے بری طرح ناکام ہوئے۔ یہ تسلیم کیا کہ تمام نئے ایجادات اور انکشافات کے نتائج اور سائنس کے ذریعے فطرت کی تسخیر وغیرہ خراب امور ہیں اور ان کو ترک کردینا چاہیئے نہایت مہمل اصول ہے جس کو دائرہ تعلیم سے مطلقاً خارج کردینا چاہیئے۔ گھریلو دستکاریوں کی تائید اور حوصلہ افزائی ہر محب وطن کا فرض ہے اور ہر شہری کو چاہیئے کہ وہ اس کو اختیار کرے اور عمل میں لائے۔ لیکن یہ بات اس مشورے سے بالکل مختلف ہے کہ ہندوستان میں کلوں کے استعمال کو ترک کردینا چاہیئے اور پھر اسی حالت کو اختیار کرلینا چاہیئے جبکہ ہر شخص خود چرخہ سے تھوڑی سی روئی اپنے لئے کاتتا تھا اور پوشاک بناتا تھا۔ چرخہ کو اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کا معیار بنا دینا

ایسی تلقین نہیں ہے جس سے تعلیم میں آزاد خیالی پھیلے یا اُس کی نوعیت بہتر ہو۔ یا ہماری پالیسی تنگ نظری و منافقت کے دائرہ سے باہر نکل سکے۔

یورپ کے مسائلِ عظیمہ

اب ہم ان تعلیمی مسائل پہ ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں جنھوں نے موجودہ اقوام یورپ کو پریشان کر رکھا ہے یہ فوراً کہدینا چاہئے کہ تمام یورپ کی حالت پر ایک عمومی تبصرہ کرنا ناممکن اور غیر مفید ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ یورپ کے چند بڑے بڑے تعلیمی مسائل کو بیان کر دیا جائے اور ان کا تقابل ہندوستان کے اُن چند تعلیمی مسائل کے ساتھ کیا جائے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہ مسائل بھی جن کو میں نے خاصۃً ہندوستان کے ساتھ وابستہ کیا ہے، دراصل عالمگیر تعلیمی مسائل کی خاص شکلیں ہیں جو ہمارے ہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اور اس لئے تمام دنیا کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ میں یورپ کے صرف پانچ یا چھ تعلیمی مسائل سے بحث کروں گا اور ان مسائل کو جن کی اہمیت محض مقامی ہے یا جو مخصوص قومی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں بالکل نظر انداز کر دوں گا۔

نوجوانوں کے لئے اظہار خودی کی ضرورت

سب سے پہلے جو مسئلہ میری نظر میں ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم جدید میں نوجوانوں کی کیا حیثیت ہو اور وہ کیا مطالبہ کرتے ہیں قدیم روایات نہ صرف اساتذہ سے اٹھتی جاتی ہیں بلکہ طلبا سے بھی، نہ صرف تعلیم سے بلکہ تعلق سے بھی۔

جن ممالک کی آبادی جنگ عظیم نے گھٹا دی ہے وہاں سن رسیدہ اشخاص کا تناسب بہ اعتبار آبادی اوسط سے زیادہ ہے لیکن جنگ کے اثرات زائل ہو چکے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ نوجوان طبقہ جلد حلقہائے عمل میں زیادہ سر برآوردہ اور ذی اثر ہوتا جاتا ہے خصوصاً تعلیم کے میدان میں۔ اور یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اکثر تعلیمی تحریکات مقابلتاً نوعمر اساتذہ یا ماہرین تعلیم کے ہاتھوں میں ہیں۔ سیاسی امور اور ملکوں اور شہروں کے نظم و نسق میں ان کی باتوں کو زیادہ توجہ سے سُنا جاتا ہے۔ اور قومی زندگی کے صحیح نبّاض بھی وہی ہیں۔ سن رسیدہ افراد میں تکان اور

خستگی پائی جاتی ہے لیکن جوانوں میں اعتماد ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حد سے بڑھا ہوا اعتماد وہ نئے تجربات کرنے کے لئے بیتاب ہیں اور خود کو حسب ضرورت حالات کے موافق بنانے کے لئے تیار رہیں وہ اپنے اور اپنے طلبہ کے لئے نئے امکانات کا خیر مقدم کرتے ہیں جبری تعلیم کا دور اکثر ممالک میں یا تو شروع ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے اور نوجوان اشخاص کا ایک وسطی طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو ممکن ہے کہ جبری تعلیم کی دسترس سے باہر ہو لیکن پھر بھی گویا تعلیمی حدود کے اندر رہے تاکہ وہ تعلیمی دنیا سے خارجی دنیا میں بہت ناگہانی طور پر منتقل نہ ہوں اور آئندہ اقتصادی کشمکش میں ان کو بہتر مواقع مل سکیں۔

ب صنفی آزادی | مردوں اور عورتوں کی مساوات اور عورتوں کی آزادی نے جو کم از کم نظریاتی حیثیت سے مسلم ہو چکی ہے میدانِ تعلیم میں نئے مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ یورپ کی متعدد جدید یونیورسٹیاں عورتوں سے پر ہیں ان میں سے بعض میں مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہے اور مردوں کے مقابلہ میں وہ ایسے مضامین کی تعلیم کے لئے زیادہ سرگرم ہیں جن کا تعلق تہذیب سے ہی بہ نسبت ان مضامین کے جو پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ان کو وہی مضامین پڑھائے جائیں جو مردوں کو پڑھائے جاتے ہیں یا نہیں؟ آیا نصاب کو بالکل دو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یا یہ کہ نصاب تمام مدارج تعلیم میں یا اعلیٰ مدارج میں مشترک ہو لیکن اس میں صرف اس قدر ردوبدل کر دی جائے کہ وہ اس جدید عنصر کی ضروریات کو پورا کر سکے؟ پھر یہ کہ عورتوں کی موجودگی سے مردوں کی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا؟ ظاہر ہے کہ مرد و عورت کی مساوات کا یہ قطعی مطالبہ ہے کہ علم یا ملازمت کا کوئی شعبہ بھی کسی ایک ہی صنف کے ساتھ مختص نہ کیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ کلیتاً ہر موقعہ پر مساوات کا برتنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عملی ضروریات کے پہلو بہ پہلو جذباتی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ہے اس لئے اگر مردوں اور عورتوں کی تمام اعصابی قوتیں اور طاقتیں، عملی زندگی کی کشاکش یا اعلیٰ تعلیم کے حصول کی زبردست محنت سے ضائع یا خستہ ہو جائیں اور خانہ داری

اولاد، شادی اور اُن کے متعلقہ کاروبار کے مطالبات پسِ پشت ڈال دئے جائیں تو یہ ایک قسم کی نسلی خود کشی ہوگی۔ بہر حال یہ تحریک ابھی اتنی نوعمر ہے کہ پوری طرح اس کی ترتیب و تنظیم نہیں ہو سکی۔ بلکہ دراصل لوگوں نے ان مسائل کی پوری پوری اہمیت بھی ابھی تک محسوس نہیں کی۔ یہ محض ایک تعلیمی مسئلہ ہی نہیں بلکہ اس سے متعدد معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں جو بے حد اہم ہیں مثلاً مستقبل میں نکاح کی صورتیں خانہ داری کا انتظام و ترتیب ضبط تولید، اور مالتھس (Malthus) کا نظام اخلاق وغیرہ۔

ج۔ تعلیمی آزادی | ایک مسئلہ جس پر بہت زور شور سے بحث ہو رہی ہے تعلیم میں آزادی کا مسئلہ ہے مثلاً طلبہ کی آزادی اساتذہ کی آزادی، مضامین کی آزادی اور اختیار انتظام میں لچک اور پرائیوٹ جماعتوں، میونسپل جماعتوں اور حکومت کے اختیارات اور اقتدار میں تخفیف، کیا عجب ہے کہ لیگ اقوام اپنی مجلس اتحاد ذہنی (Committee of Intellectual Co-operation) کے ذریعے تعلیمی مسائل میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ ہم تعلیم میں مرکزیت کو جس قدر کم کرتے جائیں گے اُسی قدر وہ مختلف جماعتوں کی حقیقی ضروریات کے لئے زیادہ مناسب اور موزوں ہوتی جائیگی مجھے یہ شک ہے کہ ایک میونسپل حلقہ بھی اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی یکساں تعلیمی دستور العمل تجویز نہیں کر سکتا نہ صرف یہ بلکہ متفرق پیشے، مختلف معاشرتی مدارج، حتیٰ کہ مختلف جغرافیائی قطعات بھی اپنی مخصوص ضروریات رکھتے ہیں، اسکول کے ہر شعبہ۔ Decentralization میں بلکہ ہر کلاس تک میں مرکزیت کو کم کرنے اور طلبا پر انفرادی توجہ کی ضرورت ہے، اور اگر ہم کو بہترین نتائج پیدا کرنے مقصود ہیں تو تمام معاملات میں آزادی کی بہت بڑی ضرورت ہوگی مگر آزادی کے ساتھ ساتھ اتحاد عمل، تقابل آرا اور جذبہ مسابقت کی بہت ضرورت ہے۔ ذاتی مفاد کا اثر بالکل نہ ہونا چاہئے بعض قدیم یونیورسٹیوں کو لوگ بعض مخصوص مفاد سے منسوب کرنے لگے ہیں، اور وہ نئی تحریکات سے بیزار اور جدید خیالات کی طرف سے بے پروا ہیں۔ جدید یونیورسٹیوں کو بھی اسی فرسودہ راہ پر پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہر نئی تحریک کے قائم اور پختہ ہو جانے کے ساتھ ہی یہ خطرہ بھی لاحق ہو جاتا ہے کہ مبادا وہ بھی اپنے مخصوص حدود سے باہر کی تمام تجاویز کو بدعت اور

بغاوت اور نوجوانوں کے خیالات کے لئے تباہ کن نہ سمجھنے لگے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ترقیاں تو ہمیشہ اسی طرح ہوتی ہیں کہ اولاً ایک قائم شدہ نظام درہم برہم ہوتا ہے اور پھر وہ ایک نئی شکل اختیار کرتا ہے جائز آزادی اس عمل میں موید ہوتی ہے لیکن اگر ناجائز جبر او رسختی کی جائے تو اس سے شدید ہیجانات پیدا ہوتے ہیں اور ترمیم و تنسیخ کا یہ مفید اور قدرتی سلسلہ رک جاتا ہے۔

د۔ جدید اقتصادی تنظیم

تعلیم میں سوسائٹی کی جدید اقتصادی ترتیب کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ بعض اشخاص اجتماعیت اور اشتراکیت، کو محض باتیں ہی باتیں خیال کرتے ہوں لیکن یہی الفاظ بعض افراد کے لئے پرجوش بانگ عمل بھی ہیں جن کو اس تعمیر جدید کا ایک زبردست رکن شمار کرنا چاہیئے۔ وہ زمانہ گیا جب ان امور کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی یا اُن حالات کی طرف سے جو اُن کے وجود کا باعث ہوتے تھے غفلت کی جاتی تھی اور اُن کو کوئی وقعت نہیں دیجاتی تھی۔ اب ان امور پر یقین رکھنے والوں اور نہ رکھنے والوں، دونوں کا فرض ہے کہ باہم مشورہ کرلیں اور اس امر کا خیال رکھیں کہ کہیں اس پرجوش اقتصادی بحث کے گرد و غبار میں تعلیمی مقاصد چھپ کر نہ رہ جائیں، مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکی کالج اور اشتراکی یونیورسٹیوں کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اتنا ہی قابل وقعت ہے جتنا وہ جو قدیم یونیورسٹیوں یا قدیم کالجوں کے متعلق کہا جاتا ہے اس سے اختلاف بجائے کم ہونے کے اور بھی بڑھ جائے گا۔ حصول علم میں ہم کو نفس حق کی جستجو کرنا چاہیئے اور گو یہ بظاہر محض ایک ناممکن واہمہ معلوم ہو مگر مناسب یہی ہے کہ ہم اپنے اعلیٰ نصب العین کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

ر۔ بین الاقوامی تعلقات کا جدید رنگ

بین الاقوامی تعلقات کے جدید رنگ کی وجہ سے اس امر پر غور کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ آیا تعلیم کو کلیتاً قومی ہونا چاہئے یا اس میں بین الاقوامی رنگ نمودار ہونا چاہیئے؟ پرزور قومیت اور تنگ نظر قومی تعصب کے حدود کا متعین کرنا مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قومیت نے دنیا کی تاریخ میں بہت مفید کام دیا ہے مگر یہ ضروری ہے کہ مستقبل کے تعلیمی نظام کو شکل دینے کے وقت جملہ اقوام کے مختلف کارناموں

ملحوظ رکھا جائے میں نہیں سمجھتا کہ بین الاقوامیت کی کوئی ایسی تعریف ممکن ہے جس سے ہم کو اپنے نظام تعلیمی کی نشو و نما میں مدد ملے۔ بین الاقوامیت کا جو مفہوم موجودہ زمانے میں لوگوں کے ذہن میں ہے وہ محض انسانی دماغ کا ایک میلان پرواز ہے کسی ایسی چیز کی طرف جو ہماری روزمرہ کی بے رنگ زندگی سے الگ یا ہمارے گرد و پیش کی چیزوں سے بہت بعید ہے۔ معاشرتی مصلحین اور جوشیلے صاحبان نے جو تصاویر دوسری اقوام کی کھینچی ہیں وہ اصلیت سے دور اور صداقت کے خلاف ہیں۔ اور اندیشہ ہے کہ اگر کہیں ان کی طرف سے ردعمل ہوا تو ان سے بہت نقصان پہنچے گا خواہ وہ تصویریں بغیر تنقید کے قابل تحسین سمجھ لی گئی ہوں۔ بلکہ اس صورت میں بالخصوص برا اثر پڑے گا۔ حقیقت تک پہنچنے کے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے حیطۂ نظر کے اندر ہیں اُن پر مضبوطی سے قائم رہیں لیکن ساتھ ہی اس کے وہ جذبہ جس کا تقاضا ہو کہ اقوام غیر کے علمی کارناموں اور خوبیوں کو تسلیم کرے۔ تعلیم میں بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر بین الاقوامی مجالس میں یہ جذبہ ہر جگہ ترقی کر رہا ہے اور ہر طرح کی حوصلہ افزائی کے قابل ہے۔

س۔ <u>تحقیق تاریخی</u> اس جذبہ کو سب سے زیادہ عملی صورت میں تاریخی مطالعہ کے ذریعہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اگر بہترین مسلمہ طریقوں سے تاریخ کی تدوین و تعلیم کی جائے تو وہ ایک ایسا فن بن جاتی ہے جس میں انسانی فعلیت کے تمام شعبے آجاتے ہیں اور اس سے متفرق شعبہ جات کی اضافی قدر و قیمت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ علاوہ اس کے نوع انسانی کی معاشی اور روحانی کوششوں کو جو بلاشک حیات انسانی میں ایک اہم تر حیثیت رکھتی ہیں تاریخ اپنی اصلی جگہ پر بحال کر دیتی ہے۔ جنگ و جدل کے واقعات، خواہ اندرونی ہوں یا بیرونی بظاہر زیادہ سنسنی پیدا کرنے والے اور شدید الاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ہم نسل انسان میں اتحاد عمل اور ارتباط و یک جہتی کے خواہاں ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ زندگی کا جو نقشہ اپنے طلبا کے دماغ کے سامنے مرتب کریں اُس میں اس جنگ و جدل کے عنصر کو بہت کم نمایاں کریں۔ اس اصول کی تائید میں تمام ممالک میں علیحدہ علیحدہ اور بین الاقوامی طور پر بھی بہت سی تحریکات زور پکڑ رہی ہیں۔ انجمن اقوام کی مجلس اتحاد ذہنی

(Committee of Intellectual Co-operation) کے روبرو بھی اس ضمن میں بے شمار امکانات موجود ہیں۔ نیز بین الاقوامی اخلاقی تعلیم کی کانگرس نے ایک لائحہ عمل تجویز کیا ہے جو متعدد قومی تحریکات کے ساتھ ہم آہنگ ہو انگریزی زبان بولنے والے ممالک میں جو تحریکیں پھیلی ہوئی ہیں ان سے اینگلوسیکسن دنیا خوب واقف ہے۔ جرمنی کی تحریک "مدارس کی انقلابی اصلاح" (Redical School Reform) کی جانب توجہ کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اس کا منشا یہ ہے کہ وہ ان روحانی ضروریات کو نمایاں کرے جو جنگ عظیم کے بعد خواب سے چونکی ہوئی جدید جرمن قوم میں پیدا ہوگئی ہیں اور اس کی حیثیت غالباً بہترین طور پر اس اقتباس سے سمجھی جا سکتی ہے جو ہم ڈاکٹر زیگ فریڈ کویر (Siegfried Kaweraw) کے قابل تعریف "مجمل تاریخی نقشوں" سے ۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۰ء کے زمانہ کی بابتہ ذیل میں دیتے ہیں

مجمل تاریخی نقشے (بین الاقوامی) ذیل کے عنوانات کے تحت میں مختلف ممالک اور زمانہ کی موزوں تقسیم کے لحاظ سے، متوازی کالموں میں واقعات ترتیب دئے گئے ہیں:۔

ا۔ ارتقائے اقتصادی۔

ب۔ معاشرتی حالات اور تحریکات۔

ج۔ روحانی زندگی:
- مذہب اور نظام مذہب (Church)
- فلسفہ اور سائینس
- ادب اور موسیقی
- نقاشی، سنگتراشی اور فن تعمیر
- تعلیم اور تربیت

د۔ اندرونی ملکی تنظیم:
- قانون
- حکومت
- نظم و نسق
- مسلح فوجیں

س۔ غیر ملکی یا بین الاقوامی سیاسیات۔

اس آسان تقسیم سے ان مختلف عناصر کی نئی قدر و قیمت کا اظہار ہوتا ہے جو انسان کی ذہنی، نظامی اور معاشرتی ترقی کا جزو ہیں۔

تعلیمی اداروں کی عالمگیر انجمن

تعلیمی اداروں کی بین الاقوامی انجمن (World Federation of Educational Associations) نے جس کی بنیاد ۱۹۲۳ء میں بمقام سان فرانسسکو رکھی گئی تھی اور اس نے حال ہی میں (جولائی ۱۹۲۵ء) میں اپنا دو سالہ اجلاس بمقام اڈنبرا منعقد کیا ہے، اس انجمن کی بنیاد بھی اسی عقیدہ پر ہے کہ تمام عالم میں تعلیمی مقاصد ایک ہی ہیں، انجمن مذکور سکول آنے سے پہلے کے زمانہ کے لئے ایک باقاعدہ نظام تعلیم قائم کرنے پر زور دیتی ہے اس کو جغرافیہ، تاریخ اور شہریت کی تعلیم پر اعتقاد ہے بشرطیکہ یہ تعلیم صرف ایک قومی بلکہ جدید معاشرتی و بین الاقوامی نقطہ نظر سے دی جائے۔ اس کی تمنا ہے کہ اس بات کو ظاہر کرے کہ کس طرح تاریخ عالم میں ترقی اختلافات سے ہم آہنگی کی طرف جانے سے ہوئی ہے اس کو ایک ایسی یونیورسٹی کا خواب دکھائی دیتا ہے جس میں جملہ تعلیمی نظامات باہم متحد اور مربوط ہوں، وہ بین الاقوامی تعلقات میں دلچسپی لیتی ہے اور سیرت کی تربیت اور تندرستی کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔

تعلیم کا ماحصل اور غایت اعلیٰ

اس نئے نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ تعلیم کی غایت اعلیٰ اور اس کا ماحصل ہو جاتی ہے وہ انسان سے اسی قدیم نصیحت پر عمل کراتی ہے یعنی "اپنے کو پہچان"۔ تاریخ کا اثر یہ ہوگا کہ وہ تمام اختلافات اور تنازعات سے مقامی، فرقہ وارانہ اور قومی تلخیوں کو دور کر دے گی ہم کو اپنے کمزور بھائیوں کی جد و جہد یا کوتاہیوں میں ایسی باتیں نظر آئیں گی جو یا تو ہم پر بھی گزر چکی ہیں یا گزر سکتی ہیں۔ تاریخ اس امر میں ہماری معین ہوگی کہ ہم ہر قسم کی جماعتی جنگ اور منافرت اور بین الاقوامی اور مذہبی کشمکش کو ان کے حقیقی رنگ میں دیکھ سکیں یعنی یہ کہ ان میں پڑنا انسانیت کی روح کے خلاف ایک گناہ عظیم ہے۔ تاریخ مادہ پرستی کا توڑ بتلا سکتی ہے اور مادہ پرستی وہ زہر ہے جو سرسی (Circe) کے سحر کی طرح انسانوں کو خونخوار درندے اور ناپاک سور بنا دیتی ہے!

مترجمہ سید ندیم الحسن رضوی بی۔ اے

متعلم مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج۔ علیگڑھ

کہیں جا رہا ہے یا نہیں۔ مثلاً کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ قوم کہیں جا رہی ہے؟"

قوم کا نام یوں بے دھڑک سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حضرت ضرور "نیچری ریفارمر" ہیں کیوں کہ "قومی لیڈر" کی یہ وضع قطع نہیں ہوتی اور ان دونوں کے علاوہ کسی کا قوم سے اتنا قریبی رشتہ نہیں کہ اس کا ذکر اس بے تکلفی سے چھیڑ دے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

میں ۔ معلوم نہیں۔ قیاس سے کہہ سکتا ہوں شاید "ترکستان" جا رہی ہو

سقراط۔ آخر آج کل یہ ہنگامے، شورشیں، ہڑتالیں جو ہو رہی ہیں ان سب کا مقصد کیا ہے۔

م ۔ جی یہ تو سب کو معلوم ہے کھلی بات ہے۔ اس شاندار قومی جدوجہد کا مقصد مخلوط یا جداگانہ انتخاب، سندھ کا علیحدہ صوبہ ہونا یا نہ ہونا، سائمن کمیشن کا مقاطعہ یا "معانقہ" (جسے معانقہ بھی کہتے ہیں) اور سوراج بیرون یا اندرون سلطنت برطانیہ ہے!

س ۔ میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں اوّل تو میں نے سوائے انسٹی ٹیوٹ گزٹ مرحوم اور البشیر کے کوئی اخبار پڑھا نہیں جو ان عجیب و غریب اصطلاحات سے واقفیت ہو دوسرے میں نے آپ سے ایک مقصد پوچھا تھا آپ نے کئی بتا دیئے اور اس میں بھی یا یہ یا وہ زرا اپنے مطلب کو واضح کیجئے۔

م ۔ "یا چناں کن یا چنیں"

س ۔ خدا کے لئے اس چناں چنیں کو چھوڑیئے اور یہ بتایئے کہ قوم کے پیش نظر کیا مقصد ہے؟

م ۔ آپ ہی بتا دیجئے میں جو بتاتا ہوں وہ آپ کو پسند نہیں آتا۔

س ۔ بھائی مجھے لوگ سقراط کہتے ہیں اور میرا کام سوال کرنا ہے۔

م ۔ مجھے لوگ کچھ نہیں کہتے اور میرا کام ٹالنا ہے۔

س ۔ خیر آپ مجبور کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ سر سید احمد مرحوم کے انتقال کے بعد سے قوم کا کوئی مقصد نہیں رہا۔

م - مگر ماشاء اللہ آپ بجائے خود قوم ہیں آپ کا کیا مقصد ہے۔

س - تعلیم

م - کیسی تعلیم قومی یا سرکاری، دینی یا دنیاوی، عام یا صنعتی؟

س - ہر طرح کی مگر خصوصیت کے ساتھ تعلیم نسواں

سقراط کی زبان سے یہ الفاظ نکلنا تھا کہ سارے درجے میں دفعتہً سناٹا چھا گیا جو لوگ باتیں کر رہے تھے اُنھوں نے اپنی تقریر کو ناتمام چھوڑ دیا، جو اخبار پڑھ رہے تھے اُنھوں نے اخبار کو موڑ کر گھٹنے پر رکھ لیا، جو کھڑکی کے باہر سر نکالے گنگنا رہے تھے اُنھوں نے ایک مشہور دریائی جانور کی طرح تیزی سے سر اندر کر لیا اور سب کے سب "سقراط" کی طرف تعجب کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ واقعی کپتانوں کے زمانے میں کسی شخص کا تعلیم نسواں جیسے فرسودہ مسئلے کو چھیڑنا اور اسے قومی زندگی کا مقصد قرار دینا تھی بھی حیرت کی بات۔ میں بھی سنبھل کر بیٹھ گیا کیوں کہ اس گفتگو نے جسے اب تک میں محض تفریح کا ذریعہ سمجھتا تھا خلاف توقع سنجیدہ اور نازک صورت اختیار کر لی تھی۔

م - تعلیم نسواں سے آپ کی کیا مُراد ہے؟

س - بس یہی کہ ہونا چاہیئے میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا ہمارے لئے یہ شرم کی بات نہیں کہ ہم نے اپنی عورتوں کو جہالت کے اندھے کنوئیں میں قید کر رکھا ہے۔ کیا اُن کا ہم پر یہ حق نہیں ہے کہ ہم اُن کے لئے علم و تہذیب کی روشنی مہیا کریں۔ کیا سوسائٹی کے لئے یہ مہلک چیز نہیں کہ اس کی ایک صنف عقل و دانش کے اعتبار سے جانوروں کے برابر ہو۔ کیا جاہل اور غیر مہذب عورتوں کے بچے صحیح معنی میں تعلیم یافتہ اور مہذب ہو سکتے ہیں کیا عورتوں کی مدد کے بغیر قوم قعر مذلت سے نکل سکتی ہے کیا ہم انگریزوں۔۔۔

سقراط اس قدر بلند آواز سے گفتگو کر رہے تھے کہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور پیشانی

سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ گرمی زیادہ تھی اور ان کی آنکھیں بہت چمک رہی تھیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اُن کا قطع کلام کرکے برف کا پانی پیش کروں۔ سقراط نے پانی کے دو گلاس پیئے، ایک گہری سانس لی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور پھر سلسلۂ تقریر شروع کرنا چاہتے تھے مگر انھیں غالباً یاد نہیں آتا تھا کہ کہاں سے چھوڑا ہے۔ میں نے انھیں اس زحمت سے بچانے کے لئے کہا " نہیں، ہرگز نہیں۔ بے شک۔ بے شک آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر میں تو آپ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کے نزدیک تعلیم نسواں کا نصب العین کیا ہے

س۔ کیا آپ کا منشا ر آئیڈیل سے ہے؟

م۔ جی ہاں۔ مگر تقریر کرنے سے پہلے تھوڑا سا پانی اور پی لیجے۔

س۔ نہیں شکریہ۔ ہاں تو میں آپ کو تعلیم نسواں کا آئیڈیل بتاؤں۔ سنئے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں زیور علم سے آراستہ ہوں، وحشت و جہالت سے پاک ہوں، مہذب ہوں، روشن خیال ہوں، اُن کے دل میں قوم کا درد ہو، ایک ہاتھ میں دین ہو دوسرے میں دنیا اور سر پر ــــ

م۔ بالکل بجا فرمایا۔ مگر یہ تو شاید تعلیم کا عام نصب العین کہلائے گا۔ عورتوں کی تعلیم میں کوئی خصوصیت ہونا چاہیئے یا نہیں۔

س۔ بے شک ہونا چاہیئے۔ انھیں سینا پرونا سکھایا جائے اور امور خانہ داری اور موسیقی۔ ان کے لئے مدارس الگ ہوں، کتابیں الگ ہوں، طرزِ تعلیم الگ ہو۔

م۔ مگر یہ آپ تعلیم کے نصاب سے بحث کرنے لگے۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ عورت کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔

س۔ عورت

م۔ الحمدللہ۔ مگر عورت کے معنی آپ کے نزدیک کیا ہیں

س۔ عورت کے معنی؟ زن، وومن، استری اور عربی میں جو نسا ر کا واحد ہو

م - یہ تو آپ نے عورت کے ہم معنی الفاظ بتائے۔ یہ معنی تو نہیں۔

س - اب آپ تو معمے حل کرانے لگے۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔

م - میں یہ پوچھتا ہوں کہ عورت میں وہ کون سی باتیں ہیں جن کے بغیر وہ عورت نہیں ہو سکتی اور جنھیں اُس کی تعلیم میں مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

س - تو یہ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ عورت اور مرد میں سب سے بڑا فرق تو جسمانی ساخت کا ہے۔

م - جسمانی ساخت سے تعلیم کا کیا خاص تعلق ہے۔ آپ کیسی ہی تعلیم دیں عورت جسم کے اعتبار سے عورت ہی رہے گی۔

س - بے شک مگر عورت کی جسمانی ساخت سے فطرت کا ایک اہم مقصد وابستہ ہے۔

م - یعنی بقائے نسل۔ یہ بالکل درست ہے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے فطرت نے عورت میں ماں بننے کی صلاحیت رکھی ہے۔ لیکن کیا آپ کے نزدیک یہ صلاحیت محض جسمانی پہلو رکھتی ہے؟

س - اور اس میں روحانی پہلو کون سا ہے۔

م - کیا ماں کو بچے سے جو محبت ہوتی ہے وہ روحانی چیز نہیں۔ کیا اس کی پیدائش اور پرورش کے لئے وہ جتنی تکلیفیں اٹھاتی ہے وہ روحانی ریاضت نہیں۔

س - اچھا مانا مگر اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اسے تعلیم سے کیا تعلق ہے۔ عورت کو کیسی ہی تعلیم دی جائے وہ اپنی فطرت کے اثر سے ماں ضرور بنے گی۔

م - اگر آپ جدید یورپ کے حالات سے واقف ہوتے تو ایسا نہ فرماتے۔ وہاں غلط تعلیم نے خدا جانے کتنی عورتوں کو اس خبط میں مبتلا کر دیا ہے کہ ماں بننا ان کا فرض نہیں ہے چنانچہ ان میں نہ جسمانی حیثیت سے ماں بننے کی صلاحیت ہے اور نہ روحانی حیثیت سے جذبۂ مادری باقی رہا ہے۔ جن قوموں میں یہ مرض عام ہو گیا ہے وہ اب تیزی سے

ہلاکت کے غار میں گر رہی ہیں اور اہل بصیرت کو وہ دن نظر آ رہا ہے جب ان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔

م۔ کیا آپ کبھی یورپ تشریف لے گئے ہیں۔

س۔ اس سے کیا بحث ہے۔ البتہ یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو واقعہ میں بتا رہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے۔ اب آپ یہ فرمائیے کہ آپ اس سے کیا نتیجہ نکالتے ہیں۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ "سقراط" کو میرے یورپ جانے کے گمان نے کسی قدر مرعوب کر دیا۔

س۔ آپ کس قسم کا نتیجہ چاہتے ہیں۔

م۔ اس گفتگو کے بعد تعلیم نسواں کے نصب العین یا آئیڈیل کا پہلا اہم عنصر کیا قرار پایا۔

س۔ یہ کہ عورت کو جسمانی اور روحانی حیثیت سے ماں بننے کی تعلیم دی جائے۔

م۔ ہاں مگر تعلیم سے مراد یہاں کوئی پوتھی پڑھانا یا وعظ سنانا نہیں بلکہ ایسا ذہنی ماحول پیدا کرنا ہے جو اچھی صلاحیتوں کو ابھارے اور برے اثرات کو روکے پھر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اُمومت یعنی ماں بننا محض بچہ پیدا کرنے اور اس سے محبت کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ اس کی پرورش اور تربیت کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لینا اور ان کے پورا کرنے کی قابلیت بہم پہنچانا بھی اس میں داخل ہے۔

س۔ بے شک آپ بجا فرماتے ہیں۔ کاش ہماری قوم کو یہ احساس ہوتا کہ اس پر قومی یونیورسٹیوں کی امومت کا فرض عائد ہوتا ہے۔ کاش وہ یہ سمجھتی کہ یونیورسٹی قائم کر دینا اور اس کی فلاح کا دل سے طالب ہونا کافی نہیں بلکہ جس طرح ماں اپنے بچے کو ہر وقت نگاہوں میں رکھتی ہے اور اسے ہر طرح کی تکلیف سے بچانے کے لئے اپنا لہو پانی ایک کر دیتی ہے ۔ ۔ ۔

گرمی بہت بڑھ گئی تھی اور برف کا پانی ختم ہو چکا تھا مگر جو نوجوان سقراط کے قریب بیٹھے تھے اُن میں سے ایک صاحب کے پاس پنکھا تھا۔ میرے اشارے کو سمجھ کر وہ سقراط کو پنکھا جھلنے لگے اور اُن کے ساتھی نے گانا شروع کر دیا۔ آتا ہی یاد مجھکو گزرا ہوا زمانہ ۔۔

جب وہ گا چکے تو میں نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

م ۔ اگر آپ غور فرمائیں تو امومت کے معنی اصل میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔ امومت کی تحت میں عام شفقت، ہمدردی، شکستہ دلوں کی دلدہی، زخمیوں کی خبرگیری، بیماروں کی تیمارداری۔ غرض وہ سب چیزیں آتی ہیں جنھیں فطرت نے عورت کے دل میں اس غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ انسانی زندگی کی محافظ بن سکے ان باتوں کی صلاحیت ایک حد تک مردوں میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن نہ انھیں اس میں اتنا سلیقہ ہے نہ اتنا انہماک جتنا عورتوں کو ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ان کی تعلیم منشائے فطرت کے مطابق ہوئی ہو۔

س ۔ آپ نے بجا فرمایا شاعر کہتا ہے۔ "a ministering angel thou"

م ۔ اچھا اب یہ فرمائیے کہ عورتوں کی تعلیم کا دوسرا اہم عنصر کیا ہے۔

س ۔ اگر پہلی ضروری چیز ماں بننے کی تعلیم ہے تو دوسری غالباً بیوی بننے کی تعلیم ہوگی۔

م ۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً۔ یہی دو چیزیں عورت کو عورت بنانے کے لئے ضروری ہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ عورت کی سیرت میں سوائے امومت اور زوجیت کے کوئی اور اہم پہلو نہیں۔ مگر اور باتیں جو ہیں وہ اس میں اور مرد میں مشترک ہیں لیکن جو صلاحیتیں عورت کے لئے مخصوص ہیں اُن میں یہی دو سب سے نمایاں ہیں۔

س ۔ مگر مولانا حالی نے فرمایا ہے " اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے " اس میں عورت سے تین حیثیتوں سے خطاب کیا ہے ۔ زوجیت کا ذکر نہیں۔

م ۔ مقدر ہے جو مذکور نہیں۔ خطاب میں تعمیم خلاف مصلحت تھی۔

س - مگر یہ تو فرمائیے زوجیت سے آپ کا منشا کیا ہے

م - اس سے میری مراد ہے وہ صلاحیت جس سے عورت مرد جیسے وحشی کو رام کرتی ہے، اُس کی خشونت کو دُور کرتی ہے؛ اس کے دل میں نرمی، لطافت، ذوقِ حسن۔ غرض ساری جمالی صفات کی تخلیق کرتی ہے۔ اگر عورت ہماری زندگی میں دل فریبی اور دل کشی نہ پیدا کرتی تو ہم ہمیشہ نیم وحشیوں کی طرح پہاڑوں کے غاروں میں رہا کرتے جانوروں کا کچّا گوشت کھاتے اور درختوں کے پتّوں سے اپنا بدن ڈھکتے۔

س - اسی لئے ہمارے ملک کے ایک انشا پرداز نے عورت کو گہوارۂ تمدن کہا ہے۔

م - مگر زوجیت کو ہمارے ملک کی جدید تعلیم پائی ہوئی عورتوں کی طرح جمالیاتی زندگی تک محدود نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بیوی کا کام محض اتنا ہی نہیں کہ وہ اپنے جسم و روح کو سنوارے، اپنے گھر کی آرایش کرے، اپنے شوہر کے دل کو لُبھائے بلکہ تقسیم محنت کے اصول کے مطابق اُس کے حصے میں خانہ داری اور اُس کے تمام لوازم بھی آتے ہیں جنھیں شاعری سے کوئی مناسبت نہیں۔ زوجیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ عورت اپنی ذات میں جمالیات و معاشیات، کاروبار اور رومان، نزاکت اور محنت کا صحیح امتزاج پیدا کرے۔

س - سچ کہا آپ نے۔ یہ نہ ہو کہ۔ معلمت ہمہ شوخی و دلبری آموخت اور کام کا یہ حال کہ روٹی کچی اور دال گلتی نہیں۔

م - تو حضرت میرے خیال میں عورت کے تعلیم کا نصب العین یہ ہے کہ علاوہ عام انسانی صفات کے اُس میں امومت و زوجیت کی مکمل صلاحیت موجود ہو۔

س - کیا علوم و فنون، سیاست و حکومت وغیرہ میں مہارت ہونا عورتوں کے لئے ضروری نہیں۔

م - اگر آپ مہارت پر زور دیں تو میں کہوں گا کہ نہیں۔ ایک حد تک تو ان سب چیزوں کا

بھی عورت کی زندگی سے تعلق ہے۔ لیکن اس حد سے آگے مستثنیات سے قطع نظر کرکے
عام طور پر عورتوں کو نہ ان کی ضرورت ہے نہ صلاحیت نہ شوق۔

س ۔ آخر یہ حد کون سی ہے ؟

م ۔ یہ بجائے خود ایک بحث ہے اس وقت میں مجمل طور پر یہ کہوں گا کہ جہاں تک یہ چیزیں اُمومت و زوجیت کے لئے ضروری اور مفید ہیں اسی حد تک انھیں عورتوں کی تعلیم میں جگہ ملنا چاہیئے۔

س ۔ آپ کے نزدیک عورتوں کی تعلیم کا یہ نصب العین ہے تو آپ غالباً اس سے بھی اتفاق کرینگے کہ عورتوں کی تعلیم کا طریقہ اور نصاب بھی جداگانہ ہونا چاہیئے اس باب میں آپ کا کیا خیال ہے۔

م ۔ تعلیم کے دو عناصر ہیں۔ تربیت اور درس۔ تربیت تو ظاہر ہے کہ لڑکیوں کی لڑکوں سے بالکل الگ ہوتی ہے اور ہونا چاہیئے لیکن درس کا طریقہ علٰحدہ ہونے کے کیا معنی ہیں کسی فن کے طریقۂ درس کے تعین میں دو چیزوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ ایک تو خود اس فن کی ماہیت کا دوسرے پڑھنے والے کی طبیعت کے انداز کا پہلی چیز میں تو اختلاف کی گنجائش نہیں اب رہی دوسری چیز اُس کی بھی یہ صورت ہے کہ عورتوں اور مردوں میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو ادراک و تعقل کا عمل دونوں میں ایک ہی طرح واقع ہوتا ہے خصوصاً جب تک لڑکے اور لڑکیاں کم عمر ہوں اُن کے قوائے ذہنی بڑی حد تک یکساں ہوتے ہیں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ درس کا طریقہ کیسے الگ ہوسکتا ہے۔ کیا اُستاد اور اُستانی لڑکیوں کو ریاضی پڑھاتے وقت ناک پر اُنگلی رکھ لیا کریں یا جغرافیہ کی تعلیم شرم سے سر نہوڑا کر اور مُنھ چھپا کر دیا کریں۔

س ۔ خیر طریقۂ درس نہ سہی نصاب تعلیم تو جداگانہ ہونا چاہیئے۔

م ۔ نصاب تعلیم بھی ابتدائی تعلیم میں الگ ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ آٹھ نو برس کی عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ ساتھ اور ایک ہی نصاب کے ماتحت تعلیم دینا چاہیئے کیوں کہ

اس وقت فطرت ذہنی پہلو سے ان کے اختلاف جنس کو نمایاں نہیں کرتی پھر آخر دنیا میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے اور ان کے خیالات اور سیرت میں کسی حد تک یکرنگی کی ضرورت ہے۔ کوئی زمانہ تو ایسا ہونا چاہیئے جب اُن کی تعلیم و تربیت یکجا اور یکساں ہو اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے سب سے موزوں بچپن کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں البتہ لڑکیوں کے مدارس الگ اور اُن کی تعلیم جداگانہ اصول کے مطابق ہونا چاہیئے۔ درسی طریقہ یہاں بھی یکساں رہے گا۔ البتہ نصاب تعلیم میں اس حد تک فرق ہوگا کہ عورتوں کی تعلیم میں منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ مجرد علوم کو بہت کم جگہ ملے گی اور دوسرے علوم میں بھی انتخاب سے کام لیا جائے گا۔ یہاں عورتوں کی تعلیم کا مرکز علم دین، ادب اور فنون لطیفہ کو قرار دینا چاہیئے اور ان چیزوں کا نصاب اس عنوان سے بنایا جائے کہ امومت اور زوجیت کے لئے عورتوں کو جو معلومات اور ذہنی تربیت درکار ہے وہ حاصل ہو سکے۔ مگر حتی الامکان اس تنگ نظری سے بچنا چاہیئے کہ زنانہ اور مردانہ ادب میں کوئی گہرا فرق کیا جائے۔ ادب کا موضوع زندگی ہے اور زندگی کوئی ریل گاڑی نہیں جس میں زنانہ اور مردانہ ڈبّے الگ ہوں۔ بلکہ ایک دریا ہے جس میں ہر موج ایک دوسرے سے اس طرح ملی جلی ہوتی ہے کہ الگ نہیں کی جا سکتی اور اس کے مشاہدہ کے لئے ہمیں پوری سطح پر ایک ساتھ نظر ڈالنا ضروری ہے۔

گاڑی ایک بڑے اسٹیشن پر رکی جہاں مجھے اُترنا تھا۔ میں سقراط سے رخصت ہوا اور اُن کا شکریہ ادا کیا کہ اُن کے سبب سے وقت اچھی طرح کٹ گیا۔ انھوں نے بھی بہت شکر گزاری کا اظہار کیا۔ نوٹ بک میں میرا نام اور پتا لکھا اور اپنا نام اور پتا بتایا جسے ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسٹیشن کے دروازے سے نکلتے وقت میں نے مڑکر پیچھے دیکھا بیچارے برف ہاتھ میں لئے زنانی گاڑی کی طرف دوڑتے چلے جا رہے تھے۔

عابد حسین

تعلیم اور اصلاح معاشرت

آج کل کے زمانہ میں جب ملک کی ذہنیت زیادہ تر سیاسیات کی طرف راجع ہو گئی ہے "اصلاح معاشرت" کے مسئلے کے متعلق کچھ لکھنا بظاہر بعید از کار معلوم ہوتا ہے۔ گذشتہ بیس سال کے واقعات نے ہمارے خیالات اور دلچسپیوں کی رو کو بہت کچھ بدل دیا ہے اور ہمارے رہبروں اور نوخیز نسلوں کی توجہ کو تعلیم، مذہب اور معاشرت کے مسائل سے ہٹا کر زیادہ تر ملک کے سیاسی حالات کی طرف پھیر دیا ہے۔ میں سیاسیات کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک میں حکومت خود اختیاری کا قیام نہایت ضروری ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ ضروری ہے کہ ملک کے باشندوں میں وہ پختگی اور خوبیاں پیدا کی جائیں جو ان کو نہ صرف ایک دوسرے پر بلکہ اپنے نفس پر حکومت کرنے کے قابل بنا دیں۔ حکومت ذمہ داری کا احساس چاہتی ہے اور یہ احساس ہم میں مفقود ہے۔ اس لیئے ضرورت ہے کہ ہم اپنے سیاسی مطالبات کو استقلال اور سرگرمی کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ قومی سیرت کی بنیادوں کو مستحکم کریں تاکہ عمدہ طریقے سے فرائض کی ادائگی اور حقوق کی حفاظت کر سکیں۔

تاہم میرے خیال میں اپنی پوری توجہ کو سیاسیات کی طرف مبذول کر دینا ٹھیک نہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ ۹۹ فیصدی لوگوں کے لیئے سیاست کے معنی پبلک میں تقریر کرنا اور پبلک سے چندہ جمع کرنا رہ گئے ہیں۔ لیکن چونکہ اس میں شہرت جلد تر حاصل ہوتی ہے، شور و غل زیادہ ہے، اور لیڈری کی کشش زبردست، اس لیئے بہت سے لوگوں کی کوششیں "تعمیری مشاغل" سے ہٹ کر

سیاسی ہنگاموں اور ہنگامہ خیزیوں میں صرف ہوتی ہیں۔ اور تعلیم و اصلاح کے زیادہ صبر طلب کام، جو خاموشی اور متانت چاہتے ہیں، جن کے لیے طبیعت کی بے نیازی درکار رہے، جو نام و نمود کے لئے نہیں بلکہ جذبۂ خدمت کی تشفی کی خاطر کیے جاتے ہیں، یہ کام ہندوستانیوں نے بالعموم اور مسلمانوں نے بالخصوص پس پشت ڈال دئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری کوششیں اور سرگرمیاں محض سطحی اور نمائشی ہوتی ہیں ان کا کوئی دیرپا اور مستقل اثر نہیں ہوتا ہم آتشبازی کی تیز روشنی کو تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں پر ترجیح دیتے ہیں اس لیئے ہمارا جوش اور ہماری قوت عمل بھی آتشبازی کی طرح عارضی ہوتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آج آپ کی توجہ ان قومی مسائل اور ضروری کاموں کی طرف مبذول کراؤں جو بظاہر اس قدر دلچسپ اور اہم معلوم نہیں ہوتے جس قدر سیاسی مسائل پر تقریریں کرنا یا بزعم خود ان کو حل کرنا۔ لیکن جو دراصل تعمیر ملت اور قوم کی غیر منتظم اور پراگندہ زندگی کی شیرازہ بندی کے لیئے بالکل لازمی ہیں۔ وسیع معنوں میں "معاشرت کی اصلاح" کا مسئلہ اس لیئے اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا تعلق ہر فرد بشر سے ہے۔ اس کا اثر ملک کے ہر باشندے کی زندگی پر فوری اور براہ راست ہوتا ہے اس کے مطالعہ سے روزمرہ کے ان مشاغل کو سمجھنے اور باحسن وجوہ پورا کرنے میں آسانی ہوگی جن میں اس کی زندگی کا بیشتر حصہ گذرتا ہے۔ سیاست کی حد آدمی کی زندگی کی حدود کو محض ایک رخ پر چھوتی ہے لیکن معاشرت اس کی تمام زندگی پر محیط ہے۔ علاوہ بریں سیاست محض ایک ذریعہ ہے معاشرت کو بہتر اور خوبتر بنانے کا۔ اس لئے ہمیں محض ذریعہ کو حاصل کرنے کی سرگردانی میں مقصد اعلیٰ کو فراموش نہ کرنا چاہیئے۔

ناشکری ہوگی اگر میں اصلاح معاشرت و تمدن کے سلسلے میں مختصراً ان کوششوں کا ذکر نہ کروں جو گذشتہ صدی کے اخیر میں اور اس صدی کے شروع میں کی گئی تھیں۔ سرسید مرحوم اور ان کے تمام رفقائے کار، محسن الملک وقار الملک، حالی شبلی وغیرہم اصلاح

تمدن پر نہ صرف زور دیتے تھے بلکہ اپنی تقریر و تحریر سے اور اپنے اپنے مخصوص انداز اور مخصوص حلقہ میں اس کے لیئے عملی کام کرتے تھے۔ اور یہ اسی بلند پایہ جماعت کی مخلصانہ خدمات کا فیضان ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کی خواہش پیدا ہوئی، اسلامی اسکول اور کالج قائم کیئے گئے، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد پڑی اور اس نے اپنی توجہ کو نہ صرف تعلیمی مسائل کی جانب پھیرا بلکہ اصلاح معاشرت کی ضرورت کو تسلیم کیا اور اس کو اپنا ایک اہم شعبہ قرار دے کر بہت عرصہ تک کم و بیش کامیابی کے ساتھ "صیغہ اصلاح تمدن" کو چلایا۔

اس صیغہ کے اصلی روح رواں اور اول سکرٹری آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم تھے اور احسان ناشناسی ہوگی اگر میں اصلاح تمدن کی کوششوں کے تذکرہ میں ان کی خدمات کا اعتراف نہ کروں۔ انھوں نے اپنی دوراندیشی اور نکتہ فہمی کی وجہ سے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ قوم کی مستقل اور پائیدار اصلاح کے لیئے ان کے اخلاق و عادات، ان کے رسوم و عقائد، ان کے طریقہ کاروبار اور آمدنی اور خرچ کو درست کرنے اور اعتدال پر لانے کی ضرورت ہے۔ اصلاحات جو گورنمنٹ کی طرف سے یا قانون کی رو سے نفاذ پذیر ہوں بیرونی اصلاحات ہیں۔ وہ بجائے خود قوم کی زندگی کو پاک اور پاکیزہ نہیں بنا سکتیں۔ اصلاح اندر کی طرف سے ہونی چاہیئے۔ اس طرح کہ اس کا اثر روزمرہ کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر عمل میں سرایت کر جائے۔ خواجہ صاحب مرحوم نے بیس سال مسلسل اس کوشش میں صرف کیئے۔ تقریر و تحریر کے ذریعہ سے، ذاتی گفتگو اور اثر سے اپنی پاکیزہ زندگی کی متعدی مثال سے لوگوں سے معاہدے لکھا کر، اور رسالہ عصر جدید کی وساطت سے انھوں نے اصلاح تمدن کے متعلق صحیح خیالات کی اشاعت کی۔ یہ رسالہ ابتدائے ۱۹۰۳ء سے اخیر ۱۹۰۸ء تک ایک ماہوار رسالہ کے طور پر نہایت متانت اور خوش اسلوبی سے نکلتا رہا۔ اور اس کے بعد ان کے انتقال سے پہلے ڈیڑھ سال تک بطور ایک ہفتہ وار اخبار کے نکلا۔ اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے ایک معقول حصے میں وہ خیالات راہ پا گئے

جن کی اس رسالہ نے علم برداری کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ مختصر طور پر آپ کو بتاؤں کہ وہ کیا خیالات تھے جو اس کانفرنس کے صیغہ اصلاح تمدن کے سکرٹری نے اپنے قول اور فعل کے ذریعے مسلمانوں میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے خود عصر جدید کے دوسرے دور کی ابتدا کرتے ہوئے ان اصلاحی خیالات کو اس طرح ترتیب دیا تھا۔

(۱) دولت کو بُری طرح نہ مٹاؤ۔

(۲) شادی، غمی، رسموں اور دعوتوں کے اخراجات میں اعتدال برتو۔

(۳) اولاد کو حتی الامکان تعلیم دو اور ان کو نئی تہذیب کی فضول خرچیوں سے بچاؤ۔

(۴) خوف خدا اور رسول کو معاشرت میں اپنا رہنما بناؤ اور خاتم الرسل اور ان کی عترت کی پوری پوری عزت و عظمت کرو۔

(۵) کسی مذہب کے بزرگوں پر بدتہذیبی سے حملہ نہ کرو اور نہ لوگوں میں مذہبی اشتعال پیدا کرو۔

(۶) جائز ذرائع سے معاش پیدا کرنے کو عین دین سمجھو۔

(۷) بُرے قصوں، بُرے لٹریچر اور بُرے اخباروں کو اپنے مطالعہ سے خارج کرو۔

(۸) ہر شخص محنت اور کام کئے بغیر دوسروں پر اپنا بار نہ ڈالے۔ خیرات صرف معذور اور مستحق لوگوں کو دیجائے۔

(۹) زراعت، تجارت اور صنعت کے پیشوں کو عزت کے ساتھ دیکھو۔ اور جہاں سرکاری ملازمت ملنے میں دقت ہوتی ہے وہاں اس پر ٹوٹ کر نہ گرو۔

(۱۰) دولت امانت الٰہی ہے اس کے حاصل کرنے اور خرچ کرنے میں مرضی خدا کا خیال کرنا لازم ہے۔ یہی جسمانی اور روحانی قوتوں کے حصول و خرچ کا مآل ہونا چاہیئے۔

(۱۱) مذہبی طبقے کو اپنے تقدس کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اپنی خدمات کے ذریعہ سے

محترم بننا چاہیئے۔ وہ خدمات یہ ہیں کہ لوگوں میں کفایت، اعتدال اور خدا ترسی کے خیالات پھیلائیں۔

(۱۳) یورپ کی تہذیب سے بالکل سراسیمہ اور پریشان نہ ہو جاؤ۔ بلکہ ناموس الٰہی اور تقویٰ کے ماتحت اس کی پیروی کرو۔

(۱۴) فضول جھگڑوں کو چھوڑ کر تمام تر توجہ کام کی باتوں پر کرو۔

اس تحریک کا، جو اولاً محرک کی ذاتی ذمہ داری پر اور پھر ان کے ایما سے کانفرنس کی سرپرستی میں شروع کی گئی تھی، مقصد یہ تھا کہ "باتوں کی جگہ کاموں کو نمود کی جگہ حقیقت کو، ناموری کی جگہ خدمت کو، ترقی ترقی کی صدا کی جگہ ادائے فرض کو، اور جاہ طلبی کے بجائے اسلام کی حقیقی روح پیدا کرنے کے جذبہ" کو مسلمانوں میں رائج کیا جائے جن لوگوں نے گذشتہ بیس برس کی ہندوستانی سیاسیات اور ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف تحریکوں کا غور سے مطالعہ کیا ہے وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان مقاصد کی جس قدر اہمیت اُس وقت تھی اس سے کہیں زیادہ اب ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے قوم کا دماغی ارتقا بیس سال سے اسی طرح ہو رہا ہے کہ ان میں باتوں کی نمود کی اور جاہ طلبی کی خواہشات دن بدن مضبوط ہوتی جاتی ہیں اور وہ اصول اور قوت عمل جو قوموں کو بناتے ہیں اور ان کی اجتماعی طاقت کو مستحکم کرتے ہیں رفتہ رفتہ ان میں سے مفقود ہو گئے ہیں۔ اس ناگوار اور خطرناک صورت حال کے احساس نے مجھ کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ میں اولاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس مدراس میں حاضرین کی توجہ اس اہم تعلیمی اور اصلاحی مسئلہ کی جانب مبذول کروں۔ اور اب تعلیم و تربیت کے صفحات میں ان خیالات کو مختصر طور پر بیان کروں جن پر غور کرنا میرے خیال میں ہمارے اساتذہ کے لیے خاص طور پر ضروری ہے۔

اس ایک مضمون میں یہ ممکن نہیں کہ میں اصلاح تمدن کے ان تمام مسائل پر نظر ڈالوں جن کا اقتباس میں نے اوپر دیا ہے اس لیے میں بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنی توجہ کو ان

کرنا چاہیئے جس کی ہم ان سے خواہش کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اخلاق کے ان بنیادی سادہ اصولوں کو تسلیم کر لیں اور ان کو اپنی زندگی کے لیے مشعل ہدایت بنالیں تو وہ رحشیانہ جنگ اور خونریزی جس نے آج کل ملک کی فضا کو تیرہ و تار کر رکھا ہے، اور جس کو غیر اقوام ہماری سیاسی ترقی روکنے کے لیے ایک عذر بنائے ہوئے ہیں دور ہو جائیگی

لہذا اصلاح تمدن کے سلسلے میں سب سے پہلے جس مسئلے سے ہم دوچار ہوتے ہیں وہ اصلاح اخلاق کا مسئلہ ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ لوگوں میں عام طور پر اس بات کا احساس ہی نہیں کہ اصلاح ضروری ہے۔ وہ خود کو ابھی تک ماضی کے افسانوں اور داستانوں کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھتے ہیں اہل مغرب اور دوسری قوموں کے مادی تفوق سے مرعوب ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس برتری کا اصلی سبب ان کے اخلاق کی برتری ہے۔ ان میں باہمی اتحاد زیادہ ہے۔ وہ لین دین میل جول، سیاست و معاشرت کے مسائل میں ایک دوسرے پر زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ ان میں کسب معاش کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور ان کے ہاں مفت خوروں اور ذلیل ناکردہ کاروں کی فوجیں موجود نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان میں صحیح عزت نفس اور قومی عزت کا احساس ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی زندگی میں سنجیدگی اور بھاری بھرکم پن ہے جو ہمارے ہاں مفقود ہے۔

اس بیان سے آپ کو واضح ہو گیا ہو گا کہ اصلاح تمدن کا شعبۂ اول یعنی اصلاح اخلاق دراصل ایک تعلیمی مسئلہ ہے۔ اور اگر ہم اس سے عہدہ برآ ہونے اور نئی نسلوں میں ایک صحیح تر معیار اخلاق کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی توجہ تعلیم کی جانب مبذول کرنی پڑیگی میں اس امر کے متعلق آگے چل کر خیالات کا اظہار کرونگا۔

اب میں دوسرے اہم مسئلہ کی جانب رجوع ہوتا ہوں جس کا تعلق ملک کی اقتصادی حالت سے ہے۔ میری شکایت صرف یہی نہیں کہ ہمارا ملک غریب ہے اور لوگوں کو دو وقت کھانے کو نہیں ملتا۔ بلکہ میں ان خطرناک اور دوررس نتائج کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں

جو ہمارے افلاس، ہماری غربت اور ہماری بے کاری کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں - اور جن کی وجہ سے ہمارے قومی تمدن کی بنیادیں متزلزل ہو رہی ہیں اور اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو وہ کچھ عرصہ میں بالکل کھوکھلی ہو جائیں گی - ہماری غربت کے بہت سے اسباب تو ایسے ہیں جو ہندوستان میں عام ہیں یعنی تجارت اور صنعت و حرفت سے بے پرواہی تعلیم کی کمی اور اسی کی وجہ سے دولت پیدا کرنے کے طریقوں اور دنیا کی ترقی علم و فن سے بے خبر ہونا، سرکاری ملازمتوں پر یورش، متعلقین کی تعداد کا زیادہ ہونا وغیرہ - اور بعض اسباب ایسے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ بالکل مخصوص تو نہیں لیکن زیادہ شدت سے انھیں میں پائے جاتے ہیں یعنی تمدن کے ہر شعبہ میں فضول خرچی اور ذاتی وجاہت کا معیار، کارکن لوگوں اور ایمانداری کے ساتھ کسب معاش کرنے والے لوگوں کی کمی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں مختلف قسم کے گداگروں، خیرات خوروں، مفت خوروں، بیکاروں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی جو ملک کی دولت کو بڑھانے میں مدد نہیں دیتے - محض اس کو خرچ کرتے ہیں - اس سے نہ صرف یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی فی کس دولت کم ہو جاتی ہے بلکہ بڑا نقصان یہ ہے (اور اسی کا مجھے اس وقت خاص طور پر ذکر کرنا ہے) کہ اس بیکاری کی وجہ سے ملک کے اخلاق پر نہایت ہی تباہ کن اثر پڑتا ہے - جو شخص اپنی زندگی میں کسی جائز کام میں مشغول نہیں، جو شخص کسی معقول طریقے سے کسب معاش یا خدمت خلق نہیں کرتا وہ نہ صرف ملک پر بار ہے بلکہ اس کی اپنی شخصیت ایک مضر اور ذلیل چیز ہے - کام زندگی کی قیمت ہے اور جو شخص اس قیمت کو ادا نہ کرے وہ اپنے خالق کو دھوکا دیتا ہے اور اس کی زندگی اخلاقی نقطۂ نظر سے وہی درجہ رکھتی ہے جو ایک چور یا گرہ کٹ یا ڈاکو کی کیونکہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی کمائی پر گذارہ کرتے ہیں - ایسے لوگوں میں نہ پاس عزت ہوتا ہے، نہ صلاحیت عمل، وہ اپنی زندگی بھی تباہ کرتے ہیں اور ان سب کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں جن سے ان کو واسطہ پڑتا ہے -

میں اس زمرہ میں نہ صرف گداگروں، خیرات خوروں، ڈوموں، قوالوں وغیرہ کو شامل کرتا ہوں بلکہ وہ سب لوگ بھی جو مذہب کی غلط آڑ لے کر مختلف طریقوں سے قوم کی گاڑھی کمائی کھاتے ہیں اور مزاروں کے مجاور، یا نام نہاد پیر، یا صوفی، یا ملّا یا فقیر اور شاہ صاحب بن کر بیوقوفوں کی بیوقوفی پر گذارہ کرتے ہیں، میں اس زمرہ میں ان تندرست اور ہٹے کٹے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی شامل کرتا ہوں جو رئیسوں اور نوابوں کی مصاحبت اور خوشامد کر کے ان کا اور اپنا دونوں کا کیرکٹر خراب کرتے ہیں اور کوئی مفید تخلیقی کام انجام نہیں دیتے۔ میری اس فہرست میں وہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل ہیں جو گھر پر بیٹھ کر مفت روٹی کھاتے ہیں کیونکہ ان کو ان کی "حیثیت" کے مطابق نوکری نہیں ملتی۔ حیثیت میری رائے میں کوئی چیز نہیں اور اگر وہ کوئی چیز ہے تو اس کا تمام تر انحصار انسان کی اپنی اخلاقی قوت، اس کی ایمانداری، راستبازی اور ادائے فرض پر ہے۔ کسی جائز پیشہ کو اختیار کرنے سے، خواہ وہ عوام کی نظر میں کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو کسی انسان کی اور بالخصوص کسی مسلمان کی حیثیت اور شرافت میں فرق نہیں آسکتا۔ اسلام نے اس امتیاز باطل کو بالکل ہی مٹا دیا ہے کیونکہ اس کے پیغمبرؐ نے اپنے ہاتھ سے وہ تمام کام انجام دیئے ہیں جن کو ہم اب ذات پات کی بیہودہ تقسیموں سے متاثر ہو کر ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ اور اسلام جتنے انبیائے اولوالعزم کو تسلیم کرتا ہے وہ سب بلا کسی استثنا، کے مختلف قسم کا ہاتھ کا کام جانتے تھے اور کرتے تھے۔ کیونکہ کام مقدس اور متبرک ہے اور بقول کارلائل کے دنیا کے ہر شخص کے لیے آخری اور بہترین پیغام یہی ہے کہ "اے شخص اپنے لیے مناسب ترین کام تلاش کر اور اس کو ایمانداری سے انجام دے۔" میں اسی زمرہ میں ان دولتمند، بے فکر اور بے کار رئیسوں اور نوابوں اور تعلقہ داروں کو بھی شمار کرتا ہوں جو اپنے آبا و اجداد کی جائداد اور سرمائے پر زندگی بسر کرتے ہیں اور دنیا کی ہر قسم کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن کسی قسم کی خدمت یا کام سے ان نعمتوں کی قیمت ادا نہیں کرتے۔ وہ غریب کسانوں اور مزدوروں

کی وجہ سے کرنے کے لئے کوئی کام ہی نہیں ملتا، اور پھر ان کے بعد وہ بے شمار لوگ ہیں جن کی مختلف قسمیں میں نے ابھی گنوائی ہیں جو باوجود صحیح الاعضا ہونے کے، اپنی نالائقی یا سستی اور کاہلی کی وجہ سے اور سب سے زیادہ ادائے فرض کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے ارادۃً اپاہج اور معذور بن گئے ہیں۔ اور ملک کو نہ صرف اقتصادی بلکہ اخلاقی نقصان پہنچاتے ہیں ہمارے ہاں کمانے اور کھانے والوں کی نسبت ایک اور دس کی ہے!

لہذا اصلاح تمدن کے سلسلے میں ایک نہایت اہم اور مقدم کام یہ ہوگا کہ ہر شخص کو جائز ذرائع سے محنت اور کسب معاش کی ترغیب دی جائے۔ ہمارا جمود، ہماری سستی، ہمارے اخلاق کی خرابی اور وہ تمام برائیاں جو قومی زندگی میں زہر کی طرح سرایت کئے ہوئے ہیں بہت حد تک دور ہو سکتی ہیں اگر ہماری بے کاری کم کر دی جائے اور قوم کی تمام جسمانی، اخلاقی اور دماغی قوتیں مختلف قسم کے تعمیری اور مفید کاموں میں صرف ہونے لگیں۔ تعفن اور گندگی اسی پانی میں پیدا ہوتی ہے جو بے حس و حرکت کھڑا رہے جس میں کوئی ہل چل اور تموج نہ ہو۔ برخلاف اس کے وہ پانی جس میں بہاؤ اور حرکت ہو، جس کا ہر ہر قطرہ مصروف عمل ہو، اس میں بجائے خود یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اپنی پاکی اور پاکیزگی کو قائم رکھ سکے۔ اسی طرح وہ قوم جس کے تمام افراد، افراد کاسبہ ہوں، مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں میں مصروف ہوں، جن میں فعالی قوت اور صلاحیتِ عمل ہو، بہت سی خرابیوں اور کمزوریوں سے محفوظ رہتی ہے اور اس میں کم از کم وہ جمود اور بے پرواہی اور زندگی کی طرف سے ناامیدی پیدا نہیں ہوتی جس نے آج کل ہمارے ملک اور ہماری قوم کو بے دست و پا کر رکھا ہے۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں ایماندارانہ کسب معاش کو نہ صرف اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے ملک میں دولت پیدا ہوتی ہے (گو یہ بھی ایک کافی ضروری چیز ہے) بلکہ اس لیے بھی اس کو اہم سمجھتا ہوں کہ بے کاری اور بے روزگاری انسان کے اخلاق کو کمزور اور اس کی شخصیت اور عزت نفس کو ذلیل کر دیتی ہے۔ کسب معاش کے اس مسئلہ کا دوسرا رخ

دولت کا صرف یعنی ہمارے اخراجات کی تنظیم ہے، اسلام نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ دولت بھی، مثل دوسری عمدہ اور مفید چیزوں کے، امانت الٰہی ہے۔ اور اس کی تحصیل اور صرف میں بھی ان قوانین اعتدال و اخلاق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہیں جو ایک مسلمان کی باقی زندگی پر حاوی ہیں۔ مسلمانوں کی گذشتہ نسلوں اور موجودہ نسلوں کے خلاف ایک بہت بڑا اعتراض یہ ہے، اور صحیح اعتراض ہے کہ ان میں اسراف حد سے زیادہ رائج ہے۔ وہ نہ صرف روپیہ کمانا نہیں جانتے بلکہ اس کو خرچ کرنا بھی نہیں آتا۔ اور بے جا نام و نمود کی خواہش کی وجہ سے ہر شخص اپنی حیثیت اور استطاعت سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے اور اکثر لوگ قرضدار ہو کر دیوالیئے پن جاتے ہیں اور آباؤ اجداد کی کمائی کی عظیم الشان جائدادیں ضائع کر کے روزمرّہ کے کھانے کے لیے بھیک مانگتے ہیں۔ اصلاح تمدن کی تحریک کے لیے ایک زبردست مہم اس صورت حال کی اصلاح ہو گی۔ اور شادی و غمی کے اسرافات اور بے جا رسوم کی روک تھام کرنی پڑے گی۔ خواجہ صاحب مرحوم نے جن کی ان تھک کوششوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس خاص مسئلہ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر کے اس سلسلہ میں بہت استقلال کے ساتھ عملی تدابیر استعمال کی تھیں۔ اور اپنی مثال اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے، اور لوگوں سے باضابطہ معاہدے لکھا کر ان کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اسراف کو راہ نہ دیں۔ چنانچہ میں اب بھی ایسے بہت سے حضرات سے واقف ہوں جو نہایت وضعداری کے ساتھ اس روش کو نباہ رہے ہیں جو اس زمانہ میں ڈالی گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس خیال کے لوگ جو باقی ہیں وہ اُسی نسل کے لوگ ہیں۔ موجودہ نسل کے لوگ، جنہوں نے زیادہ تر اسی صدی میں تعلیم و تربیت پائی ہے ان خیالات سے بیگانہ اور بے نیاز ہیں ان کو معلوم نہیں کہ جنگ کی وجہ سے اور جنگ کے بعد سے کشمکش حیات کس قدر سخت ہو گئی ہے۔ ان میں مغرب کی عیش پسندی اور فضول خرچی راہ پائے ہوئے ہے لیکن ان کو یہ نہیں معلوم کہ یہ باتیں اسی قوم کو زیب دیتی ہیں (اگر اِس کو زیب دینا کہا جا سکے) جو اہل مغرب کی طرح دولت پیدا بھی کر سکے۔ جس بیوقوف کی تحصیل صفر یا تقریباً صفر ہو اور اخراجات متمول لوگوں سے مقابلہ کریں

اس کی یادگار محض عبرت کے لیے باقی رہ سکتی ہے اور بس!

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو خیرات کا موجودہ دستور ہے جس کی وجہ سے قوم میں بے کاروں اور ہٹے کٹے فقیروں وغیرہ کی تعداد اندیشہ ناک طریقے سے بڑھ رہی ہے۔ بدقسمتی سے یہ ذلیل قسم کی مفت خوری تمام اسلامی ممالک میں، ایران، عرب، شام، مصر وغیرہ میں اور ہندوستان میں عام ہے۔ سنتا ہوں کہ بیداری عزم افغانستان اور ترکی میں اس کی روک تھام کی جا رہی ہے۔ بہرحال ہندوستان میں لوگ خیرات کے معنی بالکل غلط سمجھے ہوئے ہیں ان کا خیال ہے کہ ہر کس و ناکس، اہل اور نا اہل جو اُن کے دروازہ پر صدا لگائے یا شاہ صاحب بنکر بیٹھے، یا مزاروں اور مسجدوں کو ذریعہ معاش بنانا چاہے، یا کسی اور طرح ناداری کا اظہار کرے وہ ان کی ہمدردی کا مستحق ہے۔ اس سے نہ صرف یہ نقصان ہے کہ غیر مستحق لوگوں کو خیرات پہنچتی ہے اور ناجائز پیشوں کو فروغ ہوتا ہے۔ بلکہ اصل مستحق جو اپنی شرم و حیا یا بے کسی کی وجہ سے سوال نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے محروم رہ جاتے ہیں۔ دوسرے متمدن ممالک میں منتظم اور باقاعدہ طریق سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سربازار بھیک مانگنے کا دستور بالکل روک دیا گیا ہے۔ اگر شاذو نادر انگلستان وغیرہ میں آپ کو کوئی بھیک مانگنے والا نظر پڑیگا تو اس کے پاس میونسپلٹی کی طرف سے لائسنس یعنی بھیک مانگنے کی اجازت کا پروانہ موجود ہوگا۔ مستحقوں، بیواؤں، یتیموں، اپاہجوں وغیرہ کی پرورش کے لیے مختلف قسم کے سرکاری اور پرائیویٹ محتاج خانے موجود ہیں جن کا خرچ منتظم جماعتیں اُٹھاتی ہیں اور جہاں ان لوگوں کو حتی الامکان خیرات کا کھانا نہیں دیا جاتا بلکہ ان سے ان کی قابلیت اور استطاعت کے مطابق مختلف قسم کے کام لیے جاتے ہیں۔ دستکاریاں وغیرہ سکھائی جاتی ہیں تاکہ ان میں سے عزت نفس اور امداد ذات کا جذبہ بالکل مفقود نہ ہو جائے اور وہ "کام" کے مقدس اور متبرک اثر سے بہرہ اندوز ہوتے رہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے ہاں کا یہ نظام مکمل اور بے عیب ہے۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ان کے ہاں ایک نظام موجود تو ہے۔ ہمارے ہاں تو اس قسم کے مسائل کی طرف اجتماعی حیثیت

سے کوئی گروہ متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ سارا دارومدار چند نیک نیت افراد کی علیحدہ علیحدہ کوششوں پر ہی جن میں کوئی نظم ونسق یا ترتیب عمل نہیں۔ مجھے یاد ہی کہ تین سال ہوئے ییل یونیورسٹی یونین میں یہ مباحثہ ہوا تھا کہ "Philanthropy has a pernicious influence on our social system"

یعنی "ہمدردی نوع کے جذبات نے ہمارے نظام معاشرت پر بہت برا اثر ڈالا ہی" میں نے اس مباحثہ کی تقریریں سن کر یہ خیال کیا تھا کہ خواہ یہ دعویٰ انگلستان کے لیے صحیح ہو یا نہ ہو لیکن ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے جس معنی میں Philanthropy کا لفظ استعمال کیا گیا ہو اس کے خیال سے اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو اپنے نظام معاشرت کو حتی الامکان اس مردانہ اور جری اصول پر قایم کرنا چاہیے کہ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہی:

"He who will not work nor shall he eat"

یعنی "جو صحیح الاعضا اور کام کرنے کے قابل آدمی کام نہیں کرے گا اس کو روٹی نہیں ملے گی"۔ ممکن ہی کہ ہماری موجودہ ذہنیت اس اصول کو بہت سخت اور رحم کے منافی سمجھے لیکن یاد رکھیے کہ قوموں کی زندگی کا قیام انصاف اور محض انصاف کی مضبوط چٹان پر ہو سکتا ہے اور رحمدلی اور مراعات وغیرہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔

میں فی الحال انہی دو مسائل پر اکتفا کرتا ہوں یعنی اصلاح اخلاق اور کسب معاش کی حقیقی اہمیت۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اصلاح اخلاق کا مسئلہ بھی دراصل اور بالآخر تعلیم کا مسئلہ ہے۔ اور اگر مندرجہ بالا صورت حال پر غور کریں تو کسب معاش اور دولت کے صحیح استعمال کا مسئلہ بھی تعلیمی مسئلہ میں تبدیل ہو جاتا ہی۔ انسان کی قدرت میں کوئی ایسا خارجی دباؤ یا جبر نہیں ہے جن کے ذریعے سے ہم لوگوں کے اخلاق کی اصلاح یا ان میں کسب معاش کی صلاحیت اور اسراف سے نفرت پیدا کر سکیں۔ اور اگر ایسا کوئی ذریعہ ہوتا بھی تو اس کا استعمال مضر ہوتا۔ کیونکہ انسان ایک آزاد اور صاحب اختیار ہستی ہی اور اس کا صرف

وہی فعل اخلاقی شان رکھتا ہی جو وہ اپنی مرضی یعنی اختیار اور پسند سے کرے - اس لیے ان نئے خیالات کی اشاعت اور ان پر عملدر آمد کرانے کے لیئے ہمیں موجودہ اور آیندہ نسلوں کی ذہنیت تبدیل کرنے کی ضرورت ہی - اس بات کو ذہن نشین کرانا ہی کہ زندگی میں کون سی باتیں اور چیزیں اور نصب العین برتر اور مقدم ہیں اور کون سے کم تر اور موخر - یا دوسرے الفاظ میں یہ کہیئے کہ چونکہ ہر دیرپا اور حقیقی اصلاح اندر کی طرف سے ہوتی ہے اس لیے ہم کو لوگوں کا معیار قدور (values) بدلنا ہی تاکہ وہ خود بخود یہ محسوس کریں کہ ہمارا موجودہ معیار اخلاق کس قدر پست اور انسانی مرتبہ سے گرا ہوا ہی - تاکہ وہ لازماً ہر جائز وسیلہ معاش کو عزت کی نظر سے دیکھیں اور بیکاری اور مفت خوری کو ذلیل ترین حالت سمجھیں - تاکہ وہ دولت کو اپنے اس نئے معیار قدور کے مطابق، محض ایک ذریعہ، ایک آلۂ کار جانیں انسانی بہبود اور آسائش کو زیادہ کرنے کا؛ اور نہ تو اس کو مقصد حیات سمجھ کر انسانی حقوق کی پامالی کریں تاکہ وہ خود مالدار بن جائیں اور نہ اس کو بالکل فضول اور اس کے حصول کو گناہ سمجھ کر اس سے بالکل دست بردار ہو جائیں اور اسی طرح ان بے شمار فوائد سے محروم رہیں جو دولت سے حاصل ہو سکتے ہیں - غرض مختصراً یہ کہ ہمارے سامنے اصلاح تمدن کی جو مہم در پیش ہے اس کا تعلیمی نقطۂ نظر سے یہی مطلب ہے کہ ہم لوگوں کے نقطۂ نظر اور نظام قدور کی ازسرنو تشکیل کریں - یہی وہ امر ہے جس کی بابت جرمنی کے مشہور فلسفی نے کہا تھا کہ "We require a transvaluation of all values" یعنی ہمیں اپنے نظام قدور میں ایک [illegible] کی ضرورت ہے - اور اگر مجھے آیندہ موقع ملا تو میں کوشش کرونگا کہ آپ [illegible] کے ذریعہ سے کس طرح ممکن ہے کہ اس انقلاب عظیم کو عمل میں لایا جاوے -

خواجہ غلام السیدین

تحلیل نفس

یہ مضمون ہمارے محترم دوست خادم محی الدین صاحب ایم اے ڈی نے مسٹر جی کوسٹر (ہیڈ ماسٹر نیو ڈھ اسکول آکسفورڈ) کے انگریزی مضمون سے ترجمہ کیا ہے۔ امید کہ ہمارے اساتذہ اس اہم مسئلہ کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔ (اڈیٹر)

موجودہ علم النفس میں گزشتہ بیس سال سے ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوچکی ہے۔ گزشتہ زمانہ میں یہ خالصًا ایک نظری حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن آج وہ عملی اور تجربی پہلو کے بغیر بیکار سمجھا جاتا ہے۔

نفسیات کے قدیم تصور کا یہ تقاضا تھا کہ نفس کے تین مختلف پہلوؤں یعنی تعقل، تاثر اور ارادت کے متعلق بعض نظریات اور تصوراتِ مجرّدہ کو حفظ یاد کرلیا جائے حالاں کہ روزمرہ زندگی کے ساتھ ان مجردات کا کچھ بھی تعلق نظر نہیں آتا۔ نہ تو ہماری اندرونی زیست کے مسائل کا حل ان کے ذریعہ ہوسکتا ہے اور نہ یہ دوسرے لوگوں کے افعال اور ارادوں کے ساتھ چنداں وابستہ ہیں۔

چند سال پیشتر عوام کو نفسیات میں اتنی ہی قلیل دلچسپی تھی جتنی کہ علم جراثیم کے ساتھ ہوسکتی ہے ۱۸۹۹ء میں وائنا کے مشہور ڈاکٹر سگمنڈ فرویڈ (Sigmund Freud) نے تحلیل نفس کے متعلق اپنے عملی تجربات اور نظریات کو شایع کیا لیکن اس وقت تک بھی طبّی حلقوں سے باہر اس ڈاکٹر کا نام کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس کے بعد یورپ کی گزشتہ جنگِ عظیم کا زمانہ آیا۔ جب کہ تمام یورپ کے ہسپتال شکستہ دل اور زخموں سے نڈھال سپاہیوں سے بھر گئے اور چند ماہ کے اندر ہی یاؤف دماغ انسانوں کے نفسی علاج کا علم شہرت پانے لگا فرویڈ (Freud) ژنیگ (Jung) اور اڈلر (Adler) کے ناموں نے شہرت پائی اور تحلیل نفس جس کو نفس کے معالج پہلے بھی استعمال کرتے تھے اور فائدہ اٹھاتے تھے سوسائٹی کا ایک خطرناک کھلونا بن گیا۔ اس وقت سے آج تک نفسیات کا مطالعہ تعلیمی حلقوں میں محدود ہونے کے بجائے عوام الناس کی دلچسپی کا سامان ہوگیا ہے۔ اور یہ مطالعہ زندگی کے کاروبار میں ویسا ہی کارآمد ہے اور عملی قدر و قیمت رکھتا ہے جیسے ٹیلیفون یا موٹر گاڑی۔

ہر شخص جسے روزمرہ کے کاروبار میں لوگوں کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے۔ اسے بعض نفسیاتی

مسائل سے دوچار ہوناضروری ہے۔ کیا سبب ہے کہ زید جو ایک عمدہ رفیق بن سکتا ہے ایک دائمی توہم اور شکایت کی حالت میں وقت بسر کرتا ہے اور اسی لئے وہ اپنے رفقائے کار کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ؟ اس کا کیا باعث ہے کہ عمر جو معاشرتی لحاظ سے ایک ملنسار اور خوش مزاج آدمی ہے۔ اپنے ماتحتوں پر ظلم ناروا کا سلسلہ جاری رکھتا ہے ؟ میں کیوں ہمیشہ بکر کو دق کرتا ہوں اور ہر وقت اس کی برائی کا پہلو لوگوں کے سامنے نمایاں کرتا رہتا ہوں ؟ ایک بچے کو جس کی حفاظت میرے ذمہ ہے کیوں ہمیشہ بدمزاجی کے دورے ہوتے رہتے ہیں ؟ ایک عورت جسے کامل طور پر تنومند اور تندرست رہنا چاہئے۔ کیوں ہر وقت بوکھلائی ہوئی، تھکی ماندی، درد سر، زکام اور بدہضمی میں مبتلا رہتی ہے۔ یا متفکر ارادے کی کمزوری سے پریشان اور اپنی حالت پر آپ ہی رحم کھاتی رہتی ہے۔

یہ سوالات ہیں جو روزمرّہ زندگی میں کبھی تو ہمیں اپنے متعلق اور کبھی اپنے رفقائے کار کے متعلق درپیش رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی خاندان کے افراد کا یا کسی ملت کی آسودگی اور مرفع الحالی کا دارومدار اس امر پر ہو سکتا ہے کہ افراد ملت ان سوالات کو حل کرنے کی کہاں تک اہلیت رکھتے ہیں

نفسیات حاضرہ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا اس لئے بھی مفید ہے کہ اُن کی مدد سے بعض متضاد شخصیتوں کے مسائل حاضرہ کا کچھ نہ کچھ سراغ ملتا ہے۔ مزید برآں ہم ایسے دور میں ہی گزر رہے ہیں جب کہ مہذب دنیا جو آج ویسی ہی بیمار اور اعصابی تکالیف میں مبتلا ہے جیسے کہ اس سے پیشتر تھی ادویات کی بوتلوں پر کوئی اعتقاد نہیں رکھتی۔ ایک عطائی آدمی بھی وہ بات سمجھنے لگا ہے جو حکیم ایک زمانہ سے جانتا تھا یعنی یہ کہ بسا اوقات ان امراض کے علاج میں جن کا اصلی سبب اور دفعیہ اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے اور جن کی علامات کی تشخیص بھی وہ اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ دوائیں محض دفع الوقتی کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں لیکن اگر دوا کی شیشی کا کوئی بدل ہمارے پاس نہ ہو تو کیا ہم اس حالت سے گئے گزرے نہیں ہوں گے

جب کہ دوا پر سیدھا سادہ اعتقاد ہماری شفا کا موجب ہوجاتا تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ چند ایسے روحانی بدل دریافت ہوچکے ہیں جن کا اعتراف لازماً کرنا پڑتا ہے کوئی بھی فراخ دل شخص روحانی علاج کے ان معجزوں سے انکار نہیں کرسکتا جو موجودہ زمانے میں ہکسن (HICKSON) جیسے معالجوں اور لورڈے (OUrDES) جیسے مقامات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ عوام کو اُن روحانی معالجوں کی کرامت کا شمہ بھر بھی علم نہیں ہوا۔ اور سُنیئے موسیو کوئے ((M. Coue)) کے کمال کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل چکی ہے۔ یہی شخص ہے جس نے لوگوں کو ذاتی ترغیبِ نفس کے ذریعہ اپنا علاج خود کر لینے کا طریق سکھایا ہے۔ اسی طرح اپنی نفسی شناخت میں جو قوتِ شفا پنہاں ہے اسے تحلیل نفس کے ماہرین ثابت کر چکے ہیں۔

"فہمیدِ نفس" (دوسرے کے نفس کی پوشیدہ حالت کو معلوم کرنا) کے علم کی قدر وقیمت تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ دنیا۔ یہی تصور تمام بڑے بڑے مذاہب کی بنیاد ہے۔ نفس کے اندرونی عمل کو سمجھنے میں جو انتہا درجے کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اسے سب جانتے ہیں۔ ان دقتوں کو حل کرنے کے بہت سے طریقے زمانۂ قدیم اور حال میں سکھائے گئے ہیں۔ لیکن اس تعجب خیز حقیقت میں ہی یہ دقت پائی جاتی ہے کہ "فہمیدِ نفس" کا وہ عمل جس کی عام طور پر مشق کرائی جاتی ہے اپنے نفس کی شناخت میں چنداں ممد نہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ اسی طرح دوسروں کے نفس کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ بمقابلہ اپنے دوسرے بے فکر بھائیوں کے خود اس قابلیت سے یکسر محروم پائے جاتے ہیں، کیوں کہ اُن کا بے مدعا تفکرِ ذات ضد باتی کیفیت سے اس قدر رنگا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے سبب سے قوتِ مقصورہ مسلسل طور پر عمل پذیر نہیں ہوتی۔ علم النفس کے نئے اسکول نے جو کچھ دریافت کیا وہ ایک نظریہ ہے اور اسی کے ساتھ ایک عملی نسخہ بھی ہے جو براہ راست حقیقی علم النفس کا راستہ دکھاتا ہے اور ساتھ ہی اس کی مدد سے اپنا تجزیہ آپ کر لینے کا طریق بتاتا ہے۔

تحلیلی نفسیات کے مختلف طبقوں کی اضافی خوبیوں پر بحث کرنا اس مختصر مضمون کے احاطے سے باہر ہے۔ نہ ہی اس کے مختلف شعبوں کی اصطلاحات اور اُن کی اصل یہاں بیان کی جاسکتی ہے۔ سردست ہمارے ساتھ جس سوال کا تعلق خاص طور پر ہے اُسے بسا اوقات وہ لوگ پوچھا کرتے ہیں۔ جنہوں نے علاج کے سلسلے میں تحلیلِ نفس کے عمل کو کامیابی کے ساتھ ہوتے دیکھا ہے۔ گو ان لوگوں کو اس عمل کے اصول مطلق معلوم نہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ مریض کے خیالات، جذبات اور فوری میلانات کی جستجو، اس کی روزمرّہ جسمانی شکایات اور بے شمار نفسانی معذوریوں کو کیوں کر دور کرسکتی ہے؟

ہر انسان اس حقیقت سے واقف ہے کہ ذہنی اور جذباتی کشمکش (یعنی ایک ہی وقت میں دل و دماغ کا دو متضاد سمتوں میں مائل ہونا) سے بڑھ کر کوئی چیز کوفت پیدا نہیں کرتی۔ اسی طرح ہر شخص اس تسکین آمیز احساس سے بھی بخوبی واقف ہے۔ جب کہ اس کشمکش کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ ہم نہایت شدید خواہش کے ساتھ کہا کرتے ہیں" مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میں کونسا کام پسند کروں۔ مجھے تو فقط یہ بتا دیجئے کہ کس سمت کی راہ لوں"۔ جب کبھی ایسی کشمکش میں وجدان کو دخل ہوجاتا ہے تو ہم کسی نہ کسی نتیجے پر جوں توں کرکے پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن ماہر نفسیات نے یہ بات دریافت کی ہے کہ ہم میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بغیر اس امر سے واقف ہونے کے ہمیشہ ایسی دوطرفہ کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔

وجدان ایک پیچیدہ نفسانی عمل ہے۔ اس کی مثال ایک بحر ذخار کی سی ہے، جس کی چمکدار سطح اس حصّے کو ظاہر کرتی ہے جسے ہم نفسِ ذی شعور کہتے ہیں۔ حالاں کہ سمندر کا وہ حصّۂ زیریں، جو نظر سے اوجھل ہے۔ اس کا زیادہ بڑا جزو ہے۔ یہ حصہ گویا نفس کا لاشعوری حصّہ ہے۔ جس طرح سمندر کی نیچے کی لہریں ہمیشہ سطح کے پانی کے ساتھ مخلوط ہوکر اس کی ضخامت اور درجۂ حرارت کو تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ اسی طرح لاشعور کی نیچے کی تہیں ہمیشہ تبدیل ہو ہو کر ہمارے وجدانی خیالات اور اعمال میں ترمیم و تنسیخ کرتی رہتی ہیں۔

ہمارے ذی شعور افعال دراصل نتیجہ ہوتے ہیں فوری میلانات کے اس مجموعے کا

جو لاشعور سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم باخبری کی حالت میں منہ ہاتھ دھوتے ہیں کھانا کھاتے ہیں، سونے کی تیاری کرتے ہیں بسا اوقات ہم اُن کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور نہ اُن کے متعلق کسی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے ہمیں ان کاموں کے متعلق کسی غور وفکر کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کا انجام دینا ضروری ہے۔ ہر چند کہ ہم باخبر ہو کر لکھتے پڑھتے ہیں لیکن وہ پیچیدہ سلسلۂ عمل جس کی رو سے ہم ایسے کام کرتے ہیں۔ سالہا سال سے ہمارے لاشعور میں پوشیدہ ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ٹائپ رائٹر کی مثال لو۔ فرض کرو ہم ایک خط کا مضمون سوچ کر ساتھ ہی ساتھ ٹائپ کرنا چاہیں ایسی حالت میں جب کہ ہمیں ٹائپ کرنے کی چنداں مشق نہ ہو تو ابتداً یہ دوہرا عمل دشوار بلکہ ناممکن معلوم ہوگا۔ اس لئے کہ ارادی توجہ کا تمام زور جو خط کی مضمون آرائی پر صرف ہونا ضروری ہے۔ وہ بٹنوں کو دبانے اور ٹائپ کی مشین کو درست چلانے پر صرف ہو رہا ہے۔ ایک چھوٹے بچے کی مدرسہ کی زندگی میں ایسا وقت دیر کے بعد آتا ہے جب کہ وہ تحریر کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار درستی کے ساتھ کر سکے لیکن یہ مشق ایک جان کاہ مسلسل تکلیف اُٹھائے اور وقت صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ نفس کا وجدانی فعل لکھائی کی دقت آمیز حرکات اور مشین کے سے عمل پر صرف کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ لاشعور کی جذباتی کیفیات، اکثر نفس ذی شعور پر براہ راست اثر کرتی ہیں۔ انتہا درجے کے شرمیلے آدمی اکثر اس امر کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ ان کا یہی شرمیلا پن کبھی تو اُن کو مجلس میں بے ڈھنگا اور احمق بنا تا ہے اور کبھی انھیں شوریدہ اور ضرورت سے زیادہ بے تکلف کر دیتا ہے۔

لاشعور کے اندر جو کیفیات پوشیدہ ہیں وہ اس قدر پُر اثر اور وسیع ہیں کہ بڑے بڑے ماہرین نفسیات بھی ان کی تعریف کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ایک ایسی نامعلوم مملکت ہے جس کی اب تک فقط سرحد ہی دریافت ہوئی ہے۔ بعض صاحبان نے تحقیق وتفتیش سے یہ معلوم کیا ہے کہ اس کے دو مختلف حصے ہیں۔ یعنی اوّل تحت الشعور، جس سے ہمارے ادنیٰ اور حیوانی میلانات پیدا ہوتے ہیں۔ دوم مافوق الشعور جو ہماری اعلیٰ خواہشات اور مقاصد کا سرچشمہ ہے۔ یہ تخصیص عام طور پر مقبول نہیں ہوئی لیکن بطور دعویٰ بعض صورتوں میں یہ مفید ہے شاید

آیندہ علمی تحقیق یہ بات ثابت کرسکے کہ اس تقسیم نفس کا دار و مدار، نفس کے دونوں پہلوؤں کے حقیقی تفاوت پر مبنی ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لاشعور میں تمام گزشتہ اور بظاہر فراموش شدہ مشاہدات کے علاوہ، نفس اور جسم کی تمام عادات کے بیج پائے جاتے ہیں۔ ہماری فطری رغبت، نفرت اور خوف کی تمام وجوہات اسی کے اندر موجود ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کی چند مثالوں سے یہ امر واضح ہو جائیگا فرض کرو کہ دروازے کی گھنٹی بجانے سے تم بچوں کی طرح چڑتے ہو اور اس نفرت پر تمھیں کوئی قابو نہیں۔ تم باخبری کی حالت میں اس امر کا اعتراف مشکل سے کروگے کہ تمھیں یہ نفرت ہے کیوں کہ اس کیفیت کا وجود ایک فضول سے وہم کے سوا کچھ نہیں۔ با ایںہمہ تمھاری یہ کوشش ہے کہ تم حتی الامکان دروازے کی گھنٹی بجانے سے گریز کرو۔ شاید تمھاری اس کیفیت کا سبب ایک طویل جستجو کرنے کے بعد ہمیں یہ معلوم ہو کہ مثلاً بچپن میں کہیں تم کسی مکان کے دروازے کی گھنٹی بجاتے وقت پشت کے بل گر پڑے تھے اور چوٹ کھائی تھی یا یہ کہ شاید تم نے گھنٹی کا بٹن دبایا ہو اور کسی مہیب شخص نے دروازہ کھولا ہو جسے دیکھ کر تم ڈر گئے یا اس شخص نے تمھیں سخت لعنت ملامت کی ہو یا یہ کہ غلطی سے تم نے ایک مکان کے بجائے کسی دوسرے مکان کی گھنٹی بجائی ہو اور تمھیں اپنی غلطی پر شرمندگی کا ایک شدید احساس ہوا ہو۔ کیوں کہ بچے ایسی غلطیوں پر بالغ اشخاص کے مقابلے میں زیادہ حسّاس ہوتے ہیں۔ اس واقعہ کو تم نے فوراً فراموش کردیا تھا کیوں کہ ہم ہر ناگوار نفسی کیفیت کو بھول جانا چاہتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں لیکن ایک دھندلا سا نشان دروازوں کی گھنٹیوں سے نفرت کرنے کی شکل میں باقی رہ گیا ہے۔ اسی طرح فرض کرو کہ ایک بالغ عورت کسی بڑے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سے خوف و ہراس اور ایک شدید کراہت محسوس کرتی ہے۔ دریافت کرنے پر اس کا تعلق ایام شیرخوارگی کے ایک بھولے ہوئے واقعہ سے پایا جاتا ہے جب کہ کسی شتر مرغ نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اس قسم کے ہراس کی مثالیں بہت عام ہیں بعض اوقات تو ان کا سبب بالکل غایب ہوتا ہے۔ لیکن اکثر حافظہ پر زور دینے سے وہ معلوم

بھی ہو سکتا ہے۔

گزشتہ مشاہدات زندگی کی یادداشت کے علاوہ ہمارا نفسِ لاشعور ایسے ناگوار میلانات بھی اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے جس کے اظہار سے مہذب انسان شرما جائے مثلاً حرص، بے رحمی، بے جا مفاخرت اور ذاتی خطرے سے بے حد خوف زدگی۔ سالم ہوش حواس والے انسان اور غالباً بہت سے اعلیٰ جنس کے حیوانات حیا کے احساس اور خودستائی کی خواہش فطری طور پر اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوئے ہیں جو انھیں اپنے بہت سے خیالات اور افعال کو خود ملامت کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ انسانی نفس خود اپنی ذات کے ساتھ متفق نہیں۔ ہم میں کوئی چیز ایسی موجود ہے جسے ہم ضمیر کہتے ہیں لیکن نفسیات والوں نے اس کے لئے بہت سی دقیق اصطلاحات نکال رکھی ہیں۔ یہی چیز (یا قوت) ہماری روح پر ایک داروغہ کی طرح مسلط رہتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذاتی نکتہ چینی کی طاقت کچھ تو نفسِ ذی شعور سے تعلق رکھتی ہے اور کسی حد تک لاشعور کے ساتھ۔ جب ہم بیداری کی حالت میں اپنے نفس کے واقعات سے پورے باخبر ہوتے ہیں تو یہ طاقت ہمیں تکلیف دیتی ہے بہت سے لوگ اس کی ہستی کو خواب میں یا نیم بیداری کی حالت میں بھی محسوس کیا کرتے ہیں اور تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ مسمریزم کے اثر میں یہ بات شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ ایک عام بات ہے کہ جو شخص جانتا ہے کہ اُسے ایک خاص وقت پر اٹھ جانا چاہئے وہ ضمیر کے ایک قسم کے دھکے سے پورے طور پر بیدار ہونے سے پیشتر ہی گھڑی یا اپنے اردگرد کی اشیاء کو دیکھے بغیر فوراً بستر سے اُٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میکڈوگل (McDougall) نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی نہایت ایماندار اور باخلاق شخص پر مسمریزم کا عمل کرنے کے باوجود بھی اُسے کسی قسم کے اخلاقی جرم مثلاً چوری وغیرہ کے ارتکاب پر مجبور کرنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ ضمیر کی مدافعت اس کے اندر پھر بھی موجود ہوتی ہے۔ مگر ان معاملات میں جن کا تعلق اخلاقی احساس کے ساتھ نہیں وہ مسمریزم کے عمل کی پوری اطاعت کرتا ہے۔ یہی وہ محرک اعلیٰ ہے جسے بعض لوگ لاشعور کے اس عنصر سے متعلق کرتے ہیں جسے نفس کا

مافوق الشعور حصہ کہا جاتا ہے۔ بہرحال اس قوت یا احساس کی اصلیت خواہ کچھ بھی ہو اس میں کلام نہیں کہ وہ روحِ انسانی میں ایک دائمی کشمکش پیدا کر دیتی ہے کیوں کہ وہ ادنیٰ خواہشات کے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی ہے۔ جہاں تک کہ اس کا اطلاق اس اخلاقی جد و جہد پر ہے جسے انسان زندگی میں محسوس کیا کرتا ہے (یعنی روزمرّہ کی وہ کشمکش جو وہ جانتا ہے کہ اُسے کرنی چاہیئے) یہ کوئی نئی حقیقت نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ کے ماہر نفسیات نے جو کچھ ہمیں بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ بمقابلہ اس بہت بڑی مسلسل جنگ کے جو ہم لاشعور کے ساتھ کرتے رہتے ہیں اور جس کی وجہ سے ہمیں بہت سی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بے خبری کے عالم میں لڑنی پڑتی ہیں، وجدانی کشمکش چنداں اہم نہیں ہے۔ اور تحلیل نفس کا ماہر ہمیں بتاتا ہے کہ یہی وہ معرکے ہیں جو ہماری قوتِ حیات کو چکنا چور کر کے ہمارے جسم کو مریض اور ہمارے اعصاب کو ماؤف کئے دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں۔ نفس ذی شعور کی کشمکش ہمیں تکلیف پہنچاتی ہے لیکن اس کا خاتمہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان ایک قطعی اور پُرزور فیصلہ کر کے اس معاملہ کو طے کر دے۔ مگر لاشعور کے ساتھ ہماری جد و جہد کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ کیوں کہ ہماری قوت ارادی اس مقدمہ کو قوت استدلال کی کچہری میں پیش ہی نہیں کرتی۔ یہ تحلیل نفس کے ماہر کا کام ہے کہ وہ لاشعور کی تہ تک پہنچ کر اس خفیہ لڑائی کو طشت از بام کر دکھائے جو جسمانی قوت کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ اس حالت میں عموماً مریض اپنی تکلیف کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دباؤ کے دور ہو جانے سے جسم کی قوت اور تندرستی بحال ہو جاتی ہے گویا کہ پانی کے کسی بڑے نل کا سوراخ معلوم کر لیا گیا ہے اور قوتِ حیات میں جو بیجا نقصان ہو رہا تھا وہ اب بند کر دیا گیا۔

لاشعور کی اس جد و جہد کے ماخذ لاتعداد ہیں۔ شاید ان میں سب سے عام کسی قسم کا خوف ہے مثلاً اپنی ذات یا خاندان کے لئے کسی مرض یا صدمے کا خوف، کسی ناگوار تبدیلی، گناہ، غربت ضعیفی یا موت کا خوف یہ بہت عام وجوہات ہیں۔ ان میں سے اکثر کو تو ہم ٹال دیتے ہیں

یعنی دانستہ ان کا تصور نہیں کرتے یا اُن پر دباؤ ڈالتے ہیں یعنی انھیں نفس لاشعور کے نہاں خانہ میں اتنا گہرا پھینک دیتے ہیں کہ گویا ہم اُن سے قطعی بے خبر ہیں لیکن جیسا کہ ظاہر ہے خوف کی حالت ایک ایسی ذہنی اور جسمانی کشاکش پیدا کرتی ہے جس کا مقابلہ جسم اور دماغ دونوں مضبوطی کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ جد وجہد کوفت کا موجب ہوتی ہے اور یہی بعض اوقات شب بیداری پیدا کرتی ہے۔ تحلیل نفس کے ذریعے خوف کا اصلی سبب سطح شعور پر آجاتا ہے اور دماغ کے سامنے واضح ہوجاتا ہے پھر مریض اس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور اس کے بعد اعصابی اور عضلاتی دباؤ میں فوری تخفیف شروع ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادویہ کے ذریعہ شب بیداری کا علاج بمقابلہ نفسی معالجہ کے ناکام ثابت ہوا کرتا ہے۔ اب سے پیشتر علاج بہ تحلیل نفس پر بہت سے رسالے ایسے طریق پر لکھے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ خیال گزرتا ہے کہ انسانی روح اپنے لاشعوری قضیوں کو طے کرنے کی اہل نہیں مگر فرونڈ، ینگ اور ایڈلر نے ایک بے اعتقاد اور اکتائی ہوئی دنیا کے روبرو اپنی نظریات کو صاف صاف عیاں کردیا۔ یہ سچ ہے کہ اُن کے پیروؤں نے ان خیالات کو بہت زیادہ مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے تاہم واقعہ یہ ہے کہ کامل طور پر تندرست دماغ اپنی ذہنی کشاکش کو بعینہٖ اس طرح حل کرلیتا ہے جس طرح ایک کامل طور پر تندرست جسم خوراک کو کسی قسم کے پس وپیش کے بغیر ہضم کرلیتا ہے۔ کمزور اور ذکی الحس انسان اپنی ذات میں دوسری طرح ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں مثلاً مذہب، فلسفہ یا محنتِ شاقہ اور کام میں انہماک کے ذریعے جو یا تو عارضی طور پر تسکین دیتے ہیں یا بعض اوقات شفا کا موجب ہوتے ہیں۔ دیندار لوگوں کی مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات ان کی عظیم روحانی کشمکش کا تعلق گناہ کے خوف سے ہوتا ہے کیوں کہ وہ زندگی کو گناہ اور ثواب ہی کے پہلوؤں سے جانچتا ہے۔ اگر ایسا شخص مخلص ہو تو اکثر اس کی کشمکش کا خاتمہ کسی نہ کسی اقرار گناہ کی شکل میں ہوا کرتا ہے۔ بعض اوقات بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ محاسبہ نفس اور کسی مذہبی پیشوا کے روبرو گناہ کا اقرار تحلیل نفس کے عمل کا کافی بدل ہیں یا ہونے چاہئیں۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات یہی ہوتا بھی ہے۔ یعنی یہ دونوں (محاسبہ اور تحلیل نفس)

اس صورت میں مترادف ہوتے ہیں جب کہ ہمارے روبرو تحلیلِ نفس کا ماہر یا پادری موجود ہو۔ اور وہ ہر توبہ کنندہ پر کافی وقت صرف کر سکتا ہو۔ ساتھ ہی تمام معاملات پر آزادانہ گفتگو کرنے کے قابل ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہمارا مخفی طور پر اور بے خبری کی حالت میں خوف زدہ ہونا گناہ کی ذیل میں شمار کیا جائے۔ لہذا ایسی صورت میں یہ معاملہ خدا یا دینی پیشوا کے روبرو پیش کئے جانے کے قابل نہیں۔ اگر تم اقرار گناہ کے عادی ہو چکے ہو تو البتہ تم ایسی حالت میں اس امر کا اقرار کرو گے کہ مثلاً تمھیں یہ خوف تھا کہ شاید تم کہیں ناسور کی بیماری سے مر نہ جاؤ اس لئے کہ تمھاری ماں نے اس مرض سے انتقال کیا تھا۔ لیکن اگر تم اس کا اندازہ کرو تو تم خود ہی اُسے گناہ میں شمار نہیں کرو گے۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تندرست دل و دماغ کا آدمی اپنی روحانی کشمکش کو حل کر لینے کا بخوبی اہل ہے اور وہ اس کے کامیاب طریقے جانتا ہے۔ لیکن ہمیں ضرور ماننا پڑیگا کہ بہترین حالاتِ زندگی میں بھی اس قسم کی صحت یقینی نہیں۔ کیوں کہ کسی موقع پر بظاہر ایک خفیف سے زائد دباؤ بڑھ جانے سے تندرست انسان کی طبیعت کے توازن میں خلل پڑ سکتا ہے۔ اور وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کی مطابقت نہیں کر سکتا۔ جب ایسی صورت ہو تو ہم اُسے اعصابی انہدام سے تعبیر کرتے ہیں اور ڈاکٹر اس کے لئے کامل آرام اور افکار سے بچنے کا علاج تجویز کیا کرتے ہیں۔ اس قسم کے انہدام کے بعض بعض خوش قسمتی سے تعطیل منانے کے عنوان سے آرام کرنے کی توفیق رکھتے ہیں۔ لیکن وہ بدنصیب شخص جو غم اور فکر میں گھل رہا ہو اپنے آپ کو کیوں کر اس تکلیف سے رہائی دے سکتا ہے؟ اس کا اعصابی انہدام میں مبتلا ہو جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ افکار سے مخلصی نہیں پا سکا۔ پس ان حالات میں نفس لاشعور کا تھوڑا سا علم بھی بڑی حد تک ہمارے لئے عملی طور پر مفید اور قابل قدر ہو سکتا ہے۔

خادم محمد الدین

ار سیدیں گناہ، غربت

اکثر کو تو ہم ٹال دیتے ہیں

ہندوستانی تاریخ کی تعلیم

تاریخ کا موضوع ہے انسان اور اُس کا ارتقا ابتدائے عالم سے آج تک اس لئے مؤرّخ کے لئے اس کی قوم کی تاریخ کے معنی نہ صرف اُس کی گزشتہ زندگی کی تفصیلات ہونی چاہئیں بلکہ اُس کے جملہ علوم وفنون کی ترتیب اور اُس کے تمام کارناموں کی سرگزشت۔ اُسے لازم ہے کہ وہ اپنی قوم کے ہمہ گیر علمی نظریوں میں اُس عنصر کو معلوم کرے جو کسی قوم کی دماغی ترقی اور نشو ونما کا باعث ہوتا ہے۔ مورّخ کو خود اپنی ذات میں اس جذبہ اور کوشش کی آئینہ داری کرنی چاہیئے جو اُس کے خیال میں اس کی قوم نے ابتدائے تاریخ سے آج تک علم کی افزائش، اس کی مخفی اور پوشیدہ قوتوں کے دریافت اور زیادہ کامل اور شاندار "انسانیت" کے حصول کے لئے کی ہے۔ اُسے ہر حیثیت سے اپنی قوم کی تہذیب کا حاصل اس کے مناظر کا مصوّر۔ اُس کے جذبات۔ احساسات اور خیالات کا ترجمان اور اُس کے عقائد کا نمایندہ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ بھی کافی نہیں۔ اس کے علاوہ اُس میں قدرت کی طرف سے ایسی صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ چیزوں کو غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھ سکے تاکہ وہ سچ اور جھوٹ میں فرق کر سکے! اور نہ اُسے اپنی ذات پر اتنا اعتماد اور اپنے عقائد پر اتنا ایمان ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی ذاتی رائے قائم کر کے اُس کی بے دھڑک اشاعت کر سکے۔ اگر ایک طرف وہ اپنی قوم کی تہذیب و تعلیم کا سچّا نمائندہ ہو تو دوسری طرف سے قوم کا نقاد اور راہبر بھی ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے تاریخ کے بعض معلّم ان سخت شرائط اور مطالبات کو سُن کر خائف یا حیران ہوں لیکن اِس سے اُس نصب العین پر کچھ اثر نہیں پڑتا جو میں نے پیش کیا ہے نفس اور کسی مذہبی پیشوا کے رہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کی طرف سے صریحاً منہ چاہئیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم ہندوستانی بحیثیت ایک قوم کے ابھی ابتدائی حالت

میں ہیں۔ ہماری قومیت کی ابھی داغ بیل ڈالی جارہی ہے۔ اس لئے یہی وقت ہے جب ہم اپنے نصب العین کو معین کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے مؤرّخوں کا فرض ہے۔ کہ وہ ہمارے اسلاف کے کارناموں کی صحیح اہمیت ہم کو بتا کر اور آیندہ کے متعلق اپنی خیالات ظاہر کرکے ہمیں انتخاب میں مدد دیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستانی تاریخ کا معلّم ایسے مشاغل میں پڑ جائے جو علمی فضا سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں اس کو اوچھے پن۔ فریب اور لفاظی کا وہ مجموعہ ہرگز نہ بننا چاہیئے۔ جسے آجکل کی اِصطلاح میں لیڈر کہتے ہیں۔ اُس کا کام یہ ہے۔ کہ وہ اپنے طریقۂ تعلیم اور اُس کی پوری روح کو تبدیل کردے اور اپنے شاگردوں سے اُس رشتہ سے زیادہ گہرا اور زیادہ قریبی اتحاد ذہنی پیدا کردے۔ جو روزمرّہ کے کام سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سب سے مدلّل اور مؤثر طریقۂ تعلیم اس کی اپنی ذاتی شخصیت اور مثال ہے۔ نہ صرف تقریر سے بلکہ عمل سے اُستاد کو یہ ثابت کرنا ہے۔ کہ اس کی شخصیت میں اس کی قوم کی روح زندہ ہے۔ کہ وہ اُس قوم کی توقّعات اور اُمنگوں کا نمایندہ اور اُس کی تہذیب کی ایک جاندار مثال ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے اُس کی خانگی زندگی بہت محدود یا شاید بالکل برباد ہو جائے۔ لیکن جو اُستاد اپنی زندگی کو پسِ پردہ بسر کرنا چاہتا ہے وہ یا تو اِس حق کا طالب ہے کہ اس کے قول وفعل میں فرق ہو یا وہ اُن ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا ہے جو اس کے عہدہ نے اُس پر عائد کی ہیں۔ اُستاد در اصل وہی ہے جو قدیم زمانہ کے "گرو" کی طرح ایک ہی وقت میں ہمارا معلّم، رہبر اور دوست ہو اور شاگرد کے ساتھ ساتھ علم اور صداقت کی تلاش کرے۔ اگر ہندوستان کی تاریخ کے معلّم کو اپنے فرائض کا صحیح احساس ہے۔ اور ان پر عمل کرنے کی قوت بھی ہے تو اس کی بالکل یہی حیثیت ہونی چاہیئے۔

اور اس وجہ سے تاریخ کے معلم کے فرائض عام اُستادوں کے فرائض سے مختلف اور دشوار تر ہو جاتے ہیں۔ سائنس معاشیات، ریاضی وغیرہ ایسے علوم ہیں جن کے کوئی خاص اخلاقی نتائج

و اثرات نہیں نہ کوئی ایسی تہذیب وتمدن کی ذمہ داریاں ہیں جن کو بجا لانا اُستاد کے لئے ضروری ہو قبل اِس کے کہ وہ اِن کو سمجھ سکے۔ صرف فلسفہ کے اُستاد کے فرائض تاریخ کے اُستاد کے فرائض کے ملتے جُلتے ہیں لیکن جو فلسفی اپنے مضمون کو غیر دلچسپ مشکلات اور خشک "علمیت" سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے اُسے نصف سے زائد مؤرّخ ہونا چاہئے۔ اور اپنی تعلیم کا ربط فلسفہ کے تاریخی مظاہر کے ساتھ قائم کرنا چاہیئے۔

اِسی طرح ایک مؤرّخ کے لئے بھی ایک حد تک فلسفہ دانی ناگزیر ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ اِس مضمون کو فلسفی کے نقطۂ نظر سے یا اسی قدر تفصیل سے پڑھے۔ اس کی دلچسپی اپنی قوم کے فلسفہ کے ان شواہد و مظاہر سے ہے جو اُس کی تہذیب کا جزو ہیں۔ لیکن اخلاقی معیار اور نصب العین اگر ہر ملک و قوم کے لئے مختلف نہیں تو یہ ضرور ہے کہ وہ مختلف جگہ مختلف صورتوں اور طریقوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک مؤرّخ کا فرض ہے کہ واقعات پر اپنی رائے کا اظہار کرے۔ اس کو فلسفہ اور اخلاق سے اتنی واقفیت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی رائے اور فیصلہ کے لئے ایک معیار قائم کر سکے۔

مذاہب کا موازنہ اور مطالعہ

اس سے بھی زیادہ شاید یہ ضروری امر ہے کہ مؤرّخ جملہ مذاہب کا بہ نظرِ موازنہ مطالعہ کرے اور ان سب میں سے کسی ایک پر ایمان کامل رکھتا ہو۔ مذہب کے لفظ کے متعلق آجکل ہندوستان میں شبہات اور بدگمانیاں روزبروز بڑھتی جاتی ہیں۔ لیکن مؤرّخ کا فرض ہے کہ وہ ان سے بالکل متاثر نہ ہو اور سیاسی چال بازوں کے مصنوعی تعصبات اور انسان کے عمیق ترین جذبات میں تمیز کر سکے۔ اگر انسان کے ارتقا میں مذہب کو کم دخل ہوتا تو تاریخ بہت مختصر ہوتی۔ اور تاریخ کا میدان بہت تنگ ہو جائے گا۔ اگر بہت جلد مذہب کو انسانی اُمور میں زیادہ دخل حاصل نہ ہو تاریخ کے اُستادوں میں عموماً اور ہندوستانی تاریخ کے معلموں میں خصوصاً ان صفات کا ہونا

نہایت ضروری ہے۔کیونکہ مؤرّخ کی دیانت داری اور ایمان کا اِس سے زیادہ سخت امتحان کہیں نہیں ہوتا اور اس امتحان میں ناکام ہونا اور سب ناکامیوں سے زیادہ ذلت کی بات ہی۔ قومی مصائب کے ایک طولانی اور حوصلہ شکن داستان ہے۔جسے اس کو سمجھنا اور دوسروں کو سُنانا ہی۔ اور سب سے زیادہ دشوار یہ کہ اس کے لئے سندِ جواز پیش کرنی ہے۔ دنیا میں مذہب کی خاطر لڑائیاں ہوئی ہیں۔ محض طمع کی خاطر ہوئی ہیں۔ اور بغیر کسی مقصد کے بھی ہوئی ہیں۔ جوانمرد اور جانباز لوگ اپنے ملک کی خاطر لڑتے ہیں۔ جانیں ضائع کرتے ہیں۔ اور اسے نہیں بچا سکتے۔ قوّت حق پر غالب آجاتی ہے۔ کمزور اور عاجز لوگوں کے حصّہ میں ظلم اور قہر کے سوا کچھ نہیں آتا۔ یہ سب اور اس کے علاوہ اور بہت سی تلخ حقیقتیں ہیں جن سے ایک منصف مزاج ہندوستانی مؤرّخ کو دوچار ہونا ہے پھر اسے حق اور سچّائی کی قرباں گاہ پر اپنے ذاتی رجحانات اور ہمدردی کو اپنے تمام ذرا ذرا سے مقامی، قومی۔ مذہبی تعصّبات کو جو اس نے وراثتاً حاصل کئے ہیں اور جو شاید اسے بہت عزیز ہیں نثار کرنا ہے۔ اور پھر اسے اسی کے ساتھ ساتھ باوجود ان تمام باتوں کے اپنی قوم کی محبت اور عشق کو قائم رکھنا ہے اور ہر تازہ قومی مصیبت سے اس جذبہ کو فروغ دینا ہے۔ اس کے بلند نظر دماغ میں تمام اختلافات اور متضاد چیزوں کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے اس کے دل میں ہر قسم کے تعصّبات اور نفرت کو محبت میں تبدیل ہوجانا چاہیے۔ ورنہ ہندوستان کی تاریخ یا تو اس کے دماغ کو پراگندہ کردے گی یا اس کا دل توڑ دے گی۔

اتنا کچھ تو مؤرّخ کی نسبت۔ اب وہ پڑھائے کیسے؟

ہم نے اوپر کہا ہے کہ معلّم کی اپنی مثال اُس کی تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔ اُستاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ علاوہ تاریخ پڑھانے کے یہ کوشش کرے کہ اُس کے شاگرد دماغ کے علاوہ دل سے بھی سمجھیں اور جو کچھ سمجھیں اُس سے محبت بھی کریں مثلاً اورنگ زیب اور سیواجی کے مناقشات کے سلسلہ میں فریقین کے ساتھ انصاف کرنے اور خود اپنی ذاتی رائے کو قائم رکھنے کا اس کے علاوہ

اور کوئی طریقہ نہیں۔ ایک اپنی قوم کی کھوئی ہوئی محبوب آزادی دوبارہ حاصل کرنے کے لئے لڑتا تھا تو دوسرا ایک پرانی عظیم الشان سلطنت کے وقار کو قائم رکھنے کی خاطر۔ اس جنگ کو مذہبی تعصبات نے ایک بالکل دوسری شکل دے رکھی ہے اور آج ہمارے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم اس معاملہ کی نسبت فریقین کے حق میں ایک ایک کلمہ خیر کہہ کر اس معاملہ کو ختم کر دیں اور آخیر میں اس بات پر افسوس کریں کہ مذہبی تعصبات کی وجہ سے اصلی تاریخی واقعات پر پردہ ڈال دیا گیا۔ ہمیں اپنی پوری حب الوطنی اور غیر جانبداری سے اس معاملہ پر غور کرنا چاہیئے۔ حق کا اظہار ضروری ہے خواہ اُس کے اظہار میں کتنا ہی رنج کیوں نہ ہو۔ مقامی آزادی جس کے لئے سیواجی نے لڑائی شروع کی ہندوستان کے حق میں ہمیشہ مضر ثابت ہوئی پہلے بھی کتنی ہی دفعہ حملہ آوروں کے سامنے ہندوستان کو اس جذبہ نے بالکل بے دست و پا بنا دیا تھا اور ایسا ہی سیواجی کے بعد کی صدی میں ہوا۔ اورنگ زیب اپنی سلطنت کی تمام قوت اور ذرائع ایک خانہ جنگی میں صرف کر رہا تھا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اپنی اس ابتدائی غلطی کو تکمیل تک پہنچا دے کہ شمالی ہندوستان میں بیٹھ کر جنوب میں حکومت کرے۔

اب ہم جانتے ہیں کہ سلطنتِ مغلیہ بے جان ہو رہی تھی۔ اور اگر سیواجی نہ بھی پیدا ہوتا تب بھی اُس کا زوال یقینی تھا۔ لیکن وہ علاوہ ایک منتظم قوت ہونے کے ایک روایت (TRADITION) بن گئی تھی۔ وہ دوبارہ زیادہ آسانی سے ایک زبردست اور قومی سلطنت بن سکتی تھی اگر اُس کا وقار قائم رہتا۔ یہ یقینی امر ہے کہ اگر سیواجی جیسی زبردست شخصیت نے یہ مناسب سمجھا ہوتا کہ مغلیہ سلطنت کی حماقتوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کر دے اور اپنی خدمات اُس کے لئے پیش کرے تو آج ہندوستان کی تاریخ بھی مختلف ہوتی لیکن اُس کے ایسا نہ کرنے کی وجہ سے اُس کو برا کہنا یا اُس کی وقعت نہ کرنا بیجا ہے۔ اسی طرح اورنگ زیب ہرگز جابر و ظالم نہیں تھا جیسا کہ سیواجی کے پرجوش مداح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُس [illegible] ایک فاش غلطی کی تھی لیکن واقعات کی جس منطق کے زیر اثر سیواجی بغاوت پر آ[illegible] [illegible] اسی نے

اورنگ زیب کو بھی مجبور کیا کہ وہ اُس کو زیر کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرے۔ دونوں شخصیتیں ہندوستان کی زبردست شخصیتیں ہیں۔ اور ہمیں ان کی وقعت کرنی چاہیئے لیکن بہ حیثیت ایک محب وطن کے جس کو تمام ملک کا مفاد عزیز ہے۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ دونوں بہت بڑی حد تک غلطی پر تھے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی مخالفت یا اُس کے ساتھ ناانصافی کریں بلکہ ہمیں اس قومی عاقبت اندیشی پر اور مصیبت پر دل سے ملول ہونا چاہیئے۔

غرض ایسے سوالات کی جانب جو ہمارے جذبات کے قابو میں نہ آسکیں یا جہاں دوسروں کے جذبات کا بہت زیادہ لحاظ کرنے سے ہمارے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہو ہمیں کم و بیش یہی رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ کا اُستاد اپنے شاگردوں میں اور اسی لئے سب سے پہلے اپنے میں ایک پر جوش قومی احساس پیدا کرے جو مقامی تعلقات اور سطحی مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو اور ہماری گزشتہ تاریخ کو ہماری زندگی کا ایک جزو لازم بنادے

چنانچہ اس غرض سے نیز تاریخی ذوق کے لئے ایک مستحکم اخلاقی بلکہ مذہبی بنیاد قائم کرنے کے لئے طلبا میں ان جذبات اور نصب العین کو پیدا کرنے اور فروغ دینے کی کوشش کرنی چاہیئے جو یونانیوں کے نزدیک لفظ *ealhenia* یعنی "خیر" میں مضمر ہیں اس کی حیثیت محض ایک علمی نظریہ یا رائے کی نہیں ہونی چاہیئے بلکہ یہ ایک گہرا، پائیدار عقیدہ و اور ایمان ہونا چاہیئے جو طلبا کی خارجی اور اندرونی زندگی کو ہمیشہ متاثر کرتا رہے اور خود تاریخ کے مطالعہ کے تقویت اور فروغ پاتا رہے اس میں مدد دینے کے لئے ضروری ہے کہ اُستاد میں ایسا ملکہ ہو جس کے ذریعہ وہ طالب علم کے تخیل کے سامنے گزشتہ زمانے کی بڑی بڑی شخصیتوں کی جیتی جاگتی تصویر لاکر کھڑی کردے جن کے کارناموں سے طالب علم میں صداقت اور جرأت پیدا ہو جن کی جرأت وہمت سے اس کی ہمت میں اضافہ ہو۔ اور جن کی دانشمندی اُس کو عقلمند بنائے۔

استاد اور شاگرد

چھوٹی عمر کے طالبعلموں کے لئے تاریخ کے روحانی رُخ پر زیادہ زور دینا ضروری ہے بچوں کے لئے جو تاریخ کی زیادہ گہری حقیقتوں کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے یہی ایک ایسی چیز ہے جو مستقل دلچسپی پیدا کرسکتی ہے اگر ان کے دماغ میں اس قدر قابو بھی ہو۔ تو کافی نیز تھوڑا ہی سا ادبی اور جمالیاتی ذوق انھیں مسحور کر دے گا۔ نیکی بھی بدی کی طرح متعدّی ہے اور اپنا اثر رکھتی ہے۔ اور اُستاد کو چاہیئے کہ وہ اُسی طالب علم کو جو واقعات اور تاریخوں کی خشک اور غیر دلچسپ داستان سے اجتناب کرتا ہو، ایک عمدہ شہری بنانے جو اس میں دلچسپی لے۔

اب ایک امر اور باقی رہ گیا۔ مطالعہ کے لئے جو تاریخی اشخاص یا زمانہ منتخب کیا جاوے اس کا معیار کیا ہو؟ میرا خیال ہے کہ ان کا انحصار تمام تر ورنہ زیادہ تر طلباً کے ذوق اور دلچسپی پر ہونا چاہیئے! استاد کو محض یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ انتخاب مہمل یا بے ربط نہ ہو لیکن تاریخوں اور واقعات کے علم کی بجائے خود کوئی قدر و قیمت نہیں۔ تاریخ کا اصلی موضوع انسان، اور اس کی کشمکش اور جدوجہد ہے۔ نہ کہ روز و شب اور سن و سال تاریخ اور واقعات کا سمجھنا محض اِس لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیں گزشتہ زندگی کے پیچیدگیاں اور گتھیاں سلجھانے میں مدد دیتے ہیں۔ اور بس! واقعات کی جانچ و پڑتال اور تاریخوں کا دریافت کرنا اور ان کو یاد رکھنا خود بخود آجائے گا۔ ہمارا فرض تو یہ ہے کہ طالب علم کی توجہ کو کسی بڑی شخصیت یا تحریک یا نصب العین پر لگائے رکھیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ممکن ہے متعدد نسلوں کی گزر جانے کے بعد تاریخ کا مطالعہ ہمارے طالب علموں میں محبت، علم اور مفاہمت پیدا کر دے گا اور وہ مادرِ وطن کے وفادار کارکن اور مفید شہری بن جائیں گے۔ تاریخ کے معلم کو ہمیشہ اپنی نظر درخشندہ مستقبل پر رکھنی چاہیئے۔

محمد مجیب

ایک اُستاد کی تصویر

مجھے اپنے بچوں کے لئے جس استاد کی ضرورت ہے وہ ضرور دنیا میں کہیں نہ کہیں ہے اور میں نے اپنے خیال میں اس کی ایک تصویر کھینچ لی ہے تاکہ میں اُسے پہچان لوں جب اس سے ملاقات ہو۔

اس کو بچوں کی فطرت پر مکمل اور مستقل ایمان ہے۔ اُسے یقین ہے کہ اُن کی فطرت لازماً اچھی ہے لیکن نہیں کہ بچوں کے قصوروں کی جانب سے اندھا ہو یا اُن کی دل پذیر باتوں سے غیر ضروری طور پر متاثر ہو۔ اسے مسکرانا آتا ہے۔ اس کا تبسم آنکھوں سے شروع ہوتا ہے ذراسی دیر تک اس کے چہرے کو روشن کرتا ہے اور پھر مسرت کی لہروں میں تبدیل ہو کر کانوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسا تبسم جو رقصاں آنکھوں اور چمکتے دانتوں کو منور کردے ایک وسیع ہمہ گیری دلی تبسم !۔

اس کی خاموشیاں عمیق ہوتی ہیں۔ ناراضی کی خاموشی نہیں جو زود رنج لوگوں میں ہوتی ہے بلکہ ایک قوت والے کی پُرعزم اور لبریز خاموشی۔ اس بری اٹل چٹان کی خاموشی جو موسموں کے تغیر اور دھوپ اور طوفان سے بے نیاز کھڑی رہتی ہے۔ وہ خاموشی جسے بچے قوت کی دلیل سمجھتے ہیں، ایک دوستانہ، پرفکر اور مطمئن سکون۔ جب وہ بچوں کو پڑھاتا ہے تو اُن سے تعارض نہیں کرتا نہ اُن سے نہ اُن کے کام سے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنا گویا اپنے ٹوٹتے ہوئے دماغ کو ان کے دماغ پر حاوی کرنا ہے ایک سایہ کو تاریکی پیدا کرنا اس لئے وہ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوتا ہے تاکہ اس کی روشنی صاف طور پر چمکے۔

حقیقی استاد کار دیانتی کام کی جانب عجز کا ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی تعلیم کا موضوع حقائق کی ایک صنعت ہے اور اس میں ایسے بھید ہیں جن پر شک کرنا اس کا کام نہیں۔ اسے صرف راستہ صاف کرنا ہے تاکہ وہ خود ظاہر ہو سکیں۔ وہ ہمیشہ اس امید میں کام کرتا ہے کہ جلوہ کی رونمائی ہو۔ اس کا طرز عمل سائنٹفک ہے۔ وہ اپنے علم کا ادعا نہیں کرتا۔ وہ آج کا قول قبول کرتا ہے اور ایک حیرا، بیدار، جویا دماغ کے ذریعہ کل کے لئے کام کرتا ہے۔ ایک طالب حق ہے ادعائے حق نہیں کرتا۔ جہاں وہ ہوتا ہے بچے خوش ہوتے ہیں وہ اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں وہ اس کی آمد و رفت پر نظر رکھتے ہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس سے انھیں دلچسپی ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے ان کی آرزو ہے کہ وہ بھی کریں۔ بالکل سچ ہے کیوں کہ وہ اُن سے محبت کرتا ہے۔ جب کوئی اس کے طرز عمل پر شک کرتا ہے تو وہ استقلال سے اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کیونکہ اس میں وہ اعتبار ہے جو علم اور تجربہ سے پیدا ہوتا ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کرتا جو اس کے خیال میں بچوں کے مفاد کے خلاف ہو اور اس کے تمام معاملات میں یہی اصول اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ میرا ایسا استاد کھیلتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی تفریحی مشغلہ ضرور ہے جب اس کے آرام کا وقت ہوتا ہے تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے قدم تیز تیز پڑنے لگتے ہیں جب وہ خود کو اس میں گم کردیتا ہے تو وہ زیادہ اچھی خدمت کرسکتا ہے کیوں کہ ایسے آرام کرانا ہے اس کا ایک نصب العین ہے جس کی روشنی میں وہ دنیا کو دیکھتا ہے۔ دنیا جو ہمارا اور آپ کا آرام گاہ ہونا چاہیے۔

میرا استاد ضرور کہیں نہ کہیں دنیا میں موجود ہے۔ تم بھی اپنے لئے ایسا ہی استاد تلاش کرو۔ (ماخوذ "بچوں کے مسائل" سے انجیونیٹری)

طالب علم اور شہریت

ہر چند کہ وہ شے جس کو ہندوستان میں تعلیمی ترقی سے موسوم کیا جاتا ہے، متعدد جدید اصطلاحات اور مفہومات سے ہم کو آشنا کر چکی ہے اور بہت کثرت سے نہ صرف استعمالی بلکہ علمی الفاظ زبانوں پر چڑھ گئے ہیں تاہم اکثر لغات کا مفہوم و محل استعمال بہ اعتبار ان کے حقیقی اثر کے ہنوز اور سطحی معنوں میں رائج ہے "پبلک" "پارلیمنٹ" "پالیسی" "ڈپلومیسی" "پروفیشن" "جرنلزم" "ایجوکیشن" "ٹریننگ" اور اسی طرح کے بیسیوں الفاظ ہیں جن کا کچھ نہ کچھ مفہوم کامل خواہ ناقص بوقت استعمال ہمارے دماغوں میں ضرور رہتا ہے مگر وہ مفہوم بہ لحاظ جامعیت اور تکمیل بڑی حد تک ناقص ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر اجنبی الفاظ خصوصاً انگریزی الفاظ کے لئے جو لفظ بطور ترجمہ استعمال ہوتا ہے وہ اصل لغوی معنوں کے اعتبار سے اپنے مفہوم کے بالکل ابتدائی اور سطحی پہلوؤں پر حاوی ہوتا ہے۔ پھر ایک بڑی خرابی جو عام طور پر محسوس نہیں کی جاتی یہ ہے کہ زبان انگریزی کی ابتدائی ترویج کے زمانہ میں جن کلمات کا ترجمہ کیا گیا وہ نہ صرف ترجمہ میں بلکہ خود اصل زبان میں بھی اس وقت کے لحاظ سے اپنے دائرۂ استعمال میں محدود و معذوریت رکھتے تھے مگر علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ اصل لفظوں کے مفہوم میں بتدریج وسعت ہوتی رہی لیکن ان کا اردو ترجمہ وہیں رہا جہاں وہ روز اول تھا۔ ایسی صورت میں انگریزی لفظ کے اردو ترجموں میں نقص کیوں کر نہ رہتا اور نہ صرف نقص بلکہ اکثر حالتوں میں بعض الفاظ بروقت استعمال ادائے مطلب سے بھی قاصر رہتے ہیں۔

ازاں جملہ "سوسائٹی" کا لفظ بھی ہے جس کے معنے عموماً "صحبت" یا "مجمع" کے

لئے جاتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ان الفاظ سے کبھی وہ پورا پورا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا جو خود اصل لفظ "سوسائٹی" میں موجود ہے اور جن معنوں میں عموماً یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے مفہوم کے ناقص ہونے کا ثبوت دیگر اردو ترجموں کی طرح اس سے بھی ملتا ہے کہ ترکیبی اور اضافی صورتوں میں ہم ان کو استعمال نہیں کر سکتے اور روہی ایک کلموں کے بعد یہ ترجمہ قائم نہیں رہ سکتا مثلاً سوسائٹی کے مشتقات انگریزی یعنی "سوشل" یا "سوشیلزم" یا "سوشئے لای زے ثن" یا "سوشیلسٹ" وغیرہ الفاظ کا ترجمہ صرف ایک لفظ "صحبت" یا "اجتماع" کے مشتقات کے ذریعہ سے ہونا نہایت مشکل ہے تاہم اس مضمون میں ہم کوشش کرینگے کہ "سوسائٹی" کا حقیقی مفہوم بتلا کر طالب علم کی سوشیل (یا معاشرتی) حیثیت و وقعت کو جو ہماری تعلیمی دنیا کے لئے ہنوز اجنبی ہے نمایاں کریں اور اسی بنیاد پر "شہریت" کی تفصیل کریں۔

عموماً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ سوسائٹی کا اطلاق اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ متعدد افراد کا مجمع ہو یا ان کا مجموعی اثر مقصود ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے ہر فرد یا انسان کسی نہ کسی حیثیت میں سوسائٹی کے اندر ہی رہتا ہے خواہ اس کے پاس سوسائٹی کا ایک فرد بھی نہ ہو۔ ہر شے کے بولنا استعمال کرنا، بیٹھنا چلنا پھرنا، وضع و لباس، عادات و اطوار، اقوال، خیالات و احساسات غرض کہ ہر بات اسی سوسائٹی کی پابند ہے جس کا وہ ایک جزو ہے زید اپنی سوسائٹی کے اثرات سے لامحالہ متاثر ہوگا عام اس سے کہ اس نے اپنی سوسائٹی میں کوئی عملی حصہ لیا ہو یا نہ لیا ہو، یا مثلاً طبقہ اعلیٰ کا ہر فرد فطرتاً اپنے ہی طبقہ کی طرف ہر اعتبار سے مائل رہتا ہے اسی طرح پیشہ ور طبقات اپنے گرد و پیش کے اثرات اور اپنی سوسائٹی کی گرفت سے کبھی اپنے کو الگ نہیں رکھ سکتے گو یہ گرفت عیاں نہ ہو اور جزو کبھی اپنے کل کے اثرات اپنے سے باطل نہیں کر سکتا اگرچہ بظاہر نظر آتا ہو کہ ان دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔ پس یہ مسلمہ ہے کہ ہر فرد اپنی ہی سوسائٹی کا ایک کامل یا ناقص نمونہ ہوتا ہے۔ خواہ اس نے عملاً سوسائٹی کا منہ کبھی نہ دیکھا اور نہ اس سے کوئی سروکار رکھا ہو یہ اس کی طبیعت ہے اور وہ طبعاً مجبور ہے کہ فعلاً یا انفعالاً کسی نہ کسی طرح اس سوسائٹی کے اثرات و رجحانات

مظہر ہو جس کا کہ وہ ابتدا سے ممبر ہے۔

سطور مذکورہ سے جہاں یہ واضح ہو گیا کہ ہماری زبان میں "سوسائٹی" کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو کلمہ مذکور کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہو۔ وہاں ضمناً یہ امر بھی صاف ہو گیا کہ ہر فرد طبعاً اپنی سوسائٹی کے اثرات و میلانات سے متاثر ہونے پر مجبور ہے اور ہمیشہ اسی کی طرف مائل رہے گا نیز وہ فطرتاً اپنی سوسائٹی کا انفعالی طور پر (Passively) نمائندہ و مظہر ہوگا۔

اس تمہید کے بعد ہم نفس مبحث کے لحاظ سے اگر کسی ایسی ہستی کا تصور کریں جو نہ صرف انفعالاً بلکہ فعالاً (Actively) بھی سوسائٹی کے اندر مکمل طور پر عملی حصہ لینے اور نمایاں ہونے پر قدرت و اختیار رکھتی ہے اور اپنی ذات سے اپنی پوری سوسائٹی کو بھی متاثر بلکہ منقلب کر دینے کی جرأت کر سکتی ہو تو ایسی ہستی بجز طالب علم کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس موقع پر طالب علم کو متعارف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہی اس قسم کے صفات مثلاً حسن ادراک، حسن شعور قوت تعمیل و نفوذ وغیرہ کی استعداد اور مادّہ رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ سوسائٹی کا ہر فرد اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ سوسائٹی کو اپنے وجود سے متاثر کر دے۔ چنانچہ ایسے متعدد نظائر موجود ہیں کہ سوسائٹی کے غیر طالب علم اشخاص نے من حیث الجماعت اپنے مخصوص اصول اور طرز عمل کی بنا پر اپنی سوسائٹی کو پستی سے عروج اور عروج سے انتہائے عروج پر پہنچا دیا ہے۔ اس کو معمولی بدنظمی سے نکال کر ایک قومی حیثیت دی ہے اور پھر اس قومی حیثیت کو دیگر اقوام میں ممتاز کر دیا۔ یہ صحیح ہے مگر ایسے واقعات عموماً شاذ ہوتے ہیں اور محض اتفاقاً چند اشخاص ابھر کر اور اپنی مخصوص قابلیت و استعداد کی بنا پر وقتی طور پر ماحول سے متمتع ہو کر عروج جماعت کا باعث ہو جاتے ہیں لیکن ان میں کوئی ایسا خمتی اصول اور پائدار جذبہ نہیں ہوتا جو ان کے لیے رہنمائے عمل ہو اور جس کو مد نظر رکھ کر کسی مخصوص غایت کے لیے ابتدا ہی سے جد و جہد کی جائے اور حصول غایت کے اثنا میں اور اس کے بعد بھی اس کو پوری طرح

اور مستقل طور پر سوسائٹی کے نظام میں قائم و برقرار رکھا جائے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اتفاقی طور پر سوسائٹی کو متاثر کر دینے والے حضرات کی جد و جہد اکثر عمدہ نتائج پیدا نہیں کرتی اور بجائے فائدہ کے اس سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

پس عزم، تازگی، جرارت، جوش و حوصلہ وغیرہ صفات کے اعتبار سے صرف طالبعلم ہی کی ہستی ہے جو سوسائٹی کی تعمیر و تخریب اور شکست و ریخت کی ابتدا ہی سے قابلیت رکھتی ہے اور مستقل آغاز، وسطا اور انجام کو مد نظر رکھکر حرکت کرتی اور سلسلۂ عمل کی بنیاد ڈالتی ہے بلکہ سوسائٹی کا فرد یا اکائی ہونے کے لحاظ سے طالبعلم ہی سوسائٹی کا بہترین بنیادی پتھر ہے جس پر آیندہ سوسائٹی کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اس کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہوتی ہے اسی کا مکمل خاکہ عملی پہلو سے شہریت کہلاتا ہے۔

سوسائٹی اور شہریت کی مختصر تفصیل کے ضمن میں یہ ظاہر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مفہوم متذکرہ کے لحاظ سے شہریت اور سوسائٹی کا ایک طالبعلم سے وابستہ کرنا ایسے اشخاص کے لیے بالکل جدید اور حیرت انگیز ہے جو تعلیم و تعلّم کا مقصد اور مآل کار محض کتابی علم کی تحصیل یا جلب منفعت قرار دے چکے ہیں، حالانکہ ان کو یہ معلوم نہیں کہ دورِ حاضرہ کی علمی ترقی نے جہاں ایک طرف طالبعلم کی پوری پوری تحلیل نفسی Psycho-(analysis) کرکے اس کے تمام ممکن رجحانات کو واضح کر دیا ہے وہیں طالبعلم کے لیے ایک اہم غایت تعلیم یہ قرار دی ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی اور جمہور کا ایک قیمتی اور مفید اور عمدہ کارکن شہری بنے اور ظاہر ہے کہ ایک عمدہ شہری کے اندر تہذیب، امن پسندی، احترام قانون، اشاعت علم، ہمدردی بنی نوع انسان، ایثار و صداقت وغیرہ سب قسم کے صفات شامل ہیں۔

وہ امور اور محرکات جو ایک طالبعلم کو ... کی ... کی طرف منفیاً یا اثباتاً دعوت دیتے ہیں اور جن کی وساطت سے رفتہ رفتہ طالبعلم سوسائٹی سے دور ہونے لگتا ہے

بہت سے ہیں۔ مگر حسب ذیل چار محرکات ایک مخصوص حیثیت رکھتے ہیں :۔

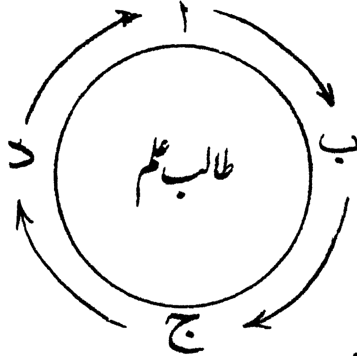
ا ۔ ماحول ذاتی

ب ۔ ماحول اضافی

ج ۔ ماحول مطالعی

د ۔ ماحول کاذب

مذکورہ احوالات کا دائرہ ہر طالبعلم کی زندگی پر نہ صرف بہ تسلسل بلکہ بتدریج اثر ڈالتا رہتا ہے جس کی کیفیت تشریح کی خاطر اس طرح ظاہر کی جاسکتی ہے۔



ا ۔ ماحول ذاتی یا شخصی اور مخصوص ماحول سے وہ ماحول مراد ہے جو طالبعلم اپنے ذاتی وانفرادی حالات اور اثرات کے ماتحت اپنے میں رکھتا ہے، جس میں اس کی فطری اور موروثی خصوصیات شامل ہیں جو اس پر اثر ڈالتی رہتی ہیں، فطری ذہانت وذکاوت فطری کند ذہنی اور حمق، موروثی عادات وخصائل اور دوسری طرح کے عیوب مثلاً یکچشم یا ناقص الاعضا ہونا، دائم المریض اور لاغر یا فربہ ہونا، خاص خاص ذہنی ودماغی خصائل مثلاً غصہ، حلم، یا درشت مزاجی، نیک طبعی کا وراثتاً طبیعت میں رہنا اور اس قسم کے دیگر امور شخصی ماحول میں داخل ہیں، آبائی رسم ورواج یا خاندانی طور پر کسی خاص فن میں ملکہ ہونا، دستور کا اثر۔ قدیم رسم ورواج نیز پیشوں اور حرفت کو بھی اس ماحول میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ اس ماحول کے اہم عناصر کو علم توریث (Eugénics)

نے حال میں بہت کچھ روشنی ڈالی ہے اور ہمارے علم اور امکانات ترقی میں اضافہ کیا ہے۔
لیکن حقیقی ماحول مخصوص وہ ہے جو کسی حال میں متغیر نہو سکے اور پوری زندگی میں بحیثیت ایک جزو مشترک کے وجود انسانی پر اثر انداز رہے۔ وہ قدرت کا ایک مستقل اور نہ بدلنے والا عطیہ ہے۔

ب۔ ماحول اضافی سے طالبعلم کا وہ ماحول مراد ہے جو ماحول ا کو خارجاً متاثر کرتا رہتا ہے، والدین، اہل خاندان، اتالیق، معلمین مدرسہ، ہم جماعت طلبہ، جلسے، کلب، کھیل، تقریبات و رسوم، میلے، سفر و سیاحت جنگ و صلح وغیرہ طالبعلم کے ماحول اضافی میں شامل ہیں اور ماحول ذاتی کے بعد اور اس سے ملکر سوسائٹی کے اثر سے عام طور پر طالبعلم کو روشناس کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ماحول اضافی کا ہر پہلو طلبہ کے لیے نہایت اہم ہے اور اسی منزل سے آئندہ سیرت کا ہیولی تیار ہوتا ہے اور اس کو مخصوص شکل دی جاتی ہے۔ اس لیے اس منزل کا ہر قدم نہایت احتیاط سے اُٹھانا چاہیئے اور ہر پہلو سے اپنی اور سوسائٹی کی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ملحوظ رکھنا چاہیے، کوئی ادنیٰ سا واقعہ بھی اس کے روبرو ایسا نہ آنا چاہیے جو سوسائٹی کے اجتماعی مقاصد کو سلب یا ان کی نفی کرتا ہو۔ ورنہ طالبعلم کی آئندہ سیرت کے قطعی اور کلیتاً تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور جو خفیف سا داغ بھی اس منزل میں اس کی سیرت کے دامن پر پڑے گا وہ آئندہ چل کر بڑے بڑے دھبوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اور اس سے پوری سوسائٹی کو تباہی میں ڈالنے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔

ج۔ ماحول مطالعی، کتابی یا علمی واقفیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں بالعموم بہت بڑی حد تک کتب نصابی کو دخل ہوتا ہے اور بہت کم عام مطالعہ کو۔ مطالعہ نصابی اس قدر محدود اور قیود سے جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ اس سے کسی خاص ماحول کو پیدا کرنے کی بہت کم امید کی جا سکتی ہے اس لیے کہ ماحول مطالعی کی ایک لازمی شرط یہ ہے کہ وہ آزاد و اختیاری ہو اور

امتحان یا کامیابی و ناکامی کی پابندی کا اس پر کوئی اثر نہو۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو مطالعہ کیا جاتا ہے اس میں جبر کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اس لیے بہت جلد دماغ اس کو باہر نکال پھینکنے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے دلچسپی اور رجحان طبعی سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں ہوتا بلکہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر یہ نصابی اور جبری مطالعہ تو اے دماغی کو اس قدر مضمحل اور شل کر دیتا ہے کہ مطالعہ کی اسپرٹ ہی مُردہ ہوجاتی ہے اور طبیعت میں مطالعہ کی طرف سے ایک قسم کا تنفر پیدا ہوجاتا ہے جو سخت مضر ہے۔

چونکہ طالبعلم فطرتاً اس بات پر مائل ہوتا ہے کہ اپنے گردوپیش کے حالات کو اپنی کتابی معلومات سے منطبق کرنے کی کوشش کرے اور عملی طور پر اپنے نظری تجربات سے فائدہ اٹھائے۔ اس لیے تاوقتیکہ مطالعہ آزاد اور اختیاری نہو (جس کے لیے لازم ہے کہ وہ بالکل رجحانی ہو) اس سے صحیح قسم کا دماغی ماحول پیدا نہیں ہوسکتا اور مطالعہ کا کوئی پہلو کسی حیثیت سے قابل اطمینان طور پر طالبعلم کی زندگی کی تشکیل میں اعانت نہیں کرسکتا، طالبعلم کی معلومات جسقدر باترتیب اور عملی پہلو لیے ہوئے ہونگی۔ اس قدر اعلیٰ "مطالعی" ماحول پیدا ہوسکے گا۔ مختلف قسم کی علمی، اخلاقی، فنی، اکتشافی کتابیں اور اسی قسم کے ماحولات اور صحبتیں ماحول مطالعی کو بہت خوبی سے پیدا کرتی ہیں۔

د۔ ماحول کاذب سے مراد وہ عارضی اثرات ہیں جن کو پائدار طور پر مختلف کیفیات اور واردات کے ضمن میں اور مختلف واقعات کے نتائج کے طور پر طالبعلم اخذ کرتا ہے اور جو یکے بعد دیگرے ہنگامی طور پر اس پر طاری ہوتے اور زائل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر واقعہ اور مشاہدہ سے طبیعت پر ایک جدید اثر پڑتا ہے جس کو ایک دوسرا واقعہ یا مشاہدہ زائل کرکے دوسرا اثر پیدا کردیتا ہے لیکن پھر خود بھی زائل ہوجاتا ہے۔ یہ ماحول جس قدر جلد پیدا ہوتا ہے اسی قدر جلد زائل بھی ہوجاتا ہے اور ماحولات متذکرہ کے مقابلہ میں بہت ضعیف ثابت ہوتا ہے، اور اس میں فاعل کی قوت ارادی و استقلال کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اکثر معلمین اور اتالیقوں کو

اس خاص صورت سے سابقہ پڑا کرتا ہے کہ اپنے بتائے اور سکھائے ہوئے اصول و قواعد کے بالکل خلاف یکایک اور ناگہانی طور پر ان کے طلبہ سے بعض ایسے حرکات وقوع میں آجاتے ہیں جن کا گمان بھی نہیں ہوتا مگر ساتھ ہی ان کو استقلال بھی نہیں ہوتا۔

ماحول کاذب کی تفصیل کافی دلچسپ ہے اگرچہ ہم اس کو دراصل ماحول کا نام نہیں دے سکتے تاہم چونکہ سیرت کے سلسلہ میں بھی ایک کڑی ہے اس لیے اس کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس ماحول کے اثرات باوجود ضعیف ہونے کے اگر عرصہ تک مسلط رہتے ہیں اور کسی دوسرے مستقل ماحول کے وساطت سے متغیر نہیں ہوتے تو رفتہ رفتہ ایک مستقل صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس صورت میں کسی دوسرے ماحول کو ان کے مغلوب کرنے میں سخت دشواری ہوتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی ماحول کاذب، ماحول صادق کی صورت اختیار کرکے متذکرہ ہر سہ شکلوں میں سے کسی شکل میں نمودار ہوجاتا ہے اس لیئے لازم ہے کہ ہم ماحول کاذب سے بھی فائدہ اُٹھائیں اور اس کے تحت میں جن واقعات یا مشاہدات کو طلبہ کے لیے خفیف الاثر سمجھتے ہیں اگر وہ مفید ہوں تو اُن کو نشو و نمو دیکر قوی بنائیں اگر ناقص ہوں تو کامل، اور غیر مرتب ہوں تو باقاعدہ بنائیں تاکہ عملی زندگی میں یہی امور خود طلبہ کے لیے اور سوسائٹی کے لیے کارآمد ہوں۔

یہاں تک ہم نے مختصراً ان ماحولات سے بحث کی ہے جو لازماً ہر طالبعلم کی زندگی کے مختلف منازل میں پیش آتے ہیں اور وہ بری بھلی طرح ان سے متاثر ہوتا ہوا منزل حیات کو طے کرتا چلا جاتا ہے۔ ہم نے اس موقعہ پر لفظ 'بری بھلی طرح' استعمال کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں چونکہ طالب علم کا معاشرتی پہلو قطعاً نظر انداز کردیا گیا ہے اور اس غریب کے جذبات و عملیات کی دنیا کتابیں۔ اور مقصد اعلیٰ امتحانات قرار پائے ہیں اس لیے اس کو خود فاعلی حیثیت سے دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اور اس کے تمام قوار ایک ایسے عمل کو انجام دینے میں مصروف رہتے ہیں جو اس کی سیرت یا معاشرت سے کوئی تعلق

نہیں رکھتا۔ بلکہ اکثر مضر ہوتا ہے ۔ اور کشمکش حیات کے نقطہ نظر سے اس کو بالکل معذور اور اپاہج کر دیتا ہے ۔ مگر بہر کیف اپنے موضوع کے اعتبار سے ہم ماحولات کے اثر کی اس منزل کو طالبعلم کی "بری بھلی" معاشرتی اہمیت کے لحاظ سے اس کی معاشرت کی ابتدائی منزل کہیں گے اور اس دور کا خاصہ یہ ہے کہ عموماً اس میں طالبعلم کو پہلی مرتبہ اپنے معاشرتی حیثیت کا صاف اور صریح احساس ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب طالبعلم سوسائٹی کا ایک فرد بنکر دنیا میں نکل آتا ہے وہ اپنے مقصد حیات اور غایت زیست کو متعین کر لیتا ہے اور اسی کے مطابق ایک ذہنی اور مخصوص معاشرتی دستور العمل کے لحاظ سے ایک مستقل زندگی بسر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اکثر و بیشتر اس کو اپنے سامنے کوئی ایسی راہ عمل کھلی پڑتی ہے جس کا بدقسمتی سے اپنی سابقہ زندگی میں اس کو کبھی خیال بھی نہ گذرا تھا۔ اسی منزل میں اس کے تمام ماحولات مذکور رفتہ رفتہ ایک مجموعی عملی شکل اختیار کر کے ایک مخصوص سیرت کیریکٹر کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں، غریب طالبعلم کو جیسی دنیا اپنے چاروں طرف ملتی ہے وہ اسی رنگ میں رنگنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا کیا ہوتی ہے ؟ یہ دنیا اس ہی جیسے چند فارغ التحصیل طلبہ کا مجمع ہوتا ہے جو مختلف حیثیتوں سے زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اور اپنی مختلف سیرتوں اور مختلف مقاصد کے لحاظ سے ایک عجیب معجون مرکب کا نقشہ پیش کرتا ہے جس میں ہمارا غریب طالبعلم بھی شامل ہو جاتا ہے۔

اس منزل پر اس کا ہر فعل سوسائٹی پر اثر انداز ہونے لگتا ہے اور سوسائٹی اپنے مفاد و ضرر کے لحاظ سے اس کے ہر عمل کو تنقیدی، تحسینی یا اصلاحی نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے اور اسی منزل میں پہلی مرتبہ طالبعلم کو محسوس ہوتا ہے کہ اس میں اس قسم کا مادہ موجود ہے جس سے وہ قدرتی طور پر اپنے گردوپیش کو متاثر کر سکے۔ طالبعلم کے سوشل ارتقاء کے لحاظ سے اس منزل کو منزلِ وسطےٰ کہتے ہیں اور یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ سوسائٹی نے

بزمِ معلّمین

مدرسۂ جدیدہ بلجیم میں

(بسلسلۂ سابق)

دستکاری کی تعلیم

جسمانی ورزش اور مشاغل کا یہ بیان مکمل کرنے کے لیے دستکاری یا صنعت کی تعلیم اور زراعتی کام کا ذکر باقی رہتا ہے۔ اسکول کے پراسپکٹس میں میں نے صنعت کی تعلیم کا فائدہ اور مقصد اس طرح بیان کیا ہے "ہماری جسمانی تربیت کی تکمیل اس قسم کی صنعتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جیسے ٹوکرے بنانا۔ برتن بنانا۔ گتہ کا کام۔ ڈھالنا۔ جلد سازی۔ نجاری اور لوہار کا کام یہ بچے کی جسمانی اور دماغی نشوونما کے لیے بہت مفید اور قابل قدر ثابت ہوئی ہیں۔ ان سے مشغول رہنے کی وہ ضرورت پوری ہوتی ہے جو بچوں میں اس درجہ شدید اور مستحکم ہے۔ وہ مشاہدہ موازنہ اور تخیل کی قوتوں کو ترقی دیتی ہیں۔ اختراع اور تعمیری قوتوں کو ابھارتی ہیں صحتِ عمل کی تعلیم دیتی ہیں۔ اور مختلف علوم (علوم طبیعی حساب۔ جغرافیہ طبیعی) کے استعمال کا موقع دیتی ہیں۔ اور ان علوم کی واقفیت کو مستحکم اور واضح بناتی ہیں۔ علاوہ بریں، طلبا اس طرح سے ایسے ہاتھ کے کام سیکھ لیتے ہیں۔ جو بعد کی زندگی میں بہت ضروری ہوتے ہیں۔

یہاں تک نظری بحث تھی۔ اب ہم تعلیم صنعت کے عملی نظام کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

(۱) جیسا کہ اوپر کے بیان سے ظاہر ہوگا ہم مختلف قسم کے صنعتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ بچوں کی مشغولیت، تخلیق، خیالات کو عمل میں لانے اور اظہار خودی کے بہت سے مواقع دیئے جائیں۔ کیونکہ اگرچہ مختلف قسم کی دستکاریاں ایک ہی قسم کے مشاغل پر مشتمل ہیں۔ ان میں آپس میں کئی لحاظ سے فرق ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ کس قسم کا اثر ڈالتی ہیں۔ کن کاموں کی ترغیب دیتی ہیں۔ کس رجحانات کو بیدار کرتی ہیں۔ اور کن قوتوں کو ترقی دیتی ہیں۔

صنعت کی تعلیم جس قدر متنوع ہو گی۔ اسی قدر اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ طالبعلم کو کام کرنے کی جو خواہش ہے وہ پوری ہو سکے۔ اور اس کے مذاق، رجحانات اور مخصوص قابلیتوں کا علم حاصل ہو۔ اس طرح جوں جوں ہم طالبعلم کو زیادہ اچھی طرح سمجھیں گے اس کی زیادہ کامیابی کے ساتھ راہبری کر سکیں گے۔

نمونہ کے طور پر ایک لڑکے کا ذکر کرتا ہوں۔ جو اسکول میں داخل ہونے کے وقت چاہتا تھا کہ تجارت کا پیشہ اختیار کرے۔ لیکن نجاری اور لوہار کی دوکان میں کام کرنے سے معلوم ہوا کہ اس میں دستکاری کا ہنر ہے اور اس کی دماغی قابلیت اسی کام کے لیے موزوں ہے۔ یہاں تک کہ اس کو خود معلوم ہو گیا کہ وہ غلط راستہ پر ہے۔ اس لیے اس نے میکانیکل انجینیر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جو اس کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ ایسی صورتِ حال اکثر پیش آتی رہتی ہے۔

(ب) صنعت کی تعلیم میں طالبعلم کی عمر کا لحاظ رکھا جاتا ہے سب سے کم عمر کے طلبا کو جن کی عمر ۸ سال سے ۱۰ سال تک ہے کاغذ موڑنا، گتے کی چیزیں بنانا، نقشہ کشی، اور مٹی کی چیزیں ڈھالنا سکھایا جاتا ہے۔ باہر میدان میں وہ باغ کے راستوں کو ٹھیک رکھتے ہیں۔ اپنی کیاریوں کو بوتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کو پالتے ہیں۔ مثلاً مرغیاں، خرگوش، کبوتر، وغیرہ انہوں نے بعض ذرا بڑی عمارتیں بھی بنالی ہیں۔ جن میں قابلِ ذکر ایک خرگوش خانہ ہے۔ ایک اونچی جماعت کا طالبعلم اس کا حال یوں بیان کرتا ہے۔

"نومبر میں چھوٹے بچوں نے خبر دی کہ انہیں خرگوش رکھنے کے لیے ایک بڑا احاطہ بنانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے بنیادیں ڈالیں، چونا تیار کیا، اور باقی تمام کام خود کیا۔ دیواریں بہت موٹی نہیں۔ لیکن وہ پانچ فٹ اونچی ہیں۔ خرگوش خانہ پانچ فٹ چوڑا ہے۔ اور اس کی چھت "فلٹ" کی ہے۔ بڑے لڑکوں کی مدد سے انہوں نے کھڑکی اور دروازہ نجّار خانے میں بنایا۔ کام لمبا تھا۔ لیکن ایک مہینہ کے ختم پر خرگوش اپنے نئے گھر میں رہنے لگے۔ کس قدر خوش گوار ہے اینٹیں لگانا، اور چونے کو پانی اور ریت میں ملا کر گچ بنانا، پانی اور ریت جو

بچے کو اس قدر عزیز اور مسرت کے لیے اس قدر مفید ہوتے ہیں! کس قدر خوشی ہوتی ہے مکمل عمارت کو دیکھ کر اور اسے اپنے ساتھ کے بچوں اور عزیزوں کو دکھا کر! مگر رنج ہوتا ہے کام کے ختم ہو جانے سے، خواہ اس کے دوران میں اختلاف رائے بھی رہا ہو۔ اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو ہموار کرنا پڑا ہو یہ ننھے معمار تو یہی چاہیں گے کہ اس ساری عمارت کو پھر ڈھا دیں۔ تاکہ اس کو از سرِ نو بنا سکیں! لیکن وہ لوگ متنبہ رہیں، جو بنانے والوں کے گروہ میں شامل نہیں اور کوئی نکتہ چینی نہ کریں۔ نہ یہ رائے دیں کہ اس بُت کو توڑ دیا جائے۔ کیونکہ اس صورت میں ننھے معمار فوراً مدافعت کریں گے اور انھیں اس کو ہر طریقہ سے بچانے کا خیال ہوگا۔ بچہ میں اس قسم کی متضاد باتیں بھری ہوتی ہیں۔ اور انھیں میں وہ شعلہ چمکتا ہے جو اس کی انفرادیت کو روشن کرتا ہے۔

دس برس سے زیادہ عمر کے طلبا بخاری کی دوکان میں کام کرتے ہیں۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد لوہار کی دکان میں۔ یہ صرف زیادہ مضبوط لڑکوں کے لیے مخصوص ہے۔ کیونکہ ڈھالنے کے کام کے لیے کافی اعصابی قوت درکار ہے۔

(ج) زیادہ تر صنعت کی تعلیم تیسرے پہر کو دی جاتی ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں صبح کو بھی ہوتی ہے۔ بہرحال قبلِ دوپہر طالبعلم کو اتنا وقت مل سکتا ہے۔ کہ وہ اسے دستکاری میں لگائے۔ یا معمل اور آرٹ کے کمرے میں صرف کر سکے۔ خواہ وہ اس کام کو عام فائدے کے لیے کرے۔ یا اپنی ذاتی نفع کے لیے یا اپنے پڑھے ہوئے اصولوں کے عملی اطلاق کی خاطر۔ میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ دستکاری کو تمام تر تیسرے پہر کے لیے مخصوص کر دینا مفید نہیں۔ جسمانی اور دماغی تعلیم متبادل ہونی چاہیئے۔ اور یہ نہ صرف عام تربیت کی وجہ سے ضروری ہے بلکہ خاص طور صنعت کی تعلیم کے لیے بھی، اکثر لوگوں کو یہ سمجھنے میں دقت ہوتی ہے کہ دستکاری ان ضروریات، جذبات اور خیالات، کے اظہار کا ذریعہ ہے جو طلبا میں علم حاصل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور گننے کا کام، مٹی کی چیزیں

بنانا، نجاری اتنی ہی ضروری ہیں جسقدر لکھنا، پڑھنا حساب وغیرہ - مزید برآں یہ کہ چونکہ ہم ان چیزوں کو اپنا مقصود بالذات نہیں سمجھتے - چونکہ ہم گتے کا کام گتے کے کام کی خاطر نہیں کرتے - جونکہ ہم مجسمہ سازی، یا نقشہ کشی، مجسمہ سازی، نقشہ کشی کی خاطر نہیں کرتے - جیسا کہ ہم پڑھنا یا لکھنا صرف پڑھنے یا لکھنے کی خاطر نہیں کرتے - چونکہ یہ تمام مشاغل طالب علم کے مختلف دماغی اور معاشرتی کاموں سے ہیں - اسی وجہ سے ان کا تعلیمی فائدہ بہت زیادہ ہے۔

(د) آرٹ کے کمروں اور کارخانوں میں تمام ضروری سامان موجود ہے - جب کوئی طالب علم بڑھئی یا لوہار کی دوکان میں داخل ہوتا ہے، اور اوزاروں کے اس عمدہ مجموعہ کو دیکھتا ہے جو استعمال کے لیے رکھے ہوئے ہیں تو اسے معاً یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ جگہ سنجیدہ اور ضروری کام کرنے کی ہے - وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر تالاب میں استعمال کرنے کے لیے وہ ایک سادہ کشتی بنا سکتا ہے تو اسی طرح دروازہ، کھڑکی یا اس قسم کی اور چیزیں بنانی بھی ممکن ہیں۔ مختلف قسم کے نہایت عمدہ آلات اور اوزاروں کی موجودگی سے بہت اچھا اثر پڑتا ہے خصوصاً بڑی عمر کے طلبا پر - اس سے ان کی قوتِ ارادہ مضبوط ہوتی ہے اور قوائے تنقیدی نشو و نما پاتی ہیں۔ طبیعی تجربات کرتے ہوئے میں نے بعض طالبعلموں کو سائنس کے اصول کی جانب سے مشکوک پایا ہے - کیونکہ تجربہ دکھانے میں جو سادہ اور معمولی آلات استعمال کئے گئے تھے ان سے بالکل صحیح نتیجے نہیں نکل سکے - چھوٹے بچے محض تخمینوں سے مطمئن نہیں ہوتے - وہ چاہتے ہیں کہ تمام چیزیں بالکل ٹھیک اور صحیح ہوں - اور ان کے بے چین دماغ، جستجو، سوال اور شک کے شائق، اور صحت کلّی، اور صریحی تیقن کے آرزومند ہوتے ہیں - اور طرفہ تماشا یہ کہ ان سب چیزوں کے ساتھ اسی وقت ان کو خوابوں کا اور تخیل کی پرواز کا شوق بھی ہوتا ہے!

(ک) ہر کارخانہ یا آرٹ کا کمرہ کسی ایک طالب علم کی نگرانی میں ہوتا ہے - ورطالبعلموں کی انجمن خود ان ذمہ داریوں کو آپس میں تقسیم کرتی ہے - یہ مہتمم باعتبار ل کے باری باری آنیکا

انتظام کرتا ہے۔ اس کی معرفت طلبا اور اُستادوں کی درخواستیں اور شکایتیں سکول کی حکمراں جماعت تک پہنچائی جاتی ہیں۔ اسے یہ خیال رکھنا پڑھتا ہے کہ کمرے میں باقاعدگی رہے۔ اور اوزار، آلات اور کتابوں کو استعمال کے بعد ان کی جگہ واپس رکھدیا جائے۔ وہ تمام چیزوں کی فہرست رکھتا ہے اور احتیاط کرتا ہے کہ اوزار خراب ہونے نہ پائیں۔ اس کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کام کرنا ہو خواہ وہ ذاتی ہو یا اجتماعی، اس کے لیے اس کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اسے سامان اور اوزار حسبِ ضرورت خریدنے پڑتے ہیں۔ سوداگروں سے دام چکانے ہوتے ہیں۔ خواہ ذاتی طور پر یا خط کے ذریعہ سے۔ اور ہر روز اسے خط و کتابت خرید فروخت کا گوشوارہ بورڈ پر چسپاں کرنا ہوتا ہے۔ یہ فرض تعلیمی لحاظ سے بہت مفید ہے۔ خواہ ہمارا تعلق نجار کی دوکان سے ہو یا بڑھئی کی دوکان سے یا طبیعیات اور کیمیا کے معمل سے۔ مہتمم بہت سی چیزیں سیکھتا ہے جو نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا کیرکٹر اور اس کی ذہانت بنتی ہے مضبوط ہوتی ہے۔ اور صیقل پاتی ہے وہ زندگی کی کشمکش میں اپنا فرض پورا کرنا سیکھتا ہے۔ کیونکہ جہاں اس کو بہت آزادیٔ عمل ہے، وہاں ذمہ داری بھی کافی ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اس کی آزادیٔ عمل بہت وسیع ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے گھر میں مالک ہوتا ہے۔ خود کام اور کام کرنے والوں کا انتظام کرتا ہے۔ جو شکایتیں پیدا ہوں انھیں سنتا ہے، اور عموماً ان کا تدارک کرنا جانتا ہے۔ وہ اپنے حلقۂ عمل میں حاکم ہوتا ہے کام کو جاری رکھتا ہے اور اس کی ترقی میں مدد دیتا ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں۔ کیونکہ اس میں انتظام، اوزاروں، سامان، پیداوار، اور خرید و فروخت کے لیے روپیہ (جو ہر مہینہ دو پاؤنڈ کے قریب ہوتا ہے) غرض سب چیزوں کی نگرانی شامل ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا گیا ہے کہ اس بات کا تو اندیشہ نہیں کہ طلبا اس وسیع آزادی کا برا استعمال کریں گے۔ میرے خیال میں نتائج سراسر قابل مبارکباد ہیں۔ بیشک مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن نوعمروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مشکلوں سے عہدہ برآ ہونا سیکھیں

بچوں کے لیے کام کرنے میں آزادی اچھی چیز ہے۔ کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے کوئی کوشش کس طرح مفید ہو سکتی ہے جب تک وہ ایسے ذاتی تجربوں کا نتیجہ نہ ہو جو فکر اور فیصلہ پر مبنی ہوں اگر بچہ شروع شروع میں غلطی کرتا ہے تو اسے مجبوراً اصلاح کرنی پڑتی ہے اس لیے ہمیں چاہیئے کہ اسے ایک ایسی زندگی بسر کرنے دیں جس میں اخلاقی تجربہ حاصل کرنے کا امکان ہو۔ یعنی ہم اسے یہ موقع دیں کہ خود سے سبقت لیجائے۔ اور برائی سے گذر کر خوبی تک پہنچ سکے۔ لیکن یہ احتیاط سے اور بغیر غل و شور کے ہونا چاہیے، ہمیں بچہ کو عمل کے اور بہت سے تجربے حاصل کرنے کے موقع دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے اس میں کیرکٹر پیدا ہو سکتا ہے اگر اس نے کوئی برائی کی ہے تو اسے خوش اسلوبی سے اور موقع کے مناسب مشورہ دینا چاہیئے عمدہ طبیعت کا ہر نوعمر بچہ، یہ کوشش کرے گا کہ آئندہ اس سے بہتر کام کرے پھر یہ کہ جو نوجوان عمل کا، اپنے آپ کام کرنے کا عادی ہے وہ اپنے دماغ کو ان تمام مشاہدات اور موازنوں سے مالا مال کرے گا جو تجربہ سے نکلتے ہیں۔ علاوہ اس کے اسے یہ عادت پڑ جائیگی کہ وہ دوسروں سے صلاح لے اپنے مضمون کا مطالعہ کرے، ایسے امور جمع کرے۔ جو اسے فیصلہ کرنے میں مدد دیں۔ اور پھر اسی فیصلہ کو عمل میں لائے۔ پیرس میں ہمارے نوجوان یہی کرتے تھے۔ فیصلہ کرنے سے پہلے وہ ہر چیز کے متعلق آپس میں گفتگو کرتے تھے۔ اور جو شخص ملتا تھا اس سے مشورہ کرتے تھے۔ کھیت کا انتظام جس کا حال ابھی بیان کیا جائیگا میرے اس بیان کی صحیح مثال ہے۔

(ذ) اسکولوں میں کسی دستکاری کو کس طرح شروع اور مکمل کرتے ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو کوئی واقعی مثال لیکر بات سمجھاؤں۔ اور اس کی مختلف منزلیں دکھاؤں میں اس مقصد کے لیئے اس بڑے چڑیا خانے کی تعمیر کو انتخاب کرتا ہوں جو علوم فطرت کے متعلق طریقہ پر بنایا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہم ایک منتخب منصوبہ کو پورا کرتے تھے اور تعمیر کے کام میں عام فائدہ سے ہم نے ایک اہم تعلیمی فائدہ بھی [illegible]۔

اس قسم کے کام کا خیال یا تو کسی ایک طالب علم کے دماغ سے شروع ہوتا ہے یا کسی گروہ کے فیصلہ سے جو ایک یا زیادہ طلبا کو اس مقصد کے لیے مقرر کرتا ہے۔ چڑیا خانے کا خیال علم حیوانات پڑھنے والے طلبا کا تھا۔ لڑکے اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو مقرر کرتے ہیں کہ وہ ایک بڑے چڑیا خانے کی فراہمی کا انتظام کرے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو کیسے کیا جائے؟ اس کو بے قاعدہ طور پر شروع نہ کرنا چاہیے یعنی بغیر یہ جانے کہ اس مقصد کے لیے کیا ذرائع موجود ہیں۔ تحقیق و تفتیش اور ضروری واقفیت بہم پہنچانے کے لیے ایک ابتدائی مہلت کی ضرورت ہے ایک نمونہ بنانا یا ڈھونڈنا چاہیئے۔ جب یہ معلوم بھی ہو جائے کہ کیا کرنا ہے پھر بھی وہ اس وقت تک کام نہیں کرسکتا جب تک مندرجہ ذیل شرائط پورے نہ ہوں۔

(۱) اس کو ایک بالکل صحیح نقشہ بنانا چاہیئے جو نقشہ کشی کے قاعدوں کے موافق اور پیمانے کے مطابق کھینچا گیا ہو۔

(۲) اس کو لکڑی اور دوسرے ضروری سامان کی مقدار اور نوعیت کی تخصیص کرنی چاہیئے۔ اس ضمن میں تمام ضروری چیزیں تار کی جالیاں، کھٹکے، کیلیں وغیرہ شامل ہیں۔

(۳) مجموعی قیمت۔ اس میں لکڑی، اور تار وغیرہ کی پوری قیمت شامل ہونی چاہیئے کام کے لیئے کسقدر گھنٹے درکار ہوں گے۔ اور اگر باہر سے مزدور بلائے جائیں تو انہیں کتنی مزدوری دینی ہو گی جب یہ تخصیص اور تخمینے تیار ہو جائیں تو ان کو نجار، مستری اور ٹھیکہ دار اور اس طالب علم کی منظوری کے لیے پیش کیا جاتا ہے جو بڑھئی کی دوکان میں مستری کا کام کرتا ہے۔ معائنہ، تنقید، مباحثہ، ترمیم، اور ضرورت ہو تو تصحیح، یہ سب چیزیں بعد میں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد نقشہ، تخصیص اور تخمینے منظور ہوتے ہیں۔ اگر وہ نامنظور کر دیے جائیں تو کام دوبارہ شروع کرنا چاہیئے اور اس نکتہ چینی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے جس کی بنا پر نامنظوری ہوتی ہے۔

جب یہ کام ختم ہو جاتا ہے تو اس مکمل کارروائی کی حیثیت اور اس کے حسن و قبح کے متعلق بحث ہوتی ہے۔ یہ طریقۂ عمل نہ صرف لکڑی کے کام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ لوہے کے اور زراعتی کام کے لیے بھی، گتے کے کام کے سلسلے میں چھوٹے بچوں کو ابتدائی نقشہ بنانا سکھایا جاتا ہے۔ جو کاغذ اور گتہ وہ استعمال کرتے ہیں اس کی مقدار کا اور وقت کا اندازہ کرنا بتایا جاتا ہے اور وہ اس چیز کی مجموعی قیمت کا تخمینہ بھی لگاتے ہیں۔

جس معنی میں ہم نے تعلیم کو لیا ہے اس کے ذریعہ سے ہم طلبا کا تعارف پیشوں کی زندگی اور صنعتی یعنی عملی زندگی سے کراتے ہیں۔ اور یہی کام دماغی اور معاشرتی تعلیم کا ایک زبردست وسیلہ بن جاتا ہے۔

اوزاروں اور خام مواد سے واقفیت، ان کی تخصیص، اور قیمت کا اندازہ بنانا، روزانہ کام کے گھنٹوں کا اور معمولی شرح اُجرت پر ان کی مزدوری کا اندازہ کرنا، ان تمام چیزوں سے صرف یہی فائدہ نہیں کہ وہ طلبا کو صنعت و حرفت کے طریقے سکھاتی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے اپنے پراسپکٹس میں بیان کیا ہے، ان کو انسانی زندگی اور کام کی واقفیت سے روشناس کراتی ہیں۔ بلکہ ان میں مزدوروں کی محنت اور اُجرت کا اندازہ لگانے کی قابلیت پیدا کرتی ہیں۔ اور اس سے ان کے سامنے معاشرتی مسائل کی ایک وسیع فضا کھل جاتی ہے۔ اس لیے ہم نے جو مقصد پیشہ کی تعلیم کا قرار دیا ہے۔ اس میں ایک بہت ضروری عملی معیار سے کام لیا جاتا ہے اور وہ گویا روزمرّہ کی زندگی کے واقعات کے لیے تمہید ہے۔ یہ کوئی محض نظری چیز یا کوئی جھوٹی اور مصنوعی بات نہیں ہے۔ میں دوبارہ یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم دستکاری محض دستکاری کی خاطر نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کوئی رسمی یا مقررہ اسکیم نہیں ہے۔ جو ساری جماعت کے لیے استعمال ہو سکے۔ کیونکہ ہم دستکاری کو خیالات کے اظہار اور ذاتی ضروریات کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یا ان ضروریات کا جو بچہ کے ماحول سے تعلق رکھتی ہوں

جس میں وہ زندگی بسر کرتا، کام کرتا، اور نشو ونما پاتا ہے۔ بچے کو اس کے ہاتھوں، اوزاروں اور سامان کا استعمال سکھاتا تاکہ وہ مفید چیزیں بنا سکے یہ گویا اس بات کو عملی طور پر بتاتا ہے کہ یہ چیزیں اس وسیع تر دنیا میں کیسے تیار کی جاتی ہیں۔ جو اسکول کے گرد ہے۔ علاوہ بریں جب ہم بچوں کو کسی دستکاری میں اشتراک عمل سکھاتے ہیں تو ہم ان کو معاشرتی زندگی کے لیے تربیت دیتے ہیں۔ ہمارے طلبا مدرسے کے ہر کام میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی گذرگاہ کے نشانات ہر جگہ موجود ہیں۔ ان کے مشتاقانہ، اور فعالی اشتراک عمل کی شہادتیں ہر طرف نظر پڑتی ہیں۔ اسکول کی بہت سی چیزوں کے متعلق وہ کہہ سکتے ہیں۔ "یہ ہمارا کام ہے۔ ہم نے اسے بنایا ہے"۔ بچوں نے جو جو کام اسکول کے لیے کئے ہیں۔ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اُنھوں نے تولیوں کے لیے سٹینڈ اور حمام خانے کے دوسرے لوازم بنائے، بوٹوں کے لیے الماریاں، باغ میں بیٹھنے کے لیے کرسیاں، ڈھالنے کی چیزیں، تختہ سیاہ کے لیے سٹینڈ، کتابوں کی الماریاں، درازیں، بنچ، زینے۔ آٹا گوندھنے کی تغاریاں (کیونکہ ہم اسکول میں روٹیاں پکاتے ہیں) ایک خرگوش خانہ، ایک مرغ خانہ، اور کتے خانہ اور فاختہ خانہ بنائے، انھوں نے ایک گاے کے لیے بھی ایک سائبان بنایا تھا جو ایک بڑا کام تھا۔ جس کی تفصیل عنقریب دیجائے گی مجھے ان کاموں کو نہ بھولنا چاہیے جو وہ باہر میدان، پائیں باغ، اور پھول باغ میں کرتے ہیں۔ باقی چیزیں مجھے یاد نہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں ایک لمبی اور غیر دلچسپ فہرست گنانے سے احتراز کرتا ہوں۔

لیکن اس مضمون میں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ہمارے طلبا کا ارادہ تھا کہ مدرسہ کی نئی عمارتوں، رہنے کے مکانات اور پڑھائی کے کمرے، دونوں کے لیے باقاعدہ نقشہ تیار کریں۔ ان میں سے ہر ایک کے بعض خاص خاص خیالات تھے اور مجھے معلوم ہے کہ جس معمار سے اُنھوں نے کئی مرتبہ مشورہ کیا تھا وہ ان کے بعض شگفتہ خیالات سے بہت متاثر ہوا تھا۔

ہماری دستکاری کا صرف یہی مقصد نہیں کہ اسکول کی زندگی کی معاشرتی ضروریات کو پورا کریں۔ بلکہ اس سے یہ بھی مطلب ہو کہ بچہ کی ذاتی ضروریات پوری ہوں۔ اس کی خواہش تعمیر، خواہش تخییل، اور تخلیق کی تشفی ہو۔ اور خیال آرائی اور ایجاد کی آرزو پوری ہو۔ اس غرض سے، طالب علم کو علاوہ اپنے آزاد وقت کو حسب مرضی بسر کرنے کے، اجازت ہے کہ وہ ہفتہ میں دستکاری کے ۸ گھنٹوں میں سے ایک اپنی پسند کے کاموں میں صرف کرے اگر دستکاری کے یہ معنی سمجھے جائیں اور اس کو اسی طرح عمل میں لایا جائے تو اس سے ایک نہایت اہم تعلیمی غرض پوری ہوتی ہے۔ جس کا پورا مفہوم آپ کی سمجھ میں اس وقت آئے گا۔ جب میں یہ بتا چکوں گا کہ زراعتی کام اس مقصد کے لیے کسقدر مفید ثابت ہوتا ہے۔

کاشتکاری

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، مدرسے کی زمین چودہ ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے پاس اتنی کافی زمین ہے کہ بہت سی کھانے کی چیزیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ سائنس کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے لیے کاشتکاری ایک عمدہ اور وسیع سرچشمہ ہے اور اس کے عملی اطلاق کے لیے ایک میدان، وہ بچوں کی جسمانی نشو و نما کا ایک ذریعہ ہے، اور علاوہ ان تمام چیزوں کے ان کی معاشرتی تربیت کے لیے بھی ایک بہترین آلہ ہے۔ اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ یہ ان کی اخلاقی تعلیم کا ایک ذریعہ بھی ہے، کیونکہ میرے خیال میں اخلاق اور معاشرت جدا نہیں ہو سکتے اس کی وجہ سے نہ صرف بچوں کا تعارف عملی زندگی سے بسہولت ہو جاتا ہے۔ بلکہ ان کو ایک باقاعدہ اور منتظم معاشرتی زندگی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

چھوٹے بچے زیادہ تر باغبانی، اور جانوروں کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اس نگہداشت کے ضمن میں وہ حیوانوں کی زندگی، اور رسوم و عادات کے متعلق دلچسپ مشاہدات اور موازنہ

کرتے ہیں۔ اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ہماری کیا کیا خدمت کرتے ہیں۔ جو بچہ کسی ایک جانور کی نگرانی کرتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خاص وقتوں میں اس کا کام کرے۔ اور اس کی وجہ سے اُن عادات کی نظم و ابتدا ہوتی ہے جو بذاتِ خود بہت معمولی ہیں لیکن نہایت اہم عادات کی بنیاد ہیں۔ بچے کے اِس شوق کو اپنی ابتدا بنا کر جو اُسے ان فرائض کے پورا کرنے میں ہوتا ہے ہم اس کی قوت توجہ اور قوتِ ارادی کی تربیت کرتے ہیں۔ اور ذمہ داری کی حس کو جو زندگی میں اس قدر ضروری ہے پیدا کرتے ہیں۔

چھوٹے طلبا مرغیوں، کتوں، کبوتروں، خرگوشوں، اور پانی اور خشکی کے مختلف جانوروں کی نگہداشت کرتے ہیں جن میں ہر قسم کی مچھلیاں بھی شامل ہیں۔ جانوروں کی اس آبادی سے جو دنیا کی ابتدائی اور قدیم طاقتوں سے اس درجہ مشابہ ہے، جس کی زندگی حیوانی اور جبلتی ہے، بچے کو انتہائی دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ وہ رنگین اور حرکت کرنے والی چیزوں سے خوش ہوتا ہے۔ ہر ہفتہ چھوٹے بچے جلسہ کرتے ہیں۔ اور اس محکمہ کے فرائض آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ان فرائض کا تعلق محض جانوروں کی خوراک کی فراہمی اور تیاری ہی سے نہیں بلکہ ان میں ان کے پنجروں وغیرہ کی صفائی بھی شامل ہے۔ اس میں بچوں کو قوت فکر کی ضرورت ہے۔

جہاں تک باغبانی کا تعلق ہے، چھوٹے بچے باغ کی پٹریوں، روشوں، چمن اور جنگل کو درست رکھتے ہیں اور اپنی اپنی کیاریوں میں ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں، درختوں کی پرورش کرتے ہیں اور ترکاریوں کو اُتارتے ہیں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے پھولوں کے تختے لگاتے ہیں۔ میں چند سطریں اس مضمون سے نقل کرتا ہوں جو بچوں نے اسکول میگزین کے حصہ "اخبار و کوائف" میں لکھا تھا۔

ہماری نیچرل ہسٹری سوسائٹی نے جہاں تک ممکن ہوا باقاعدگی سے جلسے کیے ہیں۔ گذشتہ بزم میں اس نے باغ کی آراستگی کا کام کیا۔ ہر ممبر کے پاس ایک ایک کیاری [illegible] اور ہر ایک نے اس کی کاشت کے لیے اپنی تجویزیں [illegible] کے سامنے پیش کیں۔ ہم نے ان [illegible] کی اور ان کی

تکمیل کی۔ یہ تجاویز کیاریوں کی شکل، اور پھولوں کے انتخاب اور ان کو لگانے کے متعلق تھیں۔ کئی تجویزیں کی گئیں۔ اور بہت سی کیاریاں شکل و رنگ دونوں کے اعتبار سے بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ ایک دس برس کے بچے نے اپنے باغ کا یہ سیدھا سادھا حال بیان کیا ہے۔

"میرا باغ ؟ بنگلہ کے قریب ہے میں نے اس میں "نستورتیم" اور سورج مکھی کے پودے لگائے تھے۔ اور اب نیلوفر، گلِ داؤدی، اور "لنڈن پرائڈ" بھی لگا دیئے ہیں۔ میرا باغ تکونا ہے۔ اور اسی میں گلاب کے پھول لگے ہیں۔ اِس کے چاروں طرف بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے ہیں یہ بہت خوبصورت ہے اور ہر چیز اچھی طرح اُگ رہی ہے۔ لیکن یہ بہت بری بات ہے کہ لوگ اُس گھاس پر چلتے ہیں جو میں نے، سوسن کی قطار کے قریب بوئی ہے سوسن میں پھول لگے ہیں، وہ تین قسم کے ہیں، سفید اور دو رنگ کے سبزی مائل۔ میں ہر شام کو اپنے پھولوں میں پانی دیتا ہوں۔"

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ہم باغبانی کے کام سے مختلف مضامین، مثلاً علم نباتات، علم الارض اور طبیعیات، علم موسم، جغرافیہ، جیومیٹری وغیرہ پڑھانے میں کتنا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ مذاق کی تربیت اور طبیعت میں استقلال پیدا کرنے میں بہت فائدہ مند ہوتا ہے، اور اُس حسن شناسی کے لیے، جو صرف فطرت ہی پیدا کر سکتی ہے، اپنی سب سے زیادہ سادہ سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ روشن چیزوں کے ذریعہ سے، یعنی درخت اور پھول۔ کیونکہ میں نے "نیچرل ہسٹری سوسائٹی" کا ذکر کیا ہے اس لیے میں یہ بھی بیان کئے دیتا ہوں کہ اس سوسائٹی کی بدولت ہمارے اسکول کے درختوں کی فہرست تیار ہوئی۔ اس فہرست میں ساٹھ قسم کے درخت شامل ہیں۔ اور ایک نقشہ ہے جس میں ان کے، پھولنے پھلنے، اور پتیاں گرنے کا حال دکھایا ہے۔ اس نقشہ کی اہمیت ظاہر ہے۔ اس کی وجہ سے ہم درختوں اور ان کے گرد و نواح کا تعلق، اور روشنی، حرارت، زمین، دھوپ اور ہوا وغیرہ کا اثر بخوبی سمجھ گئے ہیں۔ یہ کام زیادہ تر اوسط عمر کے طلبا کا ہے لیکن ان کے ساتھ کم عمر کے طلبا بھی شامل تھے۔

(ب) ظاہر ہے کہ بڑے طالب علم اور اوسط عمر کے طالبعلم دونوں اس سے زیادہ کاشت کا کام کر سکتے ہیں۔ ایسا کام جس کا تعلق صریحاً اخلاقی اور معاشرتی مسائل سے ہو۔ ان کے حصہ میں اس فرض کی محنت اور مسرت آئی ہے کہ اسکول کی زمین میں کاشت کریں۔ انہوں نے اس سے فائدہ اُٹھانے کا ذمہ ایسی حالت میں لیا ہے جن کو تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اور بہترین صورت یہی ہے کہ میں اُنہیں کے الفاظ نقل کر دوں۔ ایک طالبعلم اس طرح رقم طراز ہے۔

"جوں ہی اسکول کھلا، کھیت کی بنیاد، ڈالنے کے لیئے تجاویز بنائی گئیں۔ طویل مباحثے رہے، کیونکہ ہم سب اس مسئلہ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہم بہت سے جانور لینا اور ان کو پالنا چاہتے تھے۔ چودہ ایکڑ زمین تھی۔ اور پیداوار کو بہترین قیمت پر فروخت کرنے کا خیال تھا۔

نقشہ کشی کی جماعت میں ہم نے باغ کے اس حصہ کی پیمائش کا ارادہ کیا جہاں کھیت کی عمارتیں بنانے کی تجویز تھی۔ اس وسیع باغ کے بہت سے حصوں کی ہم نے مکمل پیمائش کی۔ لیکن تعمیر شروع کرنے سے پہلے ہم کئی وجوہ سے بہت عرصہ تک مذبذب رہے۔ ان میں سے صرف چند بڑے وجوہ قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ منتخب کردہ مقامات مرطوب ہونے کی وجہ سے ناقابل اطمینان قرار دیئے گئے۔ دوسرے یہ کہ وہ اسکول کی عمارت سے اس قدر دور تھے کہ بڑے موسم میں وہاں تک جانا مشکل ہوتا۔ طویل مباحثے رہے لیکن آخر کار اخیر دسمبر میں تجویز منظور کی گئی۔ اور ایک مناسب مقام طے کرکے بنیادیں ڈالنی شروع ہوگئیں۔

ہر طالب علم نے ایک عمدہ نقشہ تیار کیا تھا۔ جو بالکل باقاعدہ اور نقشہ کشی کے اصولوں کے موافق تھا۔

گاؤخانہ میں صرف دو گایوں کی گنجائش رکھی گئی تھی کیونکہ ملحقہ مکانات میں دوسرے جانوروں کے لیے کافی جگہ تھی۔ اگرچہ بنیادیں خاصی گہری تھیں لیکن وہ جلد ہی کھود دی گئیں۔ کیونکہ

موسم موزوں تھا۔ اب ہمیں لکڑھارا بننا پڑا۔ کیونکہ ایک بڑا "چیری" کا درخت راستہ میں حائل تھا اور اس کو کاٹنا تھا۔ کئی گھنٹہ تک ہم باری باری آری چلاتے رہے۔ پھر ہم نے دیواریں بنانی شروع کیں اینٹیں لگانے والے کی نگرانی میں جو اسکول کا ملازم بھی ہے، ہم نے کرنی کا استعمال سیکھا۔ صنّاعوں اور مزدوروں کی کمی نہ تھی۔ سب نے اس کام میں مدد دی، خصوصًا خالی گھنٹوں میں ... جب عمارت تیار ہو رہی تھی تو یہ تجویز کی گئی کہ ہم زمین کی کاشت اور پیداوار کی فروخت کے لیے ایک کمپنی قائم کریں۔ اس کے ممبر حصے خریدیں گے اور حصوں کی تعداد کے تناسب سے منافع تقسیم ہوگا۔ اس تجویز کا بہت جوش سے استقبال کیا گیا۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس قسم کی کمپنی بنائی جائے۔ فاریا صاحب نے کہا "یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ جاؤ، کسی قانون داں سے مشورہ کرو۔ اس قسم کے معاملات میں صلاح دینا اس کا کام ہے۔ وہ تم کو ٹھیک راہ پر لگا دیگا" اس تجویز کی تکمیل کا اب زمانہ آگیا تھا۔ ایک دوست کی مشفقانہ وساطت سے ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ اور ہم میں سے بڑی عمر کے تین طالبعلم وکیل سے مشورہ کرنے برسلز گئے۔ ایک گھنٹہ تک مشورہ ہوتا رہا۔ اس عرصہ میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس قسم کی کمپنیاں کس طرح چلائی جاتی ہیں۔ کس کس قسم کی کمپنیاں ہوتی ہیں۔ اور ہمارے مقصد کے لیے کس قسم کی کمپنی سب سے زیادہ موزوں ہوگی۔ اگلے روز کے جلسے میں ہم نے اپنی سفارت کے نتائج بیان کئے اور باتفاق رائے ایک "انجمن امداد باہمی" قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ فاریا صاحب اور تمام بڑے چھوٹے طلبا اس کے ممبر ہیں۔ اسی اثنا میں عمارات جلد جلد مکمل ہوتی جاتی ہیں۔ کیونکہ اب ہم اینٹیں جمانے اور دیواروں کے کونے بنانے میں مشاق ہوتے چلے ہیں۔ دوسری ٹرم میں ہم نے وہ گائے خانہ مکمل کرلیا جو بریجیس کی اسکول کی زندگی میں اس قدر اہم حصہ لے گا"

میگزین کے ایک اگلے نمبر میں یہ اطلاع ملتی ہے۔

"انجمن کاشتکاری" نے دوسری ٹرم میں نمایاں ترقی کی ہے۔ اگرچہ ٹرم چھوٹی تھی

لیکن کھیت کی عمارتیں بسرعت بڑھ رہی تھیں۔کرسمس کی چھٹیوں سے واپس آتے ہی ہم نے مستعدی سے کام شروع کر دیا۔اور ایک مہینہ کے اندر اندر دیواریں مکمل ہوگئیں۔اب چھت کی باری آئی اور کھپریل کے آتے تک لکڑی کا کام پورا ہو گیا "۔

(میں قطع کلام کرکے یہ بتا دوں کہ سامان تعمیر کی خرید و فروخت خود نوجوان طلبا نے کی۔ انہوں نے باقاعدہ اس مسئلہ کا مطالعہ کیا اور قیمتوں کو اسی طرح چکایا جس طرح بڑے آدمی کرتے ہیں)" اب اندر کا فرش بنانا، کھڑکیوں کے چوکھٹے اور دروازے تیار کرنا باقی رہا۔ کچھ لڑکے تو لکڑی کے کام میں مشغول رہے (کیونکہ دروازے اور کھڑکیوں کے چوکھٹے بھی ہم نے اسکول میں بنائے تھے) اور باقی فرش بنانے میں مصروف ہو گئے۔اسکول کے صحن میں ایک بڑا سا پتھر کا "ناند" تھا۔سب بڑے طلبا نے مل کر اس کو گائے خانہ میں لیجانے کا انتظام کیا۔اس میں کئی گھنٹے گئے کیونکہ زمین پھسلواں تھی اور ناند بہت بھاری تھا آخر کار ہمارا کام ختم ہو گیا اور اس کے دوران میں ہمیں ان اصولوں سے کام لینے کا موقع ملا جو ہم نے 'طبیعیات' کی جماعت میں پڑھے تھے۔ناند کو سمنٹ کے ذریعہ اس جگہ پر لگا دیا گیا اور اینٹوں کی ایک دوسری ناند بنائی گئی۔اخیر میں ہمیں گائے خانے میں سفیدی کرنی پڑی اب کام مکمل ہو گیا اور صرف بال کھاد کے لیے گڑھا اور کوڑے کے ڈھیر کے لئے جگہ بنانی رہ گئی (میں آپ کی توجہ پھر اس جانب مبذول کراتا ہوں کہ یہ سب کام طلبا نے بغیر کسی بیرونی مدد کے کیا)"۔

" گرما کے دوران میں اس امر پر بحث ہوتی رہی کہ ہم کن کن جانوروں کو پالیں۔ معاملہ کسی قدر پیچیدہ تھا۔کیونکہ چھٹیاں اس وقت شروع ہوتی جب ہمیں کھیتوں میں کام کرنے کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔اس لیے صرف تھوڑے ہی سے جانور رکھنا ممکن تھا۔علاوہ بریں ہمارا سرمایہ زیادہ نہیں تھا۔اس لیے بھی یہی مناسب سمجھا گیا کہ اپنے ارادوں میں کفایت ملحوظ رکھیں۔

(اس وقت سے سوسائٹی بڑھ گئی ہے، اور گذشتہ سال سرمایہ جو ۲۵ پچیس پچیس فرینک کے حصوں کی شکل میں تھا، دو ہزار فرینک کے قریب تھا)

" ہمارے پاس ایک گائے ہو گی، ایک بکری، کچھ خرگوش، مرغیاں، کبوتر، مرغابیاں اور شہد کی مکھیاں۔ ایک گائے! یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا! وہ کس نسل کی ہونی چاہیئے؟ بلجیم کی یا انگلستان کی۔ ہم نے سارے مسئلہ کا مطالعہ کیا۔ تجربہ کار لوگوں سے رائے لی۔ معلوم ہوا کہ انگلستان کی گائیں زیادہ سستی اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ ان کو آسانی سے کھلایا، پلایا، اور پالا جا سکتا ہے اور ان کا دودھ زیادہ عمدہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے بچھڑے کم وزن ہوتے ہیں اور ان کے دام تھوڑے ملتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تبدیلی آب و ہوا سے ان کی خوبیوں میں کمی آجاتی ہے۔

بلجیم کی گائیں زیادہ دودھ دیتی ہیں۔ لیکن دودھ اچھا نہیں ہوتا۔ یہ زیادہ مہنگی اور بڑی ہوتی ہیں۔ اور زیادہ خوراک چاہتی ہیں۔ ان کو پالنا زیادہ مشکل ہے خصوصاً جب بچہ دینے کا زمانہ ہو۔ اس مسئلہ کے طے کرنے کے لیے ہم مشورہ لینے کے واسطے ایک فارم پر گئے جو بیس کیلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اور جہاں انگریزی گائیں پالی جاتی تھیں۔ کاشتکار نے ان کی بہت تعریف کی۔ اور ہم نے ایک انگریزی گائے خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔"

اب میں اور بہت سی تفصیلات ترک کرتا ہوں اور باقی مضمون کا خلاصہ یہاں دیتا ہوں "سوسائٹی نے بکری، مرغیاں، خرگوش، اور کبوتر خرید لیے۔ کھیت کے پہلے جانوروں میں ایک گائے اور دو سوروں کا اضافہ ہوا۔ ان جانوروں کو سوسائٹی کے ممبر خود کھلاتے اور پالتے ہیں جب ضرورت ہوتی ہے تو چارہ اور گھاس وغیرہ خریدتے ہیں۔ لیکن حتی الامکان اپنے ہی کھیت کی پیداوار کو کام میں لاتے ہیں۔

میں اپنی زراعتی سوسائٹی کے نظام کو مختصراً بیان کرتا ہوں۔

(۱) اس کی صورت ایک "انجمنِ امدادِ باہمی" کی ہے۔ ہر حصہ کی قیمت پچیس فرینک

ہے۔ تمام طلبا شامل ہیں۔ اور چونکہ ان کا اصرار تھا کہ میں اس میں شامل ہوں اس لیے میں بھی راضی ہو گیا۔ ان میں سے ایک جو آیندہ زراعت کا کام کرنا چاہتا ہے۔ زراعتی منیجر بنا دیا گیا ہے تاکہ کھیت کا کام کرے۔ اور پیداوار کے فروخت وغیرہ کا انتظام کرے۔ ایک کاروباری منیجر بھی ہے جو عام طور پر مالی معاملات کا نگراں ہے۔ رجسٹر اس کے پاس رہتا ہے۔ اس میں ہر روز تجارت اور حساب کتاب کا اُستاد کی نگرانی میں اندراج ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ طلبا جو کاروباری پیشہ کرنا چاہتے ہیں ایسی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں جو ان کے آیندہ کے پیشے میں عملی طور پر مدد دیتی ہے۔

(۲) ممبران سوسائٹی زیادہ تر بڑی اور اوسط عمر کے ہیں۔ وہ کاشت کرنے، ہل چلانے، کھاد ڈالنے، بیج بونے اور فصل کاٹنے کا تمام کام کرتے ہیں۔ جب ضرورت ہوتی ہے وہ باہر سے بھی مدد لیتے ہیں۔ کھیت میں مزدوروں کو کام پر لگاتے ہیں۔ جن کو وہ خود تلاش کرتے ہیں اور مزدوری دیتے ہیں۔ کھیتوں میں ہفتہ میں دو یا تین مرتبہ کام ہوتا ہے۔ بعض دفعہ صبح کو بعض دفعہ دوپہر جیسی موسم کی حالت ہو۔

گزشتہ سال گرمی کی ٹرم میں طلبا نے ہفتہ میں تین مرتبہ صبح کو پانچ بجے سے سات بجے تک کام کیا۔ یہ ان کی اپنی خواہش تھی۔ اور میں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا شرط یہ تھی کہ قیلولہ ملا کر وہ چوبیس گھنٹے میں سے نو گھنٹے کی نیند پوری کرلیں۔

طلبا اسی طرح جانور پالتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں چرنے کے لیے ان کو کھول دیتے ہیں اور رات کو تھان پر لے آتے ہیں۔ طلبا ہی گایوں وغیرہ کا دودھ نکالتے ہیں ہر ہفتہ یہ کام دو یا تین طلبا کے ایک گروہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

اس قسم کے مشاغل سے بچوں کو جدت، آزادی، ذمہ داری، برداشت اور ہمت کا سبق ملتا ہے۔ ایسا سبق جو وہ کبھی نہیں بھولتے۔ کس قدر عمدہ بات ہے کہ وہ یہ سمجھنے اور محسوس کرنے لگیں کہ ہر مہم کی کامیابی کے لیے ہر قسم کا کام، خواہ وہ کتنا ہی ناگوار اور

حقیر کیوں نہ ہو، کرنا پڑتا ہے۔ پھر وہ اکڑ نہیں کرتے، جھوٹی شیخی نہیں بگھارتے۔ کیونکہ اب انہیں کام اور کام کرنے والے کی وقعت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے، اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بچوں کے دل میں کام کی قدر بڑھانے سے زیادہ اچھی اور ضروری کوئی چیز نہیں۔ بچہ یہ سیکھتا ہے کہ ہاتھ کے کام کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ کھاد کے ڈھیر ہی سے پھول کی خوبصورتی اور رعنائی پیدا ہوتی ہے اور بہار دیتی ہے۔ باقی تمام زندگی بھر، اس کے دل و دماغ، ان لوگوں کے لیے جو مفید عام چیزیں بناتے یا قابل قدر کام کرتے ہیں یا اس میں مدد دیتے ہیں محبت، مہربانی، عزت اور انصاف کے جذبات سے بھرے رہتے ہیں۔ خواہ ان لوگوں کی دنیا میں کیسی ہی حیثیت ہو۔

(۳) سوسائٹی کے ممبر کھیت کے جانوروں اور پرندوں کے لیے گھر بناتے ہیں، ان کی مرمت کرتے ہیں، اور اس میں انتظام رکھتے ہیں۔ علاوہ اس مشہور گائے خانے کو بنانے کے اُنھوں نے مرغیوں کا ڈربہ، ان کے چوزوں کے لیے گھر، خرگوش خانہ، کبوتر خانہ، تازی خانہ پانی پینے کے لیے اینٹوں کی ناند، سوروں کا دڑبہ وغیرہ بنائے ہیں۔

(۴) اوائل اسکول ہی کھیت کی تمام پیداوار خرید سکتا تھا۔ لیکن پھر یہ کام اس قدر بڑھا کہ باہر سے خریدار تلاش کرنے کی ضرورت پڑی۔ باہر کے لوگوں کو سامان فروخت کرنے کے لیے انتظام ہو رہا تھا۔ اگر جنگ شروع نہ ہو جاتی تو یقیناً یہ کام اتنا پھیل جاتا کہ اس سے ہمارے طلبا کے اس زراعتی کاروبار کی اصلی، معاشرتی نوعیت معلوم ہو جاتی جس زمانہ میں یہ توسیع زور ضرور عمل میں آ جاتی، درمیان میں تھی، دودھ، مکھن، انڈے، اور سوسائٹی کی اور تمام پیداوار اسکول ہی خریدتا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اتفاق و یک جہتی کا کوئی سبق اس سے زیادہ مؤثر پر زور، اور دل پذیر ہو سکتا ہے جتنی یہ دوستانہ زندگی جس میں سب مل کر اپنی چھوٹی سی جماعت کے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں۔

انجمن کاشتکاری جس میں خود اختیاری حکومت اور امداد باہمی شامل ہیں، طلبا کو عملی

اور معاشرتی زندگی سے روشناس کراتی ہے۔ یہ تعارف اس آزادی اور ذمہ داری کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جو ہر ممبر کو حاصل ہے اور اس نظم و انتظام کے تجربے کے ذریعہ جو وہ ان کے لیے بہم پہنچاتی ہے تازہ ہوا، کھلی جگہ، آزادی، ایک صحت افزا اور فرحت بخش ماحول، مختلف قسم کی دلچسپ جسمانی ورزشیں اور ہاتھ کا کام یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو بچے کی نشو و نما کے لیے موثر ہیں تمام لوگ جنہوں نے ہمارے اسکول کا معائنہ کیا ہے جن میں دوست اور عزیز سب شامل ہیں ہمارے طلبا کی زندگی سے متاثر ہوئے ہیں کیونکہ اس میں ایک مخصوص سکون اور اعتماد نفس اور خوشگوار امن و امان کی فضا پائی جاتی ہے۔

آپ اب ضرور اس بات کو سمجھ گئے ہونگے کہ تمام جسمانی مشاغل علمی، اخلاقی، اور معاشرتی نشو و نما میں کس حد تک معین ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ اس قسم کی جسمانی تعلیم جس کا ذکر میں نے کیا ہے بچے کے دل و دماغ اور اس کی سیرت کی تربیت کے لیے بہترین، موثر ترین اور مکمل ترین ذریعہ ہے مجھے ہمیشہ اپنے اسکول کے ڈاکٹر کا وہ نعرۂ تحسین یاد رہے گا جب اس نے ایک روز بچوں کو قمیص اتارے، خوش خوش اور مستعدی سے کام میں مشغول دیکھا کر کہا تھا

"یہ بچے کیسے شاندار معلوم ہوتے ہیں"

صرف بیرسیس ہی ایسا مقام نہیں جہاں طلبا شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ یہی بات ان تمام مدارس جدیدہ کے متعلق کہی جا سکتی ہے جس میں ایک باقاعدہ جسمانی تربیت کو اخلاقی اور دماغی تربیت کا پیش خیمہ بنایا جاتا ہے۔

خواجہ غلام السیدین

تعلیم
اور
ظرافت

بیچارے معلموں کو اپنے پیشہ کی بدولت جو بیماریاں ہوجایا کرتی ہیں ان میں دماغ کی خشکی بھی ہے
آپ خیال تو کیجیے کہ جو شخص خود روز دس بجے سے چار بجے تک ناک بھوں چڑھائے آنکھیں نکالے
نہی عن المنکر کی صورت بنائے بیٹھا رہے ۔ اور آدمیوں کے بچوں کو مولویوں کی طرح "صمٌ بکمٌ" بنا کر بٹھائے
رکھے جو نہ خود ہنسے نہ دوسروں کو ہنسنے دے اس دماغ کا کیا حال ہوگا۔ معلم خشک کی حالت اصل میں زاہد
خشک سے زیادہ قابل رحم ہے۔ کیوں کہ زاہد تو دنیا کی دل چسپیوں کو سائنٹیفکیشن یا بدیسی کپڑا سمجھ کر سرے
سے بائیکاٹ کر چکا ہے لیکن معلم ان دل چسپیوں میں رہنے کے باوجود ان کا لطف اٹھانے سے محروم ہے
اس خشکی کے نتائج معلم کے لئے ہر پہلو سے برے ہیں۔ ایک تو بیچارے کو کاموں کی زیادتی
اور داموں کی کمی کے سبب سے یوں بھی لوگوں سے ملنا جلنا لطفِ صحبت اٹھانا کم نصیب ہوتا ہے
دوسرے اگر کبھی موقع بھی ملے تو اس کی صورت اور گفتگو سے لوگوں کے دلوں میں مکتب۔ میاں جی
آموختہ اور قمچی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ یا تو بچپن کے منجھے ہوئے بہانوں سے کام لے کر
فرار ہو جاتے ہیں یا پھر یہ کوشش کرتے ہیں کہ جو لطف اس کی باتوں اور صورت سے حاصل نہیں ہوتا
وہ اس کی ذات سے حاصل کریں۔

علاوہ اس کے زندہ دلی اور ظرافت سے جو مدد انسان کو زندگی کی پریشانیوں اور فکروں
کو دور کرنے میں ملتی ہے اس سے ہمارا معلم محروم رہتا ہے حالاں کہ اللہ جانتا ہے اس کی مصیبتیں
دوسروں کی مصیبت سے کم نہیں ہوتیں۔ بیوی، بچے، ضعف معدہ، قرض مختصر یہ ہے کہ ساری
بلائیں جو خدا کے نیک بندوں کو آ گھیرا کرتی ہیں اسے بھی گھیر لیتی ہیں بلکہ بعض آفتیں ایسی ہیں جو اس کی
ذات کے لئے مخصوص ہیں۔ مثلاً انسپکٹر کا معائنہ۔ شریر لڑکے۔ ناکامیاب طلبہ کے باپ وغیرہ وغیرہ

ایسی صورت میں جو چیز افیون، شطرنج، فلسفہ سے کہیں زیادہ غم غلط کرنے میں مدد دیتی ہے یعنی ظرافت اُس کا نہ ہونا بڑی بدنصیبی ہے۔ مصیبت کے دور کرنے کی بہترین تدبیر مصیبت کو خفیف سمجھنا ہے۔ جو لوگ رنج وغم کی حالت میں "ہنسی مذاق" کی ہمت رکھتے ہیں ان کا رنج ایسا خفیف ہو کر بھاگتا ہے جیسے مرکب بینی کے سر سے سینگ۔ مگر غریب معلم جس کے ابرو پر بل اور پیشانی پر شکن کا ہونا اسی قدر لازمی سمجھا جاتا ہے جیسے پٹواری کی بغل میں بستہ اور کان میں قلم اس کیمیائے ہستی سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

معلم میں ظرافت کی کمی اور متانت کی زیادتی سے خود اس کو جو نقصان پہونچتا ہے اس سے کہیں زیادہ مضر اثر طالب علموں پر پڑتا ہے۔ بچے اور نوجوان جو گھر کا سکھ چین چھوڑ کر زندگی کی کٹھن سفر کی تیاری کے لئے مدرسے میں آتے ہیں۔ انھیں پہلے ہی قدم پر ایک مجسم مارشل لا سے سابقہ پڑے تو ان کے دل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ جہاں ڈر بیٹھا تو سمجھئے کہ دل کی بیدگی اور آزاد نشو و نما رخصت ہوئی۔ یہ عمر کھیل اور کام" سادگی و پرکاری بے خودی و ہوشیاری کی درمیانی منزل ہے اور ان انضداد کی ترکیب جیسی صحیح ظرافت میں ہوتی ہے اور کسی چیز میں ناممکن ہے اگر اس کا استعمال صحیح اور احتیاط کے ساتھ کیا جائے تو نوجوان زندگی کا بوجھ ہنستے کھیلتے اٹھا لیتے ہیں تعلیم کا یہ اہم ترین مسئلہ باتوں باتوں میں حل ہو جاتا ہے

جاننے والے جانتے ہیں کہ چودہ سے بیس برس تک کی عمر والے نوجوانوں کا دل شیشہ کی طرح نازک ہوتا ہے۔ اور اگر اسے بے احتیاطی سے ٹھیس لگ جائے تو پھر اس کا جوڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اگر اس عمر کے لڑکوں کو تنبیہ کی ضرورت ہو تو بہترین ترکیب یہ ہے کہ ان پر ظرافت کے پھولوں کی چھڑی سے محبت کی مار پڑے جس کے ذریعہ سے اکبر مرحوم اکثر امتِ مرحومہ کی مرمت کیا کرتے تھے۔ مگر عموماً ہمارے کڑی طبیعت اور بھاری ہاتھ کے معلم کو اس "تازیانۂ گل" کے استعمال کا سلیقہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی جگہ وہ موقع بے موقع ملامت کے ہتوڑے سے کام لیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو شیشہ بیچ میں سے یکنا چور ہو جاتا ہے

یا پٹتے پٹتے پتھر بن کر رہ جاتا ہے۔

اخلاقی تربیت کے علاوہ ظرافت سے خشک مضامین کو دل چسپ بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے نفسیات تعلیم میں یہ ایک مانی ہوئی بات ہے اور نفسیات پر کیا موقوف ہے عقل بھی یہی کہتی ہے کہ بچوں کو جس چیز سے دلچسپی ہوگی اُسے غور سے سنیں گے۔ اور جب غور سے سنیں گے تو وہ ان کے دل میں اتر جائے گی اور حافظہ میں محفوظ رہے گی۔ ہر معلم کو اور خصوصاً ریاضی، منطق، فلسفہ کے معلم کو اکثر یہ موقعہ پیش آتا ہے کہ کسی پیچیدہ یا خشک مسئلہ کو سمجھاتے سمجھاتے وہ "بخور د مغز حریفاں و حلق خود بدرید" کی منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی زبان اور سننے والوں کے کان جواب دے دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اونگھنا لازمی ہے اور متعدی بھی۔ دم بھر میں دونوں جانب یہ نقشہ نظر آتا ہے کہ آنکھیں آدھی کھلی اور آدھی بند، اور سر مراقبہ میں جھکا ہوا ہے اور جمائیوں کی ڈاک تنہا خبر رسانی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس طلسم نیم خوابی کو جھلا اور بدمزاج معلم اس طرح توڑتا ہے کہ خود اپنے اور ساری جماعت کے برم غنودگی کی سزا میں کسی بدنصیب طالب علم کو جس کی آنکھ اتفاقاً ذرا زیادہ بند ہوگئی ہو، فرض کفایہ کے طور پر کان پکڑ کر جھنجوڑتا ہے اور تاکید مزید کے لئے دو چار چانٹے بھی رسید کرتا ہے۔ اس عمل سے ساری جماعت کی ظاہری آنکھ تو خود بخود کھل جاتی ہے مگر چشم ادراک بدستور سوتی رہتی ہے۔ برخلاف اس کے ظریف معلم ایسی صورت میں یا تو اسی موقعہ سے کوئی تازہ لطیفہ پیدا کر کے یا کوئی مذاق کا قصہ جو وقت کے مناسب ہو سنا کر ہنسی کا ایسا چھینٹا دیتا ہے کہ سوتا ہوا ذہن فوراً بیدار ہو جاتا ہے۔ اب ادراک اور حافظہ کا منھ گھونگے کی طرح کھل جاتا ہے اور علمی مسائل آب نیساں کے قطروں کی طرح اس کے حلق سے اتر جاتے ہیں۔

مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بہت سی مفید چیزوں کی طرح ظرافت بھی غلط استعمال سے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ ظرافت میں سب سے بڑا خطرہ تو یہی ہے کہ کہیں یہ حد سے گزر کر اور معیار سے گر کر مسخرا پن نہ بن جائے۔ مسخرے پن اور ظرافت کا فرق اگر رتن ناتھ سرشار سے پوچھا جاتا۔

تو وہ یہی کہتے کہ وہی جو "ٹھرّے" اور "ولایتی" میں ہے۔

مذاق میں جب تک زبان کی شائستگی، خیالات کی لطافت، موقع کی مناسبت کا خیال رکھا جائے اس وقت تک وہ ظرافت ہے۔ لیکن جہاں بازاری الفاظ، بھدے اور فحش خیالات کا دخل ہوا، یا تناسب اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو وہ مسخرا پن بن جاتا ہے۔ اور اس کا استعمال معلم کے لئے قانون اخلاق کی رو سے بالکل ممنوع ہے۔ جماعت میں مدرس ایسے خواب آفریں موقعوں پر جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یا کسی شریر لڑکے [illegible] یا کسی شرمیلے اور دبو لڑکے کی ہمت افزائی کے لئے کبھی کبھی ہنسی مذاق سے کام لے سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ بات بات پر پھبتی، قدم قدم پر قہقہہ، حافظ کا ایک شعر پڑھا اور ہنسی کے مارے لیٹ گئے۔ جمعہ کب کا [illegible] بورڈ پر لکھا اور رشتہ خطی ہو گئے۔ اس طرح ایک تو استاد کا رعب [illegible] ہیں [illegible] شریف [illegible] کو بھی ایک حد تک اپنا رعب قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے بچے ہنسی میں اتنے [illegible] ہیں [illegible] کی طرف نہیں بلکہ توجہ نہیں رہتی

پھر اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بھی [illegible] معلم [illegible] یہ جائز نہیں کہ نوجوان ذہن کو دنیا کی تصویر ضرورت سے زیادہ مہیب دکھائے وہاں یہ بھی [illegible] ہے کہ وہ ان کے سامنے زندگی کو "خالہ جی کے گھر" کی صورت میں پیش کرے۔ یا کسی [illegible] پیش کرے۔ جہاں انسان اصول تقویم کے خلاف دن کو عید رات کو شب برات [illegible] کی [illegible] سے آزاد ہوتا ہے۔ ہنسی دل لگی کی زیادتی انسان میں دنائت کو بھی پیدا کرتی ہے [illegible] چھوڑ دیتا ہے۔ اور ہر بات کو مذاق میں ٹالنا چاہتا ہے۔

ظرافت سے پورا تعلیمی فائدہ اٹھانے کے لئے نیک [illegible] معلم کو اس بات کا پورا احساس ہونا چاہئے کہ اس کے ہاتھ میں آپ بڑی قوت ہے۔ جسے وہ ایمانداری کے ساتھ طلبہ کی بہبود کے لئے استعمال کرنے کا پابند ہے۔ محض ذاتی جانبداری یا مخالفت کرنے کے لئے [illegible] کے [illegible] کے واسطے بچوں کو نشانہ ظرافت بنانا بڑے کمینہ پن کی بات [illegible] کا خیال رکھتے ہوئے اگر معلم ظرافت سے کام لے تو یقین ہے کہ وہ بچوں کے لئے بہترین ناصح اور رفیق ثابت ہوگا۔ خود سودا وی امراض [illegible] کی شہادت [illegible] رکھتا [illegible] اپنے دستوں کے لئے [illegible] ثابت ہوگا۔

اقتباسات

جلسہ تقسیم اسناد کلکتہ یونیورسٹی

خطبہ صدارت
جادو ناتھ سرکار صاحب

صوبہ بنگال میں درجہ بندی کی تعلیم یونیورسٹی میں نہیں بلکہ کالجوں میں دی جاتی ہے۔ یہ کالج تین طرح کے ہیں سرکاری، مشنری، پرائوٹ۔ کلکتہ میں علاوہ سات سرکاری کالجوں، پانچ مشن کالجوں اور ایک اعانتی کالج کے پانچ پرائوٹ کالج ہیں۔ غیر سرکاری کالجوں کو پبلک کی طرف سے ایک لاکھ انتیس ہزار روپیہ سالانہ امداد ملتی ہے . . . . . .

. . . . میں بہت خوشی کے ساتھ اپنے خطبہ کے آخر میں ان کارگذاریوں کی فہرست دیتا ہوں جو سال گذشتہ یونیورسٹی کے اساتذہ نے آرٹ اور سائنس کے متعلق جدید تحقیقات کرنے میں دکھائی ہیں ان کی یہ جد وجہد وسعت اور تنوع کے لحاظ سے غیر معمولی ہے اور میری درخواست ہے کہ جیسے ہی ہمارے ملک کی فضا سے برقی حرارت کا اثر کم ہو اور عوام کے جوش اور ان کی بےسر و پا امیدوں کی شدید آندھیاں رکیں حکومت بنگال اور مجلس مقننہ کو چاہیئے کہ وہ یونیورسٹی کے پوسٹ گریجوایٹ شعبہ کے ضروری اخراجات کے لیے ایک یک مشت رقم منظور کر کے اسے مستقل بنیاد پر قائم کر دے جیسا دوسری یونیورسٹیاں کرتی ہیں۔ . . . . . .

آج کا دن سال میں وہ دن ہے جب ہمیں خود بخود یہ خیال آتا ہے کہ بہ ہئیت اجتماعی ہمارا فرض کیا ہے اور قضا و قدر نے ہمارے سپرد کیا کام کیا ہے . . . .

ہر مہذب ملک میں عموماً یونیورسٹیاں رائے عامہ کے رہنماؤں اور قومی کشتی کے ناخداؤں کا گہوارہ

ہوا کی ہیں . . . . . لیکن اسی کے ساتھ یونیورسٹیوں سے بڑھ کر کوئی قوت جمہوریت کی حامی نہیں . . . . . اگر جمہوریت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قابل آدمیوں کے لیے ترقی کا راستہ کھول دیتی ہے تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ہماری یونیورسٹیوں نے اس مقصد کے حاصل کرنے میں ملک کے دوسرے اداروں سے کہیں زیادہ مدد کی ہے . . . . . .
لیکن اُن ذہنی سرداروں کو جنھیں یونیورسٹی ڈھونڈ کر نکالتی ہے، اور تربیت دے کر وسیع بیرونی دنیا میں بھیجتی ہے یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ سرداری کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں اور یونیورسٹی کے بہترین فرزندوں پر یہ فرض ہے کہ اس ادارے کی جس کی بدولت انھیں سب کچھ حاصل ہوا ہے اور اس قوم کی جس کے وہ قائد ہیں خدمت کریں۔

ہر تہذیب کا بنیادی اصول ترقی ہے . . . . . . ایک قابل نوجوان کے لیئے یہ کافی نہیں کہ وہ اپنی قدرتی صلاحیتوں کی انتہائی تربیت کرے۔ رائے عامہ کے قدرتی رہنما کی حیثیت سے اس پر یونیورسٹی کا اور ملک کا یہ حق ہے کہ وہ نوع انسانی کی ترقی میں اپنی سی کوشش کرے . . . . . اگر ہم اپنے اس اعلیٰ فرض کو پورا کرنا چاہتے ہیں اگر قابل ترین ہندوستانی دنیا کے ذہنی قائدوں کے پہلو بہ پہلو جگہ لینا چاہتے ہیں تو یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنی علمی کوششوں میں اشتراک عمل پیدا کریں . . . . اور اپنے فضلا کو موقع دیں کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں حق کے جویا جو جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس سے واقف ہوں اور اُس میں شرکت کریں۔
اگر ہماری یونیورسٹی اپنے فرائض بخوبی انجام دے تو نہ صرف رائے عامہ کے قائد بلکہ مادر یونیورسٹی کے ہر فرزند میں ایک خاص ذہنی ضبط و انضباط پایا جائے گا۔ اس کی سیرت میں یہ بات نظر آئے گی کہ اس کے اوسان ٹھکانے رہتے ہیں اور اس کا دائرۂ نگاہ وسیع ہے۔ وہ عوام کے وقتی شور و غل سے متاثر نہ ہوگا۔ وہ اپنی عقل کی واضح روشنی کو ان کوششوں سے جو اس کے جذبات کو ابھارنے کے لیے کی جاتی ہیں دھندلا نہ ہونے دیگا۔ وہ دانستہ

کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کی نظر ہمیشہ اہم اور پائدار چیزوں پر جمی رہے گی۔ ۔ ۔ ۔

اقتصادیات میں یہ ایک پیش پا افتادہ بات ہے کہ کچی عمر کے لڑکوں سے کارخانوں میں کام لینا نہ صرف اُن کی صحت کے لیے مضر ہے۔ بلکہ اس کے سبب سے بڑی عمر کے مزدوروں کی کوئی عمدہ جماعت بھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اسی طرح جو نوجوان حب وطن کے شریف جذبہ کے اثر سے اپنی تعلیم یا عملی تربیت کو نامکمل چھوڑ دیتے ہیں انھیں یقیناً سکون کے لمحوں میں اس بات کا احساس ہوگا کہ وہ مادر وطن کے مندر پر نامکمل جسم، خام ذہن، سطحی قابلیت اور غیر منضبط ارادہ کی نذر چڑھا رہے ہیں اور یہ اُس کی خدمت میں بڑی بے ادبی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس
خطبہ صدارت شیخ سر عبدالقادر

میں آپ کی خدمت میں اپنا دلی شکریہ پیش کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لیے دعوت دی اور میری عزّت افزائی فرمائی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

صاحبان۔ کچھ عرصہ سے بعض لوگوں کی رائے کا یہ میلان ہے کہ اب اس تعلیمی کانفرنس کی بہ حیثیت ایک ایسی جماعت کے جو سارے ہندوستان کی تعلیمی ترقی کی علم بردار ہو ضرورت نہیں ہے کہا جاتا ہے کہ وہ پرزور مخالفت جو ایک زمانے میں تعلیم جدید اور انگریزی پڑھنے سے متعلق تھی اب باقی نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ میں ان حضرات سے جو یہ رائے رکھتے ہیں بہ ادب اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ گو یہ درست ہے کہ تعلیم جدید کے خلاف جو تعصب تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ ملک کے کئی حصّوں میں یہ تعصب اب تک موجود ہے اور خصوصاً اُن علاقوں میں زوردار ہے جہاں ان صاحبوں کا زیادہ اثر ہے جو مولویت کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

میں گذشتہ اجلاس منعقدہ مدراس میں جو ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا شریک تھا۔ اس صوبہ میں وہ جلسہ مسئلہ تعلیم کے حل کرنے کا گویا آغاز تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے "انجمن تعلیم مسلمانان جنوبی ہند" کی بنیاد ڈالی اس کے بعد وقتاً فوقتاً آپ کی انجمن کے تعلیمی جلسے ہوتے رہے اور یہ انجمن مختلف قسم کے مفید کام سرانجام دیتی رہی۔ اس نے مسلمان طلبہ کو وظائف دینے کے لیے چندہ جمع کیا تاکہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اس نے کئی نئے مدرسے قائم کئے اور پہلی تعلیم گاہوں کو تقویت دی۔ ۔ ۔ ۔ آپ کی انجمن کا قیام اور اس کے قیام سے جو فوائد تعلیم مسلمانان جنوبی ہند کو پہونچے ہیں وہ کانفرنس کے مفید ہونے کی بہترین شہادت ہیں۔ ۔ ۔ مسئلہ تعلیم پر عام بحث کرتے ہوئے میں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ کم از کم ثانوی تعلیم میں چونکہ آپ معتدبہ ترقی کر چکے ہیں آپ کو اب سب سے پہلے تعلیم کی نوعیت میں ترقی کی فکر لازم ہے۔ ایک زمانہ تھا جب سمجھا جاتا تھا کہ نوشت و خواند اور حساب سے معمولی واقفیت اور تھوڑی سی انگریزی جاننا حصول روزگار کے لیے اچھا خاصہ ذریعہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب ایسا وقت آگیا ہے کہ آپ ایسی تعلیم پر قناعت نہ کریں جو سہی نوشت وخواند اور عام واقفیت کے ایک معمولی درجہ کی تحصیل پر ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ آپ کو چاہیئے کہ اپنے مدارس میں نصاب کو اس طرح بدلیں کہ طلبہ اپنی روزی آپ کمانے کے قابل ہو جائیں خواہ انھیں کوئی سرکاری ملازمت ملے یا نہ ملے۔ ۔ ۔ ۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم انھیں "کارآمد آدمی" بنائیں جو مدرسے سے گھر واپس جائیں تو پہلے ماں باپ کے گھر میں کارآمد ہوں۔ پھر جب اپنی علیحدہ زندگی شروع کریں تو اپنے گھروں کو آرام دہ اور خوبصورت بنائیں۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ بیشتر مدارس محکمہ تعلیم کے زیر اثر ہیں اور امداد کی شرائط اور تسلیم کئے جانے کے قواعد کے ہونے کے باعث کوئی ایسی ترقی نہیں کر سکتے جس پر محکمہ تعلیم اپنی مہر نہ ثبت کر دے۔ مگر ہم توقع رکھتے ہیں کہ محکمہ تعلیم کسی مناسب اصلاح کی مخالفت نہیں کرے گا۔ ۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ کسی قوم کے لیے کہ ایسی درسگاہیں

قائم کرنے کی ممانعت نہیں ہی جو حکومت کے اثر یا امداد کے بغیر چل سکیں اور اُن کے ذریعہ سے تعلیم کے جدید طریقوں کے مفید ہونے کا ثبوت دے۔

اعلیٰ تعلیم کی طرف آئیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں مسلمانوں کی حالت ثانوی تعلیم سے بھی زیادہ کمزور ہے ...... عام طور پر ان کے افلاس کو اس کا ذمہ دار خیال کیا جاتا ہے ..... مدت ہوئی تجربہ نے یہ ثابت کردیا تھا کہ نادار مگر ہوشیار مسلمان طلبہ کو وظائف دینا قوم کی تعلیم پورا کرنے کے لیے مفید ہے خود سرکار نے تعلیم مسلمانان کے لیے ابتدائی مراحل پر اس ذریعے سے کام لیا..... بعض سرکاری حلقوں میں یہ خیال موجود ہے کہ کسی ایک قوم کو خاص وظائف دینا دوسری قوموں کے افراد کے ساتھ ناانصافی ہے مگر مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ ہر حکومت کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ باشندگان ملک کا کوئی حصہ اگر ذہنی نشو و نما کے اعتبار سے پستی میں ہو، اور ترقی کی چلتی گاڑی میں روڑے کی طرح اٹکتا ہو تو اس کی ترقی کے لیے کوشش کرے...... مگر یہ یاد رہے کہ اگر گورنمنٹ آپ کے دعوے کو تسلیم کرلے اور آپ کو معقول امداد مصارف تعلیم کے لیئے دیدے تب بھی آپ کی اپنی کوشش کی ضرورت باقی رہے گی...... جہاں کوئی ہونہار طالب علم اپنے مصارف خود نہ ادا کرسکے تو اس کی قوم پر واجب ہے کہ وہ اُس کی مدد کرے۔ ہر صوبہ میں ایک ایسا سرمایہ ہونا چاہیئے جس سے لایق طلبہ کو بیرونی ممالک میں ایسے مضامین کی تحصیل کے لیے بھیجا جائے جن کے لیے سائنس کی معلومات اور صنعتی کاریگری درکار ہیں ..... کچھ عرصہ ہوا ہمارے دوست آنریبل ہارون جعفر صاحب نے ایک بہت مفید تجویز پیش کی تھی جس کے عمل میں آنے سے ہمارے تعلیمی سرمائے میں بہت تقویت آسکتی ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ امپیریل بنک آف انڈیا اور اُس کی شاخوں میں جہاں کہیں ایسے مسلمانوں کی رقوم بہ مد امانت جمع ہوں جن پر وہ اپنے مذہبی اعتقادات کی رو سے سود نہیں لیتے تو جو رقم سود کی وہیں بنک میں جمع رہتی ہے اور بنک جن اغراض

کے لیے چاہتا ہے انھیں صرف کرتا ہے وہ مسلمانوں کی تعلیمی جماعتوں اور درسگاہوں کو دیدی جائے تاکہ اس سے مسلمانوں میں تعلیم بڑھے۔ ......

تا حال ہم نوعمر لڑکوں کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے رہے ہیں اب بُلغا کی تعلیم کا کچھ ذکر ضروری ہے۔ جب سے آئینی اصلاحات شروع ہوئی ہیں اور قانونی کونسلوں میں توسیع ہوئی ہے بُلغا کی تعلیم کے مسئلے کی اہمیت بڑھ گئی ہے ...... میری رائے میں آپ کو اپنی ہمسایہ قوموں سے زیادہ اس تعلیم کی ضرورت ہے اور میں آپ کو اس طرف خاص طور سے توجہ دلاتا ہوں۔ آپ کے مدرسوں میں جو معلم ہیں انھیں چاہیئے کہ تعلیم کی اس شاخ کی اہمیت کو محسوس کریں اور اسے کامیاب بنانے کے طریقے سوچیں۔

اب میں ایک ایسے صیغۂ تعلیم کی طرف آتا ہوں جسے مسلمان ہمیشہ خاص طور پر اہم سمجھتے رہے ہیں اور وہ مذہبی تعلیم ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی وجہ جس کے سبب سے ابتدا میں مسلمان جدید تعلیم سے الگ رہے یہ تھی کہ اس میں مذہب کا جز شامل نہ تھا۔ آخر جب اُنھوں نے اپنے لڑکے لڑکیوں کو سرکاری مدرسوں میں بھیجنا شروع کیا تو وہ یہ چاہتے تھے کہ انھیں اپنے بچوں کو اوقات مدرسہ کے بعد مذہبی تعلیم دینے کی اجازت دی جائے۔ کہیں یہ اجازت مل جاتی تھی اور کہیں کہیں اس بنا پر انکار کر دیا جاتا تھا کہ اس میں آسانی نہیں۔ پھر مسلمانوں نے قومی درسگاہوں کی بنیاد ڈالی جہاں وہ مدرسے کے وقتوں میں مذہبی تعلیم دے سکیں۔ یہ خیال بہت معقول ثابت ہوا۔ میری رائے میں ان درسگاہوں نے اپنے طریق پر بہت مفید کام کیا ہے۔ اُنھوں نے پہلے اُس ابتدائی تعصب کو دور کیا جو مسلمانوں میں جدید دنیوی تعلیم اور اس کے میلان مادیت کے متعلق تھا۔ اگر یہ کالج نہ ہوتے تو ہم میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہے جو نہ ہوتی .... اصلی سوال جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ آیا یہ کالج اپنی ہستی کا مقصد پورا کر رہے ہیں یا نہیں۔ جو چیز عموماً مذہبی

تعلیم کے نام سے نامزد کی جاتی ہے وہ اس نام کی مستحق نہیں..... جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی خاص کوشش ذاتی مثال کے اثر سے لڑکوں کے مذہب کے سنوارنے کی نہیں کی گئی۔ جس سے کہ صحیح مذہبی تخیل ان کے اندر پیدا ہوتا اور مذہب اُن کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کرتا کہ ان کی روزمرّہ زندگی کے تار و پود کا جزو بن جاتا...... ضرورت اس امر کی ہے کہ لفظ مذہب سے درگذر کر کے روح مذہب کی طرف توجہ کی جائے اور اس غلط احساس ورغرور مذہبی کی جگہ جو اب پیدا کیا جاتا ہے شوق خدمت دلوں میں پیدا کیا جائے تب ہم مذہبی تعلیم سے وہ فوائد پوری طرح حاصل کر سکیں گے جو اس کے اصلی مقصود ہیں۔

مذہبی تعلیم سے ملتا جلتا ایک مضمون جس سے مسلمانوں کو خاص دلچسپی ہے وہ ایشیائی زبانوں میں عربی فارسی اور ہندوستانی زبان کی تعلیم ہے۔ آپ قدرتی طور پر عربی کی تعلیم کو پسند کرتے ہیں کیونکہ آپ کی مقدس مذہبی کتاب اس زبان مبارک میں نازل ہوئی۔ فارسی کا آپ کو شوق ہے کیونکہ اُس میں آپ کی اکثر مذہبی کتابیں لکھی گئیں۔ ...... ان دونوں زبانوں میں ایک اور نفع ہے کہ یہ بعض ہمارے ہمسایہ ممالک میں اس وقت بولی جاتی ہیں اور ان ملکوں سے ہماری آمد و رفت اب بھی ہے اور آیندہ باہمی تجارتی تعلقات ہونے کا زیادہ امکان ہے ...... اب رہی اُردو اس کی جتنی تاکید کی جائے کم ہے۔ شمالی ہند میں اور جنوبی ہند کے کئی حصوں میں یہ فی الحقیقت جمہوری زبان ہے اور سب زبانوں سے زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ اس کا علم ادب روبہ ترقی ہے اور اس کی تربیت آموز ترقیاں ہندوستان کی کسی دوسری زبان سے کم نہیں .....

ہماری تعلیمی ضروریات کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر تربیت جسمانی کا ذکر نہ کیا جائے گو مدت سے یہ مسئلہ مسلم ہے کہ صحت دماغی اور صحت جسمانی عموماً ساتھ ساتھ رہتی ہیں اور اگر کسی کا دماغ اعلیٰ ہو مگر جسمانی قویٰ کمزور ہوں تو اُس کے کام ادھورے رہتے ہیں۔

اور جو کچھ کام اس دماغ سے وہ لے سکتا تھا اس کا اکثر حصہ ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مجھے امید ہے کہ آپ تعلیم جدید کے اس مسلم اصول کی طرف اپنے مدارس میں کافی توجہ رکھیں گے خواہ وہ مدرسے لڑکوں کے ہوں خواہ لڑکیوں کے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حضرات! میں اب زیادہ آپ کی صبر آزمائی نہیں کرنا چاہتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاہم اس خطبہ کو ختم کرنے سے پیشتر چند لفظوں میں مایلا قوم کی تعلیم کے بارے میں جو عرض کرنے کا وعدہ کیا تھا اُسے پورا کرنا چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے اس مضمون کا تذکرہ اس خیال سے ضروری ہے کہ یہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے اہم ہے اور بعض پہلوؤں سے یہ سارے ہندوستان کے لیے ایسی اہمیت رکھتا ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کرسکتے۔ میرے خیال میں مسلمانان مدراس کا یہ مطالبہ بجا ہے کہ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ مایلاؤں کے لیے کافی تعداد مدرسوں کی قائم کرے اور ایک کالج کھولے جو اُن کے لیے مخصوص ہو۔ اور جس کے ساتھ ایک دارالاقامت بھی ہو۔ ٹلی چری کی کانفرنس میں ان تجاویز کے متعلق کئی تجاویز پیش ہوئی تھیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان سب پر اس کانفرنس میں زیادہ زور دیں گے تاکہ وہ تجاویز گورنمنٹ مدراس کے پاس مسلمانوں کی تائید مزید سے کر پہونچیں۔

حضرات میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لیا اور اب میں اپنے معروضات کو ختم کرتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ان سے آپ کو اس بارے میں کچھ مدد ملے کہ جنوبی ہند اور دیگر اطراف ہند میں مسلمانوں کی تعلیم ترقی کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر کانفرنس کا اجلاس اس قسم کی پائدار تحریک پیدا کردے جو ۱۹۱۰ء کی کانفرنس نے پیدا کی تھی تو جو زحمت آپ نے اس بڑے مجمع کے انعقاد کے لیے گوارا فرمائی ہے وہ بیکار نہ جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کا عروج اس کا کافی معاوضہ ہوگا۔

جلسہ تقسیم اسناد میسور یونیورسٹی
خطبہ صدارت سر جے سی بوس

عرصہ ہوا کہ میں نے معلّمی کا کام کیا تھا نہ بطور پیشے کے بلکہ اس لیے کہ وہ اعلیٰ ترین طرزِ زندگی ہے۔ میرے نزدیک سب سے اعلیٰ مقصدِ حیات یہی تھا کہ میں پُرجوش اور پُرحوصلہ نوجوانوں کی رہنمائی ۔ ۔ ۔ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں۔ میرے سامنے اس وقت قوم کے وہ نونہال بیٹھے ہیں جو زندگی کی بڑی مہم پر روانہ ہونے والے ہیں۔ میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ "نا امیدی کے زمانے میں کون سا نصب العین تمہاری رفاقت اور ہمت افزائی کرے گا؟" اب سے پہلے کبھی اتنا اہم زمانہ نہیں آیا جب قوم کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے نوجوانوں کی قوتِ فکر و عمل کی اس قدر ضرورت ہوئی ہو۔ اس لیے مجھے تمہاری قوت سے سروکار ہے کمزوری سے نہیں۔ میں تمہارے سامنے وہ چیز پیش نہ کروں گا جو سہل ہے بلکہ تم کو مشکل پسندی کی ترغیب دوں گا۔ تم حق کے متلاشی ہو۔ حق جوئی کے لیے تمہیں جو ریاضتیں کرنی پڑیں گی وہ بتاؤں گا۔ اس بارے میں تمہیں اپنے اسلاف کے دماغی ترکے سے مدد ملے گی لیکن تم کو پرانی لکیر کا فقیر نہیں بلکہ بزرگوں کی عقل و دانش کا حقیقی وارث بننا چاہیئے۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں ہر اُس بڑے کام کی بنیاد جس میں دوام کی صلاحیت ہو ان قوتوں کی بیداری اور نشوونما پر رکھنی چاہیئے جو ہندوستان نے آج تک وراثت اور تربیت کے ذریعہ محفوظ رکھی ہے۔ ان ہی کی بیداری سے ہماری حیاتِ قومی میں ایک زبردست طاقت پیدا ہو جائے گی اور ہندوستان میں ایک عظیم الشان نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوگی۔ ایسی تحریک ہمیشہ اندر سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے اثرات قومی شعور کی ترقی میں نظر آتے ہیں۔ حیاتِ قومی میں سب سے زیادہ قابلِ قدر اور اعلیٰ عناصر کون سے ہیں؟ ذہنی ترقی اور علم کی مملکت کو بڑھا کر اس کے فیوض سے دنیا کو بہرہ ور کرنا۔ جب کسی قوم میں یہ قوت معدوم ہو جاتی ہے جب وہ اس کو ختم کر چکتی

ہے اور دوسروں کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا تب اس کی واقعی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کی دست نگر ہو کر ذلت کی زندگی بسر کرنے لگتی ہے کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی کی وقعت بھی کسی خارجی طریقے سے قائم نہیں ہو سکتی۔ ...... دنیا کی نظروں میں اس کا وقار صرف اس کے طلبا ء کے اجتہاد تحقیق علمی کی حقیقی قدر و قیمت سے قایم ہوتا ہے۔ ہماری قومی یونیورسٹی کا سب سے پہلا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ اس کا وقار قائم ہو اور اقوام کی انجمن میں ہندوستان اپنی مناسب جگہ حاصل کرے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں توسیع علم اور ہندوستانیوں میں اشاعت تعلیم کی صلاحیت نہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہاں حقیقی جمہوریت کی روح نہیں ہے کہ یہاں نہ تو مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق ممکن ہے اور نہ ماضی و حال میں تسلسل ہے، کہ یہاں مذہبی تعصب اور تنگ نظری لوگوں پر غالب ہے اور وہ اُن کی عقل کی فرمانبرداری کرنے کے بجائے محض اندھے عقیدے کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے۔ چونکہ ہندوستانی قدرتاً نظری مسائل پر غور کرنے کے عادی ہیں اس لیے وہ سائنٹفک علوم کی توسیع کے نا قابل ہیں اور منہاج سائنس چونکہ تجربہ ہے اور مغرب کی ایجاد ہے اس لیے قومی کلچر کے لیے ناموزوں ہے۔ یہ دعویٰ جاہلانہ اور بے بنیاد ہے ...... ہندوستان میں اشاعت تعلیم میں جغرافیائی حدود کبھی مانع ہوئے۔ زمانۂ ماضی میں ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد ذہنی کا مضبوط رشتہ موجود تھا .... ذہنی تحریکات کسی ایک صوبے کی چار دیواری میں کبھی بند نہ تھیں کیونکہ علم کی مشعل ہر ملک میں اپنی ایک یونیورسٹی روشن رکھتی تھی اور ہر بڑے گرو کی شہرت طالبعلموں کو ہند کے دور و دراز حصوں سے کھینچ لاتی تھی۔ ہمارے اسلاف کی روایات اب بھی تلف نہیں ہوئیں کیونکہ اب ملک کے علمی رہنما مختلف صوبوں سے نکل

کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے ہیں اور اتحاد و اخوت کی زنجیریں مستحکم کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے ہندوستان کی تاریخ کا صحیح مطالعہ کیا ہے اُن کو احساس ہوگا کہ ہندی تہذیب میں گھل مل جانے کی اور دوسروں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی وہ زبردست قوت ہے کہ جس کی وجہ سے بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں اس براعظم کو اپنا وطن سمجھنے لگی ہیں۔ مادرِ وطن کے لیئے ایک عالیشان معبد بنانے کے لیے اُن سب کی متفقہ کوششیں درکار ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دعوی سب سے زیادہ بے بنیاد اور جہالت پر مبنی ہے کہ دنیا اپنی علمی ترقی کے لیے کسی خاص قوم کی مرہونِ منت ہے دنیا میں تمام قومیں ایک دوسرے کی محتاج ہیں اور ہر زمانے میں تفکر کی علمی جدوجہد جاری رہی ہے اور اس نے انسان کی وراثت ذہنی کو فروغ دیا ہے یہ اسی باہمی تعاون عمل کی وجہ ہے کہ دنیا کی شیرازہ بندی ہوسکی اور تہذیب و تمدن کے تسلسل و دوام میں فرق نہیں آیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج کل جو طریقۂ تعلیم ہمارے ہاں مروج ہے وہ ضروریاتِ زمانہ کے موافق نہیں ضرورت ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے اور قوم کے معیار قابلیت اور امیدوں کو بلند کرنے کے لیے اسے ایک ذریعہ بنایا جائے۔ جس غیر ملکی طریقۂ تعلیم سے سوائے ابدی غلامی کے اور کوئی توقعات وابستہ نہ ہوں وہ سمِ قاتل ہے۔ یورپ میں ہندی طلبا کی جو حیثیت ہے وہ قوم کے لیے ذلت اور خطرے کا باعث ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود کیوں نہ بڑے بڑے علمی مرکز کی بنا ڈالیں؟ یہی خیال تھا جس نے دس سال ہوئے مجھے اپنے "ادارۂ تحقیق علمی" کے قائم کرنے کی ترغیب دی۔ مجھے امید ہے کہ اس تعلیم گاہ میں میں اُن روایات کو دوبارہ زندہ کرسکوں گا جن کی کشش سے ڈھائی ہزار سال قبل تمام دنیا سے طلبا، آکر نلندہ اور ٹکسیلہ کے قدیم دارالعلوم میں جمع ہوتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بنی نوع انسان کے فائدہ کے لیے علم کی توسیع و تسخیر یونیورسٹی کا اہم ترین فرض

ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم مختلف نسلوں اور قوموں کے تفکرات اور تخیلات سے روشناس ہوتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم انسان کی عارضی خامیوں اور غلطیوں سے بددل نہ ہوں بلکہ اس کی اولوالعزمی اور جدّ وجہد سے سبق لیں۔ میدانِ عمل سے پہلو تہی کرنا بے سود ہے۔ ہم محض عملی جد وجہد کے ذریعے قوم کی خاطر خواہ خدمت کر سکتے ہیں۔

جن طلبا سے میں آج روشناس ہوا ہوں ان کو میرا پیام کیا ہے؟ میں ان کو دوبارہ تاکید کرتا ہوں کہ تم ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے ہو جب تمہارے وطن کو تمہاری خدمت کی از حد ضرورت ہے تم اس عزت کا احساس اپنے اندر پیدا کرو۔ ہم نے جو تہذیب ترکہ میں پائی ہے وہ صدیوں سے قائم ہے، مجھے یقین ہے کہ تم اپنی کمزوری اور مجہولیت سے اسے ضائع نہ کرو گے۔ تم اس آواز کو لبیک کہو گے جو صدیوں سے ہمارے ملک میں گونج رہی ہے۔ اس آواز کو جو ہر مرد و عورت کو مجبور کرتی ہے کہ انسانی زندگی کی تکلیفوں کو کم کرنے کے لیے ایک کشمکش پیہم میں زندگی گذار دے۔ جب تک سب کو آرام نصیب نہ ہو کسی کو آرام نہیں ہو سکتا اس لیے میں تم کو فلسفہ قوت کی تلقین کرتا ہوں۔ ہماری زبردست تہذیب کے ضمیر میں یہ قوت ہے کہ وہ باوجود مسلسل تغیرات کے قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مصر اور بابل اور یونان کے ذہنی کارنامے ماند پڑ گئے لیکن ہماری تہذیب ماضی کی طرح آج بھی مستقبل پر فاتحانہ اعتماد کے ساتھ نظر جمائے ہوئے ہے۔"

شذرات

"تعلیم و تربیت" کا دوسرا نمبر آج ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہم پہلے نمبر کے استقبال سے بالکل مطمئن ہیں۔ یعنی جن لوگوں کی رائے قابل وقعت ہے، ان سب نے ہماری اس تعلیمی کوشش کی داد دی۔ اس کے مضامین کی سنجیدگی اور دلچسپی کو تسلیم کیا اور اس رسالہ کی ضرورت کا اعتراف کیا۔ لیکن اگر کسی رسالہ کی کامیابی سے اس کی اشاعت کی وسعت مراد ہو تو ہم ابھی مطمئن نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے نمبر میں اور رسالہ کے پراسپکٹس میں اعلان کر چکے ہیں۔ یہ رسالہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں اور نہ اس سے کسی شخص یا جماعت کا مالی فائدہ متصور ہے۔ اس کی ابتدا محض اس لئے کی گئی ہے کہ ہندوستان میں بالعموم اور ہندوستان کے مسلمانوں میں بالخصوص صحیح تعلیمی خیالات کی اشاعت ہو اور معلمین اور ماہرین تعلیم کو تبادلہ خیالات، اور تجربات کے ذریعے سے ایک دوسرے سے مستفید ہونے اور ایک دوسرے کو مستفید کرنے کا موقع ملے۔ اسی اعلیٰ اور بے غرض مقصد کی خاطر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اس کے مصارف کا بار اپنے ذمہ لیا ہے اور اڈیٹروں نے اپنے کم و بیش مصروف اور باکار وقت کو اس کی نذر کیا ہے اور ان کی کوشش ہے کہ اس کو نہ صرف ہندوستان میں اپنی قسم کا اعلیٰ ترین رسالہ بنائیں، بلکہ اس کا معیار اس قدر بلند کر دیں کہ تعلیمی رسالوں میں اس کو ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو جائے۔ لیکن ان کوششوں کی ہمت افزائی اور ان سے مستفید ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی اشاعت کا دائرہ جس قدر وسیع ہو سکے کیا جائے۔ تجارتی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ تعلیمی نقطۂ نظر سے ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کی ہر درس گاہ میں یہ رسالہ پہنچے تعلیمی اصلاح کے لئے جو خاموش کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں معین ہو، جہاں تعلیمی مسائل کی طرف سے غفلت یا سرد مہری ہے وہاں بیداری اور جوش پیدا کرے۔ جہاں مواقع کی کمی یا صحیح رہبری کے نہ ہونے سے

غلط راہ روی کا اندیشہ ہے وہاں یہ رہنمائی کی خدمت انجام دے اور ملک وملت کی تعلیم کے ہر شعبے کو برتر اور خوب تر بنائے۔

ہماری خواہش ہے کہ اس رسالہ کو بہت جلد اتنے خریدار مل جائیں کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوسکے۔ اس کے بعد اس سے جو آمدنی ہوگی وہ ہم اس کو زیادہ مفید، زیادہ عمدہ اور زیادہ ہمہ گیر بنانے میں صرف کریں گے اور نہ صرف ہندوستان کے بہترین لکھنے والوں سے اس کے لئے مضامین مہیا کریں گے بلکہ بیرونی ممالک سے بھی اپنے لئے مفید اور دلچسپ مضامین حاصل کرسکیں گے۔ چنانچہ موجودہ دقتوں اور مجبوریوں کے باوجود بھی ہم نے اس کوشش کو شروع کردیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہم آئندہ نمبر میں دو نہایت قابل قدر مضامین جو مصر اور امریکہ سے آتے ہیں شائع کرسکیں گے۔ اس آئندہ نمبر کی متوقعہ فہرست مضامین کی جانب (جو ایک دوسری جگہ درج ہے) ہم ناظرین کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

گزشتہ نمبر کی اشاعت کے زمانہ یعنی دسمبر کی آخری تاریخوں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا چالیسواں سالانہ اجلاس مدراس میں ہوا۔ مدراس نے سنہ ۱۹۰۱ء میں کانفرنس کو دعوت دی تھی اور اس سال کا اجلاس مسلمانان مدراس کی تعلیمی بیداری اور جدوجہد کا گویا آغاز تھا۔ اس وقت سے اب تک انھوں نے مقابلۃً بہت خاصی ترقی کی ہے اپنی موجودہ تعلیمی پوزیشن پر نظر ڈالنے اور آئندہ کے لئے لائحۂ عمل سوچنے کے لئے یہ بہت مناسب تھا کہ مسلمانان مدراس کانفرنس کو دعوت دیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے کانفرنس خاصی کامیاب رہی جلسوں میں کافی لوگ شریک ہوتے تھے۔ رونق، دلچسپی اور جوش کی کمی نہ تھی۔ رزولیوشن بہت بڑی تعداد میں پیش کئے گئے اور تقریباً سب کے سب منظور ہوئے۔

صدر کانفرنس جناب شیخ سر عبدالقادر صاحب نے ایک نہایت مفید اور سنجیدہ خطبۂ صدارت پڑھا جس میں آنھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر متانت اور اعتدال

کے ساتھ روشنی ڈالی۔ کانفرنس کے صیغہ اصلاح تمدن کے صدر جناب ڈاکٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب نے ایک قابلانہ خطبۂ صدارت پڑھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کے تمدن اور معاشرت کے تمام اہم مسائل پر نہایت عمدگی اور قابلیت کے ساتھ اظہار رائے کیا اور اس صیغہ کو دوبارہ زندہ کرنے پر زور دیا۔ کانفرنس کو چاہیئے کہ اس خطبہ کا اردو ترجمہ عام مسلمانوں کے فائدے کے لئے شائع کرے۔ صدر کانفرنس کے خطبہ میں سے چند ضروری اقتباسات اس رسالہ میں موجود ہیں اور ایک مضمون "تعلیم اور اصلاح تمدن" جو رسالہ "تعلیم و تربیت" کے ایک اڈیٹر نے تقریر کی شکل میں کانفرنس کے سامنے بیان کیا تھا ہدیۂ ناظرین ہے۔

ہمیں یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ ہم کانفرنس کی مجموعی کارگزاری اور عمل کو کافی نہیں سمجھتے۔ ہمارے خیال میں تمام مسلمانانِ ہند کی واحد مرکزی تعلیمی جماعت کے لئے یہ ہرگز کافی نہیں کہ وہ سال میں ایک مرتبہ ایک کم و بیش پر رونق جلسہ ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں منعقد کرے اور بس۔ اور باقی سال کے لئے ایک دفتر کی شکل میں منتقل ہو جائے جہاں زیادہ تر دفتری خط و کتابت اور رجسٹروں کی دیکھ بھال یا چندہ فراہم کرنے کا کام کیا جائے ہمیں اپنے ارادوں کو بلند تر اپنے نصب العین کو اعلیٰ تر اور اپنی نظر کو وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے رزولیوشن پاس کرنے سے آج تک کوئی قوم کامیاب نہیں ہوئی۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ اکثر رزولیوشن پاس ہو کر ختم ہو جائیں اور اس کے بعد ان سے کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ گزشتہ بہت سے سالوں میں کانفرنس کا سب سے بڑا خالص تعلیمی کام یہی ہے کہ اس نے اس رسالہ کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اب اس کو چاہیئے کہ اور آگے بڑھے اور ملک کی تعلیمی اصلاح میں زیادہ فعال حصہ لے ایک نہایت اہم اور فوری ضرورت اس امر کی ہے کہ کانفرنس ہر سال ماہرین تعلیم کا ایک اجلاس بڑے پیمانے پر منعقد کرے جہاں ملک کے تمام صاحبانِ فکر جمع ہو کر تعلیمی مسائل پر مضمون پڑھیں اور تبادلۂ خیالات کریں۔ اس کے موجودہ سالانہ اجلاس عوام میں تعلیمی پروپگنڈا کرنے کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں وہ بھی ایک ضروری کام ہے لیکن چالیس سال تک یہ کام کرنے کی بعد اس کی اہمیت اب مقابلۃً اس قدر زیادہ نہیں۔ اب

تعلیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے اور ایک حد تک اس کا شوق بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اب تو اس تعلیم کو ملک کی ضروریات کے لئے کافی اور مناسب بنانا مقصود ہے۔ اس کے لئے کانفرنس نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ اگر ماہرین تعلیم کی ایک ایسی کانفرنس قائم ہو جائے تو اس سے ملک کی تعلیمی زندگی پر نہایت عمدہ اثر پڑے گا۔ آج کل ملک میں مختلف علمی کانفرنسیں موجود ہیں مثلاً اورینٹل کانفرنس اکنامک کانفرنس، سائنس کانگریس وغیرہ اور کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ انہوں نے مفید علمی خدمت کی ہے اور مفید تر خدمت کا دروازہ ان کے سامنے کھلا ہے لیکن ابھی تک سائنس کانگریس کی قسم کی کوئی تعلیمی کانگریس موجود نہیں۔ یہ دوسری علمی جماعتیں گورنمنٹ کی مدد سے قائم ہیں لیکن تعلیمی کانفرنس نہ گورنمنٹ نے قائم کی ہے اور نہ اس کی قائم کردہ کانفرنس اتنی مفید ہو سکتی ہے جتنی ایک آزاد تعلیمی جماعت کی قائم کی ہوئی کانفرنس کیونکہ تعلیمی بحث و مباحثہ میں انتہائی آزادی رائے کی ضرورت ہے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے بہت مناقشات اور تصادم لازمی ہے۔ گورنمنٹ کی قائم کردہ کانفرنس میں یہ شرائط اچھی طرح پوری نہیں ہو سکتیں اور قومی تعلیم کے مسائل حسب دلخواہ طے نہیں ہو سکتے۔ اس میں سرکاری اور دفتری اثر ضرورت سے زیادہ نمایاں ہوگا۔ اس لئے ہم نہایت زور کے ساتھ کانفرنس کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کراتے ہیں اور اس کی کارکن جماعت کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ اس کام کو اپنے ذمے لیں تو وہ صاحبان رائے کے نزدیک بہت حد تک اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کر سکیں گے۔

مسلم یونیورسٹی کی گزشتہ تحقیقاتی کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی تھی وہ ممبران کورٹ کو گزشتہ ماہ تقسیم کی گئی تھی اور ۱۵ اپریل کو [illegible] کے جلسے میں [illegible] پر غور کیا گیا اور [illegible] تمام تجاویز کو حیثیت مجموعی منظور کر لیا گیا۔

ہم اس مسئلہ پر [illegible] مثالوں کی [illegible] اور [illegible] قائم کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس بات [illegible] کے سپرد

ملت اسلامیہ نے یہ بارِ امانت کیا ہے، غور کرنے کے بعد ان گتھیوں کو سلجھانے کے لئے جن کا رپورٹ میں ذکر کیا گیا ہے، عملی تجاویز قوم کے سامنے پیش کرے۔ ممبرانِ کمیٹی نے زیادہ تر انتظامی امور اور انتظامی بے عنوانیوں پر غور کیا ہے اور انھیں کے متعلق اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔ اصلی تعلیمی مسائل پر جو اس قومی یونیورسٹی کی علمی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے زیادہ تر روشنی نہیں ڈالی بلکہ کورٹ کو اس کی جانب توجہ دلاکر درخواست کی ہے کہ وہ خود ان کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ کورٹ نے چند کمیٹیاں مختلف امور پر غور کرنے کے لئے مقرر کی ہیں۔ ان میں سے بعض ماہرینِ تعلیم حضرات بھی شامل ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ معاملات کے مختلف پہلوؤں پر غیر جانب داری اور ہمدردی کے ساتھ نظر ڈال کر ایسے نتائج پر پہنچ سکیں جو یونیورسٹی کی آئندہ ترقی کے ضامن ہوں۔ اور یونیورسٹی کورٹ سوائے ضروری، فوری انتظامات کے تمام اہم تبدیلیوں کو عمل میں لانے سے پہلے ان کمیٹیوں کی تجاویز کو مسلمان اہل الرائے کے سامنے پیش کرے گا تاکہ وہ اس کو صحیح مشورہ دے سکیں۔ ان سب مشوروں سے فائدہ اٹھانے کے بعد کورٹ جن نتائج پر پہنچے گا وہ یقیناً عامۃ المسلمین کے لئے قابلِ قبول اور یونیورسٹی کی اصلاح کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔

گزشتہ چند سال میں مسلم یونیورسٹی پر اس کے دوستوں اور مخالفوں سب کی جانب سے بہت کچھ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک یہ نکتہ چینی جائز تھی اور مفید ثابت ہوئی لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر معترض نے نیک نیتی سے کام نہیں لیا۔ اب جب کہ ایک غیر جانب دار کمیٹی نے معاملات کی تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ شائع کر دی ہے اور اس رپورٹ کو بحیثیت یونیورسٹی کورٹ نے منظور کر لیا ہے۔ ہماری رائے میں مخالفانہ اعتراضات کو ختم ہو جانا چاہئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلمان بلکہ غیر مسلم پبلک اور اخبارات بھی یونیورسٹی کے معاملات پر رائے زنی سے باز رہیں۔ ایسی خاموشی اور بے تعلقی خود یونیورسٹی کے لئے غیر مفید ثابت ہوگی۔ کیوں کہ ایک زندہ تعلیمی جماعت کو ہمیشہ رائے عامہ سے باخبر اور رائے عامہ کو

ایک قومی تعلیم گاہ پر نگہبان رہنا چاہیئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لوگ خواہ مخواہ یونیورسٹی کی وقتی اور عارضی کمزوریوں کو اہمیت دے کر اس کو بدنام کرنے کی کوشش کریں۔ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی پچاس سالہ تعلیمی جدوجہد کا ثمر ہے۔ یہاں تمام ملک کے مسلمان نوجوان ایک متحدہ قومی مرکز پر جمع ہوتے ہیں اور خاص اثرات اور روایات کی فضا میں تربیت پاتے ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس یونیورسٹی کے سامنے خدمت ملک اور خدمت قوم کے غیر محدود امکانات کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں نوجوان نسلوں کی قوت فکر و عمل کی ایسی تربیت کی جا سکتی ہے کہ وہ آئندہ چل کر قوم اور ملک کی سیاسیات اور معاشرتی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیں۔ اس لیے ہمیں بددل یا ہمت شکستہ ہونے کے بجائے مستقبل کے ممکنات پر نظر جما کر اپنی بہترین کوششیں اور عزیز ترین ایثار کو اس کی نذر کر دینا چاہیئے اور قوم کے اعلیٰ ترین دماغوں کو اس کی راہبری میں بخوشی حصہ لینا چاہیئے۔

ہم یونیورسٹی کے حکام کو بھی باادب ایک مشورہ دینا چاہتے ہیں۔ حال کے واقعات اور تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کی وجہ سے لوگوں میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں پبلک کو ہمدرد اور ہم خیال بنانے کے لئے اخبارات اور تقریروں کے ذریعے سے لوگوں کی غلط فہمیوں کی اصلاح کرنی چاہیئے اور مخالف پروپگنڈے کا جواب پروپگنڈے سے دینا چاہیئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں گورنمنٹ میں اور سرکاری حلقوں میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے سرکاری اثر یا انگریزوں کی تعداد کو زیادہ کرنا چاہیئے تاکہ اس جانب سے ہماری مخالفت نہ ہو اور ہمارے طلبا کو کشمکش حیات اور ملازمتوں کے مقابلے میں حد سے زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انسان پریشانی میں اس قسم کے علاج سوچا کرتا ہے لیکن ہم نہایت وثوق اور نہایت خلوص سے ان کو یہ رائے دیتے ہیں کہ وہ پبلک اور گورنمنٹ کی رضاجوئی کی فکر کم کریں اور اپنی اندرونی اصلاح کا زیادہ خیال کریں۔ انہیں اپنے علمی کارناموں، اپنے طلباء کی قابلیت، ان کی سیرت کی پختگی اور عمدگی کے ذریعے سے دنیا کو

تسخیر کرنا ہی۔ ممکن ہی کہ چند سال تک گورنمنٹ کی نظر عنایت ان سے پھری رہے، ممکن ہی کہ پبلک اپنی گزشتہ غلط فہمیوں کی وجہ سے ان کی صحیح وقعت کو کچھ عرصہ تک نہ پہچان سکے لیکن اگر ان کی تعلیم و تربیت دوسری یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تر ہوگی، اگر ان کے اساتذہ اپنی علمی دلچسپیوں اور تحقیق و تفتیش میں دوسرے اساتذہ سے ممتاز ہونگے۔ اگر ان کے طلباء کشمکش حیات میں دوسری یونیورسٹیوں کے طلباء پر سبقت لے جائیں گے تو وہی لوگ جن کی کل تک خوشامد کی جاتی تھی دوزانو ہوکر اس یونیورسٹی کی قدر و قیمت کا اعتراف کریں گے اور اس سے منسوب ہونا باعث فخر سمجھیں گے تعصب اور مخالفت جو جہالت یا بدنیتی پر مبنی ہو حقیقی عظمت کے سامنے قائم نہیں رہتی اور جو چیزیں خلق خدا کے لئے واقعاً مفید ہوتی ہیں وہ باقی رہتی ہیں۔

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ

اس لئے ہم دوبارہ حکام یونیورسٹی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ جرأت اور استقلال کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑے ہوں صداقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور ہر کام میں تعلیم اور قوم کے فائدے کو اپنا راہبر بنائیں۔ جو جماعتیں کسی بیرونی سہارے پر زندگی بسر کرتی ہیں وہ کبھی کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتیں۔ ؎

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تند و شعلہ بے باک ست!

مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج نے سال گزشتہ اخیر مئی، جب کہ اسکولوں میں تعطیل ہوتی ہے، ایک "تعلیمی کورس" کا انتظام کیا تھا تاکہ اساتذہ اور دوسرے صاحبان جو تعلیم سے عملی یا نظری دلچسپی رکھتے ہیں اس میں شریک ہوکر فن تعلیم اور اصول تعلیم کے متعلق بہترین اور تازہ ترین خیالات اور تجربوں سے مستفید ہوسکیں۔ اس سال دوبارہ اس کورس کا انتظام کیا گیا ہی۔ اور وہ زیادہ وسیع پیمانے پر ابتدائے جون میں شروع ہوگا اور ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ لکچروں کو اساتذہ کے لئے

زیادہ سے زیادہ مفید اور دلچسپ بنایا جائے۔ اس میں کچھ لکچر عام تمدنی اور علمی مسائل پر ہوں گے جن سے اساتذہ کی نظر زیادہ بلند اور ان کی عام واقفیت زیادہ وسیع ہو۔ مثلاً ادب اور زندگی، تاریخ ہند کا نصب العین، قومی تعلیم وغیرہ اور باقی لکچر ایسے مضامین پر ہوں گے جو براہ راست اساتذہ کے روزمرّہ کے کام سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے لئے مفید ہیں۔ مثلاً تاریخ کی تعلیم، ادب کی تعلیم، جغرافیہ کی تعلیم، تعلیم میں عملی کام کی اہمیت وغیرہ۔ علاوہ یونیورسٹی اور ٹریننگ کالج کے اساتذہ کے، باہر سے بھی ممتاز ماہرین تعلیم کو مدعو کیا گیا ہے کہ وہ اس کورس میں شریک ہونے والے ممبروں کو لکچر دیں، چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل ہیں اور ریورنڈ اے ای، ہارپر نے جنہوں نے موگا میں گاؤں کے استادوں کی ٹریننگ کے لئے ایک نہایت عمدہ سکول قائم کیا ہے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے قیمتی خیالات اور تجربات سے ممبران کورس کو مستفید کریں گے۔ اس کورس کا خرچ بہت کم رکھا گیا ہے یعنی ایک روپیہ فیس داخلہ اور کھانے کا خرچ۔ قیام گاہ کا انتظام یونیورسٹی کی طرف سے ہوگا۔ ہم اساتذہ صاحبان کو بزور دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس عمدہ موقع سے فائدہ اٹھائیں اور کورس میں شریک ہوں۔ داخلہ کے لئے ۲۰ مئی تک درخواستیں پرنسپل ٹریننگ کالج کے پاس پہنچ جانی چاہئیں۔

اس دفعہ رسالہ کی ضخامت گزشتہ مرتبہ سے اور ہمارے اپنے اندازہ سے قدرے کم ہے۔ اس کی مختلف وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے رسالہ کے معیار کو نہایت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ بہت بلند رکھنا چاہتے ہیں اور محض صفحات پُر کرنے کے لئے مضمون چھپوانا نہیں چاہتے۔ امید ہے کہ رسالہ کا آئندہ نمبر اپنی پوری ضخامت میں شائع ہوگا۔

ہمارا گزشتہ نمبر

ہمارے گزشتہ نمبر میں جو جنوری میں شائع ہوا تھا من جملہ اور مضامین کے مندرجہ ذیل حضرات کے مضامین شائع ہوئے تھے۔

علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب ایم اے، ایل ایل ایم سی سی۔ بی ای آئی سی ایس	تعلیم - ماضی اور حال
ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب۔ ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی فل (آکسن)	فلسفہ اور تعلیم
خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے، ایم ای ڈی۔	"مدرسہ جدیدہ" بلجیم میں
سید محمد عمر صاحب بی ای (برلن)	جرمنی میں صنعتی تعلیم
ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی	نفسیاتِ شباب
سید محمد یوسف صاحب ایم ایس سی (وکٹوریہ)	تعلیم اور مسئلہ ہندو مسلم اتحاد

وغیرہ وغیرہ

ہمارا آئندہ نمبر

ہمارے آئندہ نمبر کے لیے ہمیں بعض نہایت قابلِ قدر مضامین موصول ہوئے ہیں اور بعض بلند پایہ مضامین کا وعدہ ہے۔ مصر کی مشہور ماہر تعلیم خاتون سیدہ ذکیہ سلیمان صاحبہ نے جو قاہرہ میں تعلیم الاطفال کی مہتمم ہیں ایک نہایت پُر مغز مضمون بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم پر خاص رسالہ تعلیم و تربیت کے لئے ارسال فرمایا ہے ہمارے دوست امیر علی خاں صاحب نے جو شکاگو کی مشہور یونیورسٹی میں تعلیم اور معاشیات [illegible] کی ڈگری کے لئے تعلیم حاصل کر رہے ہیں ایک مختصر مقالہ "خاموش مطالعہ" کے متعلق بھیجا ہے۔ جس کا مطالعہ

تمام اساتذہ اور تمام لکھے پڑھے حضرات کے لئے مفید اور دلچسپ ہوگا ۔

جامعہ ازہر پر ایک نہایت مستند اور بسیط مضمون فرانس کے قابل قدر علمی رسالہ (LIETUDES ISLAMIIQUE) میں شایع ہوا ہے۔ اس میں اس عظیم الشان یونیورسٹی کے ارتقا اور اس کی موجودہ حالت پر بہت واضح روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ اگلے نمبر میں ہدیہ ناظرین ہوگا ۔

قومی تعلیم کے کسی خاص شعبہ پر ہمارے محترم دوست جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ ہمیں ایک مضمون عنایت کرینگے ۔

اُردو کی تعلیم پر ہمارے دوست جناب خادم محی الدین صاحب ایم اے، بی ٹی، ایم ای ڈی اور مسلمانو کی تعلیم کے کسی اہم مسئلہ پر ہمارے دوست سید بشیر احمد ہاشمی صاحب ایم اے ۔ ایم ای ڈی مضمون لکھنے کا وعدہ کرچکے ہیں۔ اور ہمیں ایفائے وعدہ کی قوی اُمید ہے۔

بعض اور محترم احباب جو ہم سے قول ہار چکے ہیں لیکن اب تک اس کے ایفا کا وقت مقرر نہیں کرسکے درخواست ہے کہ وہ بھی ہمیں اور ہمارے ناظرین کو اپنے خیالات سے جلد تر مستفید کریں۔ ان میں سے ہم بالخصوص مندرجۂ ذیل حضرات کی خدمت میں یاد دہانی کرنا چاہتے ہیں۔

جناب شیخ سر عبدالقادر صاحب

جناب سید راس مسعود صاحب (نواب مسعود یار جنگ بہادر)

جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب (لکھنؤ یونیورسٹی)

جناب سید علی اکبر صاحب انسپکٹر مدارس (حیدرآباد دکن)

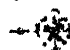
جناب سلطان محی الدین صاحب (میسور یونیورسٹی)

جناب اعزاز الدین خاں صاحب (بھوپال)

جناب سید شبیر حسین صاحب زیدی (علی گڑھ)

اگر یہ سب حضرات اس "کارِ خیر" میں شریک ہوں تو بقول صفی ۔۔

زینتِ خانہ بڑھیگی کہ گھٹیگی اے دوست
اگر آئینہ کے آئینہ مقابل ہو جائے



طابع وناشر :- محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع ونشر :- مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ
کا
سہ ماہی رسالہ

تعلیم و تربیت

زیر ادارت
ڈاکٹر سید ظفر الحسن، پی ایچ۔ڈی، ڈی فل   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی
خواجہ غلام السیدین بی اے، ایم ای ڈی

ششماہی [illegible]
قیمت سالانہ [illegible]



جلد ۱ | جولائی ۱۹۲۸ء مطابق محرم ۱۳۴۷ھ | نمبر ۳

فہرست مضامین

مضامین خاص

مذہبی تعلیم کے طریقے

انسان کا رجحان فطرتاً عبادت کی جانب ہے۔ وہ ایک ایسی زبردست قوت یا قوی کارساز طاقت کے وجود کا اعتراف کرنیکی جانب مائل ہے جو عالم اور اس کے تمام عجیب مخلوقات کے نظام کو چلا رہا ہے یہ احساس طبیعی ہے اور کسی بیرونی رہنما کا محتاج نہیں۔ تمام بنی نوع انسان کا اعتراف الوہیت کرلینا حتی کہ اپنے زمانہ وحشیت میں بھی قبل اس کے کہ انکے پاس کوئی نبی انکی رہبری کے لئے آئے اسکی بڑی دلیل ہے لیکن چونکہ حقیقت الوہیت کا سمجھنا دشوار ہے اسلئے لوگوں نے اس کو مظاہر قدرت کی طرف منسوب کردیا جن کی علت اور اسرار کے سمجھنے سے وہ عاجز رہے۔ اس طرح وہ سورج چاند آگ وغیرہ کی پرستش کرنے لگے اور انہوں نے اپنے لئے بت بنائے جن میں انہوں نے ذات الٰہی کو مشخص کرلیا۔ اسکا سبب یہی ہے کہ وہ فطرتاً مجبور ہیں کہ ہر اس چیز پر متحیر اور معتقد ہوں جس کو وہ سمجھ نہیں سکتے اور جس کے اسرار تک وہ نہیں پہنچ سکتے۔

دین سے وہ تمام احکام و قوانین مراد ہیں جن کو خدائے تعالیٰ نے وضع کیا ہے تاکہ انکے ذریعے سے اپنے بندوں کو بہبودی کے راستہ کی طرف رہنمائی کرے، اور رسولوں اور نبیوں کو ان کی تعلیم دے کر یکے بعد دیگرے مبعوث کیا تاکہ وہ لوگوں کو تعلیم دیں اور اس چیز کی طرف انکی رہبری کریں جس میں عالم کی خوشحالی اور سلامتی ہے اور اس نے آسمانی کتابیں نازل کیں جن میں قصص مواعظ اور احکام و شرائع ہیں۔

پس دین انسان کے لئے خالق کو پہچاننے کا راستہ ہے اور افراد و قبائل اور قوموں کی

فلاح کا ضامن ہے، گویا دین قوموں کا شیرازہ ہے جس پر وہ اپنی سیاست کی تعمیر کرتی ہیں، کیونکہ دین ایسا کلی اعتقاد ہے جو افراد کو ایک مقصد اور ایک ضابطہ اخلاق و عادات پر مجتمع کر دیتا ہے۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ دین ہی وہ بنیاد ہے جس پر حکومتیں اور قومیں قائم ہوتی ہیں۔

دینی تعلیم کی غرض

تعلیم دین کے تین مقصد ہیں اول خدائے تعالیٰ پر ایمان اور اعتقاد یعنی انسان کے قلب میں ایک قادر اور ذی اختیار معبود کے وجود کے اعتقاد کا احیا۔ اس اعتقاد سے انسان میں اس نسبت کے احساس کی نشو و نما ہوتی ہے جو اس کو اپنے خالق سے ہے۔ اس طرح اس میں اس کی عظمت کے تصور کے وقت خضوع و خشوع کا۔ اس کی قدرت کے تصور سے تواضع اور عجز کا اس کے انعام کے تصور سے احسان اور تشکر کا۔ اور اس کی رحمت و مغفرت کے تصور سے محبت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

دوم دین کا علم۔ یہ علم انبیا اور گزشتہ قوموں کے قصص و حالات سے جو کتب دینیہ میں مذکور ہیں اور پیش رفتگان کے نیک و بد اعمال کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے تاکہ صالحین کے اعمال سے ہم عمدہ نصیحت حاصل کریں اور بد کردار و بد افعال سے اجتناب کریں۔

سوم احکام دین پر عمل، کیونکہ خدائے تعالیٰ نے ان کو ہماری ہی ہدایت اور منفعت کے لئے جاری کیا ہے اور ان سے اپنے بندوں کے ساتھ اس کی محبت اور ان پر اس کی رحمت ظاہر ہوتی ہے اس لئے اپنی مرضی اور اختیار سے ان پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے تاکہ ہم انکی خاطر فضائل سے آراستہ ہوں اور نیکی کو نیکی کی خاطر کریں نہ کہ ثواب کے طالب ہو کر اور برائی سے برائی کی خاطر اجتناب کریں نہ کہ عذاب کے خوف سے۔

دینی تعلیم، قدیم و جدید

اس زمانہ سے پیشتر تمام مذاہب میں دینی تعلیم کی طرف توجہ زیادہ تھی، بلکہ اکثر لوگ تعلیم کو تمام تر مذہبی کتب کے ادب حفظ کرنے پر صرف کر دیتے تھے جن کے بعد وہ بہت سا وقت ان کو سمجھ

سے لکھنے میں اور انکو نقوش او ر تصاویر سے آراستہ کرنے میں صرف کرتے تھے۔ لیکن زمانہ
زرنے پر تعلیم کا دائرہ وسیع ہوا اور علوم بے شمار ہو گئے تو محض تعلیم دینی پر اکتفاء نہ رہا اداس
نے دوسرے علوم کیطرف توجہ کی لیکن باوجود اس کے وہ تعلیم دینی کو بھی کافی توجہ اور وقت
یتے رہے۔ جب قومیں آگے بڑہیں اور انکے تمدن نے ترقی کی اور علوم و فنون اور صنعتوں
نے رواج پایا اور لوک تحقیق و اختراع میں مشغول ہوئے تو علوم درسیہ کا شمار اور زیادہ
ہو گیا اور ماہرین نے تعلیم کے نئے نئے طریقے اور تربیت کے نئے نئے ذرا ئع نکالے یہاں تک
، وہ طلبہ کو زندگی کے متعدد شعبوں کے لیے تیار کرنے لگے۔ قدرتی طور پر انکو تعلیم دینی کی
لیے کم فرصت مل سکی، بلکہ ان میں سے بعض یہاں تک کہنے پر آمادہ ہوے کہ تعلیم دینی والدین
ا حصہ اور حق ہے اور اس کو تربیت منزلی میں شامل ہونا چاہئے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس
طرف سے مدرسوں کا اعتناء کم ہو گیا۔ مگر یہ ایک صریح غلطی تھی کیونکہ مدرسہ اور گھر دونوں
چاہئے کہ تربیتِ اخلاق اور تعلیم دینی میں ایک دوسرے کے شریک رہیں۔

علیم دینی گھر میں

اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ بچہ کو تعلیم دینی اس کے مدرسہ میں داخل ہونیکے بعد اسوقت
روع کرانی چاہئے جب وہ اس کے معانی اور اس کے قواعد و احکام کو سمجھ سکے۔ لیکن یہ غلطی
ہے کیونکہ تعلیم دینی سے یہ غرض نہیں ہے کہ بچہ اس کے اصول و قواعد کو یاد کرے۔ بلکہ اس
سے یہ غرض ہے کہ وہ ابتدا ہی سے قبل اس کے کہ وہ انکو سمجھ سکے ان پر نشو و نما پائے، اس
رح گویا اس کی پرورش افعال حسنہ، مکارم اخلاق اور حسن معاشرت پر ہوگی۔

تعلیم دینی کی ابتدا بچہ کی زندگی کے اول سال ہی میں ہونی چاہئے کیونکہ بچہ عادت
ر ماحول سے بہت جلد اثر پذیر ہوتا ہے۔ بچہ کے ادراک حسی اور جسم کا نمو اس کی زندگی
کے پہلے سال میں بہ نسبت اور کسی سال کے زیادہ ہوتا ہے، اسی طرح اس میں واقعات
حول سے اثر پذیری کی استعداد بہت زیادہ ہوتی ہے پس بچہ کو اعمال و صفات حمیدہ

سے آگاہ کرنے میں اس کی ماں اس فطری استعداد سے کام لے سکتی ہے تاکہ تعلیم دینی کی درسگاہ کا راستہ تیار ہو جائے، وہ اس کے لئے اس طرح تیار ہو سکتا ہے کہ مثلاً وہ اپنی ماں کو ہر روز فریضۂ نماز صحیح اوقات میں ادا کرتے ہوئے دیکھتا رہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ بچہ قبل ولادت ہی سے دینی طور پر متاثر ہوتا ہے، کیونکہ ماں کا خلق، اسکا خشوع، اس کی نماز اسکا دوسروں کے ساتھ قول وفعل سے نیک برتاؤ اور اسکا خدائے بزرگ کی عظمت و قدرت پر غور کرنا یہ سب بچہ کو متاثر کرتے ہیں۔ پس بچے کے ساتھ ان تمام صفات کے قوائے نامیہ بھی پیدا ہوتے ہیں اور ماں کی توجہ اور تربیت انکے شامل حال ہوتی ہے تو وہ نشو ونما پاتے اور بار آور ہوتے ہیں اور آخر کار ایمان اور دین کے علم صحیح اور اسکی تعمیل کے سب سے بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ماں کے اہم ترین فرائض میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے بچہ میں صفات حمیدہ کی پرورش کرے۔ مثلاً وہ اس میں باپ کی محبت اس طرح پیدا کرے کہ وہ اس کو اس کی شفقت کیطرف ہمیشہ متوجہ کرتی رہے کہ وہ کس طرح ہر روز محنت ومشقت کرنے کے لئے باہر جاتا ہے تاکہ وہ اسکے لئے کھانے کی چیزیں فراہم کرے جس سے اس کی پرورش اور معاش کا انتظام ہوتا ہے اور لباس فراہم کرے جو اس کو سردی اور گرمی سے بچاتا ہے اور کھلونے جن سے وہ کھیلتا ہے اور بہت سی دوسری باتیں جن سے بچہ میں اپنے باپ کی محبت اور اسکی مہربانی کا اعتراف پیدا ہو۔ اور یہی طریقہ اس کو اپنے بہن بھائی اور دوسرے رشتہ داروں اور جان پہچان والوں سے محبت کرنا اور احسان کا شکر گزار ہونا اور خادموں کے ساتھ حسن برتاؤ کرنا سکھائیگا یہی تمام باتیں تعلیم دینی کے راستہ کو ہموار اور آسان کرتی ہیں۔

ماں کا فرض ہے کہ اس وقت سے جبکہ بچہ میں ادراک پیدا ہو اس کو فطرت[1] اور عجائبات فطرت کی طرف متوجہ کرے جن کے سمجھنے میں اس کی عقل متحیر ہوتی ہے۔ مثلاً سورج چاند

---

[1] ...

کو گرمی پہنچاتا ہے اور ستارے اور خوبصورت چاند جو رات کو روشن کرتے ہیں اور پھول جو اپنے فرحت بخش رنگوں اور اپنی لطیف خوشبو سے اس کو خوش کرتے ہیں۔ اور اس قسم کی بہت سی نعمتیں۔ اور نیز اس کو بتائے کہ ہمارے پروردگار نے اپنی محبت سے اور ہماری بہبودی کی خاطر یہ تمام چیزیں علاوہ بے شمار اور چیزوں کے ہم کو عطا کی ہیں، اور اسی نے ہم کو ہمارے ماں باپ اور بہن بھائی اور دوسرے رشتہ دار دئے ہیں، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے محبت کریں اور ہم پر اسکی جو مہربانی ہے اسکا اعتراف کریں اور ان تمام باتوں پر عمل کریں جن کا اس نے حکم دیا ہے اور ان تمام باتوں سے دور رہیں جن سے اس نے منع کیا ہے کیونکہ وہ حکیم اور علیم ہے، وہ ہماری ہی بھلائی کے لئے نیکی کرنے کا اور برائی سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم اسکا ہمیشہ شکر کرتے رہیں۔

باپ کا حق اس بارے میں ماں کے حق سے کم نہیں اگرچہ اس کا گھر سے باہر مشغول رہنا اس کو اتنی فرصت نہ دیتا ہو جتنی ماں کو میسر ہے۔ اور آج بھی ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے باپ کی اس مہربانی اور شفقت کو نہیں بھولے جو اس نے ہماری بیماری میں ہم پر کی جب ہم کمسن اور بے شعور تھے، اور نہ اس کے عدل و انصاف کو جب ہم اپنا کوئی قضیہ اسکے پاس لاتے، اور نہ اپنی اس خوشی کا جو اس کے واپس گھر آنے پر ہم کو ہوتی اور بچپن میں بسا اوقات ہم اپنے ماں باپ کی ناراضگی کے ڈر سے بہت سے افعال سے باز رہتے، اور اس کی وجہ ہماری محبت اور انکی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش ہوتی۔

جب یہ واقعہ ہے تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بچے اور اس کے خالق کے رشتہ کو مضبوط کرنیکے لئے اس راستہ پر چلنا چاہیے اور ہم کو اس کی تربیت دینی میں اس کے دل میں خوف وہراس ڈالنے سے بچنا اور خشوع اور محبت کیطرف رجوع کرنا چاہئے؟

تعلیم دینی مدرسہ میں

اگر ماہرین تعلیم اس امر پر غور کریں تو ان کو مدرسہ میں تعلیم دینی کے بہت سے تمہیدی

وسائل معلوم ہو جائیں گے اور ان کے لئے والدین کا طریقہ تعلیم اختیار کرنا ممکن ہو جائے گا۔ ان وسائل میں عمدہ مثالیں "درس الالعاب" (کھیلوں کے سبق) درس المحادثہ (داستان گوئی) اور حکایات، مطالعہ فطرت وغیرہ شامل ہیں۔

بچہ فطرۃً تقلید کرتا ہے اور اس کا نفس گرد و پیش کی زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے جسم اور عقل کی کمزوری اور بہت سے ایسے کاموں کے نہ کرسکنے کی وجہ سے جن کو بڑے آدمی بآسانی کر لیتے ہیں وہ قدرۃً قوت اور عقل و حکمت کی مثال اپنے گرد و پیش کے بڑے لوگوں میں دیکھتا ہے۔ پس گھر میں اس کی نظر اپنے والدین اور اقارب پر اور مدرسہ میں اپنے اساتذہ اور بڑے طلبہ پر پڑتی ہے۔ اس سے ہم پر عمدہ مثال کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ بچے اپنے سے بڑوں ہی کے اقوال و افعال کی تقلید بہت زیادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا مدرسہ کے اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے لئے صدق، امانت، امداد باہمی، اطاعت، تعاون، معاشرت وغیرہ اوصاف کا جو انسان کے لئے ہر وقت ضروری ہوتے ہیں اپنے کو بہترین نمونہ بنائیں۔

"درس الالعاب" بچوں میں صفات حمیدہ پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً دیانت کا احساس [illegible] معاملات میں [illegible] ذمہ داری اور [illegible] یہ باتیں شاگردوں کو ان صفات کی خوبیوں سے آگاہ کرتی ہیں کیونکہ وہ جان لیتے ہیں کہ یہ صفات شخص کے [illegible] ہوتی ہیں تو وہ خود ہی مدرسہ میں [illegible] ان پر عمل کرتے ہیں

درس المحادثہ اور حکایات [illegible] تعلیم اخلاق کے بہت سے مواقع پیش کرتے ہیں کیونکہ [illegible] واقعات کی [illegible] یا ان کی [illegible]

فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ سچ کو جھوٹ پر کس طرح فضیلت حاصل ہے۔

"دروس الطبیعۃ" جب کہ وہ صحیح طریقوں سے پڑھائے جائیں نہ کہ تحلیل و تشریح اور اصطلاحات کو یاد کرا کر اور اس میں استحسان و تعظیم اور خشوع کا پہلو مد نظر رکھا جائے تو وہ اپنے خالق کو پہچاننے کا اور اس کی بے حد و بے حساب قدرت سے آگاہ ہونے کا ایک بڑا ذریعہ ہے کیونکہ فطرت خدائے تعالیٰ کی کتاب ہے جس میں اس نے اپنی قوت اور عظمت کے مظاہر جمع کرا دیئے ہیں جو ہم کو اس کی مخلوقات کے اسرار پر غور کرنے کے بعد اس کی الوہیت اور بادشاہت کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔" "دروس الطبیعۃ" میں بچہ مثلاً ایک بیج بوتا ہے اور اس کو سیراب کرتا ہے اور طرح طرح خبرگیری کرتا ہے، پھر وہ بیج پھوٹتا ہے اور بڑھتا ہے یہاں تک کہ وہ بڑا ہو جاتا ہے اور پھر وہ پھلتا پھولتا ہے اور اس میں پھر ویسے ہی بیج پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ وہ خود تھا آخر کار وہ مرجھاتا اور پھر مر جاتا ہے۔ کیا اس بیج کے نمو کے ان متعدد مدارج میں بچے کے لئے سبق نہیں ہیں؟ یا مثلاً مدرسہ میں بچہ کے سامنے ایک کبوتروں کا جوڑا لایا جاتا ہے۔ اس کی استانی اس کو بتاتی ہے کہ ان کو باقاعدگی سے دانہ دیتے رہنا چاہیے اور انکے کابک کو ہمیشہ صاف رکھنے ضرورت ہے، وہ اور اس کے ساتھی بہت دنوں تک اس پر عمل کرتے ہیں لیکن اتفاق سے وہ ایک روز غفلت کرتے ہیں اور جب صبح کو مدرسہ میں آتے ہیں تو ان میں سے ایک کبوتر کو مردہ اور بے حس و حرکت پاتے ہیں کیا اس کی موت میں بچہ کے لئے عبرت نہیں ہے؟ اس کی استانی اس کو دلاسا دے کر ایک اور کبوتر لا دیتی ہے اب طلبہ کی توجہ کبوتروں کی طرف زیادہ ہو جاتی ہے کبوتری انڈے دیتی ہے اور ان کو سیتی ہے تو اسکا رفیق اس کو کھلاتا ہے۔ پھر انڈے کھٹکتے ہیں اور ان میں سے ذرا ذرا سے بچے نکلتے ہیں جو ہر چیز سے حتیٰ کہ کھانے سے بھی عاجز ہوتے ہیں۔ انکے ماں باپ ان کی پرورش کرتے ہیں یہانتک کہ وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا ان سب باتوں میں طلبہ کے لئے سبق نہیں ہیں؟ یا مثلاً استانی بچوں کو اواخر گرما میں چیونٹیوں کی طرف [illegible] ان کو [illegible]

خصوصاً مدرسہ کے ریتیلے صحن میں دیکھتے ہیں کہ وہ جاڑے کی خوراک بہم پہنچانے کے لئے کیسے کیسے بوجھ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے جن کو وہ بمشکل اٹھا سکتی ہے۔ پھر ایک روز جاڑے کی آمد پر بچے دیکھیں گے کہ وہ غائب ہوگئی، جاڑا گزر جاتا ہے اور موسم بہار میں سردی زائل ہونے پر چیونٹی دوبارہ اپنے سوراخوں سے نکل آتی ہے۔ اس طرح استانی بچوں کو سمجھا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے جس سے نہ تو کوئی چھوٹی چیز پوشیدہ ہے نہ کوئی بڑی چیز اور وہ اپنی سب سے چھوٹی مخلوق تک کی نگہبانی کرتا ہے۔

پھر استانی کو چاہئے کہ ایسے مذہبی قصوں کو جن سے خدا کی قدرت اور اسکا رحم و کرم ظاہر ہوتا ہے مناسب موقعوں پر سنایا کرے اور اس کے احکام کی تعلیم کو جاری رکھے، اور نیز انبیاء کے سوانح زندگی کا ان کو مطالعہ کرائے جن سے طلبہ کو ان کی معیشت کا راز، انکا اپنی امانت کو بخوبی انجام دینا، انکا لوگوں کو دعوت الی الخیر دینے میں اپنے آپ کو قربان کر دینا، ان کو منکرین کے ہاتھوں جو اذیتیں پہونچیں ان پر انکا صبر وغیرہ بآسانی سمجھ سکیں تاکہ ان کے دل میں انکی محبت پیدا ہو۔ یہاں مناسب موقعوں پر استانی طلبہ کو قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی سورتیں اور آیتیں پڑھکر سنائے گی جن کا سمجھنا اور مطلب ذہن نشین کرنا آسان ہو اور پھر وہ ان کو یاد بھی کریں علاوہ بریں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ابتدا ہی سے وہ ان کو تلاوت قرآن شریف کے وقت خشوع اور ادب سے بیٹھنا سکھائے۔

دین کے ارکان خمسہ یعنی شہادتین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی تعلیم میں تدبر چاہئے کیونکہ طلبہ کو محض انکا یاد کرا دینا کہ وہ بغیر انکے محاسن و فوائد کو سمجھے ہوئے ان پر عمل کرنے لگیں درست نہیں بلکہ انہیں انکے محاسن و فوائد سے آگاہ کرنا چاہئے جو انسان کو ان پر عمل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں تاکہ وہ انکو اپنی خوشی اور مرضی سے ادا کریں۔

شہادتین کا ان تمام مدارج کے بعد سکھانا آسان ہے کیونکہ طلبہ پہلے ہی سے اس

بات کے خوگر ہو کر نشو و نما پا رہے ہیں کہ ہر ایک چیز کی نسبت ایک اللہ کے ساتھ ہے اور اسی نے اپنے نبی کریم سیدنا محمدؐ علیہ افضل الصلوٰۃ و السلام کے ہاتھ ہم کو ہدایت بھیجی ہے۔

طلبہ کو نماز کے فوائد بتائے جائیں کہ وہ ہمارا خدائے تعالیٰ کو یاد کرنا ہے تاکہ ہم بدی کے کرنے سے باز رہیں اور وہ ہمیں مقررہ اوقات پر اپنے فرائض ادا کرنا سکھاتی اور ہماری صحت کو درست کرتی ہے کیونکہ اس کے ادا کرنے میں ریاضت جسمانی بھی ہے یہاں وضو کی ضرورت بھی بتائی جانی چاہئے کہ وہ ہم کو صفائی کا عادی بناتا ہے، ہمارے جسم میں چستی پیدا کرتا ہے اور ہماری صحت درست کرتا ہے۔ مدرسہ میں بڑے طلبہ چھوٹوں کو نماز کی ترغیب دے سکتے ہیں۔

زکوٰۃ کو خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے تاکہ حاجتمند فقیر تھوڑا سا حصہ اللہ کی ان نعمتوں میں سے پائیں جن سے غنی متمتع ہیں اور اس طرح افلاس اور مصیبت کم ہو۔ احکام زکوٰۃ مالداروں پر اس امر کو واجب کرتے ہیں کہ وہ ان نعمتوں میں جو ان کو اللہ نے دی ہیں اپنے غریب بھائیوں کو شریک کریں۔ اس طرح زکوٰۃ فقیر میں غنی کی محبت پیدا کرتی اور باہمی الفت کا سبب بنتی ہے اور اس کے رشتہ کو تمام قوم میں قوی تر کرتی ہے کیونکہ اس سے ایک دوسرے کی غمخواری پیدا ہوتی ہے اور قوم کے مختلف طبقوں میں دولت عام ہوتی ہے۔

ہمیں چاہئے کہ روزہ کے متعلق طلبہ کو یہ بتائیں کہ وہ روزہ دار کے لئے مفید ہے کیونکہ وہ صحت جسمانی کو درست کرتا اور روحانی غلبہ کو جسمانی غلبہ پر قوت دیتا ہے اور اس کو بھوک اور شکم سیری میں فرق سکھاتا ہے تاکہ وہ مساکین پر مہربانی کرے اور فقرا کو خیرات دے۔

اسی طرح ان کو حج کے بے شمار فوائد سے آگاہ کیا جائے، لوگوں کا مختلف ممالک سے جمع ہونا آپس میں تعارف و تعاون اور خیالات میں وسعت پیدا کرتا ہے اور تجارت اور

صنعتوں اور علم و ادب کو فروغ دیتا ہے اور ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے آداب سکھاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مصر سے حاجیوں کے سفر کا حال سنانا۔ حج کے قوانین و فوائد سمجھانے میں بہت مدد ہوگا۔ ہم طلبہ کو بتائیں کہ کس طرح مصر سے ہر سال خانہ کعبہ کے لئے غلاف بن کر جاتا ہے اور کس طرح محمل شریف مصر سے روانہ ہو کر خشکی اور سمندر کا سفر کر کے مکہ پہنچتا ہے۔ پھر مکہ سے مدینہ کو سفر کیا جاتا ہے۔ حاجیوں کا حال سنائیں اور جو اعمال وہ وہاں کرتے ہیں ان کو بیان کریں۔ پھر ان کا سفر مراجعت بیان کریں اور حجاج کو وطن میں صحیح و سلامت دیکھ کر عزیز و اقارب کی خوشی کا حال۔

سیدہ زکیہ عبدالحمید سلیمان

قاہرہ۔ ۱۸ رمضان ۱۳۴۶ھ

(۱۰ مارچ ۱۹۲۸ء)

معلم کی وضع نفسی

برلن یونیورسٹی کے جید استاد فلسفۂ تعلیمات پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر نے اپنی قابل قدر کتاب "اوضاع نفسی" میں اشخاص کی مثالیں قائم کی ہیں۔ اور اُنکا یہ نظریہ یانسن رنیگوارٹ، ریبو، پولھان، فوئیے، اسٹرن وغیرہ کے نظریوں سے زیادہ مفید ہے۔ انہوں نے ان انفرادی مثالوں کی امتیازی خصوصیت خالص نفسیاتی یا عضویاتی علامتوں کو نہیں ٹھہرایا ہے بلکہ ان صفات اور ان قوانین کو جو تمدن کے مختلف شعبوں میں کارفرما ہیں۔ انہوں نے اس طرح کی چھ نفسی مثالیں قائم کی ہیں، نظری یا علمی آدمی، تخئیلی آدمی، مذہبی آدمی، سماجی آدمی، اقتصادی آدمی اور سیاسی آدمی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی مثالیں محض خیالی ہوتی ہیں اور اُنکا وجود خالص صورت میں معدوم یا شاذ ہے۔ لیکن اس طرح کی مثالوں میں (اگر وہ نفس انسانی کی تمام ممکن صورتوں کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہوں) ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان سے ہمیں افراد کی طبیعت کے اہم رجحانات کو سمجھنے میں اور ان معیاروں کے مطابق اُنکی تعلیم کا انتظام کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ہم یہاں ان مثالوں کو تفصیل سے بیان نہیں کر سکتے۔ جنہیں اسکا شوق ہو وہ پروفیسر اشپرانگر کی کتاب پڑھیں۔ البتہ ہم ان میں سے ہر ایک کی ایک اہم علامت کا یعنی اس بنیادی قانون کا ذکر کریں گے جس کی وہ پابند ہیں۔

نظری آدمی وہ ہے جس کی نفسی نشو و نما کا رہنما قانون حقیقت یا سچا علم حاصل کرنیکا جذبہ ہوتا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ ہر چیز کی ماہیت اور حقیقت کی جستجو میں رہتا ہے۔

تخئیلی آدمی یا صناع حقیقت کے خارجی علم کا طالب نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے داخلی معنی کو جو اُسے خود اپنی واردات قلب کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں ظاہر کرتا اور اپنے عمل

سے حقیقت کا جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ نظری آدمی کی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ ایک چیز کے "ہیولے" کو پہنچانے اور سمجھے اور تخیلی آدمی چاہتا ہے کہ اُسے جس "صورت" میں اس چیز کا احساس ہوا ہے اسکا اظہار کسی طرح کرے۔

مذہبی آدمی اپنے فعل اور ترک فعل میں ان تعلقات کا پابند ہوتا ہے جو تمام مظاہر اور تمام واقعی اشیاء ایک برتر روحانی نظام سے رکھتی ہیں تاکہ اس کی اندرونی زندگی میں نفسیاتی ہم آہنگی اور خالص روحانیت کی بدولت سکون پیدا ہو۔

سماجی آدمی کی سیرت میں نوع انسانی کی نسبت کا قانون کارفرما ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی جبلت نہ تو علم ہے نہ صورت گری نہ موجودات کو کسی مافوق ہستی سے نسبت، دینا بلکہ زندہ انسانوں کی محبت، ہمدردی، شفقت اور ایثار۔

خالص اقتصادی آدمی وہ ہے جس کی سیرت میں اصول معاشی یعنی اس اصول کی حکومت ہو کہ کم سے کم محنت اور کم سے خرچ میں اشیا تیار کیجائیں یا حاصل کیجائیں یا پھیلائی جائیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھایا جائے۔

سیاسی آدمی وہ ہے جو قانون حکومت کا قائل ہو وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں پر اپنے ارادے کا سکہ اس طرح جمائے کہ وہ اس کی مرضی کے تابع ہو جائیں۔

اگر ہر نفسی مثال کے خالص نمائندے ہوتے تو ان میں سے ہر شخص ایک اعلیٰ مخصوص قانون کا پابند ہوتا۔ نظری آدمی قانون حق کا، اقتصادی آدمی قانون افادہ کا، سماجی آدمی قانون اُنس کا، جمالیاتی آدمی قانونِ ۔ ۔ ۔ کا، سیاسی آدمی قانون طاقت یا حکومت کا، مذہبی آدمی نجات حاصل کریگا۔

آپ نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا ہوگا کہ معلم سماجی مثال کی تحت میں آتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اچھے معلم کے دل میں حقیقت کی تلاش، کائنات اور زندگی کا تصور قائم کرنے کی آرزو نہیں ہوتی یا جمالیاتی قانون کا کم از کم اتنا اثر نہیں ہوتا کہ وہ بچہ کی ذہنیت کی تشکیل کسی مخصوص تعلیمی نصب العین کے تحت کرے۔ اسی طرح تاریخ تعلیم میں ہمیں جہاں کہیں

بھی کسی بڑے معلم کی شخصیت نظر آتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں مذہبیت بھی کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی پہلو نفس معلم کا مرکز نہیں ہے۔ اسکا مرکز صرف نوع انسانی کی محبت یعنی انس ہے جو شخص اپنی زندگی کسی دوسرے کی محبت کے لئے وقف نہیں کرسکتا وہ وہ ہرگز معلمی کے کام کا نہیں۔ پستالوزی کو جس چیز نے بحیثیت معلم زندہ جاوید بنایا وہ محض اسکا تعلیمی نظریہ نہیں بلکہ اصل میں اس کی زندگی ہے جو اس کی اصلی تعلیم کا منبع ہے۔ کتنا موثر ہے اُس زمانہ کا ایک واقعہ جب یہ تعلیم کا ہیرو انیفرٹن میں کامیابی کی آخری سیڑھی پر پہونچ چکا تھا۔ اس کی شہرت تمام یورپ میں پھیل گئی تھی اور دور دراز کے لوگ اس کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس وقت اس ستر برس بوڑھے کا دل اس آرزو سے بے چین تھا کہ سب کچھ چھوڑ دے اور جیسا اس نے ایک بار استانس میں کیا تھا اپنی زندگی یتیموں کے لئے کے لئے وقف کر دے اور انکی نازک، بیکس اور پژمردہ روحوں کی تربیت کرکے خالص "انسانیت" کی بلندی پر پہنچائے" باوجود اس قدر مشہور اور مرجع خلائق ہونے کے اُس کی شخصیت ایک گاڑی کے مانند ہے جو اس طرح سیدھی کھڑی ہے کہ اُسکا ڈھرا آسمان کی طرف ہے۔ اور اس کے پہیوں سے لڑکے کھیل رہے ہیں" اُس نے اشمٹ سے کہا تھا کہ "جبتک میں غریب بچوں کے لئے ایک دارالاقامہ کھول کر یہ نہ دکھا دوں کہ مفلس لوگ اپنی مدد آپ کس طرح کرسکتے ہیں اُسوقت تک میرا طریقہ تعلیم محض مدرسہ کے لئے مفید ہوگا نہ کہ زندگی کے لئے۔ اور میرا کام ادھورا رہ جائے گا"

جب ۷۹ برس کی عمر میں اُسے اپنی مجموعی تصانیف کی اشاعت کا معاوضہ پچاس ہزار فرانک لا تو بجائے اپنا قرض ادا کرنے کے اس نے کل رقم اس لئے وقف کر دی کہ اس کا سود نظریہ تعلیم اور عمل تعلیم کی ترقی میں یعنی دیہاتی مدارس کے معلمین اور معلمات کی تعلیم میں اور انیفرٹن کے قریب کلنڈی میں ایک غریبوں کا گھر قائم کرنے میں صرف کیا جائے۔ اور اس نے یہ امید ظاہر کی کہ جو ادارہ اس نے کلنڈی میں قائم کیا ہے وہ "یورپ میں ذہن انسانی

کو ایسی آزادی بخشے گا جو انقلاب فرانس کی آزادی سے مختلف ہوگی" اس کی یہ آرزو بھی پوری نہیں ہوئی مگر اس نے مرتے دم تک اس کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس کی عمر ۸۱ برس تک پہنچ چکی تھی کہ اس کے پوتے گاٹ لیب نے اس کی قیام گاہ کے قریب نیو ہوف ایک غریب بچوں کے گھر کی بنیاد ڈالی اور اگرچہ پیستالوزی جانتا تھا کہ اب وہ خود ان تیموں کی سرپرستی نہ کر سکے گا لیکن اس کی روح کو تسکین حاصل ہوگئی۔

اکثر پیستالوزی نے خود اپنے دل کی گہرائیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ اپنی عمر کے اس زمانے میں جب اُسے مایوسیوں نے بالکل گھیر لیا تھا وہ اپنا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "ایک شخص تھا جس کے دل میں بھولے پن کی مسرت تھی اور انسانوں پر عقیدہ تھا اتنا جتنا کسی کو نصیب نہ ہوگا اس کا دل دوستی کے لئے بنا تھا محبت اس کی جان تھی اور وفا اُس کی سرشت لیکن وہ اس دنیا کے لئے نہ تھا۔ اس کے کونے میں اس کے لئے جگہ نہ تھی" اپنے ایک دوست کو وہ اسٹانس کے قیام کا حال ان الفاظ میں لکھتا ہے "یہ بات کہ میرا دل ہر وقت اپنے بچوں میں لگا رہتا ہے ان کی راحت میری راحت ہے اور ان کی خوشی میں میری خوشی، ان بچوں کو صبح سویرے سے رات گئے تک ہر لحظہ میری پیشانی پر اور میرے لبوں پر نظر آئے گی" ۱۲ر جنوری ۱۸۱۸ء کو وہ تقریر کر رہا ہے۔ اُس کا پوتا جسے اس نے پچاس ہزار فرانک میں سے ایک حبہ بھی نہیں دیا ہے سامنے بیٹھا ہے اُس سے مخاطب ہو کر وہ کہتا ہے "تو نے میرے دل کی بات کہدی تو وہ ہونا چاہتا ہے جو میں ہوں وہ بننا چاہتا ہے جو میں ہوں۔ مگر یاد رکھ تو سونے اور چاندی سے میرا جیسا نہیں بن سکتا۔ میں جو کچھ ہوں اپنے دل کی بدولت ہوں۔ آ میرے زندگی بھر کے کام کو سنبھال۔ میں جس مقصد کے لئے یہ روپیہ وقف کیا ہے اسے اپنے دل میں جگہ دے . . تب تو وہ پائے گا جو میں نے پایا ہے اور وہ بنے گا جو میں ہوں"۔

پیستالوزی کے دل کی اس آواز کو سننے کے بعد ایک پروفیسر کے یہ الفاظ عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں کہ "علمی کی نفسی صلاحیت میں سب سے مقدم علم ہے" نہیں ہرگز نہیں

سب سے مقدم سب سے موخر سب کے وسط میں دل ہے، محبت ہے، جوش ہے، معلمانہ عشق ہے۔ غلط ہے اس پروفیسر کا یہ قول کہ "معلم کا دل جذبات اور جوش سے اس حد تک خالی ہونا چاہئے کہ اس کے ساتھ تشکیل کا شوق باقی رہے اور یہ بات علم سے حاصل ہوتی ہے"۔ برعکس اس کے معلمانہ عشق ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو تعلیمات کا گہرا علم حاصل کرنے پر اُبھارتا ہے۔ اس کی روشن مثال نقط پیستالوزی کی ذات ہی نہیں۔ ہر سچا ماہر تعلیم معلمانہ عشق کو معلم کی بنیادی نفسی صلاحیت قرار دیتا ہے۔ کاؤنٹ ڈونن برکاؤسکی اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں فرماتے ہیں "ایثار اور محبت سے نہ صرف عمل تعلیم میں جان پڑ جاتی ہے بلکہ نظریہ تعلیم اور طریقہ تعلیم میں علمی وحدت پیدا کرنے کے لئے بھی اسے بنیاد قرار دینا ضروری ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ وہ نظریہ تعلیم جس کا مرکز فلسفہ محبت اور نفسیات محبت نہ ہو کبھی کسی عملی نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا لیکن محبت کے معنی یہاں محض احساسات نہیں بلکہ دوسرے کو اپنی ذہنی دولت میں شریک کرنا ہے۔ محبت کرنے والا اپنا خزانہ اپنے محبوب کو نذر کرتا ہے۔"

غرض معلم نہ تو تعلیمات کی کتابیں پڑھنے سے بنتا ہے اور نہ عام علم و فضل سے۔ ڈونن برکاؤسکی کہتا ہے "فن تعلیم کی کتابوں کے انبار کی نسبت خود اُنکے مصنف بھی اگر ان میں وسعت نظر ہو۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے پڑھے بغیر کوئی تعلیم کا نام نہ لے"۔ جب پیستالوزی کو ہلویشیا کی جمہوری حکومت نے اسٹانس میں ایک یتیم خانہ قائم کرنے اور اسے چلانے پر مامور کیا اور وہ مدرس، نگراں اور خادم کی حیثیت سے شب و روز ستّر یتیم بچوں کی خدمت کیا کرتا تھا جس کی بدولت چند مہینے میں خود اس کی حالت قابل رحم ہوگئی تھی اس وقت تک وہ فن تعلیم کی ابجد بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ دل و جان سے تعلیمی اصولوں کے سمجھنے کی انتھک کوشش کررہا تھا لیکن چاہتا تھا کہ پہلے خود اپنے تجربہ سے تعلیم اور درس کی حقیقت کو سمجھ لے۔ اس کے بعد دوسروں کی مدد قبول کرے۔ بیشک آئندہ زندگی میں بھی وہ انتہائی انہماک اور محبت سے اپنے تعلیمی خیالات کو واضح کرنے اور نظریہ تعلیم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن

اس کی تحقیق اور اس کے عمل کا سرچشمہ وہی نوع انسان کی محبت تھی۔ یہ شخص جو دنیا کے سارے معلموں میں سب سے زیادہ منکسر تھا ایک بار برگ ڈورف میں اپنے ایک پرستار کارل رٹر سے جو آگے چل کر جغرافیہ کا بڑا ماہر مانا گیا، کہتا ہے "میں نہ تو گنتی جانتا ہوں نہ لکھنا نہ صرف و نحو نہ ریاضی میں تو صرف اس مدرسہ میں لوگوں کو بیدار کرنے کے لئے ہوں یہ دوسروں (نیڈرر، کریوسی، اشمڈ) کا کام ہے کہ جو میرے خیال میں ہے اُسے وہ عمل میں لائیں۔ میں قضا و قدر کے ہاتھ میں محض ایک آلہ ہوں"

۱۸۳۹ء میں کریوسی گائس کے نارمل اسکول کے طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے پیستالوزی کے اس قول کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے "مگر اصل میں یہ شخص جس نے یورپ کے مدارس میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ایسی چیز کا مالک تھا جو اسے کسی نصاب تعلیم کے پورا کرنے سے نہ حاصل ہوتی۔ وہ ذہن انسانی کی ماہیت سے اور اس کی تربیت اور ارتقا کے قانون سے واقف تھا وہ انسان کے دل کی حقیقت اور اسے زندہ کرنے اور اوج شرف پر پہنچانے کا طریقہ جانتا تھا . . . . . اس کی آنکھیں ہزاروں چیزوں اور ہزاروں تجربوں میں نوع انسانی کی رفتار ارتقا کا مشاہدہ کرتی تھیں"

اس بات کا کہ تعلیمات کا ماہر ہونے سے آدمی معلم نہیں بنتا۔ پیستالوزی کا جلیل القدر ہمعصر کانٹ بھی قائل تھا، اُس نے اُس ابتدائی زمانہ میں جب وہ کونگسبرگ میں معلمی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ فن تعلیم کے متعلق قابل قدر ہدایات قلم بند کی تھیں مگر خود صاف الفاظ میں اعتراف کرتا ہے کہ میں نے خود اپنے تعلیمی اصول پر کبھی عمل نہیں کیا اور مجھ سے بدتر اتالیق دنیا کے پردے پر شاید ہی ہو میں نے خود اپنے طویل تجربہ کے دوران میں جو مجھے بہ حیثیت انسپکٹر مدارس حاصل ہوا، یہ دیکھا ہے کہ ابتدائی مدارس اور ہائی اسکولوں کے جو مدرس فن تعلیم پر کتابیں لکھتے ہیں (اور بعض اچھی بھی لکھتے ہیں) اُن میں سے فیصدی چند ہی ایسے ہیں جو معلم اور مدرس کی حیثیت سے بھی امتیاز رکھتے ہوں۔ اور یہ کوئی عجیب

بات بھی نہیں ہے۔ نظری آدمی جس پر عقلیت کا اثر غالب ہوتا ہے، جو ہمہ تن مظاہر کی حقیقت و ماہیت کے ادراک میں محو ہوتا ہے اس میں سماجی آدمی کی صفات کہاں سے آئیں جس کی سیرت میں لاعقلی عنصر غالب ہوتا ہے اور جو دوسروں کی روح کا ادراک عقل سے نہیں بلکہ وجدان سے کرتا ہے؟ جو شخص نظرتہً اس پر مجبور رہے کہ ہمیشہ نئی معلومات حاصل کیا کرے اور اُن کی مدد سے اپنے خیالات کی ترتیب اور تدوین کو مکمل کرتا ہے اس کے لئے ہمیشہ یہ خطرہ ہے کہ معلمی کے پیشے میں جو چھوٹے چھوٹے کام روزمرہ کرنا پڑتے ہیں اور جن کو انسان محض محبت کی قوت سے انجام دے سکتا ہے وہ اس پر بار ہوتے جائیں گے۔ تعلیم کے اصل کام میں بھی خصوصًا مدرسہ کی تعلیم میں علمی پہلو کا جس میں نوجوان کی ذات کی "تحقیق" مدنظر ہوتی ہے تعلیمی پہلو کے ساتھ جس کا مقصد اس کی ذات کی تہذیب اور تشکیل ہوتی ہے جمع ہونا بہت مشکل ہے خواہ ایک ہی معلم میں نظری اور سماجی دونوں انداز طبیعت موجود ہوں۔

ابتدائی اور اوسط درجہ کے مدرسوں کے مدرس اپنے آپ کو بڑے شوق سے معلم کہتے ہیں اور پبلک انکے اس دعوے کو منظور کرتی ہے۔ ان کا دعویٰ اس بنا پر ہے کہ انہوں نے فن تعلیم اور نفسیات کا کم و بیش گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی تردید مندرجہ بالا بحث میں کافی کی جا چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ ابتدائی مدارس اور ہائی اسکولوں میں درس دینے کے چند طریقے سیکھتے ہیں جن کا سیکھنا مفید بھی ہے اور ضروری بھی کیونکہ تعلیم کے بعض طریقوں کی اہمیت اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ جو مضمون پڑھانا مقصود ہے وہ ابھی نامکمل ہے اور بجائے خود ایک فن نہیں ہے۔ اس لئے اب تک اس کا طریقۂ تعلیم اُس کے موضوع کی منطقی ساخت کا جزو نہیں بنا مثلاً درس مشاہدہ، معلومات عامہ زبان اور نوشت و خواند کی تعلیم کے ابتدائی مرحلے۔ یونیورسٹیوں میں جہاں طالب علم کو خالص علمی روح سے آشنا کرنا مقصود ہوتا ہے کسی مخصوص طریقۂ تعلیم پر زیادہ زور دینا فضول ہے کیونکہ خالص علم اور اس علم کا طریقہ یا منہاج دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں اور اس علم کی تحصیل ہی بغیر اس کے منہاج

کے توسط کے ناممکن ہے۔

البتہ ابتدائی مدرسوں، ہائی اسکولوں، پیشہ آموز اور صنعتی درسگاہوں کے مدرسوں کے لئے کسی مضمون کا طریقۂ تعلیم سیکھنا اہمیت رکھتا ہے مگر اس میں بھی کسی مضمون کی منطقی ساخت کے مطالعہ کی اتنی ضرورت نہیں جتنی طالب علم کی نفسی کیفیت کے مشاہدہ کی یا اس بات پر زور دینے کی کہ مدرسے خصوصاً پیشہ آموز اور صنعتی مدرسے اپنے اصلی مقصد میں کامیاب ہوں۔ مگر چونکہ طریقۂ تعلیم کا نفسیاتی پہلو مختلف طلبہ کے لحاظ سے اور اسکا مقصد و نشاء مختلف مدارس کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اس لئے کوئی ایسا طریقۂ تعلیم نہیں بتایا جا سکتا جو ہر صورت میں کام دے۔ چنانچہ پیستالوزی کی یہ ان تھک کوشش بھی بیکار ثابت ہوئی کہ ایسا طریقہ تعلیم دریافت کرلے جس سے ہر مدرس حتمی طور پر کامیاب ہو سکے جس کے استعمال سے بغیر طالب علم کی شخصیت کا لحاظ کئے ہوئے جملہ مقاصد حاصل ہو جائیں، مگر اس کوشش کے دوران میں اس نے ذہن انسانی کی ارتقا کے جو اصول دریافت کئے ہیں وہ دائمی قدر رکھتے ہیں اور ہر طریقہ تعلیم کی بنیاد انہیں پر ہے۔

ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ معلم کی شخصیت یا وضع نفسی سماجی مثال کی تحت میں آتی ہے جس کی نفسی خصوصیت کسی فرد یا کسی ایسی جماعت کی اخلاقی سیرت سے محبت کرتا ہے جس کے رکن استاد اور شاگرد دونوں ہوں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اگر اس معلم کی نفسی سیرت میں نظری مثال کا عنصر بھی شامل ہے تو جتنا گہرا یہ عنصر ہوگا اسی قدر اندیشہ ہے کہ اس کی خالص نظریہ تعلیم سے دلچسپی اس کی ذات میں معلمی کی عملی صلاحیت کو دبا دے گی۔ یہ اندیشہ اس صورت میں اور بھی بڑھ جاتا ہے جب معلم کی تعلیم میں سارا زور اسکے نظری رجحان کی تشکیل پر دیا جائے اور اس کے عملی رجحان کی طرف سے جس کا ابھارنا اس کے لئے کہیں زیادہ ضروری ہے بالکل توجہ نہ کی جائے۔

اس خطرے کی شدت کو پیستالوزی تک نے محسوس کیا ہے۔ وہ بہت افسوس کے

ساتھ شکایت کرتا ہے کہ برگ ڈورف اور ایفرٹن میں جہاں وہ محض طریقہ تعلیم کے خارجی پہلو کی تحقیق پر مصروف اور بچوں کی شخصیت کیطرف سے غافل تھا" طرح طرح کے غیر فطری اور غیر نفسیاتی تعلیمی تجربوں نے اس کے دل سے اس خالص اور بلند حقیقت کے زندہ احساس کو زائل کر دیا تھا جو ایک نوجوان کے تعلیمی نصب العین میں ہوتی ہے اور ان گمراہیوں میں مبتلا کر دیا تھا جو اس نصب العین کے بالکل برعکس ہیں"

لیکن محض اتنی بات جان لینے سے معلم کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ بہت سے ایسے پیشے ہیں جن کے لئے سماجی مزاج کے آدمی کی ضرورت ہو مثلاً پادری، طبیب، تیمار دار، بچوں کی کھلائی وغیرہ غالباً یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ سماجی (Social) اور اشتراکی (So-cialistic) میں باہم خلط مبحث نہ کر دینا چاہئے۔ اشتراکی لیڈروں کے لئے سماجی طبیعت رکھنا لازمی نہیں ان میں سیاسی عنصر ہوتا ہے اور بعض اوقات اسقدر غالب ہوتا ہے کہ سماجی عنصر بالکل دب جاتا ہے۔ برخلاف اس کے سماجی طبعیت والوں میں قوی مذہبی عنصر موجود ہوتا ہے اور یہ مذہبی انداز طبیعت کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر طبیعت کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ کی ذات میں ہمیں سماجی مثال خالص نظر آتی ہے جو سیاسی انداز سے کوسوں دور ہے جب تک دنیا قائم ہے اور نوع انسانی کو سماجی روح کے ذریعہ نجات کی آرزو ہے یہ صورت رات کی تاریکی میں بہ حیثیت ایک روشن نصب العین کے چمکا کرے گی جہاں تک انسان کا پہنچنا دشوار ہے۔

بعض لوگوں نے یہ بھی ثابت کرنا چاہا ہے کہ پستالوزی کی سیرت کا مرکز مذہبیت تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ خواہ پستالوزی میں مذہبی عنصر کتنا ہی قوی رہا ہو اور اس کے "فطرت" "مشاہدہ" "احساس"، "آدمیت"، "انسان کی بنیادی قوت" وغیرہ کے تصورات پر اس زمانہ کے مذہبی خیالات کا رنگ کتنا ہی گہرا نظر آئے اس کے نفس کی بنیادی ترکیب سماجی تھی۔

پستالوزی کی سیرت میں اس خالص سماجی بنیادی رجحان کے ساتھ علاوہ مذہبی پہلو کے

ایک قوی نظری پہلو بھی موجود تھا جو اینفرٹن کے قیام کے زمانہ میں غالب آ گیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ معلم کی سماجی ترکیب نفسی میں کونسی ایسی خصوصیت ہے جو اُسے اور سماجی پیشوں سے ممتاز کرتی ہے

اس کے پیشہ کو سب سے زیادہ مشابہت ماں کے کام سے ہے۔ اُس کی خدمت اور شفقت کا موضوع بھی ایک ارتقا پذیر انسان کا جسم اور اس کی روح ہے اور اس کے عمل کا سرچشمہ بھی نوع انسان کی محبت یعنی انس ہے۔ محبت کے ساتھ بہت سے فطری عناصر ایسے شامل ہو جاتے ہیں جن سے معلم محروم ہے۔ اس محبت میں عموماً شہوت جنسی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا یہ محض بعض ماہرین تعلیم نفسی کی من گھڑت ہے البتہ بعض اور اہم عناصر ہوتے ہیں مثلاً بچہ کی جسمانی کمزوری اور بیکسی دیکھ کر شفقت اور رحم کا جذبہ پیدا ہونا جو ماں کی خصوصیت ہے۔ علاوہ اس کے بچہ کو اپنی ملک سمجھنا، اس آرزو میں رہنا کہ بچہ بھی اس سے محبت کرے، یہ امنگ رکھنا کہ بچہ آگے چل کر عروج و کامیابی کے اس نصب العین کو حاصل کرے گا جو خود اُس کے دل میں پوشیدہ ہے ان احساسات کا غلبہ ان اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی ہوئی عورتوں تک میں ہوتا ہے جو اپنے بچوں سے "معلمانہ محبت" رکھتی ہیں، معلم کو بچہ کی ذات میں ایک انسانی قدر کا حامل نظر آتا ہے اور جس طرح اس کے دل میں قدور کی محبت اور اپنے ناقص ہونے کا کم و بیش احساس ہوتا ہے، اُسی طرح وہ اپنے کام کے موضوع یعنی اپنے شاگرد سے محبت کرتا ہے اور اس سے عقیدہ امید، محبت اور ادب کے ساتھ روحانی تعلقات قائم کرتا ہے اور جس طرح ہر تخلیقی قوت رکھنے والے انسان کو اپنے کام سے الفت ہوتی ہے جس میں اس کے نفس کی قدور صورت پذیر ہوئی ہیں اسی طرح معلم کو اپنے شاگرد سے الفت ہوتی ہے بلکہ معلم کی خلاقی میں اپنے موضوع سے محبت کرنے کا ایک ایسا پہلو ہے جو کسی اور تخلیقی کام میں نہیں ہو سکتا وہ موضوع جس کی وہ تشکیل کرتا ہے خود اسکا ہم جنس ہے۔ یہاں ایک روح بلا واسطہ دوسری روح کی تشکیل کرتی ہے۔ جتنا گہرا اندرونی طبعی اور اخلاقی رشتہ

ہوتا ہے اسی قدر روحانی رابطہ پیدا کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اور جس قدر روحانی رابطہ زیادہ ہوتا ہے اسی قدر دونوں روحوں میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ یہ معلمانہ محبت کی ایک بنیادی خصوصیت ہے جس کے ساتھ اور بہت سی ضمنی جذبات بھی شامل ہیں۔ محبت کا احساس ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ وہ انسان کے دل میں ہزار ہا شکلیں بدل کر آتی ہے۔ اس لئے محبت کی جامع اور مانع تعریف نہ کوئی آجتک کر سکا ہے نہ کر سکے گا۔

اس میں شک نہیں کہ ہر معلم کا کام روح کی خبرگیری کرنا ہے۔ لیکن اس میں اور پادری میں جو تنگ معنوں میں روح کی خبرگیری کرتا ہے فرق ہوتا ہے کیونکہ پادری بچہ کے دل میں مذہبی قدر پیدا کرنے کے لئے محض چند محدود ذریعوں سے کام لیتا ہے معلم میں اور اُس میں ایک بڑا فرق تو یہی ہے کہ وہ زیادہ تر محض بچے کی روحانی زندگی کی طرف توجہ کرتا ہے اور اس روحانی زندگی کے حامل یعنی جسم کی طرف سے غافل رہتا ہے۔ اس سے اکثر بڑا نقصان پہنچتا ہے خصوصاً خانقاہوں کے زنانہ مدارس میں۔ (مگر الحمدللہ اب یہ نقص آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے) دوسرا فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ پادری عموماً مذہبی قدر کو سب سے اہم سمجھتا ہے جس کا نتیجہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ وہ اُس قدر کی طرف بے توجہی کرتا ہے جو بچہ کی شخصیت میں سب سے نمایاں ہے اور جس کے لئے اُسے خاص طور پر تربیت دینا ضروری ہے بعض ایسے معلم بھی ہیں جو سچی سماجی طبعیت رکھتے ہیں مگر مذہب کا اثر ان پر بہت غالب ہے یعنی خود انکی سیرت میں مذہبی قدر دوسری قدر پر غالب ہے۔ یہ لوگ اپنی جمعیت خاطر کی بدولت معلموں کے بہترین نمونے ہیں اور میں انکا تہ دل سے احترام کرتا ہوں۔

جس طرح معلم پادری سے جداگانہ طبعیت رکھتا ہے اسی طرح وہ طبیب اور تیمار دار سے بھی مختلف ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں اگر سماجی رجحان بھی رکھتے ہوں اور انکے دل میں انس و محبت کے قانون کی فرمانروائی بھی ہو تب بھی ان کی خبرگیری کا موضوع عموماً محض جسم ہوتا ہے

لیکن تجربہ شاہد ہے کہ سماجی طبیعت کے یہ انداز بھی معلم کی طبیعت میں پائے جا سکتے ہیں۔

اب ہم معلم میں اور ان سماجی طبیعت کے لوگوں میں بھی فرق کرنا چاہتے ہیں جن کے مدنظر انسانوں میں قدور کا ابھارنا ہوتا ہے لیکن بچوں میں نہیں بلکہ بڑوں میں۔ ان میں نہ اسکا شوق ہوتا ہے نہ صلاحیت کہ اس ناسمجھ بچے کی خبر گیری کریں جو اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے ارتقائی حالت میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی معلم ہیں اور اصلی معنی میں معلم ہیں۔ سچ پوچھئے تو اکثر لوگوں کو عمر بھر تعلیم کی حاجت رہتی ہے اور خصوصاً ان کروڑوں آدمیوں کو جنہوں نے بچپن میں اس تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے جو انسان میں یہ احساس پیدا کر دیتی ہے کہ وہ قدور کا حامل ہے اور اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تعلیم دے۔ کسی نئے مذہبی، اخلاقی، سماجی، یا سیاسی خیال کے علمبردار، عوام کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھانے والے، نئے فلسفیانہ خیالات کا پرچار کرنے والے، نئے اصول زندگی کی تلقین کرنے والے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی طبیعت میں کوئی خاص کشش بچوں یا نوجوانوں کی طرف نہیں ہوتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ منجملہ اوروں کے وہ کبھی کبھی ان کی طرف بھی توجہ کریں بیشک یہ لوگ بھی انسانوں کی سیرت میں قدور پیدا کر دیتے ہیں لیکن انکے مدنظر افراد کے نفس کی تشکیل سے زیادہ خارجی نتائج ہوتے ہیں انکے تعلیمی عمل کا مقصد زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ جن مفید عام چیزوں میں انہیں اپنی محبوب قدور نظر آئیں اُن کی اہمیت لوگوں کو سمجھائیں اور انکی اشاعت کی کوشش کریں۔

چنانچہ اصل میں وہ اُن اداروں کی خدمت کرتے ہیں جن کا مقصد ان قابل قدر چیزوں کی ترقی اور اشاعت ہے اور انسانوں سے انہیں اس لئے تعلق رکھنا پڑتا ہے کہ ان چیزوں کی قدر صرف انسان ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم یہ دریافت کریں کہ اس قسم کے معلم کن قدور کی بدولت معلم بنے ہیں تو معلوم ہوگا کہ مذہبی اور اخلاقی قدور کی بدولت، اور ظاہر ہے کہ یہ قدور انسانوں ہی میں صورت پذیر ہو سکتی ہیں لیکن ان معلموں کو قدور میں انتخاب کا موقع بالکل نہیں۔ غالباً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان معلموں کو شخصیت کی مخصوص قدر کی طرف توجہ نہیں ہے

جو ہشیار اشخاص میں ظاہر ہوتی ہو۔ کیونکہ وہ انہیں لوگوں سے خطاب کرتے ہیں جن کی شخصیت پہلے سے ایک معینہ وضع کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ لیکن وہ معلم جو اپنی زندگی نوخیز شخصیتوں کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ بغیر اور قدور کو جنہیں وہ بچہ کی ذات میں ابھارنا چاہتا ہے صدمہ پہنچائے ہوئے اُس مخصوص قدر شخصیت کو ابھارنے پر زور دیگا جو بچہ کے نفس میں مخفی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قدر شخصیت دوران تعلیم میں تبدیج ظاہر ہوتی ہے لیکن معلم کو اسکا امکان ابتدا ہی سے پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اور ان بچوں سے جو کہ آگے چل کر اس قدر کے حامل ہوں گے محبت اور "ادب" سے پیش آنا چاہئے، کیونکہ جو حرمت کسی قدر میں ہوتی ہے وہ اس کے حامل کی طرف بھی منتقل ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معلم بھی کسی جماعت ہی کی خدمت کرتا ہے۔ مگر کیا اچھا ہو اگر پیستا لوزی کی طرح اس کی خدمات ساری انسانی جماعت کی اخلاقی ترقی میں صرف ہوں۔ کیونکہ جب تعلیم کا مقصد فرد کی اخلاقی تربیت قرار دیا جائے تو یہ مقصد اس جماعت کی اخلاقی تربیت کو جس میں وہ فرد رہتا ہے خود بخود سمیٹ لے گا۔

اس لئے اگر ہم نوجوانوں کے معلم کی ساجی مثال کو دوسری سماجی اوضاع نفسی سے ممیز کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں "معلم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی جماعت کی ذہنی خدمت کرتا ہو اور جس کی وضع نفسی سماجی طبیعت کی وہ خاص قسم ہو جو نوخیز اور خام کار بچے کو ابدی قدور کا حامل سمجھ کر اُس سے انس رکھتی ہو اور محض اُس اُنس کی بنا پر بچے کی مخصوص صلاحیت کے مطابق اس کے نفس کی مستقل تشکیل کر سکے اور اس عمل سے انتہائی روحانی مسرت حاصل کرے۔"

ہم یہ بات دوبارہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مخصوص معلمانہ رجحان کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہو کہ معلم میں تعلیم کا شوق اور تعلیم کی قابلیت ساجی طبیعت کے بنیادی قانون یعنی "انسان" کی محبت پر یا بالفاظ دیگر اعلیٰ انسانی قدور کے حاملوں کی محبت پر مبنی ہو۔ کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں معلمانہ جدوجہد کا شوق اکثر علاوہ سماجی رجحان کے دوسرے

رجحانات مثلاً مذہبی، یا جمالیاتی یا اقتصادی یا سیاسی انداز طبیعت پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ اور اگر یہ صورت ہو تو جو اثرات وہ دوسروں پر ڈالتے ہیں ان میں خالص تعلیمی عنصر نمایاں نہیں ہونے پاتا ایسی حالت میں عموماً جو تعلیمی اثر پڑتا ہے اس کا کوئی خارجی مقصد ہوتا ہے یعنی حسن یا افادہ یا نجات، یا قوت، یا علم میں سے کسی ایک کے نصب العین کے تحت مخصوص خارجی اغراض کے حاصل کرنے پر زور دیا جاتا ہے خواہ اثر قبول کرنے والے کے نفس میں اس کی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ محض اس صورت میں کہ معلم کو خود متعلم کے ارتقا پذیر نفس سے محبت ہو اور اس کی اخلاقی تشکیل سے دائمی مسرت ہوتی ہو۔ اس کا اطمینان ہو سکتا ہے کہ با وجود مخصوص خارجی مقاصد کو مدنظر رکھنے کے معلم ان مقاصد کا مرکز متعلم کی شخصیت کو قرار دیگا۔

ماکس شیلر نے اپنے رسالے میں جس کا نام ہے "نظریۂ احساسات ہمدردی کی تحلیل" یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ محبت اور تعلیم کا اجتماع ناممکن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبت کو اس کوشش سے کوئی تعلق نہیں کہ محبوب کی واقعی قدر میں اضافہ کرے یا اس کے اخلاق کی اصلاح کرے یا کسی طرح بھی اُسے اعلیٰ قدور کا حامل بننے میں مدد دے۔ اگر خود بخود (یعنی بلا ارادہ) محبت سے یہ نتائج پیدا ہوں تو دوسری بات ہے۔ اخلاقی تربیت یا اصلاح کا اصلی شوق معلمانہ رجحان طبع پر موقوف ہے اور اگر یہ رجحان پیدا ہوا تو یہ فوراً محبت، رخصت ہوئی اور یہ تمیز پیدا ہوگئی کہ اس شخص میں فلاں صفات ہیں اور فلاں نہیں ہیں جو اب ہونا چاہییں۔ محبت میں یہ فرق کرنا ناممکن ہے۔

شیلر کے نزدیک محبت ایک چیز کو دوسری چیز پر ترجیح دینے کو یا نفس کے ادنےٰ قدر سے اعلیٰ قدر کی طرف حرکت کرنے کا نام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یا تو انسان ایک قدر کو دیکھتا ہے اور کسی ادنےٰ قدر سے جو محض تصور میں ہے اس کا مقابلہ کرکے اس سے محبت کرنے لگتا ہے یا متعدد قدور کو دیکھ کر ان میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے"۔ بہر حال کسی موضوع یا حامل قدور سے محبت اسی وقت شروع ہوتی ہے جب نفس اُسے کسی ادنےٰ موضوع سے مقابلہ کرنیکے

بعد ترجیح دے۔

محبت کی یہ دو صندلی تعریف اگر صحیح بھی مان لی جائے تو یہ محبت کی کل قسموں پر حاوی نہیں ہے۔ خیر اسے بھی جانے دیجئے تو خود اس تعریف کے مطابق بھی محبت یعنی نفس کا ادنیٰ قدر سے اعلیٰ قدر کی طرف حرکت کرنا اور اخلاقی اصلاح کا شوق ایک چیز ہے۔ فرض کیجئے مجھ بھولے پن سے محبت ہے تو اسی کے ساتھ میرا نفس اخلاقی شعور اور خود مختاری کی طرف حرکت کرے گا جو اس سے برتر چیز ہے یا میں کسی تخلیقی کھیل کو پسند کرتا ہوں تو اسے دیکھ کر شوق پیدا ہوگا کہ یہ تخلیقی کام میں تبدیل ہو جائے جو اس سے اعلیٰ قدر ہے یا مجھے ادب کے سبب سے اطاعت کرنیکی ادا پسند ہے تو میں چاہوں گا کہ اس سے ایک درجہ بڑھ کر علم و یقین کی بنا پر اطاعت کیجائے۔ آخر محبت اخلاقی اصلاح کی خواہش کے منافی کیوں ہے۔ ہمارے خیال میں تو اخلاقی اصلاح اگر سزا کے ذریعہ کیجائے تب بھی محبت کے منافی نہیں ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ پرانا قول موجود ہے جس پر ہر خوش عقیدہ آدمی ایمان رکھتا ہے " خدا جس سے محبت رکھتا ہے اُسے سزا دیتا ہے "

۱۸۵۷ء سے مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد اور اسکے نتائج

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طلبہ کی بزم اتحاد نے ایک مضمون نویسی کا مقابلہ کرا تھا جس میں یہ مضمون انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ ہم ناظم صاحب بزم اتحاد کے ممنون ہیں جنہوں نے ہمیں یہ مضمون اس رسالہ میں شائع کرنے کی اجازت دی۔

(ادارت)

مسلمانوں کی علمی جدوجہد جس کی ابتدا غدر کے بعد نئی روشنی اور بیرونی حکومت کے زیر اثر شروع ہوتی ہے ایک انقلاب عظیم سے کم نہیں اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس انقلاب کے بیان سے پہلے اس زمانہ کے مسلمانوں کی مجموعی حالت پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔ بلاشبہ غدر تمامی ہندوستان کے لئے بلائے عظیم یا قہر ربانی تھا جس نے دیسی قوتوں کو فنا کرنے میں نمایاں حصہ لیا مگر ہندوستان کے باشندوں میں جس قوم نے سب سے زیادہ نقصان اٹھایا وہ ایک غافل، مفلس، ناعاقبت اندیش، عیاش اور جاہل فرقہ تھا جس کو "مسلمان" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسلمانوں کی پر جبروت حکومت جو خلفائے راشدین نے قائم کی، وہ عمارت جس کی بنیاد سلاطین سلجوق و شاہان عجم کے ہاتھوں پڑی، وہ تیموری سطوت اور دبدبہ جس کی بنیاد ہندوستان میں بابر اور ہمایوں نے ڈالی تھی۔ ایک خواب ہوگیا تھا اور ناممکن الوجود تصور کیا جانے لگا تھا وہ واقعات جو واقعی اور بدیہی تھے آج صرف کتابی اور خیالی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ سلطنت جس کا تسلط افغانستان سے بنگالہ اور ہمالیہ سے دکن تک تھا آج نااہل اور کاہل الوجود بادشاہوں کے ہاتھوں چند قصبوں اور دیہاتوں تک محدود ہوگئی تھی اس لئے اس زمانہ کے مسلمان فلسفہ اور تواریخ اور دوسرے علوم و فنون میں اپنے اسلاف سے کچھ مناسبت نہ رکھتے تھے۔

مروجہ تعلیم انگریزی سے مسلمان نفرت کرتے تھے تعلیم کی حالت اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ تعصب اور نارواداری مذہب کا دوسرا نام تھا۔ افلاس و تنگدستی مسلمانوں میں پھیل گئی تھی۔ سیکڑوں ہزاروں خصائص رذیلہ صرف اسی سبب سے پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن جب جہالت عام ہو تعصب و تنگ نظری گھٹی میں پڑی ہو، فرقہ بندی نے مذہب کو بازیچۂ طفلان بنا رکھا ہو، غرور اور نخوت نے دلوں کو برباد کر دیا ہو پھر اس قوم کی حالت کیا پوچھنا ؟ ع

وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

مسلمانوں کو حکومت کے لٹنے کا غم کھائے جاتا تھا۔ انکی غفلت اور توہم پرستی نے اُن کے قوائے عمل مضمحل کر دئے تھے۔ پیہم ناکامیوں اور مسلسل مصائب اور تکالیف نے ان میں ہلک قناعت پسندی پیدا کر دی تھی جو ہندوستان کی عام قدامت پرستی کے اثر سے اور زیادہ خطرناک ہوگئی مسلمانوں نے کبھی کسی زمانہ میں اپنے مذہب سے بے پروائی نہیں برتی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی شغف اور ذوق ہی انکی تمام جد وجہد کا باعث ہوا۔ مذہب کی حفاظت میں انہوں نے لڑائیاں لڑیں۔ مذہب ہی کے نام پر قربانیاں کیں۔ مذہب کی بزرگی اور شان کے لئے انہوں علم و فضل کو ترقی دی اور اسی جذبۂ مذہبی کے اثر سے انہوں نے ذاتی وجاہت اور قومی عروج حاصل کیا۔ مگر جب سیاسی زوال کا دور شروع ہوا تو یہ قومی جذبہ بھی تنزل کی طرف مائل ہونے لگا اور جس کو عام جہالت اور افلاس نے اور بھڑکا دیا۔ بدقسمتی سے حکومت جس قوم کو ملی وہ تہذیب و تمدن، مذہب اور قومی خصائل کے لحاظ سے ہندوستانیوں سے بالکل مختلف تھی۔ زبان کے فرق نے ان اختلافات کو اس درجہ بڑھایا کہ عام ہندوستانیوں کے دماغ میں اپنے حکمرانوں کی نسبت جو خیالات تھے وہ حقیقت سے کوسوں دور اور ایک تصویر خیالی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ طرز حکومت بھی ایسا ملا جس میں شخصی عنصر نظروں سے اوجھل اور تسلط و حکومت ہر جگہ نمایاں تھا۔ ہندوستانی اس طریقہ سے ناآشنا تھے۔ بالآخر بد گمانیاں بڑھنے لگیں۔ خود انگریزوں نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ ایسا تھا کہ اس نے ہندوستانیوں

کے دلوں میں ان سے نفرت و عداوت پیدا کر دی۔ مسلمان علما انگریزوں سے اور انکی زبان سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ان کو نجس و ناپاک سمجھتے تھے اور ان سے اسقدر کراہت کرتے تھے کہ اگر کوئی انگریز افسر کسی مدرسے کے ملاحظہ کو گیا اور اس نے مولوی صاحب سے مصافحہ کرنے کو ہاتھ بڑھایا تو بیچارے مولوی صاحب نے بھی اخلاقاً یا خوف سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ تو کر لیا مگر جیسے ہی انگریز افسر نے پیٹھ پھیری۔ انہوں نے مٹی منگائی اور خوب رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھونے لگے۔ شاید نجاست لگجانے پر بھی انکو اس قدر تردد نہ ہوتا ہوگا جتنا صرف مصافحہ کرنے سے۔ غدر کے زمانہ میں مسلمان مولویوں نے جہاد کا فتویٰ دیا مسلمانوں کو انگریزوں سے لڑنے کی ترغیب دی۔ اس زمانہ میں لفظ "نصاریٰ" کے معنی مسلمانوں کے جانی دشمن ہو۔ غرض ایسے واقعات پیش آتے گئے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اختلافات بڑھتے جاتے تھے جن کو پادریوں کی دریدہ دہنی اور نامناسب حرکات نے اور اشتعال دیا۔ مسلمانوں کو عام طور پر انگریزی زبان سے نفرت ہوگئی کہ کسی مسلمان کا انگریزی پڑھ کر کفر و الحاد کے فتوے سے بچ جانا ناممکن تھا۔ غرض جو شخص انگریزی پڑھتا تھا اس کو عام مسلمان نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے اور اس کو دین فروش اور بے دین کہا کرتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے بیگانہ ہوگئے۔ اور اپنے ہندو بھائیوں سے ان تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے۔

اس زمانہ میں جو سلسلہ تعلیم مسلمانوں کے یہاں رائج تھا وہ درس نظامیہ تھا۔ لڑکے عربی اور فارسی کی چند کتابیں پڑھکر مولوی اور عالم بنجاتے مگر زمانہ کی رفتار اور اس کی ضروریات سے ناآشنا رہتے تھے۔ چونکہ دفتر کی زبان انگریزی ہو چکی تھی اس لئے ان کو سرکاری دفتر کی امیدواری بھی کرتے تو انکو ادنےٰ نوکری ملتی تھی جس کی تنخواہ نہایت قلیل تھی۔ برخلاف اس کے انکے بھائی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ دولت، علم اور ہنر مندی میں دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ اپنے تنزل کے اصلی سبب دریافت کریں کیونکہ وہ تقدیر الٰہی کے زبردست قانون کے دباؤ میں تھے جو انکو اجازت نہ دیتی تھی کہ تضاد

قدرکے پھندے سے نکل بھاگیں، ادراک وفہم اور اصابت رائے کی قوت زائل ہوچکی تھی، حکومت کا ورق الٹ چکا تھا۔ پھر بھی یہ اپنی کمزوری سے واقف ہوئے اور نہ یہ تمیز کرسکے کہ وہ کون قوت ہے جو پردہ زنگار میں انکے خلاف کام کررہی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد حکومت، ہنگامہ بغاوت، مذہبی تعصبات، ذاتی عناد وکدورت، عام افلاس وجہالت نے ان کے تنزل کو اس آخری حد تک پہنچا دیا تھا جس کے بعد تباہی اور بربادی کی کوئی منزل باقی نہیں رہتی مگر نہیں معلوم مسلمانوں کی قوم نے مرنے سے پہلے سنبھالا لیا تھا یا حقیقت میں بیمار کے افاقے کی ابتدا تھی کہ ان میں۔

"گہ آری خلیلے زبتخانہ کنی آشنائے زبیگانہ"

دہلی کی خاک سے سر سید احمد خاں نامی ایک شخص نظرتاً دل درد مند لئے ہوئے پیدا ہوا۔ خدا نے اس کو مسلمانوں کی خیر خواہی اور اصلاح کی توفیق دی۔ اس نے طبیب حاذق وجہاں کی طرح مسلمانوں کے مرض کی تشخیص کی۔ یہ تشخیص صائب تھی اور اس کی تجویز کردہ دوا حکمی اور تیر بہدف! سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی اصلاح حالت کے لئے چند در چند تدبیریں کیں۔ انہوں نے پرزور مضامین اور لکچروں کے ذریعے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ تعلیم کے نہ ہونے سے تباہی کے کنارے آلگے ہیں۔ جس طرح کی تعلیم کے لئے زمانہ متقاضی تھا اسکا سامان بہم پہنچایا۔ پہلے مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کیں اور کرائیں کہ ان سے علمی مذاق ٹھیک ہوں اور ایک خاص اخبار اسی غرض سے جاری کیا، پھر انکو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ فرہاد کا شیریں کی خاطر جوئے شیر لانا تو خیر ایک ڈھکوسلا ہے۔ مگر اس عاشق قوم نے چندے سے علیگڈھ میں ایک عظیم الشان کالج قائم کیا جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی بے حسی پر نظر کرتے ہوئے کسی طرح جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اور جس کی مثال تمام ہندوستان بلکہ اسلامی دنیا میں کہیں نہیں۔ اس نے مذہب اسلام کے مختلف مسائل پر ایک زبردست سلسلہ کتب لکھا جس کا بیشتر اور ضروری حصہ قرآن کی تفسیر ہے۔ انگریزی تعلیم کی حمایت کی وجہ سے ان کو صدہا ذلتیں اور دشواریاں اٹھانی پڑیں مگر

اس دلدادہ قوم نے پاؤں پیچھے نہ ہٹایا۔ سرسید نے دیکھا کہ عام مصیبت و فلاکت کا علاج یہی ہے کہ اول قوم سے جہالت و تعصب، تنگ نظری اور پست ہمتی کو دور کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے مفید و اعلیٰ تعلیم کی وسعت اور ترقی ضروری تھی چنانچہ اس وقت سے انکی تمام کوششوں کا خواہ وہ سیاسیات میں ہوں یا مذہب و معاشرت کی اصلاح میں، مقصد اعلیٰ یہی ہو گیا۔ مسلمانوں کے علمی جد وجہد کا آغاز گویا سرسید کی ذاتی کوششیں ہیں سرسید نے طریقۂ تعلیم اور مشرقی علوم اور اپنی قوم کے سرمایۂ علمی پر بھی غور کیا تھا خود ہمیشہ علما اور اہل فن کی صحبت اٹھائی تھی۔ پہلے لوگوں کے حالات انہوں نے دیکھے تھے موجودہ طریقۂ تعلیم سے واقف تھے اس لئے وہ ہندوستان کے مروجہ مدارس اور انکے طریقۂ تعلیم کی نسبت رائے قائم کر سکتے تھے۔ لیکن انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی نسبت رائے قائم کرنے میں انکو بیشمار دشواریاں درپیش تھیں۔ اگر انکے نزدیک دو چار مدرسے قائم کر دینا کافی ہوتا تو اُس کے لئے شاید انکو زیادہ کد وکاوش کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ اپنی قوم کے تمام امراض کا علاج تعلیم ہی کے ذریعے کرنا چاہتے تھے اس لئے ضرورت تھی کہ جس تعلیم کو وہ جاری کرنا چاہتے تھے اس۔ کماحقہ واقفیت حاصل کریں اور پھر اپنے حالات اور ضروریات پر نظر کرکے جس قدر اور جس طریقہ سے مناسب ہو اسکا انتظام کر دیں۔ اس مقصد کے لے انکو خیال ہوا کہ یورپ کا سفر کرنا چاہیے۔ اگرچہ سرسید ہندوستان میں رہکر ترقی تعلیم کی نسبت رائے قائم کر چکے تھے۔ لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی حالت اس قدر تباہ ہے اور اس کی فلاح و بہبودی کی راہ میں اس قدر موانعات ہیں کہ ان کی کوشش جب ہی کامیاب ہو سکتی ہے کہ وہ ہر طرف ہاتھ پاؤں ماریں اور اصلاح و سعی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ وہ جانتے تھے کہ مغربی تعلیم جاری کرنی ہو تو مغربی تعلیم گاہوں کو دیکھنا چاہیے۔ اجتہاد فی الذہب کی نیا ڈالنی ہو تو تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو جاؤ۔ ملک کی حکومت اور سیاسیات میں اپنا دخل چاہتے ہو تو سول سروس میں شریک ہو۔ افلاس و تنگدستی کا رونا روتے ہو تو تجارت و صنعت کے سبق سیکھو۔ جہالت اور تعصب نے گھیر لیا ہے تو روشنی ڈھونڈ ہو خواہ وہ کہیں ملے۔ اس بناء پر ان کو سفر یورپ میں

بہت سے مفید امکانات نظر آتے تھے جن کا صحیح اندازہ گھر بیٹھے نہیں کر سکتے تھے۔ لندن پہنچ کر باوجود گوناگوں مصروفیتوں اور مشاغل علمی کے انکو اپنے کام کی برابر فکر رہی۔ اہل یورپ کی عام خوشحالی انکا تمدن وطرز معاشرت، انکی صنعت وحرفت اور تجارت، ان کا علم اور ان کی تعلیم گاہیں ایسی چیزیں نہیں تھیں کہ کسی نو وارد کو فوراً اپنی طرف متوجہ نہ کرلیں۔ لیکن سرسید کو ان تمام چیزوں اور بالخصوص تعلیم گاہوں کو غائر نظر سے دیکھنا تھا اور پھر مسئلہ تعلیم ہندوستان کے متعلق ایک رائے قائم کرنی تھی۔ وہ جو کچھ بھی دیکھتے تھے اسی مقصد سے اور برابر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ انکے خط کا اقتباس جو انہوں نے محسن الملک کے نام لکھا تھا ان کے تردد اور فکر پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"افسوس کہ ہندوستان کے مسلمان ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی انکا نکالنے والا نہیں ہے۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ نہ کرو۔ اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ رہ گیا ہے اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت اولاد کس طرح ہوتی ہے اور تعلیم اولاد کا کیا طریقہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے۔ انشاءاللہ میں یہاں سے واپس آکر سب کچھ کہوں گا مگر مجھ کافر مردود، گردن مڑوڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا۔"

سرسید نے کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر وہاں کے طریقہ تعلیم اور اصول تربیت کا بغور مطالعہ کیا اور دوسرے تعلیمی مرکزوں اور تجارتی کوٹھیوں اور صنعتی کارخانوں کے متعلق بھی معلومات فراہم کیں۔ تعلیم نسواں کے متعلق خصوصیت سے غور وفکر کی اور مسئلہ تعلیم کے متعلق اپنی رائے سب سے پہلے لندن ہی میں ایک پمفلٹ میں لکھکر ظاہر کی جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم کی خرابیاں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی تھیں۔ اہل وطن کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے

طویل مضامین بھیجتے رہے جن میں نہایت خلوص و درد کے ساتھ ابنائے وطن کو اہل یورپ کی ترقیات دولت وثروت اور علم و دانش پر توجہ دلاتے اور انکو اُن کی پستی اور غفلت پر متنبہ کرتے رہے۔ انکا مقصد یہ تھا کہ ان مضامین کے ذریعے وہ اپنی آئندہ کوششوں سے ملک کو روشناس کرادیں۔ اور اگر ہو سکے تو کچھ معاون اور ہمدرد پیدا کریں۔ بہر حال اس سفر سے ان نتائج کا ظہور یقینی تھا۔ اور جس جذبہ خدمت کو لیکر انہوں نے سفر کیا تھا اس کو یورپ کی ترقیات اور علم و دانش کی روشنی نے اور چمکا دیا۔ لندن سے واپسی کے بعد سرسید نے اپنی زندگی تعلیم اور فلاح قوم کے لئے وقف کر دی۔

سرسید کے پیش نظر اس دار العلوم کا ایک نقشہ تھا جس کو وہ علیگڑھ میں قائم کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے لندن ہی میں بہت کچھ تیاری کر لی تھی اور جس کام کی ابتدا ان کو یہاں کرنی تھی اس کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا بلکہ ایک حد تک اس کی ابتدا بھی کر دی تھی یعنی لندن ہی میں ایک تحریر بعنوان "التماس بخدمت اہل اسلام اور حکام ہند در باب ترقی تعلیم مسلمانان ہند" چھپوا کر نواب محسن الملک کے پاس بھیدی تھی اور وہ اس کو ہندوستان میں تقسیم کرادیا لیکن ان کو ہمت نہ ہوئی اور بالآخر سرسید ہی نے اس کو جا بجا روانہ کیا۔

جس کام کو سرسید کرنا چاہتے تھے اس کے لئے مسلمان بالکل تیار نہ تھے اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جب تک ابتدا میں چند رفقا اعانت کے لئے نہ اٹھیں اور عام طور پر قوم میں اسکا چرچا نہو۔ انکا کام خوش اسلوبی سے نہیں چل سکتا۔ اس کام کو اس سے قبل بھی تھوڑا بہت کرتے رہے تھے مگر اب چاہتے تھے کہ پورے زور و قوت سے تحریک اصلاح شروع کی جائے۔ اس مقصد سے اُنہوں نے اخبار تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ تہذیب الاخلاق نے اصلاح معاشرت، مذہب و تمدن اور اخلاق پر خصوصیت سے زور دیا۔ عام مسلمانوں کی قدامت پسندی کو اس کے مضامین سے سخت ٹھیس لگتی تھی، اس لئے اختلاف اور برہمی کا طوفان امنڈ آیا اور مذہبی اختلافات نے ایک نئے فتنہ کی صورت اختیار کر لی لیکن یہ ضرور ہوا کہ اصلاح کی آواز اطراف ہند میں مسلمانوں

تک پہنچ گئی اور ایک ایسی جماعت بھی پیدا ہوگئی جو سرسید سے ہمدردی کرنے لگی۔

سرسید نے مسلمان امرا، اور با اثر اصحاب کو متوجہ کرکے ایک "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی اور اس کمیٹی نے ایک انعامی مضمون کا اعلان کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مضمون نگاران امور سے بحث کریں جن کے باعث مسلمانوں میں انگریزی تعلیم مقبول نہیں ہوتی اور وہ انگریزی مدارس اور کالجوں میں اپنی اولاد کو بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ علوم قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے ہیں وغیرہ وغیرہ مضامین جو مقابلہ کے لئے آئے ان کی تعداد ۳۲ تھی اور ان میں سے ۳ کو انعام دیا گیا اس کے اثر سے کمیٹی اس نتیجہ پر پہونچی کہ مسلمانوں کا وہ تعصب جس کی بنیاد پر وہ مغربی تعلیم سے گریز کرتے ہیں۔ قابل افسوس ہے۔ لیکن اس زمانہ کی سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں جو تعلیم جاری تھی وہ مسلمانوں کے لئے مناسب نہ تھی، اس لئے کمیٹی نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مسلمان اپنی ضروریات کے مطابق خود ایک دارالعلوم قائم کریں جس میں علوم مشرقی اور مغربی کی تعلیم کے ساتھ مذہبی اور قومی تعلیم کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے مجوزہ درسگاہ کے لئے ایک اسکیم بنائی مگر ایسے عظیم الشان کام کا قیام بغیر مالی امداد کے ممکن نہ تھا اس لئے ایک دوسری کمیٹی موسوم بہ "کمیٹی خزینۃ البضاعۃ" کی بنیاد ڈالی۔ اس کمیٹی نے اپنے کام کو نہایت محنت و خوبی سے انجام دیا۔ جب کافی سرمایہ جمع ہوگیا تو سرسید نے بذریعہ اعلان کے استفسار کیا کہ مدرسۃ العلوم کہاں قائم ہونا چاہئے اور بالآخر کثرت رائے سے قرار پایا کہ علیگڑھ میں قائم ہو۔

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے یہ تجویز کی کہ مدرسہ کی ابتدا ایک چھوٹے اسکول سے کردینی چاہئے تاکہ وہ مسلمان جو سرسید کے مقاصد کی مخالفت کرتے ہیں۔ نصاب تعلیم اور طریق تربیت کو دیکھ کر خود فیصلہ کرسکیں کہ آیا یہ اصول تعلیم انکے عزیزوں کے مناسب اور فائدہ مند ہے یا نہیں اور انکو یہ دیکھنے کا موقع ملے کہ طلبہ کو جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں کونسی کتاب کفر و الحاد کی ہے جن کی وجہ سے طلبہ نیچری اور کرسٹان بن جاتے ہیں۔ غرض مئی ۱۸۷۵ء

میں مدرسہ کا افتتاح ہوا اور جون سے ابتدائی تعلیم باضابطہ شروع ہوگئی۔ سرسید بسلسلہ ملازمت علیگڈھ سے بہت دور بنارس میں پڑے ہوئے تھے۔ اب وہ اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے ۱۸۷۶ء میں پنشن لیکر مستقل قیام کے لئے علیگڈھ میں آگئے۔ اور ہمہ تن قیام کالج کی تجاویز اور دوسرے قومی کاموں میں منہمک ہوگئے۔ تھوڑی ہی مدت میں انکی کوششیں اس قدر کامیاب ہوئیں کہ ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے مجوزہ علیگڈھ کالج کا سنگ بنیاد نصب کیا۔ سرسید کا مقصد اس سے زیادہ بلند تھا۔ اور وہ علیگڈھ کو مسلمانوں کا ایک ایسا تعلیمی مرکز بنانا چاہتے تھے جہاں وہ اپنی تعلیم کا انتظام اپنی قومی کیرکٹر اور ذہنیت کے مطابق خود اپنے ہاتھوں سے کریں۔ اغیار کو اس میں مطلق دخل نہ ہو۔ نیز اعلیٰ تعلیم کو اس حد تک فروغ دیا جائے کہ مسلمانوں کی گذشتہ علمی عظمت دوبارہ تازہ ہو جائے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علیگڈھ اپنے اقتدار کو اس کام میں لائے کہ اسکی مشعل علم اطراف ہند میں مسلمان گھروں کے علمی چراغ روشن کرے اور مسلمانوں میں وہ بصیرت، اولوالعزمی اور بلند نظری پیدا ہو جائے جو انکو ترقی یافتہ قوموں میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے قابل بنائے اور انکی قدامت پسندی تنگ خیالی اور توہمات کو دور کر سکے۔ ان مقاصد کے اعتبار سے علیگڈھ کو کم از کم یونیورسٹی ہونا ضروری تھا اور سرسید نے اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر ابتدائی مدرسہ کا افتتاح کیا۔ اگر دیہ مختلف دشواریوں نے علیگڈھ کو فوراً یونیورسٹی نہیں بننے دیا تاہم جس تیزی سے وہ اس مقصد کی طرف بڑھتا گیا وہ تاریخ ترقی تعلیم میں ایک غیر معمولی مثال ہے۔ ابتدائی مدرسہ قائم ہوئے ابھی تین برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاس قائم ہو گئے اور ۱۸۸۱ء میں ایم۔ اے تک اور ۱۸۸۲ء میں قانونی امتحانات بھی کھول دیئے گئے۔ چنانچہ ایک مقصد یعنی مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم کا انتظام تو اس قدر قلیل مدت میں پورا ہو گیا لیکن سرسید کا مشن محض ان منازل کی تکمیل سے نہیں بلکہ ان کے نتائج سے متعلق تھا۔ اس لئے اسکی وقت ابھی کچھ دور تھا۔ با ایں ہمہ سرسید کی خدمات کی فہرست علیگڈھ کالج ہی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے ذیل میں ہم انکے بے شمار خدمات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے نصاب تعلیم کے بارے میں اپنا وہ مشرقی علوم

کے حامی ضرور تھے مگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ کالجوں اور اسکولوں میں فارسی وعربی زیادہ پڑھانیکی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں انگریزی کی اعلیٰ تعلیم ضروری ہے وہ مشرقی علوم کی ترقی صنعتی تعلیم کے شوق کو حالات موجودہ کے لحاظ سے مفید نہیں سمجھتے تھے چنانچہ پنجاب میں مشرقی علوم کی ترقی کے لئے گورنمنٹ نے یونیورسٹی کی تجویز پیش کی تو سب سے پہلے سرسید نے بھی اس کی مخالفت کی۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

" . . . چند سال گزرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا) انکو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں ہے اور وہ ہم کو اس قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جسقدر اس کو ضرورت ہے وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس کو انتظام ملک اور انتظام دفتر کے لئے چند ایسی تیلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں۔ مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے کہ مانچسٹر میں سوت کاتنے کے لئے تیلیوں کی ضرورت ہے جو کچھ کہ وہ (یعنی گورنمنٹ) ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی اس کا شکرگزار نہ تھا۔ اس لئے کہ اس کو خود غرضی پر محمول کیا یا تھا نہ رعایا پروری پر۔ کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا (یعنی جبکہ ہندوستان میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں) کہ ہندوستانیوں سے یہ بدخیال دور ہوا تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالیسی بدل دی ہے اور درحقیقت اس کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا مقصود ہے مگر ہندوستانی خوف کرتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبران سلطنت کی پالیسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ تعلیم دینا مناسب نہیں سمجھتے۔"

انہوں نے علوم مشرقی کے متعلق خصوصیت سے ایک مضمون میں اپنی رائے ظاہر کی ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجہ کی مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں اُن پنڈتوں کی برابر نہیں بنا سکا - جو دھوتی باندھے کمری پہنے، منکنگا اور شوالہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھکر اپنی مقدس زبان سنسکرت کی تحصیل کرتے ہیں مگر ان کی تحصیل سے ملک کو بجز اس کے کہ بنارس میں دس پانچ منگتا پنڈت اور زیادہ ہوگئے کیا نتیجہ حاصل ہوا ؟ یونیورسٹی کالج نے بدخشاں اور بلخ کے طالبعلموں کو جو کچھ تعلیم دی ہو اسکا حال معلوم نہیں مگر آجتک (ہندوستان میں) اس نے ایک کو بھی عربی فارسی میں ان لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنہوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور درود و فاتحہ کی روٹی پر گزران کرکے عربی فارسی علوم کی تحصیل کی اور اعلیٰ درجہ کا تبحر ان میں پیدا ہوگیا - مگر اسکا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوا کہ مردوں کی روٹیاں کھانے والے اور زیادہ ہوگئے، ملک کو ان سے کیا فائدہ پہنچا - اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہوجائے اور ہم کو مشرقی علوم میں ویسی ہی تعلیم دی جائے (گو ویسی تعلیم ممکن بھی نہیں) تو بجز اس کے کہ چند بھکاری اور چند فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملک میں اور زیادہ ہوجائیں کیا نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے. ہم کو صاف صاف بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو پروفیشنسی اور ہائی پروفیشنسی کا خطاب مرحمت فرمائے ہیں - وہ کس مرض کی دوا ہیں - ان سے ملک کو، قوم کو، اسکی حکومت کو، اس کی تجارت کو، اس کے اخلاق کو، اس کی روشن ضمیری کو اور اس کی وسعت خیالات کو کیا فائدہ پہنچا یا آئندہ پہنچ سکتا ہے - ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس تعلیم سے مقصد یہی ہے کہ ایسے نہ ہونے پائیں تو سب کچھ تسلیم کیا جا سکتا ہے"

سرسید کی ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدید تعلیم میں علوم مشرقی کے یکسر مخالف تھے اور قدیم طرز تعلیم کو محض لغو اور بے سود قرار دیتے تھے - لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے

وہ بلاشبہ قدیم طریقۂ تعلیم میں مناسب ترمیم اور نصاب تعلیم میں ضروریات زمانہ کے مطابق تبدیلی چاہتے تھے۔ لیکن وہ ہندوستانیوں کو ان علوم سے بے بہرہ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہندوستانی زبان کے ذریعے سے ابتدائی تعلیم کے مخالف تھے۔ البتہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ محض قدیم طریقۂ تعلیم اور اپنی ہی زبان پر اکتفا کیا جائے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں اور زیادہ صاف کر دیا۔ ہندوستانی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے متعلق انہوں نے بیان کیا کہ۔

"ان ورنیکلر اور انگریزی پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جنکا مقصد طالب علموں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے واسطے تیار کرنا نہیں ہے مغربی علوم کا جہاں تک کہ وہ ان میں پڑھائے جاتے ہیں ورنیکلر زبان میں پڑھایا جانا بیشک ملک کے حق میں بہتر ہوگا مگر انگریزی ابتدائی اسکولوں میں جو اس غرض سے قائم کئے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک زینہ کے کام میں آئیں ورنیکلر زبان کے ذریعہ یورپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے۔"

تعلیم نسواں کے بارے میں سرسید ایک خاص رائے رکھتے تھے انکا خیال تھا کہ پہلے مردوں کو اچھی طرح تعلیم حاصل کر لینا چاہئے۔ جب تعلیم یافتہ مردوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو جائے تب عورتوں کی تعلیم کا سامان کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مقررہ کمیشن کے سامنے یہ رائے پیش کی۔

"عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ اس فلاسفر کے سوال سے مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا۔ جن شخصوں کی رائے یہ ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہئے وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس

وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے
کافی ہے جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و
تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے جبکہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی
تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائیگی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اسکا ضرور بالضرور
ایک زبردست گو خفیہ اثر پہنچے گا "

سرسید جس مقصد کے حصول میں لگے ہوئے تھے اسکا دار و مدار محض ایک مرکزی کالج اور یونیورسٹی پر نہیں ہے بلکہ انہوں نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام اس مکمل طریقہ سے کیا ہے جو آجتک باقی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ نسلاً بعد نسل مسلمانوں میں قائم اور ترقی پذیر رہے گا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کو انکی آئندہ علمی ترقیات اور تعلیمی بیداری کا سنگ بنیاد قرار دینا بیجا نہیں لیکن محض اعلیٰ تعلیم ہی اس مقصد کا ذریعہ نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ مسلمانوں میں عام تعلیمی بیداری کی ضرورت تھی اور جن موانع اور مشکلات کا مقابلہ ضروری تھا اس کے لئے ایک جداگانہ نظام کی ضرورت تھی اور اسی مقصد سے ۱۸۸۶ء میں محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں قائم کی گئی۔ اس کانفرنس کی کوششیں اور اس کی کارروائیاں گویا مسلمانوں کی جد و جہد کے خاکے ہیں۔ اسکا پہلا اجلاس علیگڈھ میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کے مقاصد ابتدا میں یہ تھے۔

(۱) مسلمانوں میں مغربی علوم کی اشاعت۔
(۲) مسلمانوں کے انگریزی مدارس میں تعلیم مذہبی کی نگرانی و ترقی۔
(۳) علوم مشرقی و تعلیم مذہبی کے موجودہ مدارس کی ترقی و استحکام کی تدابیر۔
(۴) مکاتب قرآن خوانی کی وسعت و ترقی کی کوشش

ان مقاصد کے علاوہ کانفرنس کی ترقی اور ہر دلعزیزی کے ساتھ دوسری ضروری کاموں پر بھی توجہ شروع کی گئی۔ یعنی :-

(۱) تعلیم نسواں۔

(۲) فراہمی کتب نادرہ و قلمی کتبہ جات۔

(۳) اشاعت و ترقی اردو وغیرہ

باوجود اس کے کہ سرسید باقی نہ رہے انکی قائم کردہ یادگاریں رفتہ رفتہ پھولتی پھلتی رہیں۔ کانفرنس کی اس تبلیغ اور پیہم سعی و کوشش سے آہستہ آہستہ ملک کی فضا میں تبدیلی پیدا ہوگئی اور کالج و اسکول طلبہ سے معمور ہوگئے۔ گویا مسلمانوں کی علمی ترقی اُسی کانفرنس کی سعی و تدابیر اور اس کے دائرہ عمل کی وسعت کا نتیجہ تھی۔ ایک خاص فائدہ اس عہد میں کانفرنس کے قائم ہونے سے یہ ہوا کہ مسلمان قبل از وقت سیاسی تحریکات میں شامل ہونے سے محفوظ رہے۔ کانفرنس کے قیام سے ایک سال پہلے نیشنل کانگریس قائم ہو چکی تھی اور تعلیم یافتہ ہندوؤں نے سیاسی جد و جہد کا آغاز کر دیا تھا لیکن مسلمانوں میں ابھی تک کوئی ایسی جماعت پیدا نہیں ہوئی تھی جو مغربی علوم سے آشنا ہو اور سیاسیات میں صحیح طریقہ سے اپنی قوم کی رہنمائی کر سکے، اگر مسلمانوں کا رجحان اس وقت پالٹکس کی طرف ہو جاتا تو تعلیمی سائی کو صدمہ پہنچتا، اور کیا تعجب تھا کہ مسلمان پولٹیکل ایجیٹیشنز میں مبتلا ہو کر تعلیم سے محروم رہ جاتے، سرسید کی انجام بیں نگاہوں نے اس حالت کو محسوس کیا اور ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کو قبل از وقت سیاسیات میں حصہ لینے سے روک کر تمام تر تعلیم کی طرف متوجہ کر دیا۔ کانفرنس کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال بعد مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ مسلمانوں کی سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ انکو تعلیم دیجائے جو ہر قسم کی قومی ترقیوں کا سرچشمہ اور سنگ اساس ہے۔

سرسید کی کوششوں میں انکے سعادتمند فرزند سید محمود نے بہت مدد دی۔ سرسید کو انگریزی نہ جاننے کے سبب سے بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا مگر سید محمود اپنے نامور باپ کو واقفیتوں اور اطلاعوں کے بہم پہنچانے میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی طرح مسلمانوں کے سچے بہی خواہ اور تعلیم کے دلدادہ تھے انکے خیال [illegible] کہ ایسے تعلیم گاہ [illegible]

سنگ بنیاد رکھنا چاہئے تھا جو مسلمانوں کی کل ضروریات کو پورا کر سکے۔ انہوں نے خزینۃ البضاعۃ کے اجلاس منعقدہ ۱۰ فروری ۱۸۷۳ء میں یہ تجویزیں پیش کیں۔

(۱) سب سے پہلے مجھکو یہ بیان کرنا چاہئے کہ بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگراں حال رہے اور کسی قسم کی مداخلت گورنمنٹ کی اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہئے۔

(۲) اس دارالعلوم کے پاس مستقل آمدنی اسقدر ہونی چاہئے کہ بیرونی مدد کا محتاج نہ رہے۔

(۳) وہ علوم بھی جو کہ روزمرہ کار آمد تو نہیں ہوتے مگر ان سے ذہن کو اور لیاقت و استعداد کو ترقی ہوتی ہو اس دارالعلوم میں پڑھائے جائیں۔

(۴) ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ جو طالب علم سلسلۂ تعلیم میں ہو اسی کے ساتھ اس کو انعام اور وظیفہ بھی ملے۔

(۵) سلسلۂ تعلیم ختم ہونے کے بعد اگر کسی طالب العلم کی عمدہ کامیابی تحصیل علوم میں ثابت ہو تو اس کو بلا شرط خدمت صرف اس کے ترقی علوم میں مصروف رہنے کے صلہ میں ایک معتدبہ وظیفہ ملنا چاہئے۔

(۶) طالب علموں اور وظیفہ ترقی علوم پانے والوں کا دارالعلوم میں رہنا اور اس کے قواعد کا پابند ہونا شرط تعلیم کے ضروری سمجھنا چاہئے۔

آج مسلم یونیورسٹی جو اس وقت موجود ہے اسکا خاکہ سید محمود کا کھینچا ہوا تھا۔ انکا علم وسیع، طبیعت سلیم اور دل پاک تھا جس نے ان کو عالی خیال بنایا اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے انکو تیار کیا جج سے مستعفی ہو کر وہ قوم کی خدمت میں یکسر مشغول ہو گئے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۱۸۹۳ء میں سید محمود نے وہ بے نظیر لکچر دیا جو آجتک قوم کو یاد ہے۔ اس لکچر میں انہوں نے انگریزی تعلیم کی صدسالہ تاریخ پر زبردست بحث کی جس کی تعریف نواب محسن الملک ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"درحقیقت اس لکچر کی نسبت کچھ کہنا فضول ہے۔ ہم اس کی ترتیب کی تعریف کر سکتے ہیں نہ اس کے نقشوں اور ڈائیگرموں کی خوبی بیان کر سکتے ہیں۔ مگر انکی تحریر اور تقریر اور الفاظ و معانی اور طرز ادا اور جوش بیان نے جو اثر دلوں پر کیا ہے اور جس ظرافت آمیز فصاحت سے انہوں نے تاریخی حالات بیان کئے ہیں جس خوبی سے انہوں نے اپنی قوم کی تعلیم کی سچی تصویر کھینچی ہے اور جن دردناک واقعات کو انہوں نے بیان کیا ہے۔ ان سب باتوں نے من حیث المجموع ایک ایسی حالت ظاہر کر دی ہے کہ اس کی کیفیت سننے والوں کے دل جانتے ہیں۔ اسے کوئی کس طرح بیان کر سکے۔ درحقیقت اس لکچر کی نسبت یہ کہنا کہ "عطر آنست کہ خود ببوید نہ آنکہ عطار بگوید" ایک حکایت نفس الامری ہے نہ شاعرانہ مثال ہیں جانتا ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ کیسی محنت اس لکچر کی تیاری میں لکچرار نے اٹھائی ہے اور کتنی کتابیں اور کتنے ہزار صفحے اس کے لئے اس یار عزیز نے پڑھے ہیں اور کس قدر مواد جمع کرنے کے لئے اس کو زحمت اٹھانی پڑی۔ کن کن باغوں میں وہ گئے اور کہاں کہاں سے وہ پھول لائے جس کا عطر کھینچ کر اس وقت آپ کے سامنے پیش کیا اور جس سے اس بات کا کہ سید عطر فروش ہوا کرتے ہیں انہوں نے ثبوت دیا۔"

اسی سلسلہ کا دوسرا لکچر بھی انہوں نے ۱۸۹۱ء میں دیا اور مفید اور ضروری تحریکات کانفرنس میں پیش کرتے رہے۔ ۱۸۹۵ء کے اجلاس کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں اردو کی وسعت اور ترقی کی غرض سے ایک رزولیوشن انہوں نے پیش کیا تھا کہ۔

"بنظر اس امر کے کہ انگریزی تعلیم کی کتنی ہی اشاعت ہو جائے تاہم سب سے بڑا حصہ مسلمانوں کا اس زبان سے لازمی طور پر ناآگاہ رہے گا۔ اس لئے ہر انگریزی داں مسلمان کا جو کافی قابلیت رکھتا ہو یہ فرض اخلاقی اور قومی ہے کہ کم سے

کہ ایک کتاب اپنے مذاق کے موافق انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرکے شائع کرے یا
ایسی کتاب تالیف کرے جس میں وہ مفید مضامین ہوں جو انگریزی کتابوں سے ماخوذ
کئے گئے ہیں اور مسلمانوں میں یورپین علوم کی آگاہی پھیلانے کے لئے مفید
ہوں۔

اُنھوں نے اتنا ہی نہ کیا کہ پلیٹ فارم پر ایک تحریک پیش کردی بلکہ خود اُنھوں نے قانون شہادت پر ایک مفصل شرح لکھی۔

اسی زمانہ میں مسلمان علماء نے ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی۔ ندوہ کے قائم ہونے پر کچھ لوگوں کو اعتراض تھا انکے جواب میں سید محمود نے کہا کہ درحقیقت ندوہ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد میں باہم کسی قسم کا تناقص نہیں ہے۔ اس ندوۃ العلماء کے قائم کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے ترقی کے اس صیغہ کی طرف توجہ کی کہ جس سے اشاعت علوم دینی اور استحکام عقائد اسلام مقصود ہے۔ نواب محسن الملک کا بھی خیال تھا کہ ندوۃ العلما کا مقصد دینی علوم کی ترقی ہے لہذا اس کانفرنس کے مقاصد سے اس کے مقاصد متناقض نہیں، اور اس لئے اس کانفرنس کو اس کے ساتھ یگانگت اور ہمدردی کرنا چاہیے۔ سید محمود کی خدمات کو قوم فراموش نہیں کرسکتی مگر افسوس ہے کہ وہ جب سکریٹری ہوئے تو اپنا کام اچھی طرح انجام نہ دے سکے اس لئے وہ دس ماہ بعد اس عہدے سے معزول کردئے گئے اور انکی جگہ پر نواب محسن الملک سکریٹری ہوئے۔

اب نیا دور نواب محسن الملک کا شروع ہوتا ہے۔ نواب صاحب سرسید کے جاں نثاروں میں میں تھے۔ ان کی مدد اور توجہ سرسید کو برابر بہرہ رہا۔ دونوں میں غایت درجے محبت تھی اس لئے نواب صاحب نے سرسید کی یادگار قائم رکھنے میں نہایت مستعدی سے کام لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ کالج اور قومی مقاصد کے لئے نہایت پرآشوب تھا کالج مالی لحاظ سے دیوالیہ ہوچکا تھا۔ مالی اعتماد اٹھ چکا تھا۔ قرض کا بار گراں تھا انتظامی لحاظ سے بھی عام بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ قواعد

وقوانین ناقص تھے۔ ٹرسٹیوں میں باہم مخالفت تھی۔ طلبہ کی تعداد میں معتدبہ کمی تھی۔ کالج کی عمارت مستحکم کرنے کے لئے اخراجات کی زیادتی ناگزیر تھی۔ اور گورنمنٹ کی مداخلت بھی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں گورنر صوبہ متحدہ نے دفاتر سے اردو وفارسی خط کو خارج کرکے مسلمانوں میں ایک عام ہیجان پیدا کر دیا تھا نواب صاحب نے اس حکم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور احتجاجی جلسوں میں مستعدی سے حصہ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفوں کو ایک نادر موقعہ ان کی مخالفت کا مل گیا جس کا اثر کالج کے انتظام اور پالیسی پر بھی پڑا۔ اسٹاف کا طرز عمل بھی بدل گیا اور خود مختارانہ جذبات کے ساتھ تنخواہوں کے اضافہ کا مطالبہ شروع ہوا۔ مگر "آفریں باد بریں ہمت مردانہ او" کہ نواب صاحب نے ان تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ بے انتہا دلیری، جوش اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھ وہ اس میدان مقابلہ میں آئے اور کامیاب ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ہجوم مصائب وآفکار اور بعض رفیقوں کی مخالفانہ کارروائیوں نے انکو پریشان کر دیا اور وہ خستہ دل اور بددل ہوگئے۔ ایسی نوبت بھی آئی کہ انہوں نے اپنے مستعفی ہونے کو قومی مفاد کی حفاظت کے لئے ضروری سمجھا خصوصًا جب مسٹر انٹونی میکڈانل کی ناراضی اس درجہ بڑھ گئی کہ اس نے ذاتی مخالفت کی صورت اختیار کرلی اور سکرٹری کی رائے کی آزادی کو سلب کرنا چاہا تو وہ مستعفی ہونے پر قطعی طور پر آمادہ ہوگئے۔ مگر کچھ مخلص رفیقوں کی ہمت اور معاونت اور سرجیمس لاٹوش کی سچی ہمدردی وحوصلہ افزائی نے انکو مستعفی ہونے کے ارادہ سے باز رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ صرف ہمارا مایۂ ناز دارالعلوم ہی خطرہ میں نہ پڑ جاتا بلکہ قومی تعلیم کو وہ نقصان پہنچتا جس کی تلافی صدیوں میں بھی ممکن نہ تھی مگر خدا کی رحمت سے ترقی اور سرسبزی کا نیا دور شروع ہوگیا۔

انہوں نے ان مصائب سے نجات اور مخلصی کی تدبیروں سے اور دوسری طرف ملک میں دورے کرکے اور مختلف صوبوں میں کانفرنس منعقد کرا کے اپنی حسن تدبیر اور لاثانی قابلیت اور اعجاز زمانی سے قوم کو قومی تعلیم اور قومی تعلیم گاہ کی جانب متوجہ کیا۔

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا ۔ خدمت کیلئے قوم کی مرمر کے جیا

سر سید کی زندگی میں ایجوکیشنل کانفرنس کے جو گیارہ اجلاس منعقد ہوئے وہ ممالک متحدہ اور پنجاب تک محدود رہے۔ نواب صاحب نے اپنی زندگی کے آٹھ سال میں صوبہ متحدہ اور پنجاب کے علاوہ مدراس، بمبئی، کلکتہ، رنگون و ڈھاکہ تک میں اجلاس منعقد کرائے جو اپنی عظمت اور شرکا کی کثرت تعداد کے لحاظ سے بے نظیر تھے ؎

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر ۔ غل علم کا برہما میں مچایا جا کر

چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی ۔ واں آب حیات انکو پلایا جا کر

صرف یہی نہیں کہ تعلیم کا پیغام سنایا علم کی منادی کی بلکہ کالج کی ترقی اور استحکام کے لیے گرانقدر رقوم حاصل کیں۔ ہندوستان کے ہر گوشہ سے قومی دارالعلوم میں طلبہ کی آمد شروع ہوگئی۔ خود اطراف و اکناف ہند میں دورے کئے۔ مدراس اور رنگون و آسام تک سفر کیا عام مسلمانوں میں کالج کی ہمدردی پیدا کردی۔ علما کے حلقہ میں جو منافرت تھی اس کو دور کیا۔ بڑے بڑے امرا و تجار کی فیاضی کا رُخ قومی تعلیم کی جانب پھیرا اور ہزاروں روپے چندے میں دصول کئے قومی یونیورسٹی کا خیال ہر طبقہ کے مسلمانوں کے دلوں میں راسخ اور جاگزیں کردیا انکو قومی تحریکات کا دلدادہ بنایا اور قومی اخبارات نے کالج کے مباحث اور اشاعت حالات میں دلچسپی کا حصہ لینا شروع کردیا۔ انہوں نے علیگڈہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو جو بند ہو چکا تھا پھر جاری کیا۔ اور اس کو کالج کے حالات و تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ اور قومی پالیسی کا مبلغ بنایا۔ انجمن الفرض کو وسیع کیا اور کالج کے قابل اور ہونہار طلبہ کو حصہ ملک میں دورے کرنے کے لئے روانہ کیا تاکہ وہ غریب طلبہ کے لئے چندے جمع کریں اور مسلمان نوجوانوں کو اپنے قومی کالج میں داخل ہونے کی ترغیب دیں، چنانچہ طلبہ کے ان ڈپوٹیشنوں نے لاکھوں روپے جمع کئے اور ریاستوں میں خود جا کر والیان ملک اور انکے وزرا اور بااثر اصحاب سے ملاقاتیں کیں اور امدادیں مقرر کرائیں۔ کالج نے اس عرصہ میں وہ شہرت و عظمت حاصل کی جس کے اثر سے اکثر بڑے بڑے مقتدر اصحاب نے کالج کا معائنہ

کیا۔ والیان ملک اور حکام صوبہ کے علاوہ ہزرائل ہائنس پرنس اور پرنسس آف ویلز، اور ہز مجسٹی حبیب اللہ خاں امیر افغانستان کی تشریف آوری کالج کے وہ تاریخی واقعات ہیں جو نواب صاحب کے مساعی جمیلہ کی نہایت شاندار نتائج ہیں اور جن پر مسلمانوں کو من حیث القوم ہمیشہ ناز رہے گا ؎

عاقبت مقبولیٔ کالج بدیں غایت رسید   تربیت گاہ غریباں شد گذرگاہ شہاں

مالی امداد کی ترقی کے ساتھ کالج کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی۔ علوم عربیہ کا انتظام ہوا اور پرنس آف ویلز سائنس اسکول قائم کیا گیا۔ ٹیچنگ اسٹاف اور پروفیسروں میں اضافہ ہوا۔ غیر مکمل عمارتیں مکمل ہوگئیں۔ لٹن لائبریری اور نظام میوزیم کی تکمیل ہوئی۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں جو سرسید کے انتقال کا وقت ہے طلبہ کی تعداد (۳۴۳) تھی لیکن فروری ۱۹۰۷ء میں جو نواب صاحب کا سال وفات ہے (۸۶۲) ہو چکی تھی جس میں نہ صرف غربا اور متوسط طبقات کے طلبہ تھے بلکہ مرشدآباد، ڈھاکہ، مدراس، سورت، اور منگرول وغیرہ کے نوابوں کے لڑکے بھی تھے۔

اسی طرح ۱۸۹۸ء و ۱۸۹۹ء میں کل مدات کی آمدنی، ۷۲۸۳۰ روپیہ تھی۔ مگر ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں ۱۴۳۴۱۷ تک پہنچ گئی تھی۔ اولڈ بوائز ایسوشی ایشن اور کالج ایسوسی ایشن لندن کا قیام بھی نواب صاحب کی دلچسپی اور توجہ سے ہوا۔ مسلم گرلس اسکول بھی انہی کی حوصلہ افزائی اور زنانہ تعلیم کی دلچسپی کا نتیجہ ہے ؎

تدبیر سے محنت سے دکھا دی سب کو   کالج کی ترقی میں کرامات اس نے

نواب صاحب کی خدمات صرف سکرٹری ہونے کی حیثیت سے نہ تھیں بلکہ وہ اس سے پہلے بھی قوم کی خدمت اسی جانفشانی سے کرتے تھے سرسید نے جب تہذیب الاخلاق جاری کیا تاکہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت میں جہالت کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوگئیں ہیں اور مذہب کے متعلق جو غلط عقائد و خیالات راسخ ہوگئے ہیں اس کی اصلاح کیجائے تو نواب صاحب بھی برابر اپنا مضمون بھیجتے رہے۔ انکی تحریروں نے اس کو خاص امتیاز بخشا۔ وہ اکثر مذہبی، اخلاقی اور تمدنی

مضامین لکھے تھے جن میں وسیع الخیال قوت فکر، استدلال اور اجتہاد کے علاوہ ادائے مطالب میں با موقع تشبیہات اور استعارات سے خاص لطف پیدا ہو جاتا تھا اور اس طرح انہوں نے اردو ادب کی بھی خاص خدمت کی۔ سر سید نے جب "کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان" قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کی تحقیقات کرے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کیوں کم ہے۔ اور کیوں وہ سرکاری مدرسوں میں تعلیم نہیں پاتے۔ اور اس کمیٹی نے انعامی مضامین طلب کئے اور بہترین مضمون کے لئے پانچسو روپیہ انعام تجویز کیا تو نواب صاحب نے ایک مدلل اور مفصل مضمون بنام انشراحات مہدو لکھا اور کمیٹی نے اس کو اول درجہ کا مضمون قرار دے کر پانچسو روپیہ کے انعام کا مستحق قرار دیا مگر انہوں نے انعام لینے سے انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے اندازہ کر لیا تھا کہ اگر ایجوکیشنل کانفرنس کو سعی و ہمت سے چلایا گیا تو قومی تعلیم اور کالج کو بہت ترقی ہو گی اس لئے انہوں نے اس خدمت کو اپنے ذمہ لیا۔ امرا اور صاحب اثر حضرات سے مشورے کئے گشتی خطوط جاری کئے مختلف مقامات میں دورے کئے۔ کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں شریک ہوئے سنہ ۱۹۰۵ء کے اجلاس میں دوبارہ فرائض صدارت انجام دئے اور قوم میں عام بیداری پیدا کر دی خصوصاً صوبہ متحدہ کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ کیا۔ وہ سال کا کچھ حصہ درستی و بقائے صحت کے لئے بمبئی میں بسر کرتے تھے مگر یہاں انکا تمام وقت کالج اور کانفرنس اور قومی تعلیم کی ترقی اور بہبود کی جد و جہد میں صرف ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اخبارات جاری کرائے مسلمانوں کی مختلف انجمنوں اور کمیٹیوں اور سوسائیٹیوں میں تقریریں کیں۔ پرائیویٹ صحبتوں میں ان مسائل پر بحث کرتے رہے اور ایک عام رجحان قومی تعلیم اور کالج کی طرف پیدا کر دیا۔ بمبئی کے اس قیام کا سب سے زیادہ قیمتی نتیجہ یہ تھا کہ ہز ہائنس آغا خاں کے اثر و اقتدار اور فیاضی کا رُخ قومی مقاصد و اغراض کی جانب مائل ہو گیا۔ اسی عہد میں اور ہمدردان قوم مثلاً مولانا حافظ نذیر احمد صاحب کی قادر الکلامی و خوش بیانی مسلمانوں کو اصلاح و تعلیم کی طرف مائل کر رہی تھی انہوں نے بہت سی کتابیں مثلاً ابن الوقت اور توبۃ النصوح لکھکر مسلمانوں کو تعلیم کی طرف

متوجہ کیا تعلیم نسواں کا چرچا بھی انہوں نے کتابیں لکھکر مسلمانوں میں پھیلایا۔ مسلمانوں اور انگریزوں کی باہم منافرت کو دور کرنے کے لئے انہوں نے چند در چند لکچر دئے اور اپنی مفید رائے سے مسلمانوں کو برابر مستفید کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا حالی بھی اپنی دلکش نظموں سے مسلمانوں کو عبرت دلاتے تھے۔ انہوں نے مسدس حالی لکھکر قوم کے سامنے ان کے اسلاف کے کارناموں کو پیش کردیا اور انکے جوش اور ولولہ کو ابھارا۔ مولانا حالی نے زبان اُردو کی خدمت میں برابر مستعدی سے حصہ لیا۔ آپکی قومی نظموں نے مسلمانوں میں ایک روح پھونکدی اور اُنکو تعلیم اور ترقی کی طرف مائل کردیا۔

علامہ شبلی کے تاریخی لکچر، علمی مضامین اور ولولہ انگیز نظمیں مسلمانوں کے عہد گذشتہ کے شاندار مناظر آنکھوں کے سامنے پیش کرتی تھیں۔ مولانا محمد علی صاحب نے جب ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی جسکا مقصد علوم اسلامیہ کا احیا اور تعلیم قدیم کی اصلاح تھی تو سب سے پہلے مولانا شبلی نے بڑھکر خیر مقدم کیا اور اس کے ساتھ گرویدگی پیدا ہوگئی۔ مولانا تعلیم علوم اسلامیہ کے بڑے حامی تھے۔ وہ اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتے تھے اور دل سے پسند کرتے تھے لیکن انکے نزدیک مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری تھی تاہم وہ دیکھتے تھے کہ یہ تعلیم جس طرح سے جاری ہے وہ بالکل بے سود اور بے معنی ہے تو اُن کو نہایت رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ ندوہ کے قیام کے دوسرے ہی سال مولانا بحیثیت ایک رکن کے شریک ہوئے اور ندوۃ العلماء کی ضرورت پر وقتاً فوقتاً زبردست تقریریں کیں اور اپنی مفید تجاویز جو ہندوستان اور روم ومصر وغیرہ کے مدارس کے تجربات ومعلومات کا ماحصل تھیں پیش کیں اور ۱۸۹۹ء میں ارادہ کرلیا کہ اپنے تجربات اور قابلیتوں کو ندوہ کے لئے وقف کردیں لیکن اس وقت کی فضا اس قسم کی تھی کہ وہ اپنے ارادہ کو پورا نہ کرسکے۔ زمانہ کی ضرورتوں نے علماء کو قدیم تعلیم کی اصلاح کی طرف متوجہ کردیا تھا لیکن مجرد یہ خیال کہ موجودہ قدیم تعلیم ناقص و ناکارہ ہے کافی نہ تھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پرانے تعصبات

اور تنگ خیالیوں سے آزادی، وسعت خیال اور جرأت و ہمت کی ضرورت تھی جو سرسید اور انکے رفقا کا امتیازی وصف تھا۔ مولانا شبلی نے جس وقت ندوہ کے نصاب تعلیم میں انگریزی داخل کرنے کا سوال پیش کیا تو ایسی زبردست مخالفت ہوئی کہ جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا اگرچہ یہ تجویز منظور ہوئی لیکن اس وقت مدرسہ کی عنان ادارت ایسے بزرگوں کے ہاتھ میں تھی جن کے ساتھ مولانا جیسے روشن خیال فاضل کا کام کرنا مشکل تھا۔ مولانا کے دل میں ندوہ میں مستقل قیام کا خیال برابر باقی رہا لیکن افسوس ہے کہ علمائے ندوہ کی تنگ نظری اس آرزو کے پورا ہونے میں سدراہ تھی تاہم مولانا ندوہ کی خدمت سے کبھی دست کش نہیں ہوئے مگر بدقسمتی یہ کہ مولانا اس مجلس سے علٰحدہ رکھے گئے جس کے متعلق تیاری نصاب کا کام تھا۔ مولانا نے روم و شام و مصر میں مدارس عربیہ کا غائرنظر سے معائنہ کیا تھا۔ ان تعلیمی اصلاحات کا بھی مطالعہ کیا تھا جو مصر میں جاری ہورہی تھیں۔ مصر وغیرہ کی جدید مطبوعات کا کافی ذخیرہ انکے پاس تھا۔ ایسی حالت میں خود علامہ کا خاموش رہنا اور اپنی مفید معلومات سے ندوہ کو محروم رکھنا جرم تھا۔ اگرچہ مجلس نصاب نے ایسے ضروری عنصر کو علٰحدہ رکھا ہو لیکن انہوں نے سعی و ہمت سے کام لیا اور باوجود مخالفتوں کے امرتسر کے جلسہ میں اصلاحی نصاب کے متعلق اصولی مراتب طے کرائے اور ایک مکمل خاکہ پیش کردیا۔ انکی دلی خواہش تھی کہ دارالعلوم ندوہ سے ایک علمی رسالہ شائع کیا جائے تاکہ طلبہ میں علمی مذاق اور تالیف کا حوصلہ پیدا ہو اور مقاصد ندوہ کی اشاعت ہو چنانچہ انہوں نے کوشش کرکے ایک رسالہ الندوہ کے نام سے جاری کرایا۔ جو عرصہ تک مولانا کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا اس نے ملک میں مقبولیت حاصل کی اور اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوا۔ یعنی مقاصد ندوہ کی اشاعت بھی ہوئی اور طلبہ کو مضمون نگار، مؤلف و مصنف بھی بنایا اس وقت دارالعلوم ندوہ اس دور میں تھا جس کو مولانا "دور ظلمت" کہتے ہیں۔ کیونکہ مولانا محمد علی صاحب اپنی ضعف اور ناتوانی کے باعث ندوہ کے کاموں سے الگ ہوگئے تھے یہ حالت دیکھکر مولانا شبلی کا دل بے چین تھا اور بالآخر مولانا نے ۱۹۰۵ء میں مستقل طور پر لکھنؤ میں قیام

پذیر ہوکر عنان ادارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ندوہ میں مولانا کی آمد گویا مردہ قالب میں جان پڑ ناتھا، اب مولانا کو موقع ملا کہ ندوہ کو جس معراج ترقی پر پہنچانا ان کا نصب العین تھا اس کے لئے سرگرمی سے کوشش شروع کردیں۔ وہاں کے مصارف بہت زیادہ تھے اس لئے مولانا نے مصارف گھٹا کر مداخل کے قریب قریب کردئے۔ نصاب مجوزہ پر اب تک عمل نہیں کیا گیا تھا وہ جاری کردیا گیا۔ اور انگریزی بطور لسان ثانوی کے لازمی کردی گئی۔ اراکین ندوہ میں بعض کام کے آدمیوں کا اضافہ کیا۔ ندوہ کی امداد کے لئے جابجا سفر کئے۔ اور وہاں تقریریں کیں۔ لکچر دئے۔ ڈیپوٹیشن بھیجے جو کامیاب واپس آئے۔ ریاست بھوپال سے سالانہ امداد مقرر کرائی۔ جنجیرہ اور بھاول پور سے گرانقدر رقوم حاصل کیں۔ ہز ہائنس آغا خاں کو ندوہ کی طرف توجہ دلائی اور انکی اخلاقی اور مالی امداد حاصل کی، طلبہ کے لئے اپنا ذاتی اثر استعمال کر کے وظائف مقرر کرائے۔ وہ عام افسردگی جو ملک میں ندوہ کی جانب سے پیدا ہوگئی تھی دور ہوگئی اور لوگوں کو ندوہ کی زندگی کا احساس پیدا ہونے لگا تعلیم یافتہ اشخاص اور امراء ورؤسا اور عمائدین قوم نے اس طرف توجہ کی۔ اوقاف ملنے کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ مدرسہ اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی۔

ندوہ کے کتب خانہ پر مولانا نے خاص توجہ کی۔ اپنا کل ذخیرہ کتب جو تمام عمر کا سرمایہ تھا جس میں اکثر بیش بہا کتابیں تھیں ندوہ کے لئے وقف کردیا۔ اور دوسرے علم دوست اصحاب سے کتب خانہ ندوہ کے لئے کتابیں حاصل کیں اور اس طرح ندوہ میں ایک شاندار کتب خانہ قائم ہوگیا شعبہ تعلیم میں مولانا نے جہانتک ممکن تھا ایسے اساتذہ مقرر کئے جو کسی خاص علم وفن کے ماہر تھے طرز تعلیم میں بھی نہایت مفید تغیر ہوگیا۔ مولانا خود قرآن مجید، صحیح بخاری اور دیگر علوم کا درس دیتے تھے۔ ان تمام واقعات سے تمام ملک میں ندوہ کی تعلیم کا شہرہ ہوگیا۔ دور دراز مقامات کے طلبہ داخل ہونے لگے۔ جب طلبہ عربی میں برجستہ تقریریں کرتے تھے تو ان کی قابلیت کا خاص اثر ہوتا تھا۔

ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس بھی بڑی شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہونے لگے بنارس میں ۱۹۰۶ء میں جو سالانہ اجلاس منعقد ہوا وہ علمی نمائش کی وجہ سے سالہا سال یادگار رہے گا جس میں کتابوں کے نہایت نادر نسخے۔ فرامین شاہی اور خطاطی کے اعلیٰ نمونے نہایت کثرت سے فراہم کئے گئے تھے۔ نادرالوجود دواوین کا بیش قیمت ذخیرہ تھا جس سے فارسی نظم کی ترتیب وار تاریخ کا نقشہ برارالعین مشاہدہ ہوتا تھا۔ غرضکہ مولانا نے اپنی جد وجہد، سعی وکوشش محنت وسرگرمی سے ندوہ کو زاویہ جمود وخمول سے نکال کر شاہ راہ ترقی پر لگا دیا تھا لیکن بدقسمتی سے قومی تعلیم گاہوں کو ذاتی نمود اور شخصی اعزاز کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ ندوہ میں بھی ایک کارکن گروہ ایسا موجود تھا جس کا اصل مقصد یہی تھا کہ اسے اپنی شہرت وعزت اور اثر ورسوخ کا آلہ بنائے۔ لیکن چونکہ ان میں علمی قوت مفقود تھی اس لئے انکو کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ جب مولانا شبلی نے اپنی جانفشانیوں سے ندوہ کے جسد بے جان میں روح پھونکدی، اطراف واکناف ہند میں اس کی شہرت پھیل گئی اور قوم کو اس طرف توجہ ہوئی تو یہ لوگ مولانا کے اصلاحی کاموں میں قدم قدم پر روڑے اٹکانے لگے۔ اور یہ مشہور کیا کہ شبلی کی تعلیم وتلقین کا طلبہ پر برا اثر پڑا آخر مولانا مجبوراً مستعفی ہوگئے۔ مگر اکابرین قوم نے منتظمین ندوہ کو انتظام میں تبدیلی کرنے پر مجبور کیا اور جدید دستور العمل تیار ہوگیا۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے ابتدائے قیام سے مولانا اس میں شریک ہوئے اور علاوہ ریزولیوشنوں کی تائید واختلاف کے نہایت قیمتی لکچرز دئے اور رسالے پیش کئے جو مولانا کی قابل قدر قومی خدمات میں شامل ہیں۔ مولانا نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم الجزیہ، حقوق الذمین، اور کتب خانہ اسکندریہ زمانہ ملازمت کالج ہی میں کانفرنس کے لئے لکھی تھیں ۱۹۱۳ء میں مولانا شعبہ ترقی اردو کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ یہ کام انکی دلچسپی کا تھا اس لئے انہوں نے اس کو نہایت سرگرمی سے شروع کیا اور جب تک مولانا اس عہدہ پر مامور رہے اس شعبہ میں بہت کام ہوا۔ اور چند نہایت عمدہ کتابیں شائع ہوئیں۔ ۱۹۱۱ء میں صوبہ متحدہ کے چیف سکرٹری مسٹر برن نے ایک

ورنیکلر اسکیم پیش کی جو اُردو کے حق میں سم قاتل تھی۔ اس میں ایک یہ تجویز تھی کہ رااین بھاشا انٹرنس کے امتحان میں لازمی کر دی جائے اور اردو جو مدارس میں جاری ہے وہ اس طرح جاری کر دی جائے کہ ہندی بن جائے۔ اس اسکیم پر غور کرنے کو ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے مولانا بھی ممبر تھے۔ مولانا اس کے متعدد اجلاسوں میں شریک ہوئے اور پر زور بحثیں کیں۔ مولانا نے ایک یادداشت بھی لکھی اور وہ ایسی مدلل تھی کہ انگریز اور ہندو ممبروں کو بھی اتفاق کرنا پڑا اور انکی کوشش سے اردو ناگری میں ضم ہونے سے بچ گئی۔

الہ باد آباد یونیورسٹی کے قیام کے وقت ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات میں فارسی کورس نہایت آسان بنایا گیا تھا۔ ایک عرصہ تک جب طلبہ آسانی کے ساتھ اس میں کامیاب ہوتے رہے تو یونیورسٹی کے ایک گروہ نے فارسی کورس کے آسان ہونے کی شکایت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ "فارسی" یونیورسٹی کی تعلیم میں سبجکٹ ہونے کے ناقابل سمجھی گئی۔ لیکن عین وقت پر مولانا نے نہایت قابلیت سے ایک کورس تیار کیا جس کا معیار اس قدر بلند تھا کہ فارسی کا وقار قائم رہ گیا۔ اور اسکا اخراج ملتوی ہو گیا۔

اجلاس کانفرنس منعقدہ کلکتہ ۱۸۹۹ء میں یہ ریزولیوشن پیش کیا گیا کہ "بی۔اے ڈگری کے لئے فارسی بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے اور یہ کہ نصاب تعلیم جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہے اس میں اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے" مولانا نے اس ریزولیوشن کی تائید میں ایک نہایت مدلل اور زبردست تقریر کی جس میں مخالفین کے اس اعتراض کو کہ "فارسی کلاسیکل زبان نہیں ہے اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو تربیت دینے کی قابلیت نہیں ہے اور اس کے لٹریچر کا رتبہ بالکل ادنیٰ ہے" مولانا نے زبردست دلائل و براہین سے باطل کر دیا۔ انہوں نے دکھایا کہ علم کی تمام شاخیں جو عربی میں ہیں وہ فارسی میں موجود ہیں۔ علم طب اور علم نجوم بھی اس میں موجود ہے اور فلسفہ و منطق کی مکمل تصانیف کے علاوہ فارسی مسلمانوں کے عہد زریں کی تاریخ کی تنہا سرمایہ دار

ہے۔ پھر انہوں نے بادشاہوں کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمریوں اور ان کے روزنامچوں کی فوقیت کو تمام زبانوں کے مقابلہ میں بیان کر کے فارسی نظم کے فلسفیانہ مضامین پر بحث کی غرض مولانا نے پورے طور سے ثابت کر دیا کہ فارسی ایک کلاسیکل زبان ہے۔

مولانا کی تعلیمی کوششوں میں اعظم گڈھ کا اسکول خاص طور پر قابل ذکر ہے جب مولانا کو وکالت شروع کرنے کے ساتھ انگریزی کی ضرورت اور اہمیت معلوم ہوئی تو انہوں نے ۱۸۸۳ء میں چندہ سے اعظم گڈھ میں نیشنل اسکول کے نام سے انگریزی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس اسکول کو یونیورسٹی سے ملحق کرا کے گورنمنٹ سے امدادیں حاصل کیں۔ مولانا کی سب سے بڑی خدمت جو مذہبی و قومی و علمی حیثیت رکھتی ہے دار المصنفین اعظم گڈھ ہے۔ انکا ایک عرصہ سے خیال تھا کہ قابل نوجوانوں کی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ الندوہ کے اجرا کی ایک غرض یہ بھی تھی اور انکے طریقہ درس میں بھی یہی مقصد پیش نظر تھا۔ معتمدی ندوہ کے زمانہ ہی میں انہوں نے ایک خاکہ تیار کر لیا تھا۔ کہ ندوہ سے علٰحدگی کے بعد فوراً ۱۹۱۳ء میں اعظم گڈھ میں دار المصنفین کی بنیاد قائم کر دی اور اپنا باغ اور بنگلہ اس کی عمارت کے لئے وقف کر دیا۔ اور اس کے لئے کتابوں کا کافی ذخیرہ جمع کر دیا۔ مگر مولانا زیادہ دن اس کی خدمت نہ کر سکے کیونکہ مولانا نے ایک سال بعد ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ مگر دار المصنفین کا کام بدستور جاری رہا۔ بلکہ روز بروز ترقی کرتا گیا۔ چنانچہ مولوی سعید انصاری صاحب اخبار وکیل امرتسر مطبوعہ ۷ رجولائی ۱۹۱۵ء میں لکھتے ہیں کہ

> "شبلی اکادمی جس کا غلغلہ ہندوستان کے طول و عرض میں پڑا ہوا تھا قائم ہوگئی اور شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا وہ نہاں آرزو جو انکی زندگی میں سرسبز نہ ہوا تھا اب بار آور ہوگیا۔ شاید ہندوستان میں یہ پہلی اکاڈمی ہے جس کے قائم کرنے کا فخر ہندوستان کے کسی مسلمان کو حاصل ہوا ہے۔ علم میں عجیب طاقت ہے! جو باتیں کبھی خواب و خیال میں نہ تھیں آج برکت علمی سے ظہور پذیر

ہو رہی ہیں۔ اور جن اشیا تک مسلمانوں کے تصور کی رسائی نہ تھی
اب وہ تصور سے تصدیق کا قالب اختیار کر رہی ہیں . . . . . علمی برکات
اپنا اثر ضرور دکھلاتی ہے ! تمامی اسلامی ہندوستان نشۂ غفلت سے سرشار
تھا اور لشکر تاتار جہل، خلافت علمیہ پر یورشین کر رہا تھا، کسی کو خبر نہ تھی کہ
کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوکر رہے گا ؟ لیکن فطرت الٰہی یہ دست درازیاں
کب تک دیکھتی ؟ اس نے علم کی حیانت وحفاظت کے لئے ایک " امیر المومنین"
کو کھڑا کیا جس نے اٹھتے ہوئے فتنہ کو دبایا اور پھر علمی حکومت کا سکہ از سر نو
جم گیا۔ تصنیف وتالیف کا چراغ روشنی اور تہذیب پھیلانے کے لئے سب سحر
کار آمد ہے۔ علامہ شبلیؒ نے اپنی بے نظیر تصنیفات قوم کے سامنے پیش
کیں اور زمانہ پر ثابت کر دیا کہ لوگ روح کو چھوڑ کر محض جسم کی خوبصورتی پر
فریفتہ ہیں۔ انہوں نے اولاً ندوہ سے جرح وتعدیل کی صدا بلند کی اور
جب قوم میں علمی تہذیب پھیلنا شروع ہو گئی تو اکاڈمی کا خیال ظاہر کیا۔"

دار المصنفین کے قائم کرنے سے یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ پر مختلف حیثیتوں سے
نگاہ ڈالی جائے، اسلام کا ایک ایک پہلو نمایاں کرکے دکھایا جائے۔ صحابہ اور دیگر بزرگان
ملت کی سوانح عمریاں شائع کی جائیں۔ جدید علوم وفنون کی اشاعت ہو اور مفید تصنیفیں
طبع ہوں جو مسلمانوں کے مرض کا علاج ہوں۔ درحقیقت دار المصنفین کا خیال نیا نہیں
تھا کیونکہ خلیفہ منصور نے ترجمہ وتالیف کا ایک محکمہ قائم کیا تھا اور مامون الرشید کے عہد
میں تو بیت الحکمۃ کی بنیادیں آسمان تک پہنچ گئی تھیں لیکن وہاں بادشاہ وقت کا ہاتھ کام
کر رہا تھا اور یہاں نہ تو اسلامی حکومت تھی اور نہ دولت پاس تھی۔ مسلمانوں کا علمی تنزل انتہا
کو پہنچ چکا تھا۔ ایسی ناداری کی صورت میں مسلمانوں کا اتنی عظیم الشان اکاڈمی قائم کرنا
علمی تاریخ کی بہترین یادگار رہے۔ علامہ شبلی نے اس کے علاوہ خود بھی بہت تصنیف وتالیف

کی کام انجام دے۔ مولانا کو تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ لیکن جب تک مولویت کا غلبہ رہا وہ وہابیت اور حنفیت کے دائرے سے آگے نہ بڑھ سکے البتہ جب علیگڈھ کالج میں آئے تو یہاں انکے دل میں قوم کا درد پیدا ہوگیا۔ اور اس لئے مولانا نے بھی اپنے لئے "قومی تاریخ" کی شاہراہ انتخاب کی۔ مولانا کی تصانیف آج ادب و تاریخ اردو کے گوہر بے بہا ہیں۔ الفاروق مولانا کی بہترین تصنیف ہے۔ مولانا نے فارسی شعر کی طرف توجہ کی اور شعرالعجم کی پانچ جلدیں لکھکر فارسی شاعری کی تاریخ مکمل کر دی علاوہ اس کے المامون، رسائل شبلی، مقالات شبلی، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرۃ النعمان، اور موازنہ انیس و دبیر وغیرہ انہیں کے زور قلم کے نتائج ہیں۔ سیرۃ النبی کی دو جلدیں لکھ چکے تھے کہ دست قضا نے انکو زیادہ مہلت نہ دی اور وہ اپنی بے نظیر یادگاریں چھوڑ کر علیحدہ ہوئے۔

اگر علامہ شبلی اس طرف اپنے حب وطن اور جوش مذہب اور خدمت کے فرائض انجام دے رہے تھے تو دوسری طرف سرسید کی یادگاروں کی حفاظت نواب وقارالملک اور ان کے جوائنٹ سکرٹری صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔ ایجوکیشنل کانفرنس کا کام روز بروز ترقی پذیر تھا۔ ۱۹۰۵ء کا اجلاس کانفرنس منعقدہ امرتسر نہایت شاندار ہوا اور اس میں بیشمار مفید تجاویز پاس ہوئیں۔ والیان ملک مثلاً ریاستہائے بہاولپور، ٹونک، خیرپور و بھوپال وغیرہ کے فیاضانہ عطیات نے علیگڈھ کالج۔ اسلامیہ کالج۔ ندوۃ العلماء۔ نارمل اسکول علیگڈھ وغیرہ جیسے قومی مدارس کو مالی امداد پہنچائی۔ اس کانفرنس میں سر محمد شفیع بارایٹلا لاہور کی تحریک سے یہ رزیلیوشن پاس ہوا کہ

"آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی رائے ہے کہ علیگڈھ کالج کو جو کل ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکزی کالج ہے محمڈن یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچایا جائے تاکہ مختلف صوبہ جات کے مسلمان طلبہ وہ اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں جو سرسید کا مقصود اصلی تھا اور جس کی قوم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے" یہ تحریک بالاتفاق رائے پاس ہوئی۔ مسٹر علی امام

صاحب نے بنگال کی تعلیمی حالت کا پتہ لگانے کے لئے نہایت پرزور تحریک کی اور کانفرنس نے یہ رزلیوشن پاس کیا کہ "اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانان بنگالہ کی تعلیمی حالت کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کیجا دے جو حسب ذیل امور پر غور کر کے رپورٹ کرے۔

(۱) یہ کہ کلکتہ مدرسہ کا نصاب تعلیم مسلمانان بنگالہ کی موجودہ ضرورتوں کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔

(۲) یہ کہ ایسٹرن بنگال کے مدرسوں کا مروجہ نصاب تعلیم وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کے لئے کہاں تک موزوں ہے۔

(۳) یہ کہ کلکتہ مدرسہ کے ذریعہ سے ایسٹرن بنگال کے مدرسوں کا جو امتحان ہوتا ہے وہ کہاں تک مناسب ہے"

غرض کانفرنس سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کی نگرانی کرتی رہی۔ اسی کانفرنس میں ایک نہایت ضروری ریزولیوشن یہ پیش ہوا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم میں ترقی کے واسطے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مسلمان فیلوز کی معقول تعداد کا ہونا نہایت ضروری ہے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت الہ آباد یونیورسٹی میں مسلمان فیلوز کی تعداد بہت کم ہے اس واسطے کانفرنس ہز آنر لفٹننٹ گورنر بہادر صوبہ متحدہ وچانسلر الہ آباد یونیورسٹی کی توجہ مسلمانوں کی کمی تعداد کی طرف خاص طور پر مبذول کراتی ہے اور امید کرتی ہے کہ جو جگہیں نامزد شدہ مسلمان فیلوز کی خالی ہوئی ہیں وہ صرف مسلمانوں سے معمور کیجائیں گی"۔ یہ تحریک نواب وقارالملک نے پیش کی اور کانفرنس نے اسے نہایت گرمجوشی سے منظور کیا۔

کانفرنس مسلمان صوبہ سرحدی کی تعلیمی ترقی کے لئے برابر مساعی رہی اور گورنمنٹ سے سفارش کی کہ طلبہ کو معقول وظائف ملیں اور فیس کی شرح بمقابلہ پنجاب کے کم کر دیجائے۔ مڈل اسکول اور پرائمری اسکولوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اس کانفرنس سلسلہ یہ کوشش کہ ریاست کشمیر کے تمام انگریزی مدارس میں عربی پڑھانے کے لئے معلم مقرر کئے جائیں جیسا کہ زبان سنسکرت

کی تعلیم کا انتظام ہے۔ کانفرنس کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور وہاں عربی کی تعلیم جاری ہوگئی
مشرقی بنگال کے لئے دو سفیر مقرر کئے گئے جو صوبہ کی زبان اور معاشرت سے خوب واقف تھے۔
تاکہ قومی لٹریچر بنگلہ زبان میں ترجمہ کرکے ملک میں پھیلادیں۔ غرض کانفرنس برابر ساعی رہی
کہ مسلمانوں کے تعلیمی حقوق کی نگہداشت کرے اور ان میں تعلیم و تربیت کا شوق پیدا کرے۔ نواب
وقارالملک کی کوشش سے علیگڈھ کالج کی وسعت اور طلبہ کی کثرت کے ساتھ اساتذہ کی تعداد
میں اضافہ ہوتا رہا۔ یوروپین اور ہندوستانی پروفیسروں کی درجہ بندی کی اسکیم منظور کی گئی۔
اور یوروپین اسٹاف میں ان ہندوستانیوں کو بھی شامل کیا گیا جنہوں نے کامیابی کے ساتھ
ولایت میں تعلیم پائی ہو۔

قابل نوجوانوں کو کالج فنڈ سے یورپ کی یونیورسٹیوں میں تکمیل علوم کے لئے بھیجنے
کا سلسلہ شروع ہوا جن کے ساتھ یہ معاہدہ کیا گیا کہ واپسی کے بعد وہ کالج کی خدمات انجام دینگے
کالج میں فیلوشپ قائم کی گئیں انجنیرنگ اور ڈاکٹری کے وظائف جاری ہوئے اور سائنس کے
شعبہ کو ترقی دی گئی۔ طلبہ کی تعداد میں غیر متوقع اضافہ ہوا ۱۹۱۱ء میں تعداد ایک ہزار سے
متجاوز ہوگئی ۱۹۱۲ء میں اتنی کثرت ہوئی کہ بورڈنگ ہاؤس نہ ہونیکے باعث سات سو درخواستیں
مسترد کردینی پڑیں۔

نواب صاحب نے یہ کوشش کی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کالج کی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرلے
اور اس کو گورنمنٹ آف انڈیا سے امداد ملے چنانچہ گورنمنٹ نے دو لاکھ روپیہ دیا۔ یکمشت امداد مالی
کے علاوہ مستقل آمدنی میں بھی کافی ترقی ہوئی اہل ملک نے تعلیم کی طرف توجہ جوش اور سرگرمی
کے ساتھ شروع کردی چنانچہ ۱۹۱۳-۱۹۱۲ء میں کل آمدنی دو لاکھ تیس ہزار تھی اور خرچ دو لاکھ ۲۶ ہزار
پانسو تھا۔ کالج کی وقعت روز بروز بڑھتی جاتی تھی نوابوں اور رئیسوں کے لڑکے بھی پڑھنے
لگے۔ پرنس حمیداللہ خاں موجودہ والی بھوپال بھی اسی زمانہ میں بحیثیت ایک طالب علم کے داخل
ہوئے ۱۹۱۰ء میں اعلیٰ حضرت ملک معظم کے دورہ ہند کے موقعہ پر ناگپور کے اجلاس کانفرنس

میں ہز ہائنس آغا خاں نے محمڈن یونیورسٹی کے قیام کی امید دلائی اور تحریک کی کہ جس قدر سرگرمی کے ساتھ ممکن ہو اس کے لئے چندہ فراہم کیا جائے۔ چنانچہ نواب صاحب کی کوٹھی پر مشورت کے لئے جلسہ ہوا۔ چند ہی دنوں میں یونیورسٹی کی اس تحریک کی تائید تمام ہندوستان سے ہوئی جدید تعلیم یافتہ گروہ کے علاوہ علمار اور صوفیار کرام نے بھی ان کوششوں میں حصہ لیا۔ چندہ میں جس طرح والیان ملک، امرا، تجار نے لاکھوں اور ہزاروں روپے عطا کئے اسی طرح غربا اور مزدوروں نے آنے اور پیسے پیش کئے اور جولائی ۱۹۱۲ء یعنی ڈیڑھ سال میں ۲۶ لاکھ ۲۹ ہزار چار سو ۶۳ روپیہ نقد جمع ہو گیا۔

نواب صاحب نے کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک ہوکر ہمیشہ مفید بحثوں میں حصہ لیا۔ انہوں نے سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم کے اجرا کی کوشش کی۔ اس کے متعلق بڑی یادداشتیں لکھیں، لفٹننٹ گورنرز اور افسران سررشتہ تعلیم سے ملاقاتیں کیں اور بالآخر اس کو منظور کرایا جس کی رو سے مسلمانوں کو اختیار دیا گیا کہ اسکولوں میں معمولی خواندگی شروع ہونے سے پہلے وہ ایک گھنٹہ مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکیں۔ امروہہ میں ہائی اسکول قائم کیا اور مذہبی تعلیم کا سامان وہاں بھی بدستور کیا۔ چونکہ نواب صاحب کثیر الاشتغال تھے اسلئے ایجوکیشنل کانفرنس کی نظامت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے سپرد ہوئی اور وہی اس کام کو انجام دینے لگے

اب مسلمانوں کی تعلیم مغرب کی حقیقت سے روشناس کرانے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ بلکہ مسلمانوں نے اس کی حقیقت جان لی تھی اور وہ خود تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جابجا کمیٹیاں اور ایسوسی ایشن قائم ہونے لگے جو تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں دہلی میں دائرۃ الادب قائم کیا گیا۔ جس کے مقاصد حسب ذیل تھے۔ (۱) مصنفین و مولفین کے لئے امکانی سہولتیں پیدا کرنا۔ (۲) حق تصنیف و تالیف یا ترجمہ بعد ادائے زرنقد یا جو صورت طے ہو حاصل کرکے کتابوں کو شائع کرنا یا کرانا اور تاجرانہ حیثیت سے خود نفع اٹھانا

(۳) عربی - فارسی - سنسکرت - بھاشا اور انگریزی زبانوں کے خاص خاص تراجم شائع کرانا (۴) نصاب تعلیم نسواں مکمل صورت میں سلسلہ وار پیش کرنا - (۵) اردو ادب کی تہذیب و تکمیل کے لئے ایک ماہوار رسالہ اور ایک ہفتہ وار اخبار کا اجرا (۶) قدیم قلمی مسودات حاصل کرنے کے بعد ترجمہ یا توضیح یا تشریح و حل جیسی صورت ہو شائع کرنا (۷) مطبوعہ کتابوں کا کمیشن پر فروخت کرنا -
اس انجمن نے عمدہ کتابیں فراہم کرنے کے علاوہ خود بھی بہت سی مفید کتابیں شائع کیں۔

۱۹۱۵ء میں سر ہارکورٹ بٹلر ممبر تعلیم نے جو بیان پیش کیا تھا اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی پیہم سعی و کوشش کا نتیجہ کیا ہوا اور گورنمنٹ نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کیا کیا۔ سر محمد شفیع نے یہ بتایا کہ مدراس کے مسلمانوں سے ابتدائی اسکولوں میں نصف فیس وصول کیجاتی ہے - گورنمنٹ نے پسماندہ جماعتوں کے ہر ایک طالب علم کے لئے امداد کی شرح دس آنے کے بجائے ایک روپیہ کر دیا۔ ۱۹۱۳ء میں سرکاری مدارس کے غیر مستطیع طلبہ کو کتابیں و سلیٹین مہیا کرنے کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ عطا کیا - احاطہ بمبئی میں مسلمانوں میں ترقی تعلیم کے لئے خاص رعایت پیش نظر رکھی گئی - دختران اسلام کے لئے ایک اردو زنانہ اسکول قائم کیا گیا جس میں ٹریننگ کالج میں تعلیم پانے کے لئے طالبات کو تیاری کرائی جاتی تھی - احمد آباد کے زنانہ ٹریننگ کالج میں تعلیم پانے کے لئے خاص وظائف مقرر کئے گئے - سندھ کے پرائمری مدارس کے مسلمان طلبہ کے لئے ۲ ہزار ۳ سو بارہ روپیہ کے خاص وظائف مقرر کئے گئے - اسلامی یتیم خانہ پونا کے لئے ۲۲ ہزار کی رقم گورنمنٹ نے دی - شمالی مغربی و سرحدی صوبہ میں ابتدائی تعلیم تمام سرکاری اور بورڈ اسکولوں میں ۱۹۱۲ء سے مفت کر دی گئی

صاحبزادہ صاحب نے دفتر کو ترقی دی اور تبلیغ اشاعت کے لئے متعدد سفرا مقرر کئے جو تمام ہندوستان میں دورہ کرتے تھے اس وقت تک کانفرنس کا صدر دفتر ایک معمولی بنگلہ میں تھا مگر صاحبزادہ صاحب کی سعی و کوشش سے بیگم بھوپال نے سلطان جہاں منزل اس کے لئے تعمیر کرا دی - صاحبزادہ صاحب نے ایک اعلیٰ کتب خانہ صدر دفتر میں قائم کیا - یہ کتب خانہ

اس جامعیت کے ساتھ قائم کیا گیا ہے کہ فن تعلیم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق تازہ ترین تصانیف موجود نہ ہوں۔ اس کتب خانہ میں اضافہ برابر جاری ہے اور تازہ تصانیف انگلستان سے آتی رہتی ہیں۔ علیگڑھ کے ٹرینگ کالج کے طلبہ کا دارومدار اسی کتب خانہ پر ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کنڈرگارٹن کا سامان اور مختلف قسم کے تعلیمی نقشے اور تمام صوبہ جات ہند کی تعلیمی رپورٹیں اور ہر قسم کے مفید و دلچسپ لٹریچر فراہم کئے۔ اس زمانہ میں ٹیچرز کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی جو ایک مفید کام ہے۔

۱۹۱۷ء میں جب صاحبزادہ صاحب انگلستان چلے گئے تو یہ خدمت مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کے سپرد ہوئی۔ مولانا کو جن مشکلات کا سامنا ہوا وہ اس سے پہلے کبھی پیش نہ آئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس سے پہلے مسلمانوں کا ایک ہی پلیٹ فارم اور ایک ہی نصب العین تھا مگر اب ذوق سیاست نے تعلیم جیسے خشک مضمون کو اور بے مزہ بنا دیا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں دنیائے اسلام جن مصائب اور افکار میں مبتلا تھی۔ اس کے اثر سے ہندوستان بھی خالی نہ تھا۔ اس لئے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ مسلمان تعلیمی تحریک کے متعلق کسی خاص دلچسپی کا اظہار کرینگے۔ ملک میں ہنگامی طور پر مختلف چندے جاری تھے جن کی ہمہ گیری کے مقابلہ میں پرانی انجمنوں کی طرف توجہ کا کوئی موقع باقی نہ رہا تھا۔ مگر خدا کے فضل سے کانفرنس کا کام جاری رہا۔ اور کلکتہ۔ سورت، خیرپور (سندھ) امراؤتی۔ علیگڈھ اور بمبئی میں اس کے سالانہ اجلاس کامیابی سے منعقد ہوئے اور لائف ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں انکی تعداد دس تھی مگر ۱۹۲۵ء میں ۹۳ تھی۔ میوات کے علاقہ میں خصوصیت کے ساتھ میو قوم میں تعلیم پھیلانے کی کوشش کی گئی۔

کانفرنس کے ادبی شعبہ میں ترقی کی گنجایش تھی اور اس لئے اس کے سالانہ اجلاس کے موقعوں پر کچھ نہ کچھ زبان اردو کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسی سلسلہ میں مولانا عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلما نے یاد ایام کے نام سے گجرات کی علمی تاریخ لکھی جو کانفرنس نے

شائع کی۔ مولوی عبدالباری صاحب ندوی نے "مذہب وعقلیات" کے نام سے ایک کتاب کانفرنس کے لئے لکھی ۱۹۲۳ء کا اجلاس کانفرنس تعلیمی نمائش اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس میں علمی، تعلیمی، تاریخی، اخلاقی اور طبی موضوع پر تقریبًا پچاس لکچرز پڑھے گئے۔ ان لکچروں نے اردو وغیرہ کے علم وادب میں بہترین اضافہ کیا لٹریری سلسلہ میں کانفرنس گزٹ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس رسالے میں تعلیم وتربیت اصلاح ومعاشرت، سائنس وحفظان صحت کے متعلق بہت سے مفید اور پر از معلومات مضامین شائع ہوئے۔ بچوں کی تعلیم وتربیت کے متعلق صدہا مضامین اس گزٹ میں شائع ہوئے علاوہ اس کے کانفرنس نے معاوضہ دیکر کتابیں تیار کرائیں ان میں سے ایک "التربیۃ الاستقلالیہ" جس کو مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے زبان عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ دوسری نواب وقارالملک کی سوانح عمری موسوم بہ "وقار حیات" ۱۹۲۵ء میں کانفرنس کی طرف سے لکھی گئی۔ گذشتہ چند سال کے زمانہ میں کانفرنس نے تالیف وتصنیف کے سلسلہ میں اور بھی مختصر تعلیمی رسائل اور قومی نظمیں شائع کیں۔ مثلاً تاریخ التعلیم، اتالیق، آہنگ عمل، درد نہاں، نوائے انقلاب وغیرہ

کانفرنس کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی جو بہت سی مفید علمی کتابیں شائع کر چکی ہے۔ اس انجمن کا اجلاس بہ طور کانفرنس کے ایک مستقل شعبہ کے کانفرنس کے ساتھ ہوتا تھا۔ علامہ شبلی اس کے پہلے سکرٹری تھے۔ انکے مستعفی ہونے کے بعد یہ خدمت بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی کے سپرد ہوئی۔ اعلیٰحضرت نظام وبیگم صاحبہ بھوپال اور مستقل ممبروں کی اعانت وکتابوں کی تجارت سے انجمن کی مالی حالت قابل اطمینان ہوگئی۔ اردو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ مستقل ہوگیا۔ اور انجمن نے ایک ادبی سہ ماہی رسالہ بھی شائع کرنا شروع کر دیا جو اپنے مضامین کے لحاظ سے اردو کا ایک بلند پایہ رسالہ ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ) نے انجمن کی ترقی اور کامیابی کے لئے بہت کوشش کی اور عملاً

اُنہوں نے اپنی زندگی اُردو کی خدمت کے لئے وقف کردی ہے جس میں وہ سالہا سال سے مصروف رہتے ہیں۔ کانفرنس کا وہ اجلاس جو ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی کے جوبلی کے موقع پر ہوا نہایت شاندار تھا ملک کے ہر خطہ سے لوگ آکر اس میں شریک ہوئے اور صرف ہندوستان کے لوگ ہی نہیں بلکہ افغانستان کے نائب وزیر تعلیمات بھی کانفرنس میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ انہوں نے افغانستان کی تعلیمی حالت بیان کی اور تبلایا کہ افغانستان میں ابتدائی تعلیم جبری ہے۔ کوئی مستثنیٰ نہیں۔ ۵ سال سے ۱۲ سال کی عمر کا بچہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ لائق مقرر نے یہ بھی بیان کیا کہ افغانستان کے ہونہار طلبہ یورپ اور امریکہ یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اس کانفرنس کے اجلاس میں مسٹر خلیل الدین ایرایانی نے کفایت شعاری کا لکچر دیا۔ اور مسلمان بچوں کو صنعتی تعلیم دلانے پر ابھارا۔ علیگڈھ میں ایک ٹکنکل انسٹیٹیوشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور انکے ذاتی تجربات نے قوم کو بہت فائدہ پہنچایا۔

اب وہ زمانہ باقی نہ رہا کہ مسلمان صرف لٹریری تعلیم حاصل کریں کیونکہ اب علم وفضل کی وہ قدر نہ رہی جو پرانے زمانے میں تھی۔ فی زماننا اقتصادی ترقی یا مادی خوش حالی اصلی ترقی سمجھی جاتی ہے جس قوم کے پاس قوت اور دولت زیادہ ہوا سی کی چشم اقوام میں قدر ہے۔ ان اسباب کو غور کرتے ہوئے جناب سر عبدالقیوم صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۵ء کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے زراعتی صنعتی اور تعلیم مناسب اور ضروری تبلایا اور انکو تلقین کی کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔ انہوں نے بیان کیا کہ انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ میں لوگ شوق سے زراعت کیا کرتے ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ بیج بوتے ہیں اور تھوڑی سی زمین میں بہت پیداوار کرتے ہیں اور اس کی پوری نگرانی کرتے ہیں۔ بڑے بڑے دولتمند اور خاندانی امرا، بڑے شوق اور ولولہ سے ڈیری کا شغلہ کرتے ہیں حتیٰ کہ ہر مجسٹی الکزنڈرا بھی بڑے انہماک سے ڈیری میں اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں۔ انہوں نے تبلایا کہ مسلمانوں کو تجارتی تعلیم جس طرح ممکن ہو حاصل کرنا لازم ہے۔ خوش قسمتی سے مسلمانوں میں بوہروں اور

خوجوں کی تاجر قومیں موجود ہیں۔ جو تجارتی قابلیت میں دنیا کی ہر قوم سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس لئے ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے ہونہار بچے جن کو اس طرف رغبت ہو اپنے تاجر بھائیوں، بوہروں، اور خوجوں کی دوکانوں میں تجارت کا کام سیکھیں۔ انہوں نے سب سے زیادہ صنعتی تعلیم پر زور دیا اور کہا کہ تم کو اس شعبہ میں ترقی کرنا چاہیئے کیونکہ آج وہی قوم ترقی پذیر ہے جس میں صنعت و حرفت ہے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک انڈسٹریل کانفرنس قائم کیجائے جو ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ ہو اور مسلمانوں کو صنعتی تعلیم کی جانب مائل کرے اور طلبہ کو ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں صنعتی تعلیم کے لئے وظائف دیکر بھیجے۔

واقعہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال میں مسلمانوں نے ادبی علوم و فنون میں کافی ترقی کرلی ہے اب ضرورت ہے کہ مسلمان صنعت و حرفت اور تجارت کی جانب مائل ہوں اور ٹیکنیکل تعلیم پاکر دولت اور قوت حاصل کریں۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ مسلمان اس تعلیم کی طرف توجہ کریں۔ اور اس میں کامیابی حاصل کریں۔

پنجاب میں تعلیم اردو اور مسئلہ تعلیم بالغان

(از شیخ نادم محی الدین بی۔اے۔ایم۔ای ڈی۔بی۔ٹی وائس پرنسپل ماڈل اسکول قصور)

۱۔ تعلیم اُردو اور لازمی تعلیم کا مسئلہ

تعلیم اُردو اور تعلیم بالغان کا بہت قریبی تعلق ہے۔ ان معنوں میں تعلیم اردو کا مسئلہ، دراصل دکانداروں، مزدوری پیشہ لوگوں، زمینداروں اور کارندوں کی عام تعلیم کے مسئلے کا جزو ہے۔ ظاہر ہے کہ صوبۂ پنجاب میں، جہاں اُردو زبان تجارتی، زراعتی، صنعتی اور عدالتی کاروبار میں، بہ مقابلہ پنجابی زیادہ استعمال ہوتی ہے، لازمی تعلیم اردو ہی کے ذریعہ دیجا سکتی ہے۔ ہندوستان کی وسیع آبادی بالعموم اور پنجاب کی بالخصوص، زراعت پیشہ ہے۔ اکثر فوجداری اور دیوانی مقدمات میں، زمینداروں کو عدالتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے قصبات کے اکثر اَن پڑھ سوداگروں کو بڑے شہروں کے ہم پیشہ لوگوں سے آئے دن لین دین کا سابقہ پڑتا ہے۔ وہ اُن شہری تاجروں کے بلوں، رسیدوں اور اشتہاروں کو اپنے تجارتی معاملات کے دوران میں لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ آج چھاپے خانہ کی برکت سے آبادی کے تمام مراکز رسالوں اور اخباروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ جنھیں یہ لوگ پڑھ نہیں سکتے۔ اگرچہ وہ آپ کو دنیا بھر کی خبروں کو ذوق وشوق کے ساتھ کسی خواندہ آدمی سے سنتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اس تمام مرض جہالت کا اصل علاج، عوام کی جبری تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن سرکار انگریزی نے اس تدبیر کو میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی وساطت سے خاص اس مفاہمت پر جاری کر رکھا ہے کہ لوگ اپنی رضا و رغبت سے اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوں نہ کہ جبر و تشدد سے۔ جنگ عظیم سے پیشتر عوام الناس، بدقسمتی سے اپنی تعلیمی ضروریات کو نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اب حالات بہت تبدیل ہو چکے ہیں۔ موجودہ زمانے کی شدید اقتصادی کش مکش کے باعث

ہندوستانی جاہل آبادی میں ایسی تعلیمی اصلاح کے متعلق ایک عام بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ چنانچہ سر جارج اینڈرسن صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے لاہور کے وائسریگل دربار منعقدہ سمبر ۱۹۲۶ء میں فرمایا تھا کہ "لازمی تعلیم اسی صورت میں کامیاب ثابت ہوگی۔ جب کہ جبری تعلیم کی تحریک خود لوگوں کی جانب سے ہو۔ گزشتہ چھ سال کے عرصے میں پنجاب نے ایک عدیم النظیر تعلیمی پیش قدمی کی ہے۔ جس کی مثال اس صوبہ کی سابقہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ دیہات میں لازمی تعلیم کے بارے میں پنجاب دوسرے صوبوں سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ پس جبری تعلیم کے اجراء کے لئے زمیندار ہی خواہش کر سکتے ہیں نہ کہ لوکل جماعتیں جن سے یہ توقع کی جاتی ہے، کہ وہ نارضامند آبادی پر جبر و اکراہ کرنے کا ناگوار فرض انجام دیں گی"۔ ترقی کی ان خوش آیند علامات کے باوجود اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ عوام کی تعلیم میں جبر و اکراہ کے علاوہ اور ذرائع سے تیز رفتاری پیدا کی جائے۔ یعنی (۱) لوگوں کی دلچسپیوں کو فروغ دیا جائے۔ (۲) آبادی کے خواندہ حصے سے امداد حاصل کی جائے مثلاً گاؤں کے پٹواری، شہر کے کلرک اور مدرسین کی خدمات برضا و رغبت یا کسی قدر اعانت کے ذریعے حاصل کی جائیں۔

ہم یہاں ہندوستان کی لازمی تعلیم کے مسئلے کو مزید طوالت نہیں دینا چاہتے۔ ہم نے یہاں ضمنی ضرورتاً اس کی طرف اشارہ کیا ہے، جہاں تک کہ تعلیم اردو کا تعلق عوام اور بالخصوص بالغوں کی تعلیم سے ہے۔ پنجابیوں کے لئے تحصیل اردو کی اہمیت پر ہم اس لئے مصر ہیں کہ یہ زبان یہاں [illegible] سمجھی جاتی ہے۔ اور اسی کے ذریعے تحریر وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنے [illegible] کو، بمقابلہ دوسرے صوبوں کے، پنجاب کی ضروریات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ مثلاً بہار اسٹر یا برما جیسے صوبے میں، جہاں کی مادری زبان مرہٹی اور برمی ہے۔ اور جو اردو سے بالکل الگ ہے، اردو کی وسیع تعلیم پر زور دینا [illegible] ہوگا۔ چنانچہ اس باب میں سید طفیل احمد صاحب (علیگ) اپنے

مضمون "اُردو بہ حیثیت مذہبی زبان" مطبوعہ سہیل ستمبر ۱۹۲۶ء میں ارقام فرماتے ہیں ہے کہ
"مسٹر ہوم کمشنر ارکان اور مسٹر سٹوارٹ ڈپٹی کمشنر اکیاب، اُردو کے اس احمقانہ عشق پر
اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ مسٹر ہوم لکھتے ہیں کہ اس کمشنری کے اضلاع کے مدارس میں
زبانِ اُردو کی تعلیم پر مُصر ہونا ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ انگلستان کے سرکاری مدرسوں میں
لاطینی زبان کی تعلیم پر اصرار کرنا۔ تعلیم اس زبان میں دینی چاہئیے جس کو طالب علم فارغ
التحصیل ہو کر حصولِ معاش کے لئے استعمال کر سکے"۔ پس پنجاب میں عوام کو اُردو
پڑھانے پر زور دینا ہرگز خلافِ عقل نہیں۔ کیونکہ یہ اس صوبہ کی ادبی اور تعلیمی زبان قرار
دی جا چکی ہے۔ اور پنجابی کے ساتھ اس کی بہت مشابہت ہے۔

۲۔ بالغوں کو اُردو پڑھانے کی مشکلات بمقابلہ ہندی کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے؟

ہندی کے سہل الحصول ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے۔ کہ اس کے حروف اور اعراب
کی ترکیب میں بمقابلہ اُردو کے چنداں تبدیلی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اُردو حروف، مرکب ہونے
پر اپنی اشکال بدل لیتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے۔ کہ اُردو کے مقابلے میں، ہندی بہت
آسانی سے لکھی اور پڑھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے حروفِ تہجی میں ایک آواز کے لئے
ایک ہی علامت مقرر ہے برخلاف اس کے اُردو میں ہم آواز حروف کے چند گروہ موجود
ہیں مثلاً (۱) ز ذ ظ ض (۲) ت ط (۳) س ص ث وغیرہ۔ پس بالغوں کو اُردو پڑھانے
میں، جہاں تک کہ طریقۂ تعلیم کا مسئلہ درپیش ہے، مندرجہ ذیل تنقیحات پیدا ہوتی ہیں:۔

ا۔ کیا ہم آواز حروف کی مختلف علامات کو ایک علامتی طریق میں تبدیل کیا
جا سکتا ہے؟ اور کس طرح؟

ب۔ اُردو حروف کی مختلف صورتوں کو، لکھائی کی غرض سے، سکھانے کا سب
سے آسان طریق کیا ہے؟

ج۔ عربی اور ہندی کے رسم الخط کی طرح اُردو حروف کے اعراب کو مستقل طور

پران حروف کے ساتھ کیونکر وابستہ کیا جا سکتا ہے؟

د۔ اس زبان میں بالغان کو تعلیم دیتے وقت مناسب مضامین کیا ہونے چاہئیں؟

اردو کے پڑھنے میں، بمقابلہ لکھنے کے، اسی وقت تک دقّت محسوس ہوتی ہے۔ جب تک کہ ہم حروف آشنا نہ ہوں۔ لیکن آشنا ہونے کے بعد یہ کام آسان ہو جاتا ہے اس میں اصل دقّت ابتدائی مرحلے کی ہے؛ پس ہمارے نزدیک اس مسئلے کا اصلی حل طلب نکتہ یہ ہے کہ بالغون کو اردو پڑھاتے وقت ہجائے پڑھائی اور لکھائی کا سہل سے سہل طریق کیا ہونا چاہیئے؟

اس مسئلے کے مذکورہ بالا ہر ایک جزو کو لو۔ بالفرض اگر ہم آواز حروف کی تعداد کم کرکے ہم انھیں ایک رنگ پر لانے کی کوشش کریں۔ تو یہ بمنزلہ اس کوشش کے ہوگا جو مصلحین ہجاب سے پیشتر انگلستان اور امریکہ میں کرتے رہے ہیں۔ تمام مسلم دنیا اس کوشش کی مخالفت کرے گی۔ کیونکہ اس سے اردو میں کثرت سے چھائے ہوئے فارسی اور عربی الفاظ کی صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے مثلاً اگر ناظم کو جس کا مادہ نظم بمعنی ترتیب دینا ہے، نازم لکھا جائے۔ یا مضروب کو جس کی اصل ضرب ہے مزروب اور کاذب کو جو کذب سے نکلا ہے کا ضب کی صورت میں لکھیں، تو اس سے معاملہ اور بھی ٹیڑھا ہو جائے گا۔ اس سے ہمارا منتمد تو یہ ہے کہ ز ذ ظ ض کے گروہ والے تمام الفاظ کو آسانی کی غرض سے ایک ہی حرف ز یا ض کی آواز میں تبدیل کردیں۔ لیکن معنوں کے لحاظ سے پیچیدگی پیدا ہوگی۔ سادہ ازیں حروف کے یہ گروہ، ہندی کے لحاظ سے یکساں آواز رکھتے ہیں۔ جس میں ف کو پھ (फ) کی آواز اور شکل میں بولا اور لکھا جاتا ہے۔ خ کو کھ (ख) وغیرہ ہیں۔ اگر ان عربی حروف کو صحیح طور پر بولا جائے تو چہرہ ایک کا فرق ... معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن اردو تلفظ کے مقصد کے لئے اس قرات کی ضرورت نہیں۔ ... لیکن ... بالغان کے لئے

عارضی طور پر یہ عقدہ اس طرح حل کیا جاسکتا ہے کہ پڑھائی کے دوران میں طلبہ اپنا ذخیرۂ الفاظ معنوں کے لحاظ سے جمع کریں - مدرس ان الفاظ کو بطریق بین پیش کرے اور طلبا لکھائی میں ان الفاظ کی مشق کریں -

اس معاملے میں ایک سمجھ دار مدرس کو فقط یہ کام کرنا ہے - کہ وہ الفاظ کو پیش کرنے میں نہایت ترتیب اور طریقے کے مطابق چلے - اور ہجا اور پڑھائی کی مشقوں کو تدریجی صورت میں پیش کرے یعنی : —

ا - وہ جملے پڑھائے جن میں خالص اُردو یا ہندی ہی کے الفاظ آئیں مثلاً

تو بڑا سمجھ والا ہے -
میں تیری بات نہیں سمجھا -
میرا بھائی آیا -
دور چل -
روٹی کھالے -

ب - اُردو میں مشکلات کے لحاظ سے فارسی اور عربی کے بتدریج داخل شدہ الفاظ پڑھائے یعنی وہ الفاظ جن کی صورتیں بہ لحاظ ہجا خالص اُردو یا فارسی الفاظ سے مختلف ہوں - مگر بہ لحاظ آواز مشابہ ہوں - ان الفاظ کی آوازوں کا، مقابل کے حروف کے ساتھ، پہلے بہ لحاظ اصوات مقابلہ کیا جائے اور پھر بہ لحاظ معنی مثلاً

(۱) آم ؛ عام (۲) کاش ؛ قاش (۳) چاک ؛ چاق
(۴) نظر ؛ نذر (۵) زر ؛ ضرر (۶) جذر ؛ جزیرہ
(۷) کت ؛ قط -

ج - بانعون کے لئے ابتدائی کتب کی طباعت کا خاص اہتمام کیا جائے - جن میں ہر حرف پر شروع سے اخیر تک، اعراب موجود ہوں - بعد میں ضروری نہیں -

مذکورہ بالا مسئلے کی دوسری شق یہ ہے کہ ہجا سکھانے میں ایک ہی حرف کی مختلف صورتوں کی پیچیدگی کو کیونکر دور کیا جائے۔ اس کا حل سرِدست بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہجا کو سکھانے کی غرض سے الفاظ کو پہلے سالم حروف کی شکل میں لکھا جائے بعد ازاں الفاظ میں ہر حرف کی ابتدائی، وسطی اور آخری صورت دکھائی جائے مثلاً رام، ار (م ا ر) میرا (م ی ر ا) چار وغیرہ میں م کی حالت۔ اعراب کو مستقل صورت میں قائم رکھنے کا مسئلہ ہم سے متعلق نہیں۔ بلکہ مصلحانِ ہجا کے حل کرنے کا ہے۔ مدرس اپنا ہجا کا کام چلانے کے لئے صوتی طریق کو بھی اختیار کر سکتا ہے یعنی طویل اور مختصر آوازوں کی فہرست تیار کر کے، ہر آواز کے مطابق الفاظ بنا سکتا ہے۔ مثلاً

(۱) (آ) آم۔ رات۔ بات (ب ا ت)

(۲) (اَ) اب، کب، جب۔ (ک ب، ج ب)

(۳) (اے) ایک، ریل۔

(۴) (اِ) اِس، اِن، دِن۔

(۵) (اُو) اُون، لُوٹ، بُوٹ۔

(۶) (اُ) اُس، اُگ۔

(۷) (اُو) رُول، دُودھ، جھُوٹ۔

(۸) (اَے) بَیل، بَیٹھ، بَیت۔

(۹) (اَو) غَور، مَوج، اَور۔

(۱۰) (اِی) نِیس، بِین، کِیل۔

(۱۱) (آ) اور (ای) کی مرکب آواز۔ چَلی، دَہی گئی۔

(۱۲) (او) اور (آ) " بولا، تولا

(۱۳) (اُو) اور (آ) " ٹوٹا، سوٹا۔

(۱۴) (اے) اور (آ) کی ترکیب آواز - لیٹا

(۱۵) (ای) اور (ا) " جیتا -

(۱۶) (آ) اور (اُو) " آڑو -

(۱۷) (او) اور (اے) " کھوئے -

اسی طرح ایسے الفاظ مثلاً لوٹا - لُوٹا کا فرق صرف ایک پیش کو نمایاں کرکے دکھانے سے سمجھ میں آسکتا ہے - ابتداً اعراب کو تختۂ سیاہ پر ضرور دکھایا جائے ورنہ طلباء الفاظ کو پڑھنے میں غلطی کریں گے - قدرے صحت لفظی اور کچھ ذخیرۂ الفاظ جمع ہو جانے کے بعد ان علامات کو حذف کرنا ہی پڑتا ہے -

۳ - نصابِ بالغان کا مسئلہ

نصاب کو تیار کرنے سے پیشتر زمینداروں، مزدوروں، اور دکانداروں کی تعلیمی ضروریات پر غور کرنا چاہیئے - شہروں کی طرح دیہات میں بھی مدارس شبینہ کے اجرا کی تحریک جاری ہے - مزدوری پیشہ لوگوں کے لیئے یہی ایک قسم کی مناسب درسگاہ ہو سکتی ہے -

موجودہ حالات میں ان لوگوں کو زبان دانی سکھانے کے لئے، نصابِ تعلیم کو ضروری اور مناسب صنعتی، مذہبی، یا سیاسی امور پر مبنی کیا جا سکتا ہے - پنجاب کے شہروں میں مختلف قسم کے مدارس موجود ہیں - مثلاً صنعتی اسکول، عام مدارس، کمرشل اسکول، آرٹ اسکول، ٹکنیکل اسکول، وغیرہ - ان سب کو مدارس شبینہ میں منتقل کیا جا سکتا ہے - ہر چند کہ ہمارا ملک ہند فلسفہ اور مذہب کا گہوارہ ہے - تاہم مذہبی دلچسپی کو حد سے زیادہ بیدار کرکے تعلیم دینا چنداں مفید ثابت نہیں ہوا - بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ ملک کے حالات تبدیل ہو چکے ہوں اور مذہب اور سیاست کے میدان الگ الگ ہیں - ابتدائی حالات میں تعلیم کو ان

دونوں سے قدرے فاصلہ پر رہنا چاہیئے۔ تعلیم بالغان میں ہمارا مدعا زیادہ تر تعلیمی تحریک سے ہے۔ اس تحریک کے لئے اور ذرائع بھی ہو سکتے ہیں۔ جو مذہب اور سیاست سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ مذہبی چنگاری کے ساتھ کھیلنا چنداں منفعت بخش ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ آئندہ چل کر یہ چنگاری تعصب اور خونریزی کے شعلے میں بھڑک اٹھا کرتی ہے۔ اور اس تنکوں کی بنی ہوئی درسگاہ یعنی نائٹ اسکول کو بھسم کر سکتی ہے۔ بعض دلچسپ امور اور ذرائع ہماری روزمرّہ کی ضروریات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً دیہات کا حفظان صحت، گھر کی ہائی جین، گاؤں میں فصلوں کی ترقی کے ذرائع وغیرہ۔

نائٹ اسکول میں تعلیم دینے کا مسئلہ فقط ایک جملے میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی "دو گھنٹے کے عرصہ میں تمام کائنات کو بند کر کے کس طرح طلباء کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے"۔ لہذا اردو میں ایک ہمہ گیر اور تمام مضامین پر مشتمل نصاب تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کے ذریعے ہمہ طرفہ اور مفید واقفیت حاصل ہو سکے۔ لارڈ یوسٹیس پرسی (Lord Eustace Percy) موجودہ وزیر تعلیم انگلستان نے ۲۴ مارچ ۱۹۲۷ء کو بمقام لندن میں قومی تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ اس موضوع پر ارشاد فرمائے تھے کہ ۱۴-۱۶ سال کی عمر کے طلباء کے لئے جو کورس مقرر کئے جائیں ان میں لڑکوں اور لڑکیوں کی عام واقفیت کی چیزیں ہونا نہایت ضروری ہیں۔ البتہ لڑکوں کے لئے ایسے مضامین ہوں۔ مثلاً دیہاتی سائنس، نجاری، اور دستکاری۔ ہم بھی پنجاب میں اس قسم کے علوم و فنون اردو کے ذریعے پڑھا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے زراعتی صوبے میں ادلٹ تعلیم کی یہ اسکیم کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ پنجاب کے دیہات میں بالغ لڑکیوں کی تعلیم ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ جس سے ہمیں عنقریب سابقہ پڑنے والا ہے۔

پنجاب کے بالغان کے لئے اردو تعلیم کا مندرجہ ذیل خاکہ بطور رہنمائی پیش ہے!

جاتا ہے - جو نائٹ اسکول کے معلم کے لئے مفید ہوگا -

۱ - موجودہ مجلسی، اقتصادی، صنعتی، سیاسی، زراعتی اور حفظان صحت کے مسائل پر اُردو میں عام لیکچر ہوں - مثلاً رسومات شادی کی اصلاح، نرخ نبادلہ، نیشکر کی کاشت، ملیریا سے بچنے کے وسائل، چین جاپان یا اور کسی غیر ملک کا حال، گیہوں کی کاشت کا سب سے اچھا طریق کیا ہونا چاہیئے - غلیظ پانی پینے کے خطرات وغیرہ - ان لیکچروں میں سے بعض، میجک لالٹین کے ذریعے طلباء نارمل اسکول قصور نے دئے ہیں - ہمارے اڈلٹ اسکول میں بہ شمولیت نصاب تعلیم مجوزہ خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ہے - وہی طلبا ان لیکچروں کی مشق کرتے رہے ہیں -

۲ - اُردو سمجھنے کی غرض سے، مقامی اور باہر کے مدارس کے اساتذہ ملکر کسی گاؤں میں مفت ڈراما کریں - تاکہ لوگوں کی اصلاح کے علاوہ زبان کی ترقی بھی ہو -

۳ - تفریحی مجالس کھیل کے مراکز (Play centres) کے طریق پر جاری کی جائیں -

۴ - گاؤں کے نوجوان آدمیوں کے کلب قایم ہوں - جس میں دستکاری، ورزش، کھیل، کشتی، سوچنی، گلی ڈنڈا اور گتکے کے علاوہ، ان سے ڈراما کرایا جائے اور ساتھ ہی ریڈنگ سرکلز قایم کئے جائیں - تاکہ وہ اڈلٹ اسکول ضروریات کے مناسب شیخ صاحب موصوف کی کتابیں یا اسی قسم کی کتب کو گشتی کتب خانے میں سے لیکر پڑھ سکیں - نوجوان کاشتکاروں کو اس طریق سے مفید مشاغل میں لگایا جا سکتا ہے - اس طرح لوگ ایسے مجلسی مشغلے اختیار کر سکتے ہیں - جن میں پڑ کر نہ صرف کاہلی سے نجات پائیں - بلکہ گاؤں والوں کے لئے مفید کام کر سکیں - مثلاً کھیتی باڑی یا غلّہ کی کلب، جس میں فصل کے موقع پر اپنے کھیت کی پیداوار کے نمونے بطور نمایش رکھے جائیں اور مقابلہ کے ذریعہ ایک دوسرے سے بڑھ چلنے کا شوق پیدا کیا جائے -

۵ - ایس - پی - ایس کے (انجمن اشاعت علوم) لاہور سے سلائڈ کی تصاویر مختلف لیکچروں کے لئے مستعار لی جاسکتی ہیں - اور میجک لالٹین کے ذریعہ دیہات اور قصبات، میں لوگوں کو لیکچر دے کر نہ صرف مشغول رکھا جاسکتا ہے بلکہ اردو کو سمجھنے کا ملکہ پیدا کیا جاسکتا ہے - ساتھ ہی اردو پڑھنے کے شوق کو بڑھایا جاسکتا ہے -

ہمارے قصبات کے بالغ لڑکوں کو رات کے وقت گلی کوچوں میں آوارہ پھرتے دیکھکر ہمارے معلمین کو عبرت ہونی چاہئیے - اس میں بڑی حدتک والدین جواب دہ ہیں کیونکہ وہ خود تعلیم سے عاری اور جاہل ہیں - اگر ہمارے مدارس شبینہ میں کھیل کے مراکز (Play centres) موجود ہوں - تو ایسے لڑکوں کو بہتر طریق سے مشغول رکھا جاسکتا ہے - اور ساتھ ہی پڑھائی - لکھائی اور حساب کی ابتدائی تعلیم دی جاسکتی ہے پنجاب کا محلِ وقوع اردو بولنے والی آبادی یعنی دہلی اور یو-پی کے قریب اسی طرح واقع ہوا ہے جس طرح کہ صوبہ السّاس، فرانس کے قرب میں واقع ہے - السّاس جنگ سے پیشتر جرمنی کا صوبہ تھا - مگر ۱۹۱۸ء کے بعد فرانس کے ساتھ اس کا الحاق ہوچکا ہے - مجھے فرانسیسی زبان کی ایک قابل معلّمہ نے بتایا کہ الحاق کے وقت تک یعنی ۱۹۱۸ء میں السّاس کی ⅘ آبادی، فرانسیسی سے ناآشنا تھی - اور وہاں صرف جرمن زبان بولی جاتی تھی - آج دس سال کے بعد یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے - کہ کوئی السّاسی، فرانسیسی زبان کو سمجھنے سے عاری نہیں - اور نہ اس میں گفتگو یا تحریر کرنے سے معذور ہے - یعنی وہ اس زبان کا استعمال بلاتکلف کرسکتا ہے - یہ دس سالہ کامیابی کس چیز کا نتیجہ ہے ؟ محض فرانسیسی مدرسین کی کوشش کا، جو السّاس کے قرب وجوار یعنی سرحد سے اُٹھ کر وہاں آتے رہے - اور اپنی زبان میں تعلیم دیتے رہے - پس اگر صوبہ پنجاب میں جہاں پچاس سال سے اردو تعلیمی زبان قرار پاچکی ہے - اسی ڈھب سے ہمارے ورنیکلر مدرسین ہمت اور کوشش کے ساتھ اردو کی تعلیم کو جاری کریں - تو بہت ہی قلیل عرصے میں ہمارے زمیندار

مزدور اور دکاندار اُردو لکھ پڑھ سکیں گے۔

۴۔ لکھائی اور پڑھائی کا طریق۔

یہاں اس کے متعلق چند اشارات بیان کئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ مدرسۂ بالغان میں مدرس کے پاس بہت محدود وقت پڑھائی کے لئے ہے اور اسی وقت کے اندر اسکی کوشش یہ ہے کہ ان بالغ آدمیوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے اور ان کی عام معلومات میں بھی اضافہ کرے اس کے علاوہ اس کا یہ مدعا بھی ہونا چاہیئے کہ اس کے بالغ شاگرد اردو بولی کو سمجھ سکیں۔ اور اپنی فرصت کے اوقات میں اخبار بینی یا کتاب کا مطالعہ کر سکیں ج پڑھائی میں، نظر بحالاتِ تنگیٔ وقت، صوتی کام کو حتی المقدور کم کرنا چاہیئے۔ اور طریق بین دگو کو زیادہ عمل میں لانا چاہیئے۔ مثلاً مروّجہ اُردو گیت یا کسی عام کہانی کو کام کی بِنا قرار دیا جائے۔ جس میں کم سے کم الفاظ کی تعداد ہو۔ ان الفاظ کو بجنسہ تختہ سیاہ پر چھوٹے چھوٹے جملوں کی صورت میں لکھنا چاہیئے۔ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ایک سطر میں ایک سے تین تک الفاظ ہوں۔ اس سے زیادہ نہ ہوں۔ ان الفاظ کو مدرس اور طلبا کئی مرتبہ دیکھ دیکھ کر دُہرائیں۔ ہر لفظ کی صورت کو بار بار لکھوایا اور پڑھوایا جائے تا آنکہ یہی الفاظ متن سے علیحدہ یا کسی اور متن میں پہچانے جا سکیں۔ مثلاً ذیل کے جملوں کے گروہ تختۂ سیاہ پر لکھے جائیں:—

ایک	دفعہ	
دو	بیل	
کسی	کھیت	میں
چرنے	گئے	
راستے	میں	
ان	کو	

ایک	شیر	ملا
مگر	بیل	
شیر	سے	
نہیں	ڈرے	
کیونکہ	وہ	دونوں
بڑے	دوست	تھے

بالغ طلبا کو اردو بولی سکھانے کی غرض سے بعض جملوں کے سیٹ (Set)
حفظ کرانے چاہئیں۔ جس طرح بعض انگریز، فرانس یا جرمنی میں سفر کرنے سے پیشتر، ان
زبانوں کے کارآمد جملے حفظ کر لیا کرتے ہیں۔ مثلاً

(۱) آداب عرض۔ مزاج شریف۔ تشریف لائیے۔ یہ سب آپ کی نوازش ہے۔
شکریہ عرض ہے۔ بندہ کس لائق ہے۔

(۲) میاں قلی اِدھر آؤ۔ ہمارا سامان اٹھاؤ۔ کیا مزدوری لوگے؟

(۳) ہوٹل کس طرف کو ہے۔ ہوٹل کی عمارت تو ہمیں پسند نہیں۔ اس کا زینہ
کس بدتمیز نے بنایا ہے؟ وغیرہ

پنجاب کے ناخواندہ بالغ آدمیوں کو اردو میں لیکچروں، وعظوں، تقریروں اور ڈراموں
وغیرہ کو اردو میں سمجھنے کی دقت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لئے صرف اتنی مشق درکار ہے کہ وہ
ایسے مواقع میں بکثرت شریک ہو سکیں۔ پس پنجابی بالغان کی مقدم ضرورت یہ ہے کہ اوّل
پڑھنا لکھنا سیکھیں اور اس کے بعد دوسرے درجے پر اس کی ضرورت ہے۔ کہ وہ اردو
بولی کو اخذ کر کے کچھ بول سکیں۔ چنانچہ پنجاب کی آبادی بالعموم اپنے خیالات کو اردو میں
کم و بیش ظاہر کر سکتی ہے۔ پس مدرس کو اپنی تمام توجہ اس امر پر صرف کرنا چاہیے۔ کہ
لکھائی اور پڑھائی کے سب سے آسان اور عملی طریقے بالغون کیلئے کون سے ہوں؟

بالغوں کے لئے ایک معقول سلجھی ہوئی اور غیر پیشہ ورانہ طرزِ تعلیم مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں یہ اصول بھی پیشِ نظر رہے کہ وہ اردو مطالعہ میں اپنی فرصت کا وقت گزاریں۔ اس کے لئے اردو میں ایک خاص پروگرام مندرجہ ذیل طرز کا ہونا چاہیئے۔ مثلاً

ا۔ ہند کی تاریخی کہانیاں مدرس کی زبانی سن کر طلبا انھیں کتاب میں پڑھیں۔

ب۔ مختلف قسم کے قصّے (اخلاقی، ظرافت آمیز، مذہبی) ناول اور اخبار بینی۔

ج۔ جماعت کو ایک مجمع کی ہئیت دے کر، مجلس میں کھڑے ہو کر تقریر کرنے کی مشق کرائی جائے۔ اور اس کے بعد سب اس پر بحث کریں۔

د۔ سوانح عمری کا مطالعہ یعنی مشاہیر تاریخ و مذہب کا حال۔

ر۔ ہندوستان کا کچھ تجارتی جغرافیہ اس غرض سے پڑھایا جائے۔ کہ طلبا اردو زبان کو اپنے ماحول کے قریبی تعلق کے سلسلے میں پڑھ سکیں اور ساتھ ہی علم ادب کے ساتھ دماغی اور جذباتی اپیل کا رشتہ بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

س۔ مدرس کی نگرانی میں پبلک کو ریڈنگ روم کا استعمال سکھایا جائے۔

ش۔ خطوط نویسی بالخصوص تجارتی خط و کتابت، سرکاری خطوط، بل تیار کرنا، رسید، ہنڈی، پرچہ، بیعنامہ، رہن نامہ، اقرار نامہ، طلاق نامہ، وصیت نامہ وغیرہ روزمرّہ کی ضروریات کی چیزیں لکھائی جائیں۔

ص۔ مختلف پیشوں اور کاموں کے متعلق گفتگو اور پھر انھیں کا حال کتب اور رسائل میں پڑھوایا جائے۔ مثلاً صابون سازی، موم بتی بنانا، لکڑی کا کام، اس قسم کی پڑھائی ان لوگوں کے واسطے ہو گی جو ان پیشوں میں مصروف ہوں۔

ض۔ اردو نظم و نثر کے بہترین نمونوں کو حفظ یاد کرنا۔

ط۔ ہجا اور خوشخطی پر خاص توجہ کی جائے۔

ظ - اپنی تعلیم خود کرنے کے طریقوں کی مشق کرائی جائے - مثلاً لغت کے ذریعہ یا اس کے بغیر دکانوں کے سائن بورڈ، اشتہارات، اخبار، مذاق، کارٹون وغیرہ پڑھوانا -

مذکورہ بالا کام کو طلبا کی انفرادی ضروریات کے مطابق کرانا چاہیئے - کیونکہ طلباء کی مختلف استعداد کے باعث یہ ممکن نہ ہوگا - کہ مذکورہ سلیبس کو سب کے لئے یکساں رکھ سکیں تعلیم بالغان میں یہی ایک سب سے بڑی دقّت ہے - اس کے علاوہ دوسری مشکلات ہیں - مثلاً بے قاعدہ حاضری، بڑی جماعتیں، محدود مالی ذرائع اور کامل طور پر مرتّب شدہ نصاب کا فقدان - پس ان مشکلات کا خیال رکھتے ہوئے زیادہ توجہ نصاب اور لکھائی اور پڑھائی کے طریق کو مرتب کرنے پر صرف ہونی چاہیئے -

خادم محی الدین

اخلاقی تعلیم

آج کل پرانے لفظ تعلیم کی جگہ علم التعلیم یا تعلیمات کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے جس سے علمی شان ٹپکتی ہے۔ اگر تعلیمات کے معنی حرف بحرف وہی ہوتے جو پہلے تعلیم کے تھے تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر سچ پوچھیے تو بچوں کی تربیت کا وہ طریقہ جو کسی زمانے میں تعلیم کہلاتا تھا اب تقویم پارینہ کی طرح بالائے طاق ہو گیا ہے اور اب لوگوں کے ذہن میں ایک بالکل نیا اور خاص مفہوم ہے جس کے لئے نیا لفظ بھی ضروری تھا۔

نئے نظریہ تعلیم کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دو مخالف اصولوں میں، جن میں سے ہر ایک یکطرفہ اور نامکمل تھا، مصالحت کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلا اصول تو یہ تھا کہ ذہن انسانی میں ادراک اور ارادہ دو مختلف قوتیں ہیں جن میں سے ارادہ کی تربیت انسان کی سیرت کی تعمیر کے لئے کافی ہے۔ اور ادراک، علم، یا فکر کوئی اہم چیز نہیں۔ لیکن ذرا سے غور سے معلوم ہو جائیگا کہ بغیر خیال یا ادراک کے ارادہ محض ایک اندھی قوت ہے اور اسی قوت کی تربیت ایسی ہے جیسے کسی مشین کا مقصد سمجھے بغیر اس کا چلانا سکھا دیا جائے۔ خود اخلاق کا دارومدار قوت ادراک کی تہذیب پر ہے۔

اسی طرح یہ دوسرا اصول بھی صحیح نہیں ہے کہ علمی قابلیت اور منطقی صحت بجائے خود اس کے لئے کافی ہیں کہ ارادہ کو نیکی کی طرف حرکت دے سکیں۔ بلکہ محض علم سے تو عقل کی بھی پوری تربیت نہیں ہوتی۔ یہ کہنا کہ ہر چیز بندھے ٹکے ضوابط کے ماتحت ہے اور تعلیم و تربیت محض اس کا نام ہے کہ چند علمی ضابطے بتاتے جائیں اور ان کی پابندی کی جائے گویا انسان کو مشین کی جگہ طوطا بنا دینا ہے اور یہ دوسرا جبر بھی پہلے جبر سے کچھ کم نہیں ہے۔

لیکن اگر انسان کا مبلغ علم بجائے خود ارادہ اور اختیار پر جو عمل کا سرچشمہ ہے کوئی اثر نہیں ڈال سکتا تو کم سے کم عقل یعنی وہ قوت جو علم کو حاصل اور قبول کرتی ہے ضرور یہ

صفت رکھتی ہے۔ اسی لئے اخلاقی تربیت خیال اور ادراک کو بیکار سمجھ کر رد نہیں کرتی بلکہ اس کو بنیاد کار قرار دیتی ہے۔ عمدہ اخلاق کے لئے قوت انتخاب، نفاست اور تمیز اور خیالات و سیرت کی بلندی کی ضرورت ہے اور ان چیزوں کے لئے عقل اور ارادہ دونوں کی مدد ضروری ہے۔

تعلیم کا صحیح اور مکمل مفہوم یہ نہیں کہ کوئی خاص عادات یا کوئی خاص علم حاصل کیا جائے۔ اس سے مراد ہے کہ انسان کی تمام جسمانی، دماغی اور اخلاقی قوتوں کی تربیت اور نشوونما کی جائے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کسی میکانکی کمال کے واسطے اس کو آزادی سے محروم کر دیا جائے، خواہ وہ کمال کیسا ہی زبردست کیوں نہ ہو۔ بلکہ اس کا مقصد ہے کہ اسے انسانی آزادی کی تکمیل کے درجے تک پہنچایا جائے۔ معلم کا کام بھی نہایت عجیب اور پیچیدہ ہے۔ اس کو متعلم کے دماغ اور ضمیر پر اس طرح اثر ڈالنا ہے کہ اس میں از خود فکر اور فیصلہ کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اپج، اور اظہار خودی کی خواہش مستحکم ہو اور اس کی سیرت کی ان آزادی کے عناصر میں تشکیل کی جائے۔ یہ کام اتنا ہی قابل قدر بھی ہے جتنا مشکل ہے۔ وہ خالق عالم کے کمال تخلیق کی ایک مجازی جھلک ہے۔

لیکن جب ہم اس مسئلہ کے وسیع تر مفہوم پر نظر ڈالتے ہیں۔ اور خود سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمیں ان معاملات میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے جن کا تعلیم محض تعلیم سے نہیں بلکہ تربیت سے ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب آسان نہیں۔ جب ہم بچوں کو تعلیم دیتے ہیں جو ایک حد تک ہم سے اجنبی ہیں تو ہم خود کو کس حیثیت سے معلم کہہ سکتے ہیں؟ کیا ہمیں ان چیزوں پر کامل اعتقاد ہے جو ہم ان کو سکھاتے ہیں؟ کیا ہمیں یہ اختیار ہے کہ ہم ان کو یہ سب چیزیں سکھائیں؟ کیا ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم صریحی حقائق کے علاوہ جس کی طلبا کے والدین ہم سے توقع رکھتے ہیں اور جن کی تصدیق کی جا سکتی ہے، اور کچھ بھی طلبا کو سکھائیں یعنی مختلف مسائل کے متعلق اپنی رائے، اخلاقی اصول و قدور وغیرہ۔

ایک بات بالکل مسلمہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اسکول کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تربیت کی طرف سے غافل ہو جائے کیونکہ اس کا اثر سیرت اور ذہن دونوں پر پڑتا ہے، اس لئے ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ اثر بحیثیت مجموعی عمدہ ہو۔ لیکن دقتیں بھی اسی منزل سے پیدا ہوتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے بعض صاحبان فکر کی یہ رائے ہے کہ روشن دماغی اور تعلیم انسانکو آزادی بخشتی ہیں اور اس کی وجہ سے وہ لازماً بہتر انسان بنجاتا ہے اور زیادہ خوشی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس نظریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکول کو اپنے فرض کی ادائگی میں اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ تربیت کو تعلیم سے جداگانہ کوئی چیز سمجھے۔ وہ علم وعقل کی ترقی کو مقصود بالذات سمجھ کر اس کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اور واقعات اور ان کے باہمی تعلقات کا سائنس کے نقطہ نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں وہ گویا قوت ارادی کی تربیت بھی کرتا ہے جس کی ہم اس سے توقع رکھتے ہیں۔

لیکن یہ بات بہت مشکوک ہے کہ تربیت کے مسئلہ کا حل اس سہل طریقہ سے ہو جائے۔ اٹھارہویں صدی میں بھی روسو نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اخلاقی ترقی علمی ترقی کا لازمی نتیجہ ہے یا نہیں۔ اس کی یہ رائے تھی کہ اگر تہذیب کا مقصد یہ ہے کہ وہ جبلت کے تابع انسانوں کو عقل اور آزادی کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دے تو اسے اس بات کو قبول کر لینا چاہیئے کہ فطرت انسانی اخلاقی قوانین کے تابع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تجربے اور عقل دونوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ علم اور تعلیم ایسی چیزیں ہیں جنکو انسان اپنے ارادے سے خیر کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے اور شر کے لئے بھی۔ بے شک انسے تربیت میں بہت سی آسانیاں ہوتی ہیں۔ لیکن تربیت تمام تر ان میں شامل نہیں ہے۔ اس کے اپنے جداگانہ اصول ہیں اور ان کی بجائے خود پیروی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ بات بالکل درست ہے کہ اسکول کو تعلیم اور تربیت دونوں کے فرائض

اپنے ذمہ لینے چاہئیں اور ان کے لئے مناسب ذرائع اور طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم خاندان اور سوسائٹی دونوں کو بیکار قرار دے کر، محض اسکول کی مدد اور اسی کے ذریعہ سے بچہ کے شعور کی تربیت نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس نہ اس کے لئے کافی وسائل ہیں نہ ہمیں اس کا اختیار حاصل ہے۔ مانا کہ ہمیں اپنے عقائد پر مستحکم ایمان ہے اور ہماری نیت بھی نیک ہے۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہمارے عقائد دوسروں کی نظر میں محض ذاتی وہم وخیال معلوم نہیں ہوتے۔ اور یہ کہ لوگ ہماری اس کوشش کو ایک قسم کا جبر قرار نہ دیں گے؟

ممکن ہے کوئی شخص یہ بات کہے کہ ضمیر انسانی کی اس تربیت کو کارآمد اور جائز بنانے کے لئے، ہم حکومت کے قوانین یا کسی اور مسلمہ جماعت سے سند جواز حاصل کر سکتے ہیں لیکن انسانی ضمیر کو خاص سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش، خواہ وہ حکومت کی جانب سے ہو یا کسی فرد کی جانب سے، دونوں صورتوں میں انسانی احترام کے منافی ہے بلکہ اگر حکومت یا رائے عامہ کا اس پر قبضہ ہو تو ممکن ہے وہ اور بھی زیادہ بری معلوم ہو۔

آخر ان اعتراضات کو دور کرنے کا کوئی اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے؟ میرے خیال میں یہ اعتراضات بالکل رد ہو سکتے ہیں اگر ہم یہ اصول قرار دیں کہ معلم کو کسی صورت میں بھی متعلم کے ضمیر پر جبر کرنا یا دباؤ ڈالنا نہیں چاہئیے بلکہ اس کو چاہیئے کہ وہ ایسی شخصیتوں کی نشوونما کو اپنا مطمح نظر قرار دے جو خود فکر اور عمل کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ جن میں نہ صرف احساس فرض اور ضابطہ اخلاق کی پیروی کی خواہش ہو بلکہ اتنی جرأت بھی ہو کہ وہ اس ضابطہ کی پیروی محض اپنی آزادی رائے کی وجہ سے کریں نہ کہ کسی خارجی اثر سے۔ اس صورت میں اخلاقی تعلیم کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ وہ لوگوں کے ضمیر کو مطیع بنائے۔ کیونکہ اس کا کام تو یہ ہوگا کہ وہ آزادی ضمیر کو پیدا کرے اور اس کی پرورش کرے۔

تربیت اس وقت مکمل ہوتی ہے جب انسان کا ارادہ اور قانون اخلاق ایک دوسرے

میں مدغم ہو جائیں۔ عمل خیر کی ضامن محض یہی ہو سکتی ہے اور اس کی وجہ سے اس میں اخلاقی قدر پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس مقصد سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ معلم کو کس قدر ایمان داری اور احتیاط کے ساتھ اپنے ذرائع اور وسائل کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ اگر ضمیر کی آزادی واقعی ہے اور اس میں اخلاقی شان پائی جاتی ہے، تو یہ ضرور ہے کہ وہ قانون (قانون اخلاق) جس میں انسان کا ارادہ مدغم ہوا ہے زیادہ سے زیادہ وسیع اور عالمگیر ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ارادے کو پوری آزادی فکر و عمل حاصل ہو۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ معلم جس قسم کی آزاد شخصیت پیدا کرتا ہے اس میں یہ شرط پوری نہیں ہوگی۔ یہ کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ معلم، جو ضمیر کی تربیت کو اپنا فرض سمجھتا ہے، احتیاط اور سختی کے ساتھ وسیع، عالمگیر قوانین اور تصورات کی حد سے آگے نہ بڑھے گا اور اپنے اثر کو انھیں حدود تک محدود رکھے گا۔ اس کو بچہ کی صحیح تربیت اور اس کے لئے موزوں ماحول مہیا کرنے کی فکر ہے۔ اور اس سرگرمی میں ممکن ہے وہ اپنے اصل مقصد کو فراموش کر دے۔ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ جوں جوں وہ کوشش کرے کہ ایک آزاد شخصیت پیدا کرے۔ اتنا ہی زیادہ گہرا نقش وہ اپنی شخصیت کا بچہ پر قائم کرے؟ اور اس کے جانے بوجھے بغیر ایسا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم بالعموم دوسروں کے لئے اسی وقت آزادی فکر کو جائز سمجھتے ہیں جب ان کے خیالات وہی ہوں جو ہمارے ہیں

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بچہ کا دماغ ابھی تک خیالات اور تصورات سے بہت کچھ خالی ہے۔ اور یہ بات اس کو بہت بھاتی ہے کہ وہ بھی کوئی "شخص" بن جائے۔ اس لئے اگر آپ علاوہ معمولی تعلیم کے، آزادی اور شخصیت کو بھی اس پر عائد کرنا چاہیں تو وہ آپ کے خیالات کو اور بھی زیادہ آمادگی کے ساتھ قبول کرے گا۔ خصوصاً اگر اس کو یقین دلایا جائے کہ وہ خیالات اس کے اپنے ہیں۔ اس کی حالت اس شخص کی سی ہوگی جو ہپناٹزم کے اثر میں ہو اور جس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ جوں جوں کسی دوسرے کا ارادہ اس کے ارادہ کی جگہ لیتا جاتا ہے، وہ زیادہ آزاد اور خود مختار ہوا جاتا ہے۔

یہ خطرہ ہے جس سے معلم کو محفوظ رہنا چاہیئے - اس لئے ضمیر کی تربیت میں بہت حزم اور احتیاط کی ضرورت ہے اسکول کو ایسا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیئے کہ گھر اور سوسائٹی کے لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ وہ بچوں کی تربیت کا تمام فرض اسکول پر ڈال کر اس سے سبکدوش ہو سکتے ہیں - اسکول بے شک اپنی استطاعت کے موافق اس کام مدد دے گا لیکن محض ایک شریک کار کے طور پر، نہ بحیثیت واحد ذمہ دار تعلیمی جماعت کے - لیکن اس صورت میں بھی اس کا فرض کافی اہم ہے -

فرض کیجئے کہ استادوں کو اخلاقی نقطہ نظر سے بہت احتیاط کے ساتھ منتخب کر لیا گیا ہے -- اس حالت میں ان کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کا احساس فرض مختصر یہ کہ ان کا ہر قول و فعل بجائے خود ایک نہایت پر اثر اخلاقی تعلیم ہوں گے - وہ تعلیم جو مثال کے ذریعہ دی جائے - لیکن محض یہ کافی نہیں - ایک طرف تو وہ نظریہ ہے جس کی رو سے تعلیم کا اثر فوری اور لازمی طور پر اخلاقی ہوتا ہے - اور دوسری طرف یہ کہ تربیت تعلیم سے بالکل جداگانہ چیز ہے -- ان دونوں کے بین بین ایک اور نقطہ نظر ہے یعنی تعلیم بسبب ذریعہ تربیت - اور ایک مدرسہ کے معلم کا اصل فرض یہی ہے کہ وہ تعلیم دے، وعظ نہ کرے البتہ مضامین مطالعہ میں سے بعض ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست اخلاق سے ہے تعلیم دینے میں وہ ان کو ترجیح دے گا - اس سلسلہ میں یہ اعتراض پیدا نہیں ہوتا کہ علم بذات خود ہیچ ہے - اصل چیز عمل ہے - اور ایک سبق کو صحیح طور پر یاد کر لینے اور دہرانے میں اور جو کچھ سیکھا ہے اس پر عمل کرنے میں بڑا فرق ہے - سقراط کے اس دعوے میں کافی حد تک صداقت ہے کہ جو شخص خیر کا علم (علم اخلاق) رکھتا ہے وہ ضرور ہے کہ عمل خیر کی خواہش بھی کرے گا -

اس تعلیم اخلاق میں کیا چیزیں شامل ہیں؟ کیا اس کا مقصد یہ ہو گا کہ ایک ایسا ہفتہ وار مجموعہ ایمان و عمل طلبا کو سکھائے جس کو وہ حالات موجودہ میں حق کا مکمل اظہار سمجھیں؟

میرا خیال ہے کہ اگر ہم اس قسم کے بنے بنائے نظام عقائد کی تعلیم دیں گے تو تعلیم ضرور مبہم، مجرد اور محض دعوے پر مبنی (dogmatic) ہوگی۔ اور افراد کے ذاتی تعصبات اور اوہام کا شکار ہوگی۔ میری رائے میں پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ جب کوئی شخص اپنے عمل کی ہدایت کے لئے اخلاقی قوانین کو منضبط کرتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ غلطی ہوگی کہ ہم اسکول کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں جو عوام کے روزمرہ کے طریقوں سے مختلف ہو۔ اس سے نہ صرف تصنع پیدا ہوگا بلکہ یہ ناجائز بھی ہوگا۔ معلم کے لئے بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ ان چیزوں کو پڑھائے جو روزمرّہ کی زندگی میں انسانوں کا موضوع فکر ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے اخلاقی شعور کے بہترین اور بلندترین تصورات کو لیکر، اس تجربہ کی روشنی میں جو اس کو بحیثیت سوسائٹی کے ایک فرد کے حاصل ہوا ہے ان کو باہدگر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ یہ سمجھ لے گا کہ وہ شہری حکومتیں جو یونانیوں کے لئے مناسب تھیں اس زمانہ کے لئے موزوں نہیں۔ اور آج کل کی خانگی زندگی، اخوت، سائنس، عدل، آزادیٔ ضمیر، کام، مساوات اور حریت میں جو اچھی چیزیں ہیں ان کو سمجھے گا۔ اور وہ لوگوں کو یہ سمجھائے گا کہ بہترین طریقۂ عمل وہ ہے جو تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے اور کم سے کم لوگوں کو نقصان پہنچائے۔

اخلاق کی تعلیم سے پہلے اخلاقی زندگی، اخلاق پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسکول کی زندگی میں اس کو سب سے پہلے مثال کے ذریعہ سکھایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں معلم کو اور بھی کم اختیار ہے کہ وہ اپنے تخیل کو جولاں کرے۔ اس کو محض مسلمہ عالمگیر اصولوں سے بحث کرنی چاہیئے۔ وہ نہ صرف اپنے تمام طالب علموں کا یکساں خیال رکھے گا بلکہ وہ صرف انھیں باتوں کو بتائے گا جو تمام سوسائٹی کو سنائی جا سکیں۔ علاوہ بریں وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل کرنا اس کے لئے ایسا ہی فرض ہے جیسا اس کے سامعین پر۔ اخلاقیات کے لحاظ سے معلم اور متعلم میں کوئی فرق نہیں۔ اس سوال کے جواب میں کہ "ہمیں فلاں کام کیوں کرنا

چاہیئے اور فلاں کام سے کیوں بچنا چاہیئے ؟" معلم صرف ایک ہی جواب دے سکتا ہے (اور اس کے علاوہ انسان کے لئے اور کون سا جواب ہے ؟) اور وہ یہ ہے کہ "یہ کام اچھا ہے اور وہ کام برا ہے"۔ اس جواب کی خوبی اور قوت یہ ہے کہ یہ چھوٹے بڑے سب کیلئے یکساں ہے۔

معلم کو ہر مضمون کی تعلیم میں یہ موقع ملے گا کہ وہ اپنے طلبا کو بتائے کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ کھیل اور کام دونوں میں فرض، ایمانداری اور پاس عزت کا خیال ملحوظ رہنا چاہیئے۔ اور بغیر وعظ اور اخلاقی لکچر دئے طلبا کو ان اصولوں کی ہر ہر قدم پر یاد دہانی کرائی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں اگر ہم بعض خاص مضامین کو لیں مثلاً تاریخ اور ادب تو یہ بات ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی نظر کو محض الفاظ اور واقعات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ان کے اصلی مفہوم یعنی انسان کے خیالات، جذبات اور تقدیر کی کارفرمائیوں تک پہنچ جاتا ہے، اس کے لئے ان کے مطالعہ میں اخلاقی تعلیم و تہذیب کے بے شمار ذرائع اور وسائل موجود ہیں۔ اس تہذیب نفس کے لئے ان بڑی بڑی شخصیتوں اور مثالوں کا مطالعہ جو تاریخ اور ادب میں پائے جاتے ہیں بالخصوص مفید ہوگا۔ اغلب یہ ہے کہ اخلاقی عمل کی اصلی محرک اکثر کوئی مثال ہی ہوتی ہے۔ اسلام کو کس چیز نے زندگی اور تاثیر بخشی ؟ ایک نظریہ زندگی نے یا ایک اعلیٰ زندگی کی عملی مثال نے ؟

اشاعتِ نظریہ کی وہ شکلیں ہیں جو عمل کے قریب ہوتی ہیں۔ جب خیال کو اظہار کا عمدہ ترین جامہ پہنا دیا جائے جو اس کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھے تو اس کا اثر یقیناً بہت زبردست اور دوررس ہوتا ہے۔ ایک پرزور ضرب المثل انسان کے حافظہ پر کندہ ہو جاتی ہے اور غیر محسوس طریقہ پر عمل کی محرک اور معیار بن جاتی ہے (ارادہ کا جزو ہو جاتی ہے) اس لئے یہ ایک عمدہ مشق ہے، اگرچہ لفظاً بالکل [illegible] کہ طلبا کو ہر روز کوئی عمدہ اور شریفانہ کارنامہ یا کوئی ادبی ضرب المثل [illegible] جو دنیا کے مذہبی، اخلاقی یا ادبی ذخیرہ سے لی گئی ہو۔ خود استاد کے لئے یہ ایک [illegible] کہ وہ ان [illegible] ترتیب

سے جمع کرے۔ بچے ان کو یاد کر سکتے ہیں اور استاد کو سنا سکتے ہیں۔ استاد ان کو احتیاط کے ساتھ سمجھائے گا، دوسرے قصوں اور مثالوں سے ان کا مقابلہ کرے گا۔ اور ان کی بنیاد پر فلسفیانہ غور و فکر کے لئے مواد مصالح مہیا کرے گا۔ اس قسم کی تعلیم ایک طرف تو بہت بڑے عالموں کے لئے تشفی بخش ہو سکتی ہے اور دوسری طرف بہت محدود علم و عقل والوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے علماء نے بھی اس کے سوا کیا کیا ہے کہ وہ قرآن شریف کے اصولوں اور آیتوں کی تشریح و تفسیر کریں؟

اگر اسکولوں میں اخلاقی تعلیم اس طریقے سے دی جائے تو اس پر یہ اعتراض وارد ہو گا کہ وہ مبہم اور مجرد ہے، یا مشکل اور غیر دلچسپ ہے اور افراد کے ذاتی وہم و گمان پر منحصر ہے۔ استادوں کا اپنا اخلاقی مرتبہ اس درجہ بلند ہونا چاہیئے کہ لوگ ان کا احترام کریں۔ ان کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ انھیں وہ آزادیٔ عمل حاصل ہے جو ہر خیر کے لئے اور احساس ذمہ داری کے لئے شرط لازم ہے۔ ان کو اپنی تعلیم کھلم کھلا دینی چاہیئے اور اپنے ہمخیال لوگوں کی ہمدردی اور مشورہ پر بھروسا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس فرض کو انجام دیں تو اسکول بھی نوجوانوں کی اخلاقی تربیت کے فرض کو ادا کرنے میں معین ہو گا۔ اور نوجوانوں کو وہ بہترین سبق اور باتیں سکھائے گا جو گزشتہ نسلوں نے ہمارے لئے بطور ایک قیمتی ترکہ کے چھوڑی ہیں۔ ان کو انسان بنانے کا اس سے بہتر اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟

بشیر احمد ہاشمی

ہندوستان کے دیہات میں تعلیم

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی، اور ذہنی ترقی کا دار و مدار زیادہ تر اس ابتدائی تعلیم کی طرز پر ہے جو خاص طور سے دیہاتی آبادی کو دی جاتی ہے۔ برطانوی ہند میں ۶٫۵ فیصدی پڑھے لکھے ہیں (ملاحظہ ہو رپورٹ مردم شماری سنہ ۲۱ء) یہ تناسب بمقابلہ یورپ کے بہت گرا ہوا ہے۔ جاپان میں ابتدائی مدارس میں بچوں کا داخلہ پوری آبادی کے حساب سے ۱۴٫۵ فیصدی ہے انگلستان میں پندرہ فیصدی ہے۔ ہندوستان میں تین فیصدی سے بھی کم۔ گویا کہ ہندوستان جاپان اور انگلستان سے پانچ حصہ پیچھے ہے

ہندوستان چونکہ زراعتی ملک ہے عوام دیہات میں رہتے ہیں چنانچہ ہر دس میں سے نو ہندوستانی دیہاتی ہیں۔ لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کے دیہات میں سے تین ثلث میں مدارس بالکل نہیں ہیں۔ ان تین کروڑ اسی لاکھ بچوں میں سے جن کو مدرسہ میں ہونا چاہیئے تھا صرف اسی لاکھ اس وقت درج رجسٹر ہیں۔ موجودہ گنتی کے مدارس بھی عوام کو خواندہ بنانے میں پوری مدد نہیں دیتے۔ چنانچہ مسٹر آرتھر میہیو سابق ناظم تعلیمات صوبہ متوسط اپنی کتاب "ہندوستان میں تعلیم کی ترقی" میں کہتے ہیں:—

"جو تعلیم ہمارے اکثر ابتدائی مدارس میں دی جاتی ہے وہ بچپن ہی میں ختم ہو جاتی ہے اور اس سے مستفید ہونے والوں میں سے ۳۹ فیصدی پانچ سال کے اندر اندر پھر ناخواندہ ہو جاتے ہیں۔ ان مدارس میں اسکول کی زندگی کا اوسط زمانہ مشکل سے چار سال ہوتا ہے۔ ان چار برس میں بے قاعدہ حاضری اور غیر موثر تعلیم کی وجہ سے ابتدائی نصاب پورا نہیں ہوتا۔"

مسٹر گوکھلے نے مفت اور جبری تعلیم کے لئے سنہ ۱۹۱۱ء میں جہاد شروع کر دیا تھا اور ملک معظم نے اپنی سنہ ۱۲ء کی دربار کی تقریر میں تمام ملک میں مدارس کا ایک جال پھیلانے کی

خواہش ظاہر کی تھی۔ تھوڑی مدت کے لئے ہر وہ شخص جو خطاب یا ترقی کا امیدوار تھا اس انسان پکڑنے والی فوج میں بھرتی ہوگیا اور اس طرح جال بنانے کا کام شروع ہوگیا۔ لیکن یہ سب بیکار تھا کیونکہ مدارس کی تعداد تو بڑھتی گئی لیکن ہر مدرسہ میں طلبا کی تعداد کم ہوتی گئی۔ حاضری زیادہ بے قاعدہ ہوگئی اور تعلیمی نتائج غیر تسلی بخش ہونے لگے۔ اب حکام کو عوام کی تعلیم کے حقیقی مسئلہ سے سابقہ پڑا۔ زیادہ مدارس کی مانگ اور مجبور کرنیکے اختیارات نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کو ہر سال کا شست زیادہ غیر موثر اور قیمتی ہو جانا لازمی تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء تک صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ آئندہ مدارس کے کھولنے کی رفتار خود بخود کم ہو جائیگی بلکہ جیسا کہ مسٹر گوکھلے نے زور دیکر کہا تھا یہ طریقہ مالی اور تعلیمی لحاظ سے بالکل بیکار اور غیر مفید ہوگا۔ آخرکار حکومت ہند کو مسٹر گوکھلے کی جبری تعلیم کی اسکیم پر دوبارہ غور کرنا پڑا اور تقریباً ہر صوبہ میں ایک آئینی بنیاد قرار دی گئی جس میں مقامی جماعتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں جبری اسکیم تیار کریں اور اگر صوبہ کی حکومتیں پسند کریں تو ان کو جاری کریں اور اس غرض سے کوئی خاص یا مزید ٹیکس لگا دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۲۴۴۲۵ سے ۱۵۰۹۱۹ ہوگئی اور حاضر ہونے والے طلبا کا شمار ۶۱۳۷۰۵۵ سے ۶۴۵۱۹۲۵ ہوگیا۔ سب سے زیادہ زیادتی بہار اور اڑیسہ میں ہوئی جہاں کہ صرف لڑکوں کے لئے ابتدائی مدارس دو ہزار سے زیادہ بڑھ گئے اور حاضر ہونے والے طلباء بیاسی ہزار سے زیادہ ہوگئے لیکن اس کے بعد بھی جبری تعلیم نہایت آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ دیہات میں جبری تعلیم کے معاملہ میں پنجاب سب سے آگے ہے۔ پنجاب میں مقامی جماعت کو ناخوش لوگوں میں جبری تعلیم زبردستی نہیں جاری کرنی پڑی بلکہ گاؤں کے لوگ خود درخواست کرتے ہیں۔ وہ محرکات بہت سے ہیں جو اس درخواست پر لوگوں کو آمادہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس کا سبب تعلیم کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ اکثر اوقات قریب کے گاؤں کی مثال اور کبھی اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلباء کی تعداد بڑھ جانے پر مدرسہ لوئر مڈل یا مڈل کے درجہ تک کر دیا جائے۔ لیکن اس صوبہ

میں جبریہ تعلیم میں کامیابی ایک حد تک اس موثر اور قیمتی امداد کی وجہ سے ہے جو امداد باہمی کا محکمہ دیتا رہتا ہے۔ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز پنجاب کا ذیل کا بیان اس معاملہ میں دلچسپ ہے: "جو والدین سوسائٹی کے رکن ہوتے ہیں وہ اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ اپنے بچّوں کو ابتدائی چہارم جماعت تک مدرسہ میں بھیجتے رہیں گے۔ سوسائٹی کا انتظام ایک منتخب شدہ کمیٹی کرتی ہے جس کو سوائے ان اختیارات کے جو اس کو اپنے مخصوص قواعد یر دفعہ کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ کے رجسٹر کرانے کے ملتے ہیں کوئی قانونی اختیار نہیں ہوتا۔ ان مخصوص قوانین میں یہ بھی ہے کہ اس ممبر پر جو بغیر کسی مناسب عذر کے اپنے بچّوں کو مدرسہ نہ بھیجے جرمانہ کیا جا سکتا ہے جس کی مقدار پچاس روپیہ سے زیادہ نہ ہو۔ جرمانہ کمیٹی ہی کرتی ہے اور کمیٹی ہی وصول کرتی ہے۔ اناسی رجسٹری شدہ انجمنوں کے ۲۴۴۱ ممبر جو بچوں کے والدین ہیں اس کے علاوہ اور منتخب شدہ آدمیوں کی انجمنیں رجسٹری ہونے والی ہیں۔ مقامی کوآپریٹو عمال بیان کرتے ہیں کہ حاضری ۹۰ فیصدی سے ۱۰۰ فیصدی تک ہوتی ہے اور بالکل قدرتی بات ہے کہ اس خود اختیاری جبر سے تناسب زیادہ بڑھ سکتا ہے بہ نسبت اس جبر کے جو حکومت ابتدائی تعلیم کے قانون کے ماتحت کرے۔"

پنجاب کی حالت بھی مستثنیٰ ہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبے اس ذوق و شوق سے جبری تعلیم کے قانون کے نفاذ کو قبول نہیں کرتے جتنا پنجاب۔ جہالت کے خلاف جہاد خاص طور سے ان مواضعات میں کیا جاتا ہے جہاں مختلف فرقوں اور ذاتوں کے لوگ آباد ہیں اور تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اکثر دیہاتی حلقوں میں لوگ تعلیم کے خلاف ہیں اور اقتصادی و جغرافیائی حالات اس درجہ ناموافق ہیں کہ اگر جبری تعلیم کا نفاذ بڑی سختی اور بے رحم افسروں کا بورڈ کرے تو یہ موضع کی زندگی کی بلاؤں میں اضافہ کر دیتا ہے اور نتیجہ سخت مخالفت اور اکثر فساد بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا موجودہ حالات میں ابتدائی تعلیم کی جبریہ توسیع خارج از بحث ہے۔ اگر جبری تعلیم کے قانون سے مدارس میں طلباء کے داخلہ کی تعداد بڑھ بھی جائے تو بھی یقینی طور سے عوام ہمیشہ کے لئے خواندہ نہیں ہو سکتے۔ اس کو باقاعدہ طور سے بیان کیا گیا ہے کہ ان طلباء میں جن کو

مدارس میں تعلیم دی جاتی ہے ۹۳ فیصدی اپنے مدرسہ چھوڑنے کے پانچ برس کے اندر اندر پھر جاہل کے جاہل ہو جاتے ہیں (ملاحظہ ہو "ہندوستان میں ترقی تعلیم ۱۹۰۷ء" صفحہ ۳۲۴) اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) اسکول کی زندگی کا اوسط زمانہ مشکل سے چار برس ہوتا ہے جو بیکار تعلیم اور بے قاعدہ حاضری کو دیکھتے ہوئے بہت ہی کم ہے -

(۲) چھوٹی جماعتوں میں ان بچوں کا ہجوم ہوتا ہے جن سے ان کے والدین پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں - جب وہ اقتصادی حیثیت سے گھر کے لئے مفید بن جاتے ہیں تو یا تو ان کو اٹھا لیا جاتا ہے یا پھر وہ ناغہ کرنے لگتے ہیں - بڑی جماعتوں میں گنتی کے طلبا ہوتے ہیں جو کبھی کبھی حاضر ہوتے ہیں -

(۳) چونکہ تعداد کم ہونے کی وجہ سے ہر جماعت کے لئے علیحدہ استاد نہیں رکھے جا سکتے ایک استاد کو دو یا تین جماعتیں پڑھانی پڑتی ہیں - (۴) دس یا گیارہ کی چھوٹی عمر میں مدرسہ چھوڑنے کے بعد بچوں کو کسی چھپے ہوتے پرزے کے پڑھنے کا بھی موقع نہیں ملتا (۵) پڑھنے میں اتنی دلچسپی نہیں پیدا کی جاتی کہ یہ عادت قایم ہو جائے (۶) اقتصادی مشکلات کی بنا پر والدین اپنے بچوں کو قبل اس کے کہ وہ پوری طرح پڑھے لکھے بن جائیں اٹھا لیتے ہیں (۷) بڑی حد تک ناقص تعلیمی طریقے بھی بچوں کے جاہل رہنے کے ذمہ دار ہیں -

وہ مسئلہ جس سے ہمارا بحیثیت ماہران تعلیم کے سب سے زیادہ تعلق ہے یہ ہے کہ دیہاتیوں میں کس طرح ایسی دلچسپی پیدا کریں کہ وہ مدارس کے کھلنے سے خوش ہوں اور بچوں کو اس باقاعدگی سے اور اتنی مدت تک مدرسہ بھیجیں کہ وہ پڑھ لکھ جائیں - کس طرح ہم نصاب تعلیم کو عام پسند بنائیں کہ گاؤں کے لوگ خود بخود اپنے بچوں کو مدرسہ بھیج کر جبر کو غیر ضروری بنا دیں واقعہ یہ ہے کہ ہم تعلیم کے فوائد ہندوستان کی بے پڑھی لکھی آبادی کے ذہن نشین نہیں کر سکتے - دیہاتی لوگ اگر مدارس سے خوش نہیں ہوتے تو یہ ان کا قصور نہیں ہے کیونکہ جو مدارس بھی اس وقت ان کے علاقوں میں ہیں انھوں نے ان کو   کچھ بھی اقتصادی - معاشرتی - مذہبی حیثیت سے

نہیں پڑھایا۔ جو تعلیم ان کو دی گئی وہ ان کے ماحول اور مقامی ضروریات کے مطابق نہیں تھی اور بجائے اس کے کہ وہ پڑھ لکھ کر کار آمد ہوتے ان میں کفایت شعاری اور محبت کی عادتیں نہیں رہیں جو ان کے لئے کاشتکار ہونے کی حالت میں از حد ضروری ہیں یہ ہمارا مشترکہ تجربہ ہے کہ بچہ اگر چار پانچ سال تک برابر مدرسہ میں رہتا ہے تو اسے جسمانی محنت سے نفرت ہو جاتی ہے اور ایسا چھوئی موئی ہو جاتا ہے کہ جہاں وہ ذرا دیر دھوپ یا بارش میں رہا اور اس کی صحت پر برا اثر ہوا۔ کھیت میں جا کر کوئی سخت محنت نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کے سادہ لوح دیہاتیوں میں اتنی عقل ہے کہ وہ اس کو نقصان پہچان لیں جو ان کو ابتدائی مدارس سے پہنچتا ہے اور یقیناً وہ حکام کی ہر اس کوشش کی مخالفت کرنے میں حق بجانب ہیں جو ان میں جبریہ مدارس کھولنے کے لئے کی جائے۔

حکومت ہند کے پنجسالہ تبصرہ کے الفاظ میں جہالت کے خلاف جنگ میں ہم واقعی بڑھ نہیں رہے ہیں۔ تجاویز زیادہ ہوتی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ صرفہ بھی۔ مدارس کے ایک محدود حلقہ میں تو قطعی تجربہ اور ترقی کے لئے واقعی ہمت افزا تیاری پائی جاتی ہے لیکن ایک دلیرانہ اور زبردست اقدام کے لئے نہ تو ساز و سامان ہے اور نہ کسی قسم کی تیاری ہے۔ ہندوستان کی دیہاتی آبادی کا احیا مدارس کے زیادہ کرنے یا طلبا کا داخلہ جبری تعلیم کے قانون کے ذریعہ بڑھانے میں اتنا نہیں ہے جتنا کہ اولاً دیہاتی حلقوں میں تعلیم کو خوب تر بنانے اور ثانیاً نصاب تعلیم کو عوام میں ہر دل عزیز بنانے میں ہے۔"

قومی نقطۂ نگاہ سے ہر شہری کو انتہائی کوشش کرنی چاہیئے اور اتنا مفید اور کار آمد بننا چاہیئے جتنا اس کے لئے ممکن ہے۔ کار آمد ہونے کی بنیاد صحیح تعلیم پر ہے۔ تعلیم کے معاملہ میں اگر بے جا کفایت شعاری کی گئی تو یہ طرز تباہ کن ہے لیکن ہم کو ہر غیر ضروری تعلیمی معاملہ کے اخراجات بند کر دینے چاہئیں اور اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ایک ایک پائی موقعہ پر صرف کی جائے۔ ماضی میں ہم نے دیہاتی تعلیم پر بہت بڑی رقمیں صرف کی ہیں لیکن ان کا زیادہ

حصّہ بے کار گیا کیونکہ تعلیم بڑی حد تک کتابی اور کافی طور سے عملی نہ تھی۔ اس لئے عوام میں مستقلاً خواندگی بھی نہیں پیدا ہوئی اور وہ مستعد کاشتکار بھی نہیں بن سکے۔ دیہاتی تعلیم کے نظام کو دوبارہ درست کرنے میں سب سے بڑا اصول ہمارے ذہن میں یہ ہونا چاہئیے کہ ملک کو کس قسم کے شہریوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور یہ کہ اس میں کس قسم کی ذہنی خوبیاں ہونی چاہئیں اس کے بعد ہم کو غور و تامل کرکے اپنا مقصد حاصل کرنے کی ابتدا کر دینی چاہئیے۔

سب سے پہلے ہم کو ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جن میں اپنے ملک اور ہمسایوں کے فرائض کا پورا احساس ہو۔ ثانیاً ہم کو ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جن میں سوچ بچار کا مادہ ہو۔ ثالثاً ایسے شہری جو اپنے ہاتھوں سے مفید کام کر سکیں، کیونکہ صرف کام کو اچھی طرح کرنے ہی سے زندگی کے حالات ہمارے قبضہ اور سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

ناظم تعلیمات پنجاب نیچے کے درجوں میں تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں "یہ تعجب خیز امر ہے کہ لاپروائی اور ذہنی بیکاری کی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ لڑکے جن میں ابتدائی تعلیم اس نہج پر ہوئی ان میں اُپج اور انہماک کی کمی اس وقت ہوتی ہے جب کہ ان صنعتوں کی ان کے کام میں توقع کی جاتی ہے"۔

ابتدائی تعلیم کا موجودہ نظام دیہقانی آبادی کی ضروریات کے مطابق نہ ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جس کو بلا بحث و مباحثہ اور ثبوت کے تسلیم کرنا چاہئیے۔ یہ نظام قومی نقطۂ نگاہ سے بھی ناکافی ہے۔

ترقی کرتے کرتے ذمہ دارانہ حکومت حاصل کرنا برطانیہ کی ہندوستانی پالیسی کا مقصد بیان کیا جاتا ہے اس کے حصول کا انحصار اس امر پر ہے کہ کافی اور سمجھ دار رائے دہندے اس غرض کے لئے تیار کئے جائیں جو فی الحال موجود نہیں ہیں۔ ہم کو یہ طے کر لینا چاہئیے کہ رائے دینے والوں کے بنانے میں تعلیم ہمیں کہاں تک مدد دے سکتی ہے اور کس قسم کی تعلیم جلد سے جلد اور نہایت سرعت سے ایسے رائے دہندے پیدا کر سکتی ہے جو ذمہ دارانہ حکومت

کے بوجھ کو اٹھا سکیں جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے اس کی توضیح ہمیں ٹھیک طور سے اپنی مشکلات بتاتی ہے۔ ان تمام مشکلات کا حصر ایک لفظ "تخلیق" میں کیا جا سکتا ہے لیکن کسی پہلے کی حکومت نے ایسی کوشش نہیں کی۔ جہاں کہیں بھی خود مختار ادارے قایم ہیں وہ ایک ایسے طویل دور کا نتیجہ ہیں جس میں ایک طرف تو قومی ضروریات کے احساس نے اکثر لوگوں کے دماغوں پر رفتہ رفتہ تصرف جما لیا ہے اور دوسری طرف حکومت نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ حکومت کا انتظام صرف اس صورت میں کامیابی کے ساتھ ہو سکتا ہے جب کہ ذمہ داری اور اختیارات میں کثرت کے ساتھ رعایا کو شریک کیا جائے۔ ان تمام حالات میں بھی ہوا کہ پہلے عام مطالبہ ہوا اور پھر مراعات دی گئیں اس لئے کہ صرف اختیارات کو منتقل کر دینے نے وہ رائے دہندے نہیں پیدا کئے جو ان کو عمل میں لائیں۔ اس قسم کے رائے دینے والوں کا مواد پہلے ہی سے موجود ہے اور صرف اپنے وجود کے اعتراف کا منتظر۔ اس کی نمایاں مثال برطانیہ کے معاملہ میں ملتی ہے لیکن ہندوستان میں حالت بالکل دوسری ہے۔ ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ قوم کا ایک قلیل حصہ کرتا ہے جس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ قوم کی اکثریت کے متفقہ احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ درحقیقت قوم کا یہ طبقہ اتنا کم ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ذمہ داری اور اختیارات کو منتقل کرنے کا نتیجہ ذمہ دارانہ حکومت کو حاصل کرنے کے بجائے امرا کی حکومت کا وجود ہوگا۔

"ممالک متحدہ کے ایک کروڑ پینتیس لاکھ بالغ مردوں میں سے گزشتہ آبادی میں صرف دس لاکھ پڑھے لکھے نفوس ہیں اور خواندہ ہونے کا معیار اتنا گرا ہوا ہے کہ ان دس لاکھ میں سے بہت کم کی بابتہ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کم سے کم تعلیم لیاقت اور سمجھ دار ووٹر بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس طرح تعلیم کا اصل کام یہ ہوگا کہ اگر ہم موزوں رائے دینے والے پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو اس قلیل تعداد کو بہت بڑھانا پڑے گا۔" (ہندوستان میں تعلیم کی ترقی۔ سہ نواں بحوالہ تبصرہ ۱۷-۱۲-۱۹۱۲ء صفحہ ۱۲۲)

توگویا یہ بالکل عیاں ہے کہ ہر لڑکے کو کافی مدت میں اسکول کے مقصد کو حاصل کر لینا چاہئے۔ ذیل کی اسکیم غور و خوض کے لئے پیش کی جاتی ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ اگر اس کو کافی موقعہ دیا جائے تو یہ ہندوستان میں دیہاتی تعلیم کے مسئلہ کو اس طرح بخوبی حل کر دے گی کہ مدارس کو ہردل عزیز بنائے اور جبری تعلیم کے قانون کی ضرورت نہ رہنے دے۔

سب سے پہلی اور اہم ضرورت یہ ہے کہ گاؤں کے مدرسے کے معلم قابل اور اپنے کام کے لئے موزوں ہوں۔ اگر استاد کو اس طبقے کا ایک کارآمد اور زینت بخش رکن مانا جائے جو اس کی اقتصادی اور تمدنی زندگی کا ایک جزو ہو تو یہ لازمی ہے کہ وہ مقامی آدمی ہو اور اس طبقہ یا ذات سے تعلق رکھتا ہو جس کی روایات اس حلقہ میں دائر و سائر ہوں اور اس کو وہی طبقہ منتخب بھی کرے جس کی وہ خدمت کرے گا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ وہ روایات زندہ رہیں نیز قومی زندگی کے ان خصائص پر زور دیا جائے جن کو وہ ابھار سکتا ہے لیکن مقابلہ کے امتحانات کے ذریعہ سے نہایت ذکی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طلبا کو ٹریننگ کالج میں لینے کی کوشش میں اس امر کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ کوئی واقعی اقدام اسکول کو دلپسند بنانے میں اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس بات پر سب سے زیادہ زور نہ دیا جائے کہ استاد قومی ماحول اور تعلیمی ماحول سے مناسبت رکھتا ہو۔

جو تربیت کہ دیہاتی مدرسوں کو نارمل اسکولوں میں دیجاتی ہے وہ کافی نہیں ہوتی اور جو استاد کہ وہاں سے نکلتے ہیں وہ اپنے کام کو جذبہ حبّ وطن اور اپنے بھائیوں کی تعلیمی ضروریات کے واضح اور صاف تخیل کے ساتھ نہیں کرتے جو ہماری قومی زندگی کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ ان میں اپنے پاک کام کے بلند مقاصد کا جوش نہیں ہوتا۔ ان کے پیش نظر کوئی صاف اور کھلا ہوا اپنے کام کا پروگرام بھی نہیں ہوتا جس پر وہ دیہاتی لوگوں کے محدود حلقہ میں عمل کریں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک مرتبہ تربیت پانے کے بعد استاد چند سال میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر ان مدارس اپنے معائنہ میں ان کے کام کو نئے

تعلیمی طریقوں کی روشنی میں نہیں جانچتے بلکہ مدرسہ کی عمارت اور لڑکوں کی حاضری پر چند اشارات کو کافی سمجھتے ہیں۔ یہ معائنہ جو ہر نوع رسمی یا سطحی طور پر کیا جاتا ہے اساتذہ کے لئے مفید نہیں ہوتا۔

ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ تربیت یافتہ اساتذہ کے لئے ڈپٹی انسپکٹران مناسب مرکزوں میں زمانہ تعطیل کا ایک نصاب تیار کریں اور اس کی تعلیم دیں۔ یہاں یہ کوشش کیجائے کہ ان کے فنا ہونے والے جذبہ کو پھر زندہ کیا جائے اور ان کو نئے طریقوں کے تجربات سے آگاہ کیا جائے۔

نارمل اسکول کی تربیت جہاں تک ممکن ہو سادہ سے سادہ طرز کی ہونی چاہیئے صرف اس قسم کے تعلیمی نظریے پڑھائے جانے چاہئیں جن کو، رسین آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور دیکھ کر خود بھی عمل کر سکتے ہیں۔ وقت کا زیادہ حصّہ تعلیم دینے کے موجودہ طریقوں کے نذر کرنا چاہیئے تاکہ استاد گاؤں کے بچوں کو خوب اچھی طرح سمجھ لے اور یہ بھی جان لے کہ وہ ان کو کس مقصد کے لئے تعلیم دے رہا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ بچے کے ماحول اور کام کی محنت سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ لڑکا گھنٹوں مدرسہ کے کمروں میں بیٹھ کر بے لطف کتابی علم حاصل کرے۔ دیہاتی معلم جو نصاب بنائے اس میں سب سے نئے اور تیز پڑھنے۔ لکھنے۔ حساب۔ مطالعہ قدرت حفظان صحت اور دستکاری کے طریقے ہونے چاہئیں اگر ممکن ہو تو نقشہ کشی۔ شہریت کے موٹے موٹے اصول اور انجمن ہائے امداد باہمی کے طریقہ کار اور کچھ دیسی گانے کا بھی اس نصاب میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

دیہاتی مدارس میں طلبا ء کا داخلہ تقریباً چھ برس کی عمر میں ہونا چاہیئے اور ان کو کم از کم پانچ برس مدرسہ میں رہنا چاہیئے۔ نصاب میں پڑھنا۔ لکھنا۔ کسانی حساب۔ ہاتھ کا کام مطالعہ قدرت۔ دیہاتی راگ اور اس قسم کی جسمانی ورزشیں اور کھیل ہونے چاہئیں جو ان کی فطرت اور ماحول کے مناسب ہوں۔

محنت کو کام میں لانے کا سوال تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے اور جہاں تک

دیہاتی مدارس میں طلباء کی حاضری کا سوال خاص مشکلات پیش کرتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو بھی ان کے والدین تخم ریزی، فصل کاٹنے اور کھلیان جمع کرنے کے وقت مویشیوں کو چرانے یا اور دوسرے کاموں میں ان کے ذریعہ سے گھر کی کمائی میں اضافہ کرنے کے لئے لگا دیتے ہیں۔ ان کے کام کے وقت سے مدرسہ کے وقت کا تصادم ہوتا ہے اور اسطرح گاؤں والوں میں مدارس بدنام ہو جاتے ہیں۔ اسکول کے وقت کا تعین بہت مشکل ہے اسلئے کہ دیہات میں مختلف مقامات میں صورت حال مختلف ہے۔ افسروں کو بہرحال اسکول کا وقت اور موسم ایسا رکھنا چاہیئے لڑکے جہاں تک ممکن ہو والدین کی خدمت بھی کر سکیں اور ساتھ ہی مدرسہ میں چند گھنٹہ کے لئے آسکیں۔ عام طور سے ہندوستان میں دیہاتی مدارس میں وہاں کے حالات کے لحاظ سے تعلیم کے لئے جتنا وقت ہونا چاہیئے اس سے زیادہ دیا جاتا ہے بجائے اس کے کہ مدرسہ پانچ یا چھ گھنٹے لگاتار ہوتا ہے یہ بہتر ہے کہ اسکے دو حصے کر دئے جائیں چھوٹے بچے جو ۵ سے ۷ تک کی عمر کے ہوں وہ صرف دو گھنٹہ صبح کو مدرسہ میں اور باقی وقت میں چھوڑ دیئے جائیں ان سے بڑے لڑکے دوپہر کے وقت ۲ بجے سے پانچ بجے تک پڑھیں اس طرح والدین سمجھ لیں گے کہ مدرسہ جانے سے ان کے بچے ان کی اقتصادی مدد کرنے سے محروم نہیں رہتے جس کی ان سے توقع ہوتی ہے۔ ہر حالت میں مدرسہ کے اوقات مقرر کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ والدین کی انسانی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔

خاص خاص حلقوں میں وقتی مدارس کا تجربہ کیا جائے۔ استادوں کو دیہاتی حالات میں واقعی دلچسپی ہو اور جس کو تھوڑی سی تربیت بھی ہو وہ آدھے دن مدرسہ میں ایسا کام کرائے کہ باقی نصف دن طلبا کھیت میں کام کر سکیں اور رفتہ رفتہ ان موسموں میں جن میں کسان بہت مصروف ہوتے ہیں ان کا پورا دن کھیت میں گزرے۔ لڑکوں کو تعلیمی لحاظ سے فائدہ ہوگا نہ صرف اس لئے کہ وہ سمجھ داری سے کھیت کا کام کریں گے بلکہ ان کو مدرسہ کے کام سے بھی فائدہ ہوگا کیونکہ اب اس میں بے قاعدہ حاضری کی گڑبڑ نہیں رہے گی۔

موجودہ حالات میں جب لڑکا زراعت کے لئے مفید ہو جاتا ہے تو اس کے لئے یہ اختیار ہے کہ یا تمام دن مدرسہ میں رہے یا تمام دن کھیت میں لگا رہے حکا اثر یہ ہوتا ہے کہ لڑکا مدرسہ کو بالکل چھوڑ دیتا ہے ٹھیک طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ مدرسہ کی تعلیم معین ہو اور اس کے اوقات ضرورت کے مطابق رکھے جائیں

دوسرا سبب جسے ہم کو صاف طور سے تسلیم کر لینا چاہیئے جہاں تک دیہاتی مدارس میں طلبا کی غیر حاضری کا تعلق ہے والدین کی انتہائی عسرت ہے اس مشکل کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ یا تو لڑکے کو اتنا وظیفہ دیا جائے جتنا وہ کما سکتا ہے، یا پھر اس کو مدرسہ میں کھانا دیا جائے۔ آخری طریقہ زیادہ موزوں ہے ممکن ہے کہ مقامی جماعتیں اس پر مالی مشکلات کے خیال سے اعتراض کریں مگر عوام میں خواندگی پھیلانے کے زبردست قومی مطالبہ کو دیکھتے ہوئے حکومت سے خاص رقم لی جا سکتی ہے نیز مالدار ہندوستانیوں سے چندہ لئے جا سکتے ہیں جو روز مسٹنڈے فقیروں کو کھلاتے ہیں اور مذہبی رسوم میں ہزاروں روپیہ صرف کرتے ہیں جن سے ملک کی فلاح میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ دیہاتی اسکولوں کو ہر دل عزیز بنانے کا یہ ہے کہ سال میں دو یا تین مرتبہ چند جشنوں کا انتظام کیا جائے۔ انسب یہ ہے کہ جب ڈپٹی انسپکٹر مدارس یا کوئی افسر موضع میں آئے تب ان تقریبوں کو کیا جائے۔ اس قسم کی تقریبوں میں خرچ تو کچھ ہوگا نہیں کیونکہ ان میں دیہاتی کھیل۔ گیت۔ رقص۔ ناٹک اور طلسمی لالٹینوں کے تماشے ہوں گے اور اگر ممکن ہو تو اور ایسے ہی سادے اور غیر مضر تفریحات جو نہ صرف لوگوں کو خوش کریں بلکہ اس قسم کے مواقع پر ان کا تعلیمی اثر بھی ہو۔ استادوں اور افسروں کو نہایت بے تکلفی اور آزادی سے دیہاتیوں سے ملنا چاہیئے اور ان کو یہ محسوس کرانا چاہیئے کہ وہ اجنبی نہیں ہیں بلکہ ان کے بہترین دوست اور ہمدرد بنکر آتے ہیں یہ کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کے دیہاتیوں کے ساتھ حکومت کے عمال نے نہایت برا سلوک کیا ہے اور اس غیر ہمدردانہ حرکت کی وجہ سے یہ حکام سے ڈرتے بھی ہیں اور ان پر شبہ بھی کرتے ہیں۔ یہ عمال بالعموم تعلیم یافتہ

طبقہ کے نمائندے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کی موجودگی ان کے لئے نعمت ہونی چاہئے تھی لیکن حالت اس کے برعکس ہے - ان عمال کی تعلیمی ترکیبوں کو دیہاتی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی معاشرتی آزادی گاڑھے پسینے کی کمائی اور اس اقتصادی خدمت کو جس کی ان کو اپنے بچوں سے توقع ہے چھیننے کا بہانہ ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی تقریروں میں دیہاتیوں کو ایک موقعہ دیا جائے کہ وہ تعلیم یافتہ طبقہ کے اس رویہ کو جو انکی طرف عام طور سے اور ان کے بچوں کی طرف خاص طور سے ہے بہتر صورت میں سمجھ لیں - ان کو یہ سب بتایا جائے کہ ابتدائی مدارس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں اور ان کے بچوں کو تعلیم دینے کی کیا ضرورت ہے - ان کو اس سے بھی واقف کرنا چاہیئے کہ سلطنت کے شہری ہونے کی حیثیت سے ان کے کیا کیا حقوق و مراعات ہیں اور یہ کہ وہ اپنے بچوں کو ابتدائی مدارس میں تعلیم دلاکر کس طرح ان کو حاصل کر سکتے ہیں - لیکن اس تجویز کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب مدرس - انسپکٹری کا عملہ اور مقامی انجمنوں کے پرجوش محب وطن ممبر سب کے سب ملکر کام کریں اور سمجھ لیں کہ وہ خود ہی اس کا پروگرام تیار کر سکتے اور خود ہی اس پر عمل کرا کر رہیں گے - اس پر روزمرّہ کے سوس مروج اور ... کاروبار کیطرح عمل نہیں کریں گے بلکہ اس کو وہ چیز سمجھیں گے جس پر مادر ہند کی فلاح کی تمام تر بنیاد ہے -

یہاں تک تو ہم نے ابتدائی مدارس کو ہردلعزیز بنانے کی خاص خاص صورتیں بیان کی ہیں لیکن دیہاتی تعلیم کا دوسرا رخ زیادہ توجہ کا طالب ہے وہ رخ یہ ہے کہ کس طرح ان کو مدرسہ چھوڑنے کے پانچ سال کے اندر اندر پھر ان پڑھ ہوجانے سے بچایا جائے اور یہ کہ جب معمولی سی دیہاتی تعلیم ان کو مل چکی ہے تو کس طرح پڑھنے کی قابلیت کو پڑھنے کی عادت میں تبدیل کر دیا جائے - ایک طریقہ جس سے مطالعہ کا مذاق پیدا کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ درسی کتابوں میں زیادہ سبق ان عنوانوں پر ہوں جو مقامی روایات - قصص اور گیتوں سے لئے گئے ہوں یا پھر راماین - مہابھارت وغیرہ سے - بہ نسبت ہندوستان کی تاریخ - جغرافیہ - سائنس

یا علم حفظان صحت کے زیادہ لئے گئے ہوں۔ مسلم دیہاتی آبادی کے لئے قرآن پاک کی تعلیم۔ بزرگوں کے قصے اور بہادروں کے حالات سے کام لینا چاہیئے۔ ایسی کتابیں صرف اسکول ہی میں نہ پڑھی جائیں گی بلکہ جب کبھی وہ گھر پر سنائی جائیں گی تو پورا گھر کا گھر کا لطف اندوز ہوگا۔ جب لڑکے مدرسہ چھوڑیں گے تو ان کو بالائے طاق نہ رکھیں گے اور نہ ترک کریں گے بلکہ ان کو احتیاط کے ساتھ رکھیں گے۔ تاکہ جب کسی تقریب یا جشن کے موقعہ پر یا زراعت و فصل سے فرصت پانے کے بعد ان کا مطالعہ کیا جائے تو گاہے گاہے ان کو پڑھیں اور سنائیں۔

دوسرا طریقہ جس سے پڑھنے کی عادت قایم رکھی جا سکتی ہے وہ دورہ کرنے والے کتب خانے ہیں جن کو اس وقت استعمال میں لانا چاہیئے جب کہ ابتدائی تعلیم ختم ہوتی ہے اس معاملہ میں ریاست بڑودہ کی مثال بہت ہمت افزا ہے۔ اس کے جبری تعلیم کے قوانین کے ساتھ کتب خانوں کا ایک محکمہ کھولا گیا ہے جو اس تعلیمی نظام کا ایک جزو ہے چنانچہ بمبئی کی سوشل سروس لیگ بھی ان کتب خانوں کے استعمال کو توسیع دے رہی ہے۔

مدارس شبینہ اور نصاب جاریہ کا بھی مخصوص حلقوں میں تجربہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ خواندگی کو قائم رکھنے اور ان لوگوں کو پھر خواندہ بنانے کے بڑے موثر ذریعے ہیں جو اب جاہل ہو چلے ہیں تعلیم کے مختلف ارباب حل وعقد کے ساتھ ملکر حکومت کی زراعتی۔ صنعتی اور کواپریٹو کریڈٹ سوسائٹیوں کو تقریروں کا ایک سلسلہ مرتب کرنا چاہیئے۔ ان تقریروں کا مقصد یہ ہو کہ بالغ آبادی کے لئے ان اقتصادی زراعتی معاشرتی معاملات پر روشنی ڈالیں جن کا ان سے تعلق ہے اور یہ سلسلہ تقاریر ایسی ریڈروں سے ملا ہوا ہو اور ان میں مسلسل پڑھنے کو ترقی دے۔

سب سے آخر میں ہم اس بات پر زور دیں گے کہ دیہاتی تعلیم کے پروگرام کو صنعت و حرفت کی تعلیم پر ختم کیا جائے۔ ہندوستان میں ایک زبردست صنعتی بیداری پیدا ہو رہی ہے لیکن آزمودہ کار ہندوستانی مزدوروں کا بالکل فقدان ہے۔ سرمایہ دار بہتر مزدوروں کے بنے چلا رہے ہیں۔ لیکن جو چیز ہمارے سامنے نمایاں ہے وہ سخت محنت کا بے انتہا کام ہے جس کو

بغیر جانے بوجھے لوگ کرتے ہیں - اگر اس کام کو ان سے لے لیا جائے تو بھوکے مرنے لگیں کیونکہ ان کو دوسرا کام آتا ہی نہیں - دیہات میں عوام کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان کو صنعتی تعلیم جس میں زراعتی تعلیم بھی شامل ہو دیجائے - یہ سچ ہے کہ ہم کو ان کی روزی کمانے کی تربیت کرنی چاہیئے لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کی زندگی بسر کرنے کی قابلیت کو ٹھیک کیا جائے - یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ موجودہ ابتدائی دیہاتی مدارس کے ساتھ ساتھ چند بڑے دیہاتی مرکزوں میں صنعتی مدارس کھولے جائیں جن کا مقصد یہ ہو کہ وہ وہاں کے لڑکوں کو آدمی بنائیں اور کاریگر بنائیں - یہ مدارس صرف وہیں قائم کرنے چاہئیں جہاں کاریگروں کا عملہ مل سکے - اس کا نصاب تین سال کا ہو اور وہ طلباء جو ابتدائی مدارس کا نصاب ختم کر چکے ہیں اس میں داخل کئے جائیں - مدارس کو کامیاب بنانے کے لئے ذیل کے امور کو ذہن نشین کر لیا جائے - (۱) جو صنعتیں ان کو سکھلائی جائیں وہ مقامات کے لحاظ سے منتخب ہونی چاہئیں اور عام طور سے وہاں کی پیداوار اور لوگوں کے پشتینی رجحانات سے وابستہ ہونی چاہئیں (۲) وہاں کی مصنوعات کے لئے جلدی فروخت کرنے والا بازار ہو تاکہ مدرسہ میں مسلسل اور کافی تعداد میں کام ہو جس سے طلبا کی تربیت ہو سکے (۳) کام اتنا کافی ہو کہ جب پڑھائی کیا جائے تو مدرسہ کے تمام طلباء کام میں لگ جائیں ایسے طلباء ہر سہ پہر کا زیادہ حصہ ایسے عملی کاموں میں لگائیں جیسے نجاری - حدادی - باغبانی - خیاطی - ٹوکریاں بنانا - مرغیاں پالنا وغیرہ وغیرہ - یہ تمام باتیں روپیہ کمانے کے اصول پر سکھانی چاہئیں اور طلبا سے ضروری حساب بھی لکھوایا جائے (۵) جو کچھ کام بھی طلبا کریں اس کی اجرت کام کی نوعیت اور وقت کی مدت کو دیکھ کر ان کو دی جائے اس طریقہ سے والدین کو اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجنے کی رغبت بھی ہو گی -

بچے جھوٹ کیوں بولتے ہیں

بچّوں کی ذہنی صلاحیتوں سے ماہرینِ تعلیم بہ خوبی واقف ہیں یا کم سے کم واقفیت کے مدعی ہیں۔ ہم بچّوں کی ذہنی نشو ونما کے سلسلہ کو جانتے ہیں اور عموماً یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اس کی رفتار کیا رہے گی۔ ہم اس سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ ریاضی کے مجرّد اصول کو سمجھے گا یا فلسفہ کے دقیق مسائل کو حل کرے گا۔ اب وہ دن گئے جب تعلیم کے نام سے بچّوں کا دماغ کچل دیا جاتا تھا جب جان اسٹوارٹ مل آٹھ برس کی عمر میں "یونانی زبان میں مہارت رکھتا تھا، زینوفون، ہیرو ڈوٹس اور افلاطون کی تصانیف کے اکثر حصّے پڑھ چکا تھا" اور چودہ برس کی عمر میں "فلسفہ کی ان سب کتابوں کا عبور حاصل کر چکا تھا جو یونانی، لاطینی اور انگریزی زبان میں موجود ہیں"۔ آج کل کوئی صحیح العقل باپ یا استاد بچّے پر اتنا بارڈ النے کو کبھی گوارا نہ کرے گا۔

لیکن وہی لوگ جو بچّوں سے بڑوں کے برابر ذہنی قابلیت کا مطالبہ کرنے کو حماقت وحشت اور ظلم سے تعبیر کرتے ہیں یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اخلاقی امور میں بھی بچّوں کے ساتھ اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ رعایت ہونا چاہیئے۔ تقریباً ساری دنیا میں بچّوں سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ بڑوں کے اخلاقی دستور العمل کو سمجھیں اور اس کی پابندی کریں اور جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتے تو انھیں سزا دی جاتی ہے۔ ہم ایک واقعہ مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں ایک دس برس کے لڑکے نے اپنی ماں سے کہا کہ امّاں ہمارے مدرسہ میں ۔۔۔ گھر پر کرنے کے لئے کام نہیں دیا تا وہ بہت خوش ہوتی کیونکہ وہ چھوٹے

بچّوں سے گھر پر کام لینے کی بہت مخالف تھی کئی مہینے تک وہ اس بات کو سچ سمجھتی رہی۔ ایک دن اتفاقاً اسے اس مدرسہ کا ایک معلّم ملا۔ بے چاری نے بھولے پن سے معلّم کو اس فیصلہ پر مبارک باد دی کہ بچّوں کو گھر پر کرنے کے لئے کام نہیں دیا جائیگا بلکہ ان کا شام کا وقت کھیلنے اور اپنے عزیزوں سے بات چیت کرنے کے لئے خالی رہے گا۔ خلاف توقع اسکا جواب یہ ملا کہ اس قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے اور لڑکوں کو اب تک گھر پر کرنے کے لئے کام دیا جاتا ہے۔

اس جواب سے بہت افسوسناک نتائج پیدا ہوئے۔ یہ لڑکا اپنے ماں باپ کا اکلوتا بچّہ تھا اور چونکہ اس کی صحت خراب رہتی تھی اور اعصاب کمزور تھے اس لئے اس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ ماں باپ مذہبی اور اخلاقی عقائد میں بہت سخت تھے اور اب تک بچّہ کی حالت بھی ان معاملات میں ہمیشہ قابل اعتبار رہی تھی۔ قدرتی طور پر غریب ماں کی زندگی تلخ ہو گئی۔ باپ کو بھی بڑا صدمہ ہوا اور غصّے میں اس نے بچّہ کو "جھوٹا، کمینہ، بزدل" اور خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ دونوں خود اپنی نظر میں ذلیل ہو گئے اور ان کی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کے لڑکے سے ایسی حرکت کیوں کر سرزد ہوئی۔

انھوں نے مدرسے کے مہتمم سے شکایت کی اور اس کے معاملے کی تحقیقات کرائی تو عجیب وغریب انکشاف ہوا۔ وہ لڑکا اس تمام عرصے میں برابر گھر سے کام کر کے لاتا رہا حالانکہ اس نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ کام دیا ہی نہیں جاتا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کا کام نہ بہت باقاعدہ تھا اور نہ بہت اچھا لیکن صحت کی خرابی کے سبب سے پہلے بھی اس کے ساتھ اکثر رعایت کی جاتی تھی اور اب بھی کی گئی۔ بہرحال اس کے کام کی استادوں کو کوئی شکایت نہ تھی۔ جب اور

چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ سارا جھگڑا کمبخت حساب کا تھا۔ عرصے کے تک غیر حاضر رہنے کے سبب سے وہ حساب میں بہت کم زور تھا۔ جس پر اس کے گھر والے اسے تنبیہ کرتے تھے۔ تنبیہ کا مقصد غیرت دلانا تھا لیکن طریقہ ایسا اختیار کیا گیا کہ وہ آزردہ اور اداس رہنے لگا۔ خود اسکے الفاظ یہ تھے "اسکول میں تو میں حساب سے نہیں گھبراتا کیونکہ میں سوال نکالا کرتا ہوں اور کوئی میرے سر پر سوار نہیں رہتا۔ اگر مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ماسٹر صاحب بتا دیتے ہیں اور مجھے سوال نکالنے کے لئے ایسا کاغذ ملتا ہے جس میں خانے کھنچے ہوتے ہیں لیکن گھر پر لوگ میرا ناک میں دم کر دیتے ہیں اور کاغذ بھی بغیر لکیروں کا ملتا ہے۔ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ میرا جی جل جاتا ہے اور مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا۔"

یہاں اس سے بحث نہیں کہ سفید بے لکیروں کے کاغذ سے دس سال کا لڑکا کیوں خفا ہوتا ہے اور خانوں والے کاغذ سے اسے کیوں اطمینان ہوتا ہے۔ ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ بچہ اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ اپنا پیچھا چھڑانے کی راہ ڈھونڈھتا تھا۔ ایک سہل سی تدبیر یہ معلوم ہوئی کہ چونکہ ماں گھر پر کام دینے کی مخالف ہے اور کہتی ہے یہ طریقہ بند کر دیا جائے تو اچھا ہے اس لئے اگر ہم یہ فقرہ بنا لیں کہ کام دینا موقوف کر دیا گیا۔ اس سے وہ بھی خوش ہو جائے گی اور ہمیں بھی اس ناقابل برداشت بوجھ سے نجات ملے گی۔ اب رہا استادوں کی خفگی سے بچنا تو جب ناگوار حالت سے نجات مل جائے گی تو کہیں اور بیٹھ کر کچھ کام کر لیا کریں گے۔

غرض نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے کی طرف سے والدین سے درخواست کی گئی کہ بچے کے کام میں مطلق دخل نہ دیا کریں اور اس کی خوشی پر چھوڑ دیں کہ

جب جہاں اور جس طرح چاہے کام کرے۔ بچّہ کو نہ کسی قسم کی سزا دی گئی نہ ملامت کی گئی اور وہ فوراً کھلے بندوں جی لگا کر کام کرنے لگا اور اب تک کرتا ہے۔

بڑوں کے اخلاقی معیار کے مطابق اس لڑکے کا اپنے والدین کو دھوکہ دینا بہت بڑا اور قابل سزا فعل تھا مگر خود اس کی نقطۂ نظر سے یہ بالکل قدرتی بات تھی تحقیقات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ اس بے چارے کے ذرا بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اتنی سی بات پر یہ ہنگامہ کیوں برپا کر رکھا ہے۔ اسے سخت حیرت تھی کہ اس کی ماں کو کیوں اتنا صدمہ ہے اور اس کے باپ نے کیوں اسے سخت سُست کہہ ڈالا۔ اسے اس معاملے کا اخلاقی پہلو سمجھانے کی کوشش کی گئی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کچھ دن کے بعد صورت حال اس کی سمجھ میں آجاتے گی ابھی بتقاضائے عمر اس کے سمجھنے سے معذور ہے۔

نفسیات طفلی کا ایک ماہر کہتا ہے "راست گوئی کوئی فطری رجحان نہیں ہے بلکہ ارتقا اور تجربے کا نتیجہ ہے۔ بچّہ اسے اسی طرح حاصل کرتا ہے جیسے زبان۔ اور اس کی قدر اسے جب معلوم ہوتی ہے جب وہ عرصہ تک قدر شناسی کی مشق کر چکا ہو اور صحت، پابندی اوقات اور نظم کی اہمیت کو سمجھتا ہو"۔ . . . . اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنے انفاظ اور اپنے افعال میں کافی رنگ آمیزی سے کام لے . . . . اسے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انفاظ اور افعال کے ذریعے سے اسے اپنے مطلوب کے حاصل کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے اس لئے وہ بے تکلف انھیں استعمال کرتا ہے اور اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا کہ یہ واقعات کے مطابق ہیں یا نہیں۔ ایسی صورتوں میں ہم کہا کرتے ہیں کہ بچّہ "غلط بیانی" کرتا ہے یا "دھوکہ" دیتا ہے لیکن اصلیت اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے نیک نیتی

سے کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد جائز اور شریفانہ ہوتا ہے اور جو ذرائع اس کے پیش نظر ہیں وہ اسے موثر معلوم ہوتے ہیں۔ ابھی تک نہ اسے یہ خبر ہوتی ہے کہ اس کے بزرگ ان افعال کو ناپسند کرتے ہیں اور نہ اس ناپسندیدگی کی وجہ معلوم ہوتی ہے . . . . اگر ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں لازم ہے کہ ہم مختلف قسم کی غلط بیانیوں کی محرّکات پر غور کریں جن کا اکثر خود بچّے کو بھی شعور نہیں ہوتا۔

اس مقولے کے پڑھنے سے بچوں کے والدین اور استادوں کے بہت سے وسوسے دور ہو جائیں گے۔ خدا جانے کتنے واقعات ایسے ہوتے ہیں جن میں بچّے کی کسی غلط بیانی کے سبب سے اس کے تعلقات اس کے والدین اور استادوں سے کشیدہ ہو جاتے ہیں اور جانبین کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔

اس چھوٹے سے مضمون میں ہم بچوں کی غلط فہرست ابھی نہیں دے سکتے چہ جائے کہ ان غلط بیانیوں کو دور کرنے کی تدابیر بتائیں۔ البتہ جو مقولہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے اس کے آخری الفاظ پر ہم پھر زور دیتے ہیں اگر ہم اس نصیحت پر عمل کریں تو ضرور صحیح تدابیر بھی معلوم ہو جائیں گی۔ یہاں ہم صرف دو تدبیروں کا ذکر کریں گے جو اکثر اختیار کی جاتی ہیں اور جو ہمارے خیال میں ہرگز اختیار نہ کرنا چاہئیے۔ ایک تو ایسی صورت میں سزا کبھی نہ دی جائے۔ یوں تو ہر طرح کی سزا مضر ہے لیکن جسمانی سزا سب سے زیادہ نامعقول چیز ہے اور اس سے وہ مقصد جو ہمارے پیش نظر ہے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ پہلے جب بچے دماغی کام میں غلطی کرتے تھے ہم ان کو مارا کرتے تھے۔ اب ہمیں یہ معلوم ہو گیا

ہے کہ اس سے وہ اور کند ذہن ہو جاتے ہیں اور ہم ہر لڑکے کی حالت پر غور کرکے اسے ایسا کام کرنے کے لئے دیتے ہیں جسے وہ کر سکے۔ ان کی غلطیوں سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان سے کیا کام لینا چاہیئے اور ان کی مدد کس طرح کرنا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی بڑے کو بچّے کے جھوٹ بولنے سے صدمہ پہنچے یا وہ یہ ظاہر کرے کہ اسے صدمہ پہنچا تو بچّے کے لئے بہت مضر ہے۔ خواہ والدین اور استاد کتنے ہی متاثر ہوں انھیں چاہیئے کہ اپنے احساسات کو دبائیں۔ جب بچّہ دیکھتا ہے کہ اس کے کسی فعل سے بڑوں کو صدمہ پہنچایا اُن پر خوف اور نفرت کے آثار ظاہر ہوئے تو اس کا ردعمل ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ یا تو وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کے فعل کا اتنا اثر ہوا اور بغیر محسوس کئے قصد کر لیتا ہے کہ جلد سے جلد دوبارہ وہی حرکت کرے گا یا اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے ناگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں اور ان سے بچنے کے لئے ہر قسم کے فریب سے کام لیتا ہے یا اس کے دل پر ذلّت اور اداسی قبضہ کر لیتی ہے اور ہمیشہ کے لیے کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جس سے ان استادوں کو سخت مصیبت پیش آتی ہے جو اپنے شاگردوں میں اُپج اور تخلیقی قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اگر ہم بچّوں کے اخلاق کا ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم خود بہت سی ان غلطیوں کے ذمہ دار ہیں جو بچّے کرتے ہیں۔ ڈ۔ ب۔ ڈڑ منڈ نے سچ کہا ہے "اگر کوئی شخص ایک کتاب میں ان غلط بیانیوں کو جمع کردے جو بڑے بچّوں کے مقابلے میں کرتے ہیں تو غالبًا لوگ بچوں کی راست گوئی کے اندازے میں زیادہ نرمی سے کام کیا کریں" تعجب کی

بات یہ نہیں کہ بچے جھوٹ بولتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اتنا کم جھوٹ بولتے ہیں ۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہنوز ان کا ضمیر بیدار نہیں ہوا جو ان کی رہنمائی کر سکے اور اس عمر میں ان کے پیش نظر صرف اپنی ذات اور اپنے اغراض ہوتے ہیں اور جب ہم غور کرتے ہیں کہ ان کی اغراض سے کتنی غفلت اور مخالفت برتی جاتی ہے اور ان کے سامنے راست گوئی کا کتنا ناقص نمونہ پیش کیا جاتا ہے تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ بچوں کی غلط بیانی کے واقعات کس قدر کم دیکھنے میں آتے ہیں ۔ اس لئے ہمیں ان معاملات میں نرمی نہیں (کیونکہ بچوں کو ایسی نرمی کی ضرورت نہیں) بلکہ انصاف سے کام لینا چاہیئے اور بہت غور و فکر کے بعد طے کرنا چاہیئے کہ ہم ان سے کیا توقع رکھیں اور ان کی جانچ اپنے معیار پر نہیں بلکہ انہیں کے معیار پر کرنا چاہیئے ۔

تعلیمی تجربات

مدرسہ جدید بلجیم میں

(بسلسلہ سابق)

دماغی تعلیم

میں چاہتا ہوں کہ اس لیکچر میں دماغی تعلیم کے ان اصول اور طریقوں کا خاکہ کھینچوں جو بیرجس میں رائج ہیں۔ ہمارے اسکول کے سامان اور آلات سے جس میں زمینیں، میدان، باغ، کھیت اور اس کے جانور، معمل، آرٹ کے کمرے اور دست کاری شامل ہیں، مدرسہ صحیح معنوں ایک زندہ ماحول بنا ہوا ہے۔ اس قسم کا ماحول جس میں واقعیت بھی ہو اور جو موافق فطرت بھی ہو، بقول ریڈی کے ایک ہمیشہ کھلی ہوئی کتاب کا کام دیتا ہے۔ یعنی سائنس، آرٹ اور اخلاقیات کی کتاب۔ اسکول کے پراسپکٹس میں ہم نے بعض بنیادی اصول قرار دئے ہیں جو دماغی تعلیم کے لئے ضروری لوازم ہیں۔

(۱) سب سے مقدم بنیاد ان تعلقات کا مطالعہ ہے جو بچے یا بالغ کے اور زمین (یعنی عالم فطرت) کے درمیان ہوتے ہیں۔ ہمارے طلبہ کو بلا واسطہ انسانی زندگی اور کام سے تعلق رہتا ہے۔ ان کو چیزیں اور جاندار ہستیاں اپنے قدرتی گرد و نواح میں دکھائی دیتی ہیں۔ بچہ مشاہدہ کر سکتا ہے، غور و فکر کر سکتا ہے، تجربہ کر سکتا ہے، عمل کر سکتا ہے، چیزوں کو ہاتھ سے بناتا، پیدا کرتا، اور تعمیر کرتا ہے۔ پہلے لکچر میں میں نے دست کاری کے فوائد کی بحث کی تھی اور بتایا تھا کہ بیرجس میں ہاتھ کے کام کا کس طرح انتظام کیا گیا ہے۔ اس لئے اس

اصول کے عملی پہلو پر زور دینا غیر ضروری ہے۔ زندگی، فطرت اور کام کے ساتھ بچے کا تعلق پیدا کرنے کے لئے دستکاری کے برابر کوئی چیز نہیں۔

(۲) پھر یہ کہ ہم تعلیم و تربیت کا انتظام بچے کے فطری نشو و نما کے موافق کرتے ہیں ہم اپنے طلبہ کی ضروریات اور ان کے شوقِ جستجو کا خیال رکھتے ہیں، اس لئے کوئی چیز ان کے سامنے اس وقت تک پیش نہیں کی جاتی جب تک ان کی عقلی نشو و نما انھیں اس قابل نہ بنا دے کہ وہ اس کو سمجھ سکیں اس کو اپنا بنا سکیں اور اس کی وسعت اور اہمیت ذہن نشین کر سکیں۔ نصاب کی تدوین میں یہی اصول ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس اصول کی وجہ سے ہمارے ہاں بعض مضامین فوراً ہی شروع کر دئے جاتے ہیں۔ اور بعض مضامین خصوصاً مردہ زبانیں بعد کیلئے ملتوی کر دی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس اصول کو صرف علیحدہ علیحدہ مضامین کے منتظم مطالعہ میں ملحوظِ خاطر نہیں رکھا جاتا بلکہ ہر مضمون کے مختلف شعبوں میں بھی اس کا خیال رکھا جاتا ہے ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

زبان کے مطالعہ میں گریمر کا فائدہ اس وقت سے بہت دن بعد بچے کی سمجھ میں آتا ہے جتنا کہ لوگ عام طور پر خیال کرتے ہیں اور بچوں کو ان کی مادری زبان سکھانے کے لئے ابتدا ہی میں گریمر پڑھانے سے زیادہ موزوں طریقے بھی ہیں یعنی پڑھنے اور لکھنے کی مشق۔ اسیطرح علم حیوانات و نباتات میں زندہ چیزوں کے خارجی حالات کا بیان اور ان کی عادات زندگی اور ان کے فوائد کا حال ان کی جسمانی خصوصیات اور اصل تقسیم سے پہلے آنا چاہیئے۔

اگر واقعًا یہ مقصود ہے کہ بچے جو کچھ پڑھتے ہیں اس کو سمجھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں تو لازم ہے کہ معلم بچوں کی ذہنیت ان کے رجحانات اور ان کے شوقوں کو خیال میں رکھیں ہم اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل سے بحث کرنی ہوگی جب اس کے عملی اطلاق کا ذکر کریں گے۔

(۳) ہمارا طریقۂ تعلیم ایک طرف تو اس فطری ارتقا کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو بچپن کی ضروریات میں پایا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف اس تاریخی تربیت سے مطابقت رکھتا ہے جو مختلف

علوم کی ترقی میں پائی جاتی ہے۔ بچے کی ضروریات کا فطری ارتقا محض نسل انسانی کی ضروریات کے ارتقار کا اعادہ ہے اس طرح بچّہ یکے بعد دیگرے لیکن زیادہ سرعت کیساتھ اُن منازل سے گذرتا ہے جو نسل انسانی کو اپنی مجموعی ترقی میں پیش آئے۔ یہ بات بالکل قرین عقل ہے کہ بچّہ اپنے تجربہ کے ذریعہ علم کے نشو و نما کی تاریخ کو مختصر طور پر از سر نو ترتیب کرے اور استاد کا زیادہ تر یہ کام ہو کہ وہ طالب علم کو غیر ضروری محنت اور بے فائدہ تضیع اوقات سے بچائے۔ کوئی شخص اس بات سے انکار نہ کرے گا کہ بہترین طریقۂ تعلیم جو فطرت کے موافق ہو یہی ہے کہ بچّہ کے سامنے مختلف علوم اسی ترتیب سے پیش کئے جائیں جس سے وہ حاصل ہوئے تھے اور تعلیم کے مدارجِ ترتیبی ان مدارج کے مطابق ہوں جن سے علم حاصل ہوا اور اس نے ترقی پائی۔ وہ طالب علم جو ان مدارج سے گزرتا ہے، جو مختلف علوم کو دوبارہ دریافت کرتا ہے۔ جس نے تجربہ کیا ہے، عمل کیا ہے اور خود تلاش کیا اور پایا ہے۔ اپنی پڑھی ہوئی چیزوں کو نہیں بھولتا۔ اپنے استاد کی رہنمائی میں وہ خود تمام تجربے کرتا ہے، ان کی تصدیق کرتا ہے اور وہ انکشافات کرتا ہے جن کے ذریعے سائنس اپنے موجودہ عروج کو پہنچی ہے۔ چونکہ اس کا علم اس موافق فطرت اور منطقی ترتیب سے حاصل ہوتا ہے اس لئے وہ ایک صحیح، ذاتی اور پائدار صورت میں محفوظ رہتا ہے۔

اس منہاج تعلیم کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بچہ تجربہ اور عمل کے عمدہ طریقے سیکھ جاتا ہے۔ اگر ہم ماہرین علم کی منتظم کردہ سائنس کو بطور ایک مکمل مجموعے کے پیش نہ کریں جو تمام و کمال قابلِ تسلیم ہے بلکہ بچہ کو یہ سکھائیں کہ وہ اپنے تجربہ کے ذریعہ اس مجموعہ، اس منطقی مرکب کی تعمیرِ نو کرے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بچہ چیزوں کو "سیکھے" گا نہیں بلکہ یہ بھی جان لیگا کہ حاصل کردہ علم کو کسطرح اور کیوں استعمال کرے۔ بعد کی زندگی میں یہ چیز بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ علم کا حصول اس قدر ضروری نہیں جتنا یہ جاننا کہ اس کو کس طرح استعمال کیا جائے اور اس سے عملی طور پر فائدہ اٹھایا جائے۔

ہم جو کچھ تعلیم دیتے ہیں وہ تربیت کے لئے ہوتی ہے۔ ہماری خواہش صرف دماغ کو بھرنا نہیں بلکہ اس کو بنانا ہے۔ ہم ہمیشہ بچے کے عملی تعاون، تجسس اور شوق کو ابھارتے رہتے ہیں۔ ہم بچے کو براہِ راست جس قدر کم باتیں ممکن ہوں سکھاتے ہیں اور جہاں تک ہو سکتا ہے خود اس کو ذاتی محنت سے تحقیق کرنے کی جانب مائل کرتے ہیں۔

ان اصولوں کو عمل میں لانے کے لئے ہم نے بعض طریقے اختیار کئے ہیں جن کا بیان ضروری ہے

۱۔ چھوٹی جماعتیں

گذشتہ صفحوں میں جس قسم کی تعلیم و تربیت کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ ان کو عملی طور پر رائج کرنے کے لئے صریحاً ضروری ہے کہ ہر جماعت میں طلبہ کی تعداد کم ہو۔ بڑی جماعتوں میں کافی طور پر باہمی ربط نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ فوجی بارک کی قسم کی جماعتوں میں ٹھیک طور پر کام کرنے کے لئے مواقع پیدا نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم بچوں کے ساتھ مناسب طرح سے سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم ان کو اچھی طرح سے جاننا اور ان کی نشوونما کا توجہ کے ساتھ مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک وقت میں طلبہ کی تھوڑی تعداد سے کام لینا چاہئیے۔ جدید مدارس نے اس بات کو سمجھ لیا ہے اور ان میں ہمیشہ چھوٹی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۹۱۴ء یعنی جنگ کے دوسرے سال میں، ایسٹر کے زمانے میں ہمارے ہاں پچیس طالبعلم تھے۔ داخلے کے لئے عرضیاں آئی تھیں جن سے اس سال ہماری تعداد پینتیس سے بڑھ جاتی میرا ارادہ تھا کہ کسی صورت میں بھی ساٹھ طلبا سے زیادہ نہ لوں۔

۲۔ غیر مستقل (Mobile) جماعتیں۔ انفرادی ٹائم ٹیبل

میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ بچوں کو فرداً فرداً پڑھانا بہترین طریقہ ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت امر سے بہت بعید ہے جماعتی تعلیم بہت بہتر ہے۔ کیونکہ اور کوئی چیز معاشرتی ماحول کے ان غیر محسوس اثرات تحریکات اور ردعمل کا بدل نہیں ہو سکتی جو بچے کے تمام شوقوں کو ابھارتے

ہیں یہاں تک کہ اس کے اثر سے اس میں از خود جوش اور خواہش سبقت پیدا ہو جاتی ہے
جو اس کی علمی اور اخلاقی نشوونما کے لئے لازمی ہے۔ بچّے کے لئے کام اور کھیل دونوں
کے دوران میں مل جُل کر رہنا ایک ایسی نفسی ضرورت ہے جس کو پورا کرنا لازم ہے۔ یہ
نہایت ہی خوشگوار بات ہے کہ بچہ دوسری صحیح خواہشات کے ساتھ ساتھ مل جل کر رہنے
کی خواہش بھی ظاہر کرے اگر کسی بچہ میں سوسائٹی کا ذوق مفقود ہو تو ضرور طبیعت میں
کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔

لیکن اجتماعی تعلیم میں بعض خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اگر بہت سے طلباء ایک ساتھ
پڑھتے ہوں۔ جتنی تعداد زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی یہ رجحان زیادہ ہوتا ہے کہ تعلیم کو سب کے
لئے بالکل یکساں بنا دیا جائے اور جب جماعتوں میں طلبا کی تعداد ایک خاص حد سے بڑھ جاتی
تب اس کو بالکل نہیں۔ روکا جا سکتا۔ ایک ہی قسم کے تعلیمی طریقے عموماً صرف چند ہی طلبا کے
لئے مفید ہو سکتے ہیں جن کے دماغ کا ارتقاء "خیر الامور اوسطہا" (بہترین چیز وہ ہے جو اوسط ہو)
کا مصداق ہے غیر معمولی طور پر کند طلباء پڑھائی کو نہیں سمجھ سکتے اور انھیں وہ سب نقصانات
اٹھانے پڑتے ہیں جو سُست رفتار لوگوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ ہمیں ان خطرات سے
بچنا چاہیئے۔ اگر تعلیم و تربیت سے پوری طرح فائدہ اٹھانا ہے اس لئے بہترین صورت
یہی ہے کہ فطرتی تفاوت اور فرق کا لحاظ رکھا جائے اور اس بات کی رعایت کی جائے
کہ بچوّں کا دماغی ارتقا مختلف حد تک ہوتا ہے اور ان کی عقلی اور جسمانی ضروریات میں بھی اختلاف ہے

اس لئے جدید مدارس میں جماعتیں غیر مستقل ہوتی ہیں اور ان میں ایسی
اٹل جماعت بندی نہیں ہوتی جتنی عام سرکاری مدارس میں ہوتی ہے۔ ان طلباء کو تمام مضامین
کے لئے ایک ہی جماعت میں پڑھنا پڑتا ہے اور مختلف مضامین میں انفرادی ترقی کا خیال
نہیں رکھا جاتا۔ لیکن جہاں کہیں "غیر مستقل" جماعتوں کا نظام رائج ہے۔ طلبا کی جماعت
بندی ان کی استعداد کی کمی زیادتی اور مختلف مضامین میں ان کی قابلیت کے لحاظ سے

کی جاتی ہے - اس طرح سے ایک ہی وقت میں بچہ فرانسیسی کی چھٹی جماعت میں انگریزی کی پانچویں اور حساب کی چوتھی جماعت میں ہوسکتا ہے -

بچہ کو اس کی "اوسط" جماعت کے قابل بنانے اور تمام ضروری جماعتوں میں شریک کرنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ وہ ان مضامین کو کم وقت دیتا ہے جن میں وہ مقابلتاً بڑھا ہوا ہے اور ان مضامین کو زیادہ جن میں اس کی ترقی سست ہے بعض حالتوں میں، جب پورا ٹائم ٹیبل بدلے بغیر یہ بات ممکن ہو ہم پیچھے رہ جانے والے طلبا کے لئے زائد سبقوں کا انتظام کرتے ہیں - منزل مقصود تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں اور ہر طالب علم کے لئے مطالعہ کا ایک خاص پروگرام ہوتا ہے جو اس کی مخصوص صلاحیتوں اور اس کی اپنی عقلی اور جسمانی ضروریات کے موافق ہوتا ہے -

یہ ظاہر ہے کہ غیر مستقل جماعتوں کے انتظام کے لئے استادوں کی ایک معقول تعداد کی ضرورت ہے - برجس میں ۲۵ طلبا کے لئے ۱۷ استاد تھے جن میں دو ماہرین صناع بھی شامل ہیں - ان میں سے اکثر اسکول سے باہر رہتے ہیں -

سبقوں کی مدت - یہ مسئلہ کہ سبق کتنی دیر تک ہونا چاہئیے ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے اس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جاسکتا ہے - اس مسئلے کی اہمیت اور اثر کی وجہ یہ ہے کہ جماعت صرف ایک مقدار معلوم ہی نہیں بلکہ بعض مخصوص صفات کی حامل ہے - ہمارا سروکار نہ صرف مدت وقت سے ہے بلکہ ایک طالب علم کی اور استاد کی دماغی کیفیتوں کے اظہار سے اور دوسری طرف اس تعلق سے جو ان دماغی کیفیتوں کو مسئلہ تعلیم سے ہے - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سبقوں کی مدت کے تعین میں ہمیں من مانی حد مقرر نہیں کرنی چاہئیے لیکن ظاہر ہے کہ ایک آخری حد ایسی بھی ہے جب کام سے تھکن پیدا ہو جاتی ہے یا دلچسپی باقی نہیں رہ سکتی - اس وقت آرام کی اور سستانے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے دوران میں قوائے ارادی، توجہ اور شوق تازہ

دم ہوسکیں۔ اس لئے ہر جس میں پینتالیس منٹ کے بعد سبق ختم ہوجاتا ہے یا روک دیا جاتا ہے علاوہ بریں مجھے یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ اگر استاد مناسب سمجھے تو وہ اس سے پہلے بھی سبق ختم کرسکتا ہے۔ سبقوں کے بیچ میں کچھ وقت تفریح کا ہوتا ہی تقریباً دس سے پندرہ منٹ تک۔ جاڑے میں کام سات بجکر پچیس منٹ پر شروع ہوتا ہے اور گرمی میں سات بجکر چالیس پر اور بالترتیب سوا بارہ بجے اور بارہ بجکر پانچ منٹ پر ختم ہوجاتا ہے۔ آخری سبق صرف چالیس منٹ کا ہوتا ہے۔ دماغی تعلیم صرف صبح کے وقت ہوتی ہے اور بعد دوپہر کا وقت عام طور پر دستکاری، تفریح (Excursions) تیاری اور انفرادی مطالعے کے لئے مخصوص ہے۔

اس ترتیب کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کی جاتی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ بعض روز دماغی تعلیم اور دستکاری کی تعلیم صبح کے وقت میں یکے بعد دیگرے ہوتی ہے اور ہفتے میں تین روز اونچی جماعتوں کے طلبا کے لئے تیسرے پہر کو سوا تین بجے سے سوا چھ بجے تک دماغی تعلیم کا وقت ہے۔ اوپر کے بیان سے جو بطور ایک عام اصول کے بتایا گیا ہے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ طلبا کی تیاری اور انفرادی کام لازماً صرف تیسرے پہر ہی کو ہوتا ہے۔ اس معاملے میں اور ہر معاملے میں جہاں تجربہ نظرئے سے بہتر ثابت ہو ہم نظرئے کو ترمیم کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔

۴۔ ایک وقت میں صرف چند مضامین پر توجہ کا اجتماع (Concentration) لازمی ہے۔ اگر توجہ بیجا طور پر منتشر ہو تو نہ صرف کیرکٹر اور دماغ کی تشکیل کے لئے اس کے نتائج مہلک ہوتے ہیں بلکہ محض حصول علم میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اس لئے ہر جس میں ہم ایک وقت میں صرف چند ہی مضامین پر توجہ کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تعلیم کا کوئی انتظام اس انتظام سے بدتر نہیں جس میں بچے کی توجہ بے شمار مضامین

پر پھیلی ہوئی ہو جن کا آپس میں کوئی تعلق یا ایک دوسرے سے موضوع کے لحاظ سے یا ظاہری طور پر کوئی ربط نہ ہو ممکن ہے کہ ایک ہی دن صبح کے وقت حساب، لکھنا، پڑھنا، تاریخ، جغرافیہ، اور شاید اس کے علاوہ اور مضامین کا بھی مطالعہ کرنے کے لیے بہت ہمت اور محنت درکار ہو لیکن اس کے نتائج تو تقریباً صفر ہوں گے اگر ان مختلف مضامین کے موضوع میں کوئی امر مشترک نہ ہو۔

ہم کس طریقے سے دماغ کو اس لازمی پریشانی اور توجہ کے انتشار سے محفوظ رکھتے ہیں؟

اولاً ہم ہر ٹرم میں صرف چند شعبوں پر اس طرح توجہ مجتمع رکھتے ہیں کہ جن مضامین سے ہمارا سروکار ہے ان کو زیادہ اچھی طرح سے مطالعہ کر سکیں اور ان کو مکمل طور سے سمجھ سکیں۔ ان ذرائع سے ہم اپنی تعلیم کو ماحول کے حالات سے زیادہ موافق بنا سکتے ہیں۔ موسم بہار اور گرما میں ہمیں علم نباتات اور حیوانات کے مطالعے کے لئے زیادہ مفید مواقع ہیں۔ اگر ان علوم کو زیادہ وقت دیا جائے تو ہم بعض دوسرے علوم مثلاً طبعیات اور کیمیا کو کم وقت دے سکتے ہیں اور ان کا خزاں اور سرما میں زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن توجہ کو اس طرح مجتمع رکھنے کے اور فائدے بھی ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے طالب علم کو مضمون پر زیادہ مکمل قدرت حاصل ہو جاتی ہے وہ زیادہ شوق کے ساتھ کام کرتا ہے، بہتر نتائج پیدا ہوتے ہیں اور تکان کم ہوتی ہے۔

علاوہ بریں اس اجتماع سے جو ہمارے ہاں رائج ہے صرف یہی مراد نہیں کہ ہر ٹرم میں نئے مضامین کے ایک نئے مجموعہ کو پڑھایا جاتا ہے۔ ہم نے تو اس طریقے کو زیادہ عام اور وسیع کر دیا ہے مثلاً ہم صبح کا تمام وقت یا اس کا ایک حصہ کسی مضمون کی صرف ایک ہی شاخ، یا کئی قریبی تعلق رکھنے والی شاخوں کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ طلباء اور استاد دونوں مضمون کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں اس کا مناسب

طریقے سے مطالعہ کر سکتے ہیں، اور مختلف پہلوؤں سے اس پر غور کر سکتے ہیں۔

مثلاً بجائے ایک ہی صبح کو فرانسیسی، حساب، تاریخ، طبعیات پڑھنے کے۔ یعنی بجائے قطعاً بے تعلق مضامین کے مطالعہ کے۔ ہم ایک وقت میں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو شاخوں سے سروکار رکھتے ہیں ہم ان کو زیادہ موثر طریقہ سے بتفصیل مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں وہ رکاوٹیں اور تضیع اوقات نہیں ہوتی جو معمولی اسکولوں کے ٹائم ٹیبل میں بار بار تبدیلی مضمون کی وجہ سے ہوتی ہے۔ فرض کرو ہم کسی صبح کا بہت سا حصّہ یا ساری صبح فرانسیسی کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ طالب علم کے دماغ کو مشغول رکھتے ہیں۔ اور اس کی توجہ کو مجتمع کرنے میں کوئی دقّت نہیں۔ وہ نہ تھکتا ہے نہ گھبراتا ہے کیونکہ مضمون مختلف پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے جن میں سے ہر ایک بچّہ میں خاص اعمال کو ابھارتا ہے۔ پڑھنا، نظم خوانی، گریمر کا سبق، لکھنے کی مشق، ادب کا مطالعہ، ان سب چیزوں کے تسلسل سے ہم خوشگوار دلچسپی کو قائم رکھتے ہیں۔

کسی اور صبح کو ہم علمی سائنس لے بیٹھتے ہیں اور طبعیات و کیمیا کا باری باری مطالعہ کرتے ہیں ہمارے پاس تحقیقات اور تجربہ کے لئے کافی وقت ہے۔ صرف اسی طرح ہماری محنت بارآور ہو سکتی ہے کیونکہ مجھے یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ ایک گھنٹہ میں سائنس کا مطالعہ تجربہ کے ذریعہ ہو سکے اور طالب علم خود کام کر سکے۔ علاوہ اس کے چونکہ ہمارے پاس وقت کافی ہے، ہم تجربوں کے ایک سلسلہ کو اس طرح شروع کر سکتے ہیں کہ اس سے مفید نتائج حاصل ہوں یا کسی ایک باب کے مباحث پر مسلسل مشاہدات کر سکتے ہیں ہم سائنس کے ایک پورے شعبے یا ادب یا تاریخ یا جغرافیہ کے مطالعہ کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ ہر شعبہ ایک مکمل اور مستقل کل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ طریقہ نہ صرف خاص اس کام کے لئے یعنی جہاں تک علم حاصل کرنے کے طریقوں کا تعلق ہے مفید ہوتا ہے بلکہ عام ذہنی نشوونما اور کیرکٹر کی پختگی کے لئے بھی موزوں ہے کیونکہ اس سے طالبعلم صبر، استقلال اور

کوشش کے تسلسل کی ضرورت کو اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔

گھنٹہ بجتا ہے، تفریح کا وقت آگیا ہے۔ ہم آرام کرتے ہیں اور سستاتے ہیں پھر کچھ بعد وقفہ کے بعد ہم اسی مضمون کو دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح وقت کی بچت ہوتی ہے کیونکہ ہم زیادہ جلدی کام کرنے لگتے ہیں اور مبحث مطالعہ پر زیادہ سنجیدگی سے خیالات مجتمع ہو جاتے ہیں ہمارے کام میں زیادہ وحدت اور گہرائی آجاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی دلچسپی بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہماری صبح کبھی ادبی ہوتی ہے کبھی سائنٹفک وغیرہ۔ ہمارے یہاں کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے۔

اس قسم کا کام زیادہ تر اونچی جماعت کے طلبا سے مطلوب ہے لیکن نیچی جماعت والوں سے بھی لیا جاتا ہے۔ فرض کرو کہ ہمیں صبح کے تمام وقت میں کسی ایک جانور یا جانوروں کی ایک ہی قسم پر غور کرنا ہے۔ ہمارا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے؟ ہم مضمون پر مختلف پہلوؤں سے غور کرتے ہیں۔ ہم اس میں اور ان امور میں تعلق پیدا کرتے ہیں جو دوسرے شعبوں کے ساتھ مشترک ہیں مثلاً جغرافیہ، تاریخ، علم نباتات، طبعیات، کیمیا وغیرہ اور ہم طالبعلم کے مختلف اعمال کو ابھارتے ہیں مثلاً مشاہدہ، تجربہ، پڑھنا، بیان کرنا، لیکچر کے نوٹوں کو ترتیب دینا، ڈرائنگ وغیرہ۔

اگر ہم کسی مضمون کے متعلق اپنے آپ سے مختلف طرح کے سوالات کریں یا طالب علم اپنی اثر پذیری کا اظہار مختلف شکلوں میں کرے تو مضمون کی دلچسپی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے بچے ایک ہی مضمون یا کئی مضامین پر جو باہم مربوط ہوں بیہم توجہ صرف کرنے سے نہیں اکتاتے کیونکہ اس میں آنکھیں، ہاتھ اور کان سب شریک ہوتے ہیں۔ اس خاص مضمون پر عرصہ تک کام کر کے اور اس کے سلسلے میں مختلف اعمال کو ابھار کر ہم نے اس کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے۔ پس ایک طرف تو توجہ کا اجتماع خیالات کو گہرائی بخشتا ہے اور ہمیں ایک ہی شاخ کے مختلف مظاہر میں باہمی

تعلقات سمجھنے کا موقع دیتا ہے اور دوسری طرف ہم اس میں زیادہ وسعت پیدا کر سکتے ہیں کیونکہ مختلف شاخوں کے علیحدہ مظاہر کو باہم مربوط کر سکتے ہیں۔

خواجہ غلام السیدین

خاموش مطالعہ اور اُسکی ماہیت

مطالعہ ہمارے خیال میں وہ ابتدائی طریقہ علم ہے جو ابتدائی مدارس میں چند لکھے ہوئے الفاظ کو دُہرانے سے حاصل ہوتا ہے اور اس فن کو ہر وہ شخص سکھا سکتا ہے جو کہ ابتدائی ریڈر کی گتھیوں کو سُلجھا سکے۔ ہم لوگ بالعموم اسی قسم کے پڑھنے سے دو چار ہو چکے ہیں اور اسی پر ہماری آیندہ تعلیم کی عمارت قایم ہوئی ہے۔ یہ مسئلہ کچھ ایسا معمولی اور ابتدائی ہے کہ ہم کبھی غور بھی نہیں کرتے کہ ہم میں سے کون کون واقعی عمدہ و مکمل مطالعہ کرتا ہے۔

لوگوں کے پڑھنے کی رفتار میں جو امتیاز پایا جاتا ہے وہ اگر دریافت بھی ہو جائے تو عموماً یہ ان کے مقدار مطالعہ کے فرق کا نتیجہ سمجھا جاتے گا۔ اور یہ بات مان لی جاتی ہے کہ جو شخص سب سے زیادہ مطالعہ کرتا ہے سب سے تیز بھی پڑھتا ہے اور سب سے زیادہ سمجھتا بھی ہے یعنی اگر ہم لوگوں کے مطالعہ کی عمدگی میں فرق معلوم کرلیں تو عام طور پر اس کا سبب یہی سمجھا جائے گا کہ ان کے مطالعہ کی مقداریں مختلف ہیں اور اکثر یہ بات مان لی جاتی ہے کہ سب سے زیادہ مطالعہ کرنے والوں کی رفتار اور مضمون سمجھنے کی صلاحیت بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک حد تک تو یہ درست ہے لیکن مشق کے علاوہ اور بھی امور ہیں۔ جن کے ذریعہ ایک شخص نہایت عمدہ بلکہ کامل مطالعہ کرنے والا بن سکتا ہے۔

اس مقالہ میں حتی الامکان ان امور کو مختصراً مگر صاف صاف بیان کیا جائے گا اور ان سے فائدہ حاصل کرنے یا ان پر قابو پانے کے طریقے بھی بحث میں آئیں گے یہ بنیادی امور دور جدید کے تجرباتی علم النفس کی بیش بہا معلومات میں سے شمار ہوتے ہیں یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مختلف امتحانات اور تجربات کیے گئے۔ اور

یہ طے پا گیا کہ مطالعہ کے امتیازات سوسائٹی کے ہر طبقہ میں موجود ہیں طویل و دقیق اعمال، خارجی تجربات اور داخلی مشاہدۂ نفس، ہزاروں یادداشتوں کے مطالعہ کرنے، اور حرکات چشم کے سینکڑوں فوٹو لینے کے بعد ہم چند صریح نتائج پر پہنچتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ :۔

(۱) خاموش مطالعہ کرنے والا - بلند آواز پڑھنے والے سے کہیں زیادہ پڑھ سکتا ہے۔

(۲) خاموش مطالعہ میں بھی اکثر لوگ ہر لفظ پر زبان کو حرکت دیتے ہیں یا دیگر اعضائے صوت کی جنبش سے اندر ہی اندر بولتے ہیں۔

(۳) لوگوں کے مضمون سمجھنے کی صلاحیت اور قوت میں بہت زیادہ امتیازات اور اختلافات موجود ہیں — چنانچہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ کچھ لوگ تو بعض الفاظ پر نظر دوڑاتے ہوئے، بعض کو چھوڑتے ہوئے تیزی کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں اور جملوں کے معانی کو بھی سمجھ لیتے ہیں اور کچھ لوگ ایک لفظ کے بعد دوسرے کو پڑھتے ہیں اور اس بھنگے کی چال کے ساتھ ساتھ مطالب بھی سمجھتے جاتے ہیں۔

(۴) پڑھنے کی رفتار خاص طور پر وقفوں کی تعداد اور ان کی مدّت یا طول پر منحصر ہے

(۵) سست مطالعہ کرنے والے نہ صرف بار بار وقفہ دیتے ہیں بلکہ ان کا رجحان آنکھ کو بار بار بے قاعدگی سے آگے پیچھے پھرانے کی طرف ہو جاتا ہے (ملاحظہ ہو شکل کے حصہ ا میں وقفوں کی ترتیب)

(۶) عمدہ پڑھنے والوں کی آنکھیں ایک تسلسل اور روانی کے ساتھ ہر ہر لفظ اور ہر ہر سطر پر کو گھومتی چلی جاتی ہیں - حالانکہ پختہ طور پر دماغ میں کوئی لفظ یہاں سے کوئی وہاں سے جانشین ہوتا ہے - لیکن وہ کل کے مطالب و معانی پر حاوی ہو جاتا ہے

(۷) عمدہ مطالعہ کرنے والے لوگ اپنی بینائی کے مرکز کو پورے مطبوعہ الفاظ پر نہیں جماتے - بلکہ محض اوپر کے نصف حصوں پر۔

ا۔ قبل از تربیت پہلے درجے کے ایک طالب علم کے خاموش مطالعہ کا نمونہ

There is no more interesting study than that of

ب :۔ تربیت کے بعد اسی لڑکے کی کوشش :۔

Ancients made extended voyages urged by

مندرجہ بالا نقشے پڑھنے والے کی آنکھ کی حرکات کے فوٹو کی مدد سے تیار کئے گئے ہیں۔ سطروں سے وقفے مراد ہیں۔ سطروں کے اوپر جو ہندسے ہیں وہ ان وقفوں کی ترتیب بتاتے ہیں اور نیچے کے ہندسے ان وقفوں کی مدت سکنڈ کے پچیسویں حصہ کی مقداریں۔ نقشہ نمبر ب میں آنکھ کے وقفوں کا قیام اتنا مختصر تھا کہ اس کا طول۔ یعنی مدت وقفہ معلوم نہ ہو سکی

اس شہادت پر غور کرنے اور نتائج مذکورہ کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مطالعہ جیسے بظاہر آسان کام میں کتنے پیچیدہ اور اہم مسائل پنہاں ہیں لیکن اب یہ سوال ہے کہ اس مشکل تحقیقات اور طویل تجربات کی مدد سے ہم جن نتائج پر پہنچے ہیں۔ ان سے کیا عملی فائدہ ہے اور اسکا جواب بھی کچھ دور نہیں فی زمانہ ہر ذی شعور مہذب انسان کے لئے پڑھنا ایسا ہی ضروری فعل بن گیا ہے جیسا کہ بولنا۔ اور ہم جب گوناگوں جواہرات سے پر خزانہائے علوم کا خیال کرتے ہیں جن سے ہر تعلیم یافتہ کو روزانہ سابقہ پڑتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کو وہ طریقہ معلوم ہونا چاہیئے جس کی مدد سے وقت کے ضائع کرنے کا امکان حتی الوسع جاتا رہے۔

امریکہ کے تقریباً تمام مدارس میں آج کل پڑھنے کے معمولی اسباق کی بجائے ایسی مشقیں جاری ہیں جو کہ مذکورہ بالا اصولوں پر مبنی ہیں تاکہ ہائی اسکول کے معیار تک پہنچتے پہنچتے طالب علم ایک عمدہ مطالعہ کنندہ بن جائے۔ یعنی بمقابلتہً تھوڑے وقت

میں کہیں زیادہ مقدار اور کہیں زیادہ سمجھ کر پڑھ لیا کرے۔

یقیناً ایسی مشقوں کا ہمارے مدرسوں میں جاری کرنا ازبس مفید ہوگا اور جو لوگ اب مدرسوں میں نہیں پڑھ سکتے وہ فرداً فرداً ان سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔

خاموش مطالعہ میں تیزی اور عمدگی پیدا کرنے کے لئے مشقوں کا عام خاکہ درج ذیل ہے

ا :۔ زبان ہلانے یا آواز نکالنے کا ترک :۔ چونکہ یہ سب سے مشکل کام ہے اس لئے اس پر ابتدا ہی سے زور دینا چاہیئے۔ اس کی تربیت کے لیے بہت سے قواعد درکار نہیں۔ جو کچھ بھی اور جب کبھی بھی تم مطالعہ کرو خاموشی سے کرو۔ نہ الفاظ کے تلفظ کو ادا کرو نہ اپنے ہونٹوں اور زبان کو ہلاؤ۔ اوّل اوّل تو زبان نہ ہلانے کی کوشش تمھاری توجہ کو نفس مضمون سے ہٹا دے گی اور اس طرح رفتار مطالعہ کو سست کر دے گی۔ لیکن اگر تم چند دن جمے رہو گے تو زبان سے لفظ ادا کرنا بہت کم ہو جائے گا اور بلا ارادہ پڑھنا ممکن ہوگا اور مطالعہ کو تیز اور عمدہ بنانے کے لئے کسی ارادی کوشش کی ضرورت نہ رہے گی۔

ب :۔ جلد سمجھنے کی مشق ۔ امریکن مدارس میں اس کی مشق ایسے آلہ سے طلبا کو کرائی جاتی ہے۔ جس سے چھوٹے چھوٹے جملے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لئے نظر آتے ہیں صرف ایک نظر ڈالنے کے بعد طلبا سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان جملوں کو بالکل اسی طرح خود بیان کریں۔ ایسے آلہ کی بجائے اور سادہ ذرائع استعمال ہو سکتے ہیں۔ کوئی تحریر کا صفحہ یا ٹکڑا لیجئے ہر پیرا گراف یا فقرے پر زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ نظر ڈالیئے اور تب اپنے دماغ میں کل کا مطلب بٹھانے کی کوشش کیجئے! اوّل اوّل تو نتیجہ دماغی انتشار ہوگا۔ لیکن کئی کئی بار ایسی مشق پانچ دس منٹ چند روز کرنے سے فائدہ ظاہر ہوگا۔

س :۔ رفتار بڑھانا۔ دراصل یہ عادت مندرجہ بالا ساتوں اصولوں کو پیش نظر

رکھتے ہوئے حاصل کرنی ہے۔ اور چونکہ ابتدا میں ان پر پوری توجہ ہی رکھنا محال ہے لہذا ابتدا میں صرف آ د ب پر توجہ رکھنے اور ان کی ہی مشق جاری رکھنے کی سفارش کی گئی تھی لیکن ان دو پر کامل عبور حاصل کئے بغیر بھی باقی باتوں کو شروع کر دینا ممکن ہے۔

جوں ہی الفاظ کو خاموش مطالعہ میں بلا زبان و لب ہلاتے اور بلا ارادی کوشش کے پڑھنے لگو اور اپنے خیال میں مضمون کو سمجھنے کی صلاحیت بھی کچھ بڑھ جائے باقی سب امور پر توجہ شروع کر دو۔

ساتوں امور کو دھیان میں رکھتے ہوئے آسان آسان فقرے حتی الامکان جلد جلد پڑھو آواز نہ نکلے اور نہ زبان ولب حرکت کریں۔ ہر سطر کے نصف بالائی حصّہ پر سے نگاہ گذرے اور تم جلد جلد آگے بڑھو۔ مگر ساتھ کے ساتھ ہی مطلب بھی سمجھتے رہو۔ کیونکہ یہ مشق محض بے کار ہے اگر کچھ دور پڑھنے کے بعد تمھیں پھر واپس ہونا پڑے تاکہ مطلب سمجھ سکو۔

۲۔ اہم ہدایات کا ابتدائی مشقوں میں خیال رکھئے۔ اول تو پانچ دس منٹ سے زیادہ بیک وقت مشق نہ کرو ورنہ تھکن کے آثار اپنا سکّہ جمائیں گے۔ اور حاصل شدہ قوت ورفتار کو کم اور خراب کر دیں گے۔ دوئم:۔ صرف اس وقت یہ نئی قسم کا مطالعہ شروع کرو جب کہ تم اپنی پوری پوری توجہ پڑھنے کی طرف مبذول کر سکتے ہو۔ یہ کوشش کہ تمھارا دماغ تو کہیں اور بھٹکتا پھر رہا ہو اور تم مطالعہ میں ادراک ورفتار دونوں کو بڑھالو محض لاحاصل ہے۔ بہت جلد رفتار میں ترقی نظر آئے گی۔ لیکن ابتدائی کامیابی کی جھلک پر ٹھہر جانا غلطی ہے۔ جب تک کہ یہ عمدہ عادت جمکر خصلت نہ بن جائے اس وقت تک پرانی رفتار پر واپسی بہت ممکن ہے۔ اس لئے اس وقت بھی جب کہ تم اپنے کو تیز پڑھنے والا سمجھتے ہو۔ کبھی کبھی دس صفحوں کے پڑھنے کا وقت معلوم کیا کرو اور پھر صرف ایک صفحہ کو ارادتاً تیزی اور نئی قوتوں کے استعمال کے ساتھ پڑھو۔

بڑا فرق معلوم ہوگا - ایک ریاضی داں کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے ایک عمدہ ناول جس میں ۳۲
صفحے ہوتے ہیں کل سوا دو گھنٹے میں ختم کر ڈالا - تم بھی کوشش کر کے ایسی رفتار حاصل کرو
ملاحظہ ہو "خاموش مطالعہ" (O. Brien. Silent Reading)

امیر علی خان

بزم مُعلّمین

طوطوں کی تعلیم

امریکہ میں ایک صوبہ ہے جس کا نام ہے ٹیکساس۔ گزشتہ دنوں میں اخباری دنیا میں اس کا بہت چرچا رہا تھا۔ کیونکہ وہاں کی حکومت نے یا عدالت نے ایک پروفیسر پر اس جرم میں مقدمہ چلایا تھا اور اس کو سزا بھی دی تھی کہ اس نے اپنے لیکچروں میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی حمایت کی تھی، اور جب حکام نے مطالبہ کیا کہ وہ اس جرم سے تائب ہو تو اس نے انکار کر دیا تھا۔

اسی ستم ظریف صوبہ سے حال میں ایک نہایت دلچسپ اطلاع موصول ہوئی ہے "وہاں ایک شخص نے طوطوں کا مدرسہ کھولا ہے، جس میں بقول نامہ نگار، اس وقت ڈیڑھ سو طالبعلم تعلیم پا رہے ہیں۔ طوطے میکسکو اور وسط امریکہ سے لائے جاتے ہیں اور انھیں انگریزی بولنا سکھایا جاتا ہے۔ ہر جماعت کے لئے علیحدہ علیحدہ گریموفون ریکارڈ ہیں۔ ہر ہفتہ امتحان لیا جاتا ہے۔ جو طوطا امتحان میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے لئے خاص تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی طوطا چھ ہفتوں میں فقرے نہ رٹ سکے تو اسے تعلیم کے ناقابل قرار دے کر مدرسہ سے نکال دیا جاتا ہے"۔

کہا جاتا ہے کہ اس مدرسہ کے بانی کو اپنے بنیادی اصول ہندوستان کے تعلیمی نظام سے حاصل ہوئے ہیں۔ اس نے ہمارے ہاں کے مدارس کا، اور ان کے طریقہ تعلیم اور نصاب کا غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ طوطوں کو تعلیم دینے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کی تعلیم سے [illegible] کے مقصود [illegible] وہ ہندوستان کی تعلیم

سے بہت اچھی طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے اس خیال میں کہاں تک صداقت ہے اور ہماری تعلیم واقعتاً کس حد تک طوطوں کی تعلیم سے مشابہ ہے۔

اس بات سے تو کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے مدرسوں کی تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ طالب علم انگریزی بول سکیں۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کو ٹھیٹ محاورہ میں "رٹنا"، ہی کہہ سکتے ہیں۔ تعلیم کے فلسفی اور ماہر خواہ تعلیم کا کوئی نصب العین قرار دیں، ہم اپنی تعلیم کو اسی وقت کامیاب سمجھتے ہیں جب ہمارے طالبعلم انگریزی بول سکیں لارڈ میکالے نے جب عقل کل بنکر ہندوستان کے لوگوں کو "بابو" بنانے کے لئے انگریزی نظام تعلیم رائج کیا تو اس نے صریحاً یہی مقصد پیش نظر رکھا تھا کہ یہ لوگ انگریزی پڑھ کر اس قابل ہو جائیں کہ دفتروں کا روزمرّہ کا کام، رجسٹروں کی خانہ پری اور خط وکتابت وغیرہ، انگریزی میں کر سکیں اگرچہ اس وقت سے اب تک بعض لحاظ سے کافی ترقی ہوئی ہے اور اب ان پڑھے ہوئے "بابوؤں"، کو دفتر کی اعلیٰ نوکریاں بھی ملنے لگیں ہیں لیکن انگریزی زبان کا علم اور انگریزی بولنا اب بھی ہر قسم کی ترقی اور ملازمت کے لئے شرط لازم ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا زمانہ اسی کم وبیش بے سود کوشش میں گذر جاتا ہے کہ لڑکا انگریزی سمجھنے اور بولنے لگے اور اس کے بعد وہ تعلیم جو اعلیٰ تعلیم کہلاتی ہے اس کا ذریعہ بھی انگریزی زبان ہی ہے اور جو شخص اپنی بدنصیبی یا استادوں کی نالائقی کی وجہ سے اس کی واقفیت سے محروم رہ جاتا ہے اس پر ہمارے ہاں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا دروازہ بالکل ہی بند ہے۔ لیکن اکثر وہ طالبعلم بھی جو انگریزی جاننے کا رسمی سرٹیفکٹ کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں (اور بالعموم ہمارے ٹیکساس کے طوطوں کی طرح رٹ کر ہی حاصل کرتے ہیں!) یونیورسٹی اور کالج کی تعلیم سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ وہ ان لیکچروں کو بخوبی سمجھ ہی نہیں سکتے جو مختلف مضامین نصاب پر انگریزی زبان میں دیئے جاتے ہیں۔ لیکن مقصد تو طوطوں کو انگریزی سکھانا ہے۔ اگر اس کے حصول کی کوشش میں ان کا تاریخ کا علم سطحی اور خام رہ جاتا ہے، یا فلسفہ کا علم محض اصطلاحات کو یاد کر [illegible]

یادہ ملک کے اقتصادی مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہیں کیونکہ ان کی کتب درسی میں الفاظ اور اصطلاحات تمام تر غیر ملکوں کے حالات سے متعلق ہیں۔ تو یہ سب طوطوں کا قصور ہے۔ طوطوں کے معلم اور منتظم تعلیم کا کیا قصور؟ اور اس نقصان کی تلافی اس طرح ہو جاتی ہے کہ طوطوں میں انگریزی پڑھنے اور سمجھنے کی بہتر صلاحیت بیدار ہونے کا امکان ہے!

اب طریقہ تعلیم کو لیجئے۔ ہمارا نامہ نگار اطلاع دیتا ہے کہ طوطوں کی ہر جماعت کے لئے علیحدہ علیحدہ گرامو فون ریکارڈ ہیں۔ ان پر مختلف جملے بجائے جاتے ہیں۔ اور طوطے چھ ہفتے تک ان کو دہراتے ہیں۔ سمجھنا شرط نہیں۔ یاد کرنا، رٹنا شرط ہے۔ طوطوں کے دماغ میں حافظہ کے علاوہ اور کوئی قوت موجود نہیں۔ اس لئے معلم اس قوت کو مستحکم بنانے کے لئے سارا انتظام کرتا ہے۔ ہمارے معلم بھی اپنے طالب علموں کو "طوطا" سمجھتے ہیں۔ ان کے دماغ میں عقل یا قوت استدلال یا جدت تو مفقود ہے۔ البتہ حافظہ ضرور ہے اور وہ بھی اس قسم کا جیسی ایک موم کی پلیٹ ہوتی ہے۔ اس پر جو نشان ڈالو گے وہ پڑ جائے گا۔ اور اس کو جتنی دفعہ دھراؤ گے اتنا ہی نقش زیادہ گہرا ہوگا۔ مجھے اپنے ایک پرانے استاد کا قول یاد ہے (خدا انکو بخشے!) وہ مدرسہ میں سائنس پڑھایا کرتے تھے اور کتاب کی عبارت کو پڑھکر کہتے تھے کہ اس کو حفظ کرلو۔ اگر کوئی لڑکا کسی بات کو نہ سمجھتا (اور واقعہ یہ ہے کہ شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو سمجھ میں آجاتی ہو!) اور اس کی تشریح دریافت کرتا تو وہ کہتے: — "ایک دفعہ حفظ کرڈالو۔ کبھی نہ کبھی سمجھ میں آجائے گی اور کام دے گی!" — اور اکثر استادوں کو یہی طریقہ پسند ہے خواہ وہ کوئی مضمون پڑھاتے ہوں۔ تاریخ اور جغرافیہ تو ان کے نزدیک واقعات کے علوم ہیں۔ ان کو حفظ کرلینا چاہیئے اور امتحان میں سوالوں کے جواب لکھ کر بھول جانا چاہیئے۔ "ادب" مدرسہ کی تعلیم میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ زبانیں البتہ ہیں لیکن ان میں بھی سب زیادہ کارآمد اور سہل طریقہ یہی پایا گیا ہے کہ سبقوں کے معنی لکھا دئے جائیں اور طالب علم ان کو رٹ لیں۔ حساب کی نہ صرف بنیاد حافظہ پر رکھی جاتی ہے بلکہ تمام عمارت اسی کے بل بوتے پر

کھڑی ہوتی ہے ۔غرض تمام درس مضامین کا یہی حال ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ہمارے مدرسوں کے "طوطے" جو تعلیم پاکر نکلتے ہیں ۔ وہ بالعموم دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ جو نالائق ہوتے ہیں وہ تو کورے رہتے ہیں اور جو "قابل" ہوتے ہیں وہ بالکل گریموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ رائیں اور خیالات دہراتے ہیں جو انھوں نے اپنے معلموں سے سیکھے ہیں ۔ ان میں کوئی آزادی رائے یا انفرادیت پیدا ہونے نہیں پاتی کیونکہ ہر شخص ایک طوطا ہوتا ہے جس نے ایک ہی چیز، ایک ہی طریقہ سے اور ایک ہی وقت میں دوسرے طوطوں کے ساتھ پڑھی ہے ۔ اس میں مختلف چیزوں کا علم کانوں کے راستے بھرا گیا ہو۔ اور اعادہ اور تکرار کے ذریعہ حافظہ میں اس کو بند کر کے مہر لگا دی گئی ۔ اس کو اظہار خودی کا، اپنی طبیعت کے مخصوص رجحان کو عمل میں لانے کا کوئی موقع نہیں دیا گیا ۔اس لئے جب تماشا کرنے والا کہتا ہے "میاں مٹھو بولو" تو سب ایک زبان ہو کر بولتے ہیں۔ اگر پھر بھی ان میں فرق اور اختلاف باقی رہتا ہے تو وہ قدرت کی فیاضی ہے جس نے کسی شخص کو دوسرے جیسا نہیں بنایا ۔ بلکہ ہر شخص کو ایک "فرد" بنایا ہے ۔ ہماری "طوطا منش تعلیم" اس فرق کو مٹانے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتی ۔

امتحانوں کے متعلق ہمارے ہاں بھی وہی عقیدہ رائج ہے جو طوطوں کے مدرسہ میں ہے ۔یعنی غالب کے آموں کی طرح ان کو بکثرت ہونا چاہیئے ۔ طوطوں کے لئے ہفتہ میں ایک مرتبہ امتحان کا انتظام کیا گیا ہے ۔ ہمارے یہاں بھی استاد حسب استطاعت امتحان لینے میں کمی نہیں کرتے ۔ علاوہ سالانہ، ماہی، ششماہی اور سہ ماہی امتحانات کے، علاوہ انسپکٹر کے معائنوں اور وظیفہ کے امتحانات کے، استاد خود بھی اکثر اپنی جماعتوں پر امتحانوں کی تلوار لٹکائے رکھتے ہیں ۔ اور اس امتحانوں کی بارش کو ادائے فرض کا بہترین ثبوت سمجھتے ہیں ۔ انھیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ امتحانوں کا یہ سہم جو بیچارے طلباء پر ہر وقت سوار رہتا ہو ان کے مطالعہ اور علمی ترقی اور ذوق اور دلچسپی میں کیسی رکاوٹ پیدا کرتا ہے ۔اگر ذوق سے تو ہوتا

تو امتحان کا کوڑا اس کی توجہ اور شوق اور انہماک سب کو پراگندہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کو بھی وہی مقررہ، بے جان خشک امتحان دینا ہے جو اس کے پچاس اور ہم جماعتوں کو۔ اسلئے دوسرے مضامین کی تیاری کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ اس کا تجسس اور شوق اس کو مضمون کے جیتے جاگتے، تخلیقی حصّے کی طرف لے جاتا ہے، اس کو ادبی خوبیوں کی طرف مائل کرتا ہے یا کسی تاریخی زمانے کی اصلی تہذیب کا مطالعہ کرنے پر راغب کرتا ہے لیکن امتحان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر مضمون کے اس حصّہ کی طرف متوجہ ہو جس کے متعلق سوال پوچھے جا سکتے ہیں اور جو لازماً مقابلتہً بے جان اور خشک واقعات پر مبنی ہوتا ہے۔

چنانچہ ہمارا غریب طالب علم بھی، اپنے ہم نصیب امریکن طوطے کی طرح، امتحانوں کے لئے تیاری کرتا ہے اور تعلیم اور ذوق کو ان کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

البتہ دو باتوں میں امریکہ کی درسگاہ ہمارے اسکولوں سے بہتر ہے۔ اوّل تو یہ کہ وہاں فیل شدہ "طلبا" کے لئے تعلیم کا خاص انتظام کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں اسکا انتظام نہیں ہوتا۔ جو طالب علم فیل ہو گیا وہ اپنے خیال میں تقدیر کا کشتہ ہے اور دوسروں کے خیال میں نالائق اور کام چور۔ اس بات کی کوشش نہیں کی جاتی کہ وہ اندرونی گتھیاں اور نفسی وجوہ معلوم کئے جائیں جنھوں نے ان طالب علموں کو باوجود سال بھر کام کرنے کے محض پاس ہونے کے قابل بھی نہ بنایا۔ یہ طلبا پھر اسی چکی کے چکر میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر گرامو فون ریکارڈ بجتے ہیں اور جملے حفظ کرائے جاتے ہیں۔ پھر امتحانات ہوتے ہیں اور سال بھر کے بعد قسمت آزمائی کرنی پڑتی ہے۔ اب کے پہلے سے زیادہ محنت کے ساتھ دماغ کی سلیٹ پر گہرے نقش ڈالے جاتے ہیں تاکہ وہ امتحان کی صبر آزما گھڑی تک محو نہ ہوں۔ غرض تعلیم کی حالت ایک اندھے آدمی کی تیراندازی کی سی ہے جس میں تیر کے نشانہ پر پڑ جانے کا امکان ہے یقین نہیں۔ طلبا کی نفسی کیفیت اور ترقی سے استاد کو آگاہی نہیں ہوتی۔ اور وہ جہالت کے اندھیرے میں اپنے تعلیمی طریقوں اور وسائل سے

کام لیا ہے۔ اگر طالب علم کامیاب ہو جائے تو غنیمت ہے ورنہ شہید! ہندوستان کے لئے "طوطوں کی تعلیم" کے نتائج بالکل تباہ کن ہوئے ہیں۔ صحیح تعلیم کے لئے لازم ہے کہ طلبا کے سامنے مختلف قسم کے مشاغل ہوں، جس میں فکر اور تخیل، دونوں کو آزادی کے ساتھ اظہار کے موقع حاصل ہوں، جس میں ادب، آرٹ اور سائنس کے وہ تمام مشاغل موجود ہوں، جو انسان کی دماغی اور روحانی تربیت کیلئے ضروری ہیں۔ جس میں ان کو خود اعتمادی جدت اور اپچ کے ساتھ کام کرنے کی ترغیب ہو تاکہ وہ تعلیم حاصل کر کے اپنی قوم اور ملک کے کارکن، مفید اور عملی رکن بن سکیں جو زندگی کو مجبوروں کی طرح بسر نہ کریں بلکہ اپنی فعالیت سے اپنے گرد و نواح کی زندگی کو متاثر کریں۔ اس قسم کی شخصیت کی تشکیل میں طوطوں کا طریقہ تعلیم سراسر مضر ہے۔ اس کے لئے انگریزی بولنا کافی نہیں بلکہ اس علمی قوت کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو تمام علوم کے سربستہ رازوں کو کھول دیتی ہے اور جس کی بدولت انسان، اقلیم علم کو اپنی کوشش سے تسخیر کر سکتا ہے۔ اس کے لئے گراموفون ریکارڈ جیسے معلم کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے معلم درکار ہیں جن کو تجربہ کرنے کا شوق اور جدت پیدا کرنے کی صلاحیت ہو اور جو بچوں کی نفسی زندگی کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے طریقہ تعلیم میں تبدیلی اور ترمیم کر سکے اس کے لئے جملوں کو رٹنا اور حافظہ کو تیز کرنا کافی نہیں بلکہ استدلال، فیصلہ، تخیل اور اس قسم کی اعلیٰ دماغی قوتوں کی تربیت کی ضرورت ہے۔ جن کے لئے حافظہ کی حیثیت محض ایک خادم کی ہے۔ ہمارے لئے اس سے بلند تر نصب العین کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اس معنی خیز اور فعالی شخصیت کی نشو و نما کے لئے اپنی کوششیں وقف کر دیں؟

خواجہ غلام السیدین

جہل مرکّب

حکما کے دستور کے مطابق ہم بھی پہلے اپنے موضوع بحث کی تعریف کریں گے۔ تعریف سے مراد وہ دروغ مصلحت آمیز نہیں جو ہندوستانی رئیسوں کی غذا اور ہندوستانی شاعروں کا ذریعہ معاش ہے بلکہ وہ راستی فتنہ انگیز جو سقراط کی تلوار اور افلاطون کی سپر تھی۔ اگر ہم سے کوئی تعریف کی تعریف کرنے کو کہے اور وہ ایسا محفوظ مقام ہو جہاں سوائے دیوار گوش دار کے کوئی خطرہ نہ ہو تو ہم کہیں گے "کسی بات کو ایسے الفاظ میں کہنا کہ منطقی چاہے سمجھ لیں مگر کوئی بھلا آدمی نہ سمجھے" اب اس سے بڑھ کر جامع اور مانع تعریف کیا ہو سکتی ہے۔

خیر۔ تو ہم کو جہل مرکّب کی تعریف کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس ترکیب کو سننے سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ رفع کر دی جائیں ہم نے بعض لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ یہ بھی جمع مرکّب، تفریق مرکّب کی طرح ریاضی کا ایک قاعدہ ہے جسے اونچی ڈگری والے ریاضی داں جانتے ہیں اگر ہم بغیر کمیشن کی اجازت کے اپنی ذمہ داری پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ بعض خوش عقیدہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ہندوستانی دواخانے کے مرکبات میں سے کوئی دوا ہے مگر ہم نے جہاں تک فہرست کا مطالعہ کیا ہے اس کا نام نہ دواؤں میں ہے نہ امراض میں۔ البتہ ترکیب استعمال میں ہو تو ہو۔ محض تحقیق کے خیال سے ہم نے ایک پرانے ہیڈ مولوی صاحب سے بھی کہا کہ "قبلہ مرکّب صرف و نحو کی اصطلاح ہے مگر ہمارے علم میں جہل مرکّب کا تو کسی کتاب میں ذکر نہیں البتہ اگر یہ کوئی خاص چیز ہو اور علم سینہ کی حیثیت سے آپ تک پہنچی ہو تو بتا دیجیے۔" یہ سنکر جناب ہیڈ مولانا بہت برافروختہ ہوئے اور ہماری شان میں موصوف نے ایسے ایسے ثقیل مرکب توصیفی استعمال کیے جنکا ذکر کرنے میں ہماری زبان کا اندیشہ ہے۔ بہرحال ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جہل مرکب مولانا کی کسی دکھتی ہوئی رگ کا نام ہو تو ہو بات ہے مگر صرف و نحو سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر جہل مرکب کسے کہتے ہیں۔ کسی استاد کا مشہور شعر ہے۔

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابد الدہر بماند

اس کی بنا پر لالہ فارسی مل صاحب نے جہل مرکّب کی یہ تعریف کی تھی "ندانستن و ندانستن کہ ندانستن" اور ہمیں یاد ہے کہ اس مجمع میں اکثر لوگوں نے اس بلیغ فقرے کو سنکر قہقہہ لگایا تھا ہم بھی اپنی تعریف کو اسی شعر پر مبنی کرتے ہیں۔ ("اپنی تعریف" سے مراد ہے جہل مرکب کی وہ تعریف جو ہم کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی نے یہ سمجھ لیا کہ ہم یہ شعر اپنی شان میں استعمال کرتے ہیں تو پھر ہماری سبکی کا پہلو نکلے گا اور یہ مقصود نہیں)

اس شعر کو محض الفاظ کی الٹ پھیر نہ سمجھئے۔ اس میں واقعی جہل مرکّب کی ایسی ہی بلیغ اور لطیف تعریف ہے جیسے بلاغت کی "اقلال لفظ بے اخلال معنی" یا ہیضہ کی "اشکال باطنی بے اسہال ظاہری" ہے اور لطف یہ ہے کہ ذرا سے تغیر تبدل سے جہل مرکّب اور جہل سادہ دونوں کی تعریف نکل سکتی ہے۔ جہل سادہ تو ہوا "نہ جاننا اور نہ جاننا کہ ہم نہیں جانتے" اور جہل مرکّب "نہ جاننا اور جاننا کہ ہم جانتے ہیں" ممکن ہے کہ کوئی نحوی یہ اعتراض کرے کہ دو نفی سے ایک اثبات کے معنی نکلتے ہیں اس لئے "نہ جاننا کہ ہم نہیں جانتے" اور "جاننا کہ ہم جانتے ہیں" ان فقروں میں محض لفظی فرق ہے معنوی حیثیت سے دونوں ایک ہیں۔ اگر آپ کو ایسا نحوی ملے تو اس کی بہت قدر کیجئے کیونکہ وہ ضرور بالواسطہ بزاخفش کا شاگرد ہوگا ورنہ ایسی بات نہ کہتا۔ پھر بھی ہم احتیاطاً جہل سادہ اور جہل مرکّب کے فرق کی مزید توضیح کئے دیتے ہیں کیونکہ یہ معلّموں کے لئے جنھیں دن رات جہل سے سابقہ رہتا ہے بڑے کام کی چیز ہے۔

جہل سادہ یعنی "نہ جاننا اور نہ جاننا کہ ہم نہیں جانتے" وہ حالت ہے جس میں کسی نہ کسی حد تک ہر انسان اپنے آپ کو پاتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے تو وہ خوش قسمتی سے نہ کچھ جانتا ہے اور نہ اسے اپنی لاعلمی کا شعور ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ بچپن ہی سے جلدی

جلدی بڑھتا ہے لیکن خدا سمجھے حواس اور عقل کو جن کی بدولت وہ چار ناچار ادراک و تعقل کے جنجال میں پھنس جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو کہ وہ صبح سے شام تک دیکھنے، سننے، سونگھنے، چھونے (بلکہ توڑ پھوڑ ڈالنے) اور خصوصاً چکھنے کے ذریعے سے چند نئی اشیاء کا علم نہ حاصل کرتا ہو اور تحقیق و تجسس یعنی شرارت کی بدولت چند نئی حرکتیں نہ دریافت کرتا ہو۔

اب قابل غور یہ امر ہے کہ جب تک بچے کو ان چیزوں سے یا ان چیزوں کو بچے سے سابقہ نہیں پڑا ہے اس وقت تک وہ ان سے بالکل ناواقف ہوتا ہے بلکہ اسے اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں وجود رکھتی ہیں اور میں انھیں نہیں جانتا۔ اور بچے پر کیا موقوف ہے ہم آپ بھی باوجود اس علم و فضل اور ریش و فش کے بہت سی باتیں نہیں جانتے اور جب تک کوئی نہ بتائے اپنی لاعلمی سے بھی لاعلم ہوتے ہیں۔ لیکن تعلیم دینے والے جانتے ہیں کہ طالب علم کے لئے یہ کیفیت کچھ زیادہ مفید نہیں۔ جب تک انسان کو اپنے جہل کا احساس نہ ہو اس کے دل میں تحقیق کی لگن نہیں لگتی۔ سقراط جو سچے فلسفیوں اور معلّموں کا سرتاج تھا لوگوں سے بات پوچھتا تھا، بات کی جڑ پوچھتا تھا یہاں تک کہ انھیں بحث میں پچھاڑ دیتا تھا اور ان کی زبان سے بلکہ ان کے دل سے جہل کا اقرار کرا لیتا تھا۔ اس سے آخر اسے کیا فائدہ تھا؟ کیا اسے مناظرہ کرنے کے لئے کسی مشن کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا یا خواہ مخواہ برا بھلا سننے اور زہر پینے کا شوق تھا۔ بات اصل یہ تھی کہ وہ اپنی قوم میں علمی تحقیق اور اخلاقی اصلاح کا جوش پیدا کرنا چاہتا تھا اور یہ اس وقت تک ناممکن تھا جب تک انھیں اپنی جہالت اور اخلاقی بے اصولی کا بہ خوبی احساس نہ ہو جائے اس کا مباحثہ گویا ایک طرح کا جلاّب تھا جو فاسد مادّہ کو خارج کر دیتا تھا اور اشتہائے صادق پیدا کرتا تھا۔ ہم معلّموں کو اس بارے میں سقراط کی پیروی کرنا چاہئے لیکن دو ایک باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ ہماری نیت خالص ہو یعنی بحث کا مقصد اپنی علمیت یا برتری ثابت کرنا یا کسی سے کسر نکالنا نہ ہو اور انداز گفتگو میں بھی شائستگی تہذیب مدّنظر رہے۔ سقراط کو جو لوگوں نے ستر برس جینے دیا اس کا سبب یہی تھا کہ وہ بہت نرمی اور

خلوص سے بغیر کسی ناجائز غرض کے اُن کی بیوقوفی ثابت کرتا تھا اور خود کبھی عقل و دانش کا دعوٰی نہیں کرتا تھا۔ بیشک بعض اوقات وہ پھبتیاں کسنے اور فقرے چست کرنے پر مجبور ہوتا تھا لیکن یہ طرزِ عمل صرف ان لوگوں کے مقابلے میں تھا جو جہل مرکب میں مبتلا تھے دوسرے یہ بات بھی مدنظر رہنا چاہیئے کہ ہم خواہ مخواہ کسی شخص سے خصوصاً غصہ ور اور تنک چھٹ لوگوں سے نہ الجھیں ورنہ طرفین کے لئے خصوصاً ہمارے لئے خراب نتائج پیدا ہونگے۔ ہمیں اپنے شاگردوں سے اور دوسرے لوگوں میں صرف ان سے تعلق رکھنا چاہیئے جو دل سے طلب علم کے خواستگار ہیں اور اپنی جہالت کا اعتراف کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ تیسرے اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ گفتگو کا بار زیادہ تر اپنے مخاطب پر ڈالیں اور خود موقع موقع سے مناسب سوالات کرنے پر اکتفا کریں۔ جہالت کا سچا اعتراف وہی ہے جو خود بخود بغیر دوسرے کے دباؤ یا اغوا کے پیدا ہو۔ کیا لطف جو غیر پردہ کھولے۔

البتہ جہل مرکب کے بارے میں سقراط کا رویہ دوسرا تھا اور ہمارا بھی وہی ہونا چاہیئے۔ بیچارے یونانی فلسفی کو صدق دل سے اپنے اور دوسروں کے (خصوصاً دوسروں کے) جہل کا یقین تھا اور یہی اعتراف جہالت اس کے لئے مایۂ ناز تھا۔ مگر بعض اوقات اسے ایسے ایسے فیلسوفوں اور سوفسطائیوں سے کام پڑتا تھا جو اس کے مدعی تھے کہ وہ دنیا کے ہر فن میں اردو اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں سے بھی زیادہ کمال رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ ایسا ویسا تو ان کے سامنے ٹھیر نہیں سکتا تھا۔ مگر ہر فرعونے را موسیٰ اور ہر جہل مرکب را سقراطؔ اس نے بھی ان کے مقابلے میں ایسے ایسے پیچ نکالے کہ انھیں زمین بوا کر چھوڑا۔ اگر سقراط کی زبان کی کاٹ دیکھنا ہو تو افلاطون کے مکالمے پڑھیئے جن میں اس نے اپنے استاد کے اور سوفسطائیوں کے مناظروں کو بیان کیا ہے۔

ہمارے ہم پیشہ معلم اس مرض کے بیمار بھی ہوتے ہیں اور معالج بھی۔ بیچاروں کو دن رات سابقہ رہتا ہے لڑکوں سے جن کی ہر مشکل کو وہ حل کرسکتے ہیں یا ٹال سکتے ہیں اور جن کے سامنے

بلاخوف تردید وہ ہر مسئلے پر مبسوط، تسکین بخش بلکہ خواب آور گفتگو کر سکتے ہیں۔ انھیں اپنے آپ سے زیادہ قابل آدمی اگر کبھی ملتا بھی ہے تو انسپکٹر جو اپنے معائنے میں زیادہ زور طلبا کی حاضری، دیواروں کی سفیدی اور اپنے بھتے پر دیتا ہے یا ہیڈ ماسٹر جس نے پراونشل سروس میں آنے کے بعد سے سوائے گزٹ اور کیلنڈر کے کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر غریب معلّم سمجھتے ہیں کہ ہم (یعنی وہ) "فلاطون سے یوہیں کچھ ہوں تو ہوں کمتر" تو کوئی تعجب کی بات نہیں البتہ افسوس کی بات ضرور ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ وہ اپنے محلّے یا اپنے شہر کے قابل اور شوخ طبع لوگوں سے جو فقرے کسنے میں کمال رکھتے ہوں ملا کریں اور "تعلیم و تربیت" میں "بزم معلّمین" کے مضامین پڑھا کریں انشاء اللہ چند روز کے استعمال میں بیّن فائدہ محسوس ہوگا۔

اب رہا ان طلبا کا علاج کرنا جو اس مرض میں مبتلا ہوں تو پہلے ہر ایک کے مرض کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔ اگر کسی طالب علم کے جہل مرکب کا باعث یہ ہے کہ وہ اپنے امتحان میں اچھے نمبروں میں کامیاب ہوا ہے تو اسے خوب سخت پرچے دینا چاہیے خواہ معلّم خود بھی ان کا جواب نہ دے سکتا ہو۔ اگر وہ محض اس سبب سے بیجا قابلیت کا دعوٰی رکھتا ہے کہ دوسرے لڑکے اس سے بھی زیادہ نالائق ہیں تو معلّم کو خود اپنی قابلیت اور کارگزاری کا جائزہ لینا چاہیے اور اوّل خویش بعدہٗ درویش دونوں کی اصلاح کرنا چاہیے۔ لیکن اگر مرض کی جڑ لڑکے کی خلقی کج فہمی اور نخوت ہے تو اس مجرّب نسخے سے کام لینا چاہیے جو اس رسالے کے پچھلے نمبر میں "تعلیم اور ظرافت" کے نام سے چھپا ہے۔ اس کے کمس اجزا معلوم کرنا ہوں تو افلاطون کی تصانیف کا مجموعہ حاصل کر کے دیکھنا چاہیے کہ سقراط نے اس مرض کو دور کرنے کے لئے لوگوں کو کیسے کیسے مسائل دیے ہیں۔ بہر حال اس منحوس مرض کے علاج میں غفلت نہ کرنا چاہیے ورنہ ذہن میں دیمک لگ جائے گی جو عقل و دانش اور مذاق سلیم کو چاٹ کر چھوڑے گی۔

اقتباسات

آکسفورڈ کے طلبا کی سیاست

پچھلے چھ سال سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں جتنا سیاسی ہیجان پایا جاتا ہے اتنا غالباً اس کی ساری پچھلی تاریخ میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن کیمبرج کے مقابلہ میں آکسفورڈ ہمیشہ سے زیادہ ترقی طلب اور انتہا پسند رہا ہے اور ادھر چند سال سے یونین کے مباحث میں تقسیم آرا کا جو رنگ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی یہ بات باقی ہے۔

عام اوقات میں تو سیاسی اعتبار سے اکثر طلبہ گویا سوتے رہتے ہیں لیکن جب پارلیمنٹ کے انتخابات یا کسی بڑے پولٹیکل لیڈر کی آمد کے سبب سے ان میں حرکت پیدا ہوئی تو پھر ان کے جوش کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی اور جماعت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی مشہور مقرروں مثلاً لائڈ جارج، ریمزے میکڈانلڈ، ونسٹن چرچل، یا لارڈ برکن ہیڈ، کو یہاں سامعین کا جیسا مجمع ملتا ہے ویسا شائد کیمبرج میں ملے تو ملے۔

یہ یاد رہے کہ اکثر طلبا کو بظاہر سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جن طلبا کے ہاتھ میں تینوں پارٹیوں کی انجمنوں کا انتظام ہو وہ اچھے نہیں کہلاتے بلکہ معمولی قابلیت کے دخل در معقولات دینے والے نوجوان سمجھے جاتے ہیں۔

یونیورسٹی کے اہل سیاست تین طرح کے ہیں قدامت پسند (کنسرویٹو) احرار (لبرل) اور اجتماعی (سوشلسٹ)۔ اشتراکی (کمیونسٹ) عنصر اتنا کم ہے کہ اسے ہم نظر انداز کر سکتے ہیں

اگر یونیورسٹی کے تمام طلبا کا شمار کیا جائے تو یقیناً قدامت پسندوں کی تعداد بہت زیادہ نکلے گی۔ لیکن سنّ اور طبقوں کے قدامت پسندوں کے یہاں والوں میں بھی اتنی حرکت نہیں ہے جتنی احرار میں اور اجتماعی پارٹی میں ہے۔ اوّل تو اکثر دولت مند لوگ قدامت پسند ہیں اور دولت مند نوجوانوں کو سیاسی جلسوں میں جانے کا شوق بہت کم ہوتا

ہے وہ تھیٹر یا بائیکوپ کے تماشے کو یا کسی اعلیٰ کلب میں بیٹھ کر شراب پرتگالی اور سگار کا لطف اٹھانے کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ بے شک وہ صبح کو مارننگ پوسٹ یا ٹائمز کا مطالعہ کرتے ہیں اور غالباً سیاست حاضرہ سے اچھی خاصی واقفیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن وہ آکسفورڈ کے ارباب سیاست کو جو ورزشی کھیلوں میں کورے ہوتے ہیں اور بے سروپا سیاسی گفتگو سے لوگوں کا دماغ چاٹ جاتے ہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عموماً ہر طالب علم خصوصاً وہ جو قدامت پسند خاندان کا ہو اور سیاست حاضرہ سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو وہی خیالات اختیار کر لیتا ہے جو اس کے گھرانے میں چلے آتے ہیں۔ اس کے باپ نے غالباً ایٹن اسکول اور کرائسٹ چرچ کالج میں پڑھا ہے۔ وہ جب آکسفورڈ میں تھا تو شکار کھیلا کرتا تھا یا پولو میں مشغول رہتا تھا اور یونین جیسے بدنام ادارے سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایسی حالت میں طالب علم خاندان کی روایات سے اتنا بڑا انحراف نہیں کر سکتا کہ یونین میں جایا کرے۔ آکسفورڈ کے بڑے پرجوش سیاست پسند تک بعض وقت یہ سمجھتے ہیں کہ یہی رو یہ سب سے اچھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہر طالب علم کو سیاست میں پڑنے سے یہ خطرہ ہے کہ وہ لکیر کا فقیر اور اپنی پارٹی کا آلۂ کار بن کر رہ جائے گا۔ مشہور بات ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے لوگ جو آج کل دارالعلوم کے ممبر ہیں اپنی طالب علمی کے زمانے میں سیاست سے کوئی خاص شوق نہیں رکھتے تھے۔

یہاں تک تو بے حرکت قدامت پسندوں کا بیان تھا اب پرجوش قدامت پسندوں کا حال سنئے۔ ہر بے تعصب آدمی ان کو پرجوش نوجوان احرار اور اجتماعیت پسندوں پر ترجیح دے گا۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ موخر الذکر کو سوائے سیاست کے کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی بخلاف اس کے قدامت پسند نوجوان اور دلچسپیاں بھی رکھتے ہیں۔ آکسفورڈ کے اکثر قدامت پسندوں کا رجحان جیسا کہ نوجوانوں کا خاصہ ہے اپنی پارٹی کے بائیں حصے کی جانب ہوتا ہے (جو کسی قدر حریت پسند ہے)۔ ان میں سے جو لوگ کٹر پن

کی باتیں کرتے ہیں یہ عموماً ان کا تصنع ہوتا ہے جس سے نوجوان طالب علم اکثر کام لیا کرتے ہیں - یا پھر وہ کٹر قدامت پسند اس لئے ہوتے ہیں کہ وہ کسی قدامت پسند سیاسی لیڈر کی شخصیت سے مسحور ہو گئے ہیں اور بغیر محسوس کئے ہوئے اس کا ساین جانے کی کوشش کر رہے ہیں - یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جب لائڈ جارج یا برکن ہیڈ یونین میں آئیں تو ان کے جانے کے بعد کچھ دن تک اکثر مقرر تقریر کے وقت اپنے حرکات و سکنات میں ان کی تقلید کرتے ہیں اور بعض تو یہ ستم کرتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کے اچھے فقرے چرا لیتے ہیں -

بہت کم طلبا ایسے ہیں جو پکے قدامت پسند یا پکے حرّیت پسند یا پکے اجتماعیت پسند کہے جا سکیں کیونکہ وہ جب اپنے پبلک اسکول کے تنگ دائرے نکلکر یونیورسٹی میں آتے ہیں تو ان بیچاروں کا سیاسی عقیدہ بہت ڈانواں ڈول ہوتا ہے - وہ اکثر اس پارٹی سے اس پارٹی میں جایا کرتے ہیں اور انھیں خود اپنی صحیح رائے کا اندازہ نہیں ہوتا - اسی لئے اکثر قدامت پسند نیم گرم سے ہوتے ہیں - ان کے خیالات عارضی اور دھندلے ہوتے ہیں اور سب نوجوانوں کی طرح ان پر بھی جذبات پرستی غالب ہوتی ہے اسی لئے وہ عموماً اپنی پارٹی کے بائیں حصے کی طرف ڈھل جاتے ہیں - پھر بھی یہ بہت کم ہوتا ہے کہ آکسفورڈ کا کوئی قدامت پسند طالب علم خواہ اس کا عقیدہ کتنا ہی ضعیف ہو اپنے آپ کو حرّیت پسند یا اجتماعیت پسند کہنے لگے -

جو طلبا غور و فکر کے عادی ہوتے ہیں ان کا رجحان ابتدا میں قدامت پسند پارٹی کی طرف نہیں ہوتا کیونکہ اس میں انسانی ہمدردی کا وہ اپیل نہیں جو اکثر نوجوانوں کو اجتماعیت پسند پارٹی کی طرف کھینچتا ہے - طلبا جب تک اسکول میں رہتے ہیں عموماً غور نہیں کیا کرتے - ان میں سے اکثر یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد اپنی عمر میں پہلی بار غور و فکر سے کام لیتے ہیں - انھیں پہلی بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ علاوہ اس مسئلے کے کہ "آیندہ ٹرم میں ہیڈ ماسٹر کون ہوگا" اور بھی اہم مسائل دنیا میں ہوتے ہیں - اور پہلی بار بغیر

والدین یا استاد کی مدد کے معاملات کا فیصلہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ اس صورت میں وہی ایثار کا جذبہ جو سپی محبت کی روح رواں ہے سیاسی پارٹی کے انتخاب میں بھی کارفرما ہوتا ہے اور نظر انتخاب بجائے اس پارٹی پر پڑنے کے جو بہترین عملی پالیسی کی حامی ہے اس پر پڑتی ہے جو انسانی ہمدردی کے اصولوں کی بہترین تلقین کرتی ہے ۔

مختصر یہ کہ آکسفورڈ کی قدامت پسند پارٹی میں غالب تعداد ان لوگوں کی ہے جو کبھی غور نہیں کرتے پھر وہ لوگ ہیں جو اتنے گہرے غور وفکر سے کام لیتے ہیں کہ دوسری پارٹی کی سطحی خوبیوں سے متاثر نہیں ہوتے ۔

تیسری قسم ان کی ہے جو قدامت پسندی کے خاندانی روایات میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ کسی اور پارٹی میں جا ہی نہیں سکتے ۔ علاوہ ان کے کچھ اور لوگ بھی ہیں مثلاً وہ لوگ جو محض مادی فوائد کی طمع میں قدامت پسندی اختیار کرتے ہیں یا نودولتوں کے لڑکے جو "رئیس" بننے پر جان دیتے ہیں ۔

آکسفورڈ والوں کا فطری رجحان قدامت پسندی کی طرف نہیں ہے کیونکہ ہر سمجھ دار نوجوان کے جذبات اس کے مخالف ہوتے ہیں بلکہ اکثر طلبا محض کاہلی کی سبب سے قدامت پسند بن جاتے ہیں ۔ وہ اپنے گھر پر آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جنھوں نے کبھی آنکھ کھول کر زندگی کے تاریک رُخ کو نہیں دیکھا ہے اور ان مصیبتوں سے ناواقف ہیں جو ان کے غریب بھائیوں پر گزرتی ہیں ۔

اب آئیے ذرا حریت پسندوں پر بھی ایک نظر ڈالیں ۔ آکسفورڈ کو لوگ "ناکامیاب تحریکوں کا گھر" کہتے ہیں اور موجودہ زمانے میں وہاں کے حریت پسندوں کو دیکھ کر اس قول کی تصدیق ہوتی ہے ۔ دوسرے مقامات کی طرح آکسفورڈ میں بھی حریت پسندوں کی تعداد زیادہ نہیں لیکن ان میں حرکت و جوش قدامت پسند

اور اجتماعیت پسند طلبا سے زیادہ ہے۔ اس لئے اصل میں آکسفورڈ کی سب سے قوی سیاسی جماعت یہی حرّیت پسندوں کی پارٹی ہے۔

آکسفورڈ کے حرّیت پسندوں سے لوگ اور پارٹیوں کے نوجوانوں کی بہ نسبت زیادہ خفا ہیں کیونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو اور اپنے سیاسی خیالات کو ضرورت سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں ان کی پارٹی کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بہت سے طلبا حتیٰ الامکان کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے جان چراتے ہیں اور درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ حرّیت پسند ہونے کے لئے کسی قطعی فیصلے کی ضرورت نہیں اس لئے یہ پارٹی نوجوانوں کے لئے ایک خاص کشش رکھتی ہے۔

بعض طلبا حرّیت پسند اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کا ضمیر انھیں قدامت پسند ہونے کی اجازت نہیں دیتا اور ان کا عملی احساس اجتماعیت پسند بننے سے روکتا ہے۔ شاید یہ لوگ جدید "لبرل کونسل" کی حمایت کریں اگرچہ لائڈ جارج کی حمایت ہرگز نہ کریں گے۔ مگر اس قسم کے لوگ بہت تھوڑے ہیں۔

بہت سے طلبا اس لئے حرّیت پسند ہیں کہ ان کے والدین حرّیت پسند تھے اور بہت سے اس لئے کہ وہ غیر سرکاری کلیسا سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے مذہب کا اب وہ زور نہیں ہے جو پہلے تھا۔ اور پچھلے چند سال سے آکسفورڈ میں اس کا کوئی خاص اثر نہیں دیکھا گیا سب جانتے ہیں کہ اس صدی میں انگلستان بھر میں تمام فرقوں کے معبدوں میں عبادت گذاروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی رہی ہے اور غیر سرکاری معبدوں میں عبادت گذاروں کی کمی ہوجانے کا نتیجہ یہ ہے کہ پرانی وضع کے حرّیت پسند بھی کم ہوگئے ہیں۔ جو صورت تمام ملک میں ہے وہی آکسفورڈ میں بھی ہے۔

جو شخص حرّیت پسند پارٹی پر سختی سے لیکن ایمانداری کے ساتھ تنقید کریگا اُسے

کہنا پڑے گا کہ ان کا خلوص بہت سطحی ہے اور ان میں ظاہر داری بہت ہے۔ اس پارٹی کا یہ صریحی خاصہ آکسفورڈ کے حرّیت پسندوں میں بھی موجود ہے۔ آکسفورڈ کی حرّیت پسندی جھوٹی جذبات پرستی کا مرکز ہے اور غالباً اسی لئے وہ طلبا جن میں تلوّن زیادہ ہے اس طرف جھکتے ہیں۔

یہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ طلبا کے سیاسی خیالات پر ممتاز مدبّروں کی شخصیت کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات نوجوان حرّیت پسندوں میں بہت نظر آتی ہے اور آکسفورڈ کی سیاست میں حرّیت پسندی کی اس قدر اہمیت کا باعث زیادہ تر لائیڈ جارج یا سر جان سائمن کی شخصیت ہے۔ یہ دونوں ہستیاں بہت سے نوجوان حرّیت پسندوں میں نئی رُوح پھونکتی ہیں اور ان کی ہمت افزائی کرتی ہیں کیونکہ بڑی کامیابی کی جتنی قدر آکسفورڈ میں ہوتی ہے کہیں نہیں ہوتی۔ اور بڑے بڑے سیاست داں جو آکسفورڈ میں آتے ہیں وہ اپنی پارٹی کے نقطۂ نظر سے اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔

یونیورسٹی کے ارباب سیاست یا تو بڑے حوصلے رکھتے ہیں یا خواہ مخواہ ہر ایک بات میں دخل درمعقولات دیا کرتے ہیں۔ اگر ان میں یہ دونوں باتیں جمع ہوں تو وہ ضرور ناکامیاب ہوتے ہیں۔ حوصلہ مند حرّیت پسند کی صحبت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ وہ عموماً بہت "جوڑ توڑ" کا آدمی ہوتا ہے۔ ہر جگہ جہاں لوگ اس سے گھبراتے ہیں گھستا ہے ہر شخص کو جس سے وہ ملتا ہے سیاست حاضرہ پر اپنے خیالات زبردستی سناتا ہے اور ایسے معلّمانہ لہجے میں گفتگو کرتا ہے کہ بہت سے لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں اور غصّہ تو سبھی کو آجاتا ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ نوجوان حرّیت پسندوں میں دوسرے نوجوانوں سے کہیں زیادہ خطابت کی قابلیت ہوتی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ سیاسی نظریوں اور اصولوں پر عبور رکھتے ہیں اور اپنی تقریر بھی بہت محنت سے تیار کرتے ہیں۔

غرض حرّیت پسند طلبا پر حد سے زیادہ جوش، جذبات پرستی، سطحیت اور معمّانہ رنگ کا غلبہ ہوتا ہے وہ حرّیت پسند اس لئے ہوتے ہیں کہ یہ ان کا خاندانی مرض ہے۔ یا اس لئے کہ وہ غیر سرکاری کلب سے تعلق رکھتے ہیں یا اس لئے کہ وہ سیاسی معاملات میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے اور کوئی مضبوط عقیدہ نہ رکھنے کے سبب سے درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

ان کے علاوہ آکسفورڈ میں اجتماعیت پسندوں کی خاصی قوّت ہے۔ ان لوگوں میں کم سے کم خلوص ضرور ہے۔ خواہ کسی طالب علم پر اجتماعیت پسندی کا ایسا اثر ہو جو عمر بھر رہے گا۔ یا وہ محض جذبۂ ایثار کے سبب سے اجتماعیت پسندی کے دام الفت میں گرفتار ہو گیا ہے دونوں صورتوں میں وہ مخلص ہوتا ہے۔

طالب علم مختلف وجوہ سے اجتماعیت پسند پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ کبھی تو اس لئے کہ گھر کی ناخوشگوار زندگی اور باپ کی بدمزاجی، یا اسکول کی انتہائی سختی یا افلاس کی مصیبتوں کی بدولت ان کے دل میں انسانوں کی طرف سے غبار پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی اس وجہ سے کہ وہ اس قدر جذبات پرست ہیں کہ ان کا ضمیر انھیں چین نہیں لینے دیتا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی امیر گھرانے کا نوجوان دفعتاً زندگی کے المناک پہلو کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا دل غم و غصّہ سے معمور ہو جاتا ہے۔ وہ فوراً عہد کرتا ہے کہ ان مصائب کو دور کرنے کی تدبیر تلاش کروں گا اور غلطی سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اجتماعیت پسند پارٹی اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

بعض نوجوان اس خیال کے بھی ہوتے ہیں کہ زندگی میں بغیر بہروپ بھرے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ ان لوگوں کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں جو "حسن پرست" کہلاتے ہیں (لیکن آکسفورڈ کے سب "حسن پرستوں" کی طرح اُن میں بھی ذوقِ حسن معدوم ہوتا ہے) وہ عجیب طرح کے کپڑے پہنتے ہیں، "ڈزرائیلی کی طرح کامیابی

کا یقین واثق رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو "اجتماعیت پسند" کہتے ہیں۔ وہ سیاسی بحث سے بچتے ہیں کیونکہ انھیں سیاسی مسائل سے واقفیت نہیں ہوتی۔ اصل میں انھیں ان چیزوں سے مطلق دلچسپی نہیں ہوتی اور ان میں خلوص نام کو بھی نہیں ہوتا۔ یہ اصل میں بہروپیے ہیں جو کوئی سیاسی خیالات نہیں رکھتے اس لئے انکا ذکر کرنا فضول ہے۔

آخری قسم ان طالب علموں کی ہے جنھوں نے اقتصادیات کا مطالعہ کیا ہے اور خدا جانے کیونکر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ملک کی نجات "اجتماعیت" ہی میں ہے۔ یہ اصل میں نظری لوگ ہیں اور ان کو ان مسائل سے جو دلچسپی ہے وہ زیادہ تر علمی اور کمتر سیاسی ہے۔

جو نوجوان واقعی خلوص کے ساتھ اجتماعیت کے قائل ہیں (آکسفورڈ میں زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے) ان میں جوش بہت ہوتا ہے لیکن احساس ظرافت بالکل نہیں ہوتا۔ وہ طول طویل تقریریں کرتے ہیں جنھیں وہ بڑی محنت سے تیار کرتے ہیں جن میں زیادہ تر "رقت کے بند" اور منطقی غلطیاں ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اجتماعیت پسندی طالب علموں کی زندگی کا ایک دور ہے مگر جب تک یہ رہتا ہے اس میں انتہائی خلوص ہوتا ہے۔ "اجتماعیت پسند" طالب علم عموماً یونیورسٹی کے قیام کے زمانے میں اپنے سیاسی خیالات نہیں بدلتے کیونکہ اس میں وہ اپنی ذلت سمجھتے ہیں مگر آکسفورڈ سے جانے کے بعد جب یہ دور گذر جاتا ہے تو یا تو سرے سے سیاست ہی سے قطع تعلق کر لیتے ہیں یا آزاد (انڈپنڈنٹ) جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں اور مناسب موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ دونوں قدیم پارٹیوں میں سے کسی میں داخل ہو جائیں۔

آکسفورڈ میں "اجتماعیت پسند پارٹی" کی معقول تعداد ہے۔ بات یہ ہے کہ جو نوجوان اسکول سے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں انھیں ایک تو پہلے پہل کی آزادی کا نشہ ہوتا ہے، دوسرے ان میں ایثار کا فطری مادہ ہوتا ہے اور اس پر

طرّہ یہ کہ بلوغ کا عارضی ہیجان شامل ہو جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کے مل جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اجتماعیت پسندی کے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔

لوگ ان عارضی دوروں کی اہمیت پر زور دیتے ہیں جو یونیورسٹی کے طلبا کی زندگی میں گذرتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ آکسفورڈ میں نوجوان جو بے اعتدالیاں کرتے ہیں ان کا سبب یہی چیزیں ہیں۔ خواہ کٹّر قدامت پسندی ہو یا جذبات پرستانہ حرّیت پسندی یا اجتماعیت یا اشتراکیت ان سب کے عموماً محض عارضی دور ہوتے ہیں۔ عینیت کی جتنی شدت یونیورسٹی کے نوجوانوں میں ہوتی ہے کسی میں نہیں ہوتی۔

آکسفورڈ میں ایک اور سیاسی گروہ ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ ان کا ذہن ہر قسم کے خیالات قبول کرنے کے لئے مستعد ہے۔ یہ محض غلط ہے ان لوگوں میں سرے سے ذہن کا وجود ہی نہیں۔

ممکن ہے کہ پُرانے تجربہ کار لوگ نوجوان اہل سیاست کو اور ان کے ادّعائی خیالات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوں، ان کے عارضی دوروں کو مضحک سمجھتے ہوں اور آکسفورڈ کے سیاست پسند طلبا کے مخصوص متکبرانہ انداز سے خفا ہوں لیکن انھیں ڈزرائیلی کے یہ الفاظ یاد رکھنا چاہئیں "کہ نوجوانوں کے جذبات کی تنقید میں نرمی کرنا چاہیئے ہر شخص کو حق ہے کہ جب تک وہ کامیاب نہ ہو جائے اس وقت تک مغرور رہے"

(ف۔ مرتھ ویٹ ہو۔ رسالہ فائین ٹینتھ سنچری)

کیمبرج کے طلبا کی سیاست

(ایک کیمبرج کے انڈر گریجویٹ کے قلم سے)

کیا یونیورسٹی کے طلبا بھی کوئی سیاسی خیالات رکھتے ہیں؟ اگر رکھتے ہیں تو وہ کیا خیالات ہیں؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یونیورسٹی کے طلبا کو چار گروہوں میں تقسیم کریں۔ (۱) سیاست سے دلچسپی نہ رکھنے والے (۲) قدامت پسند (کنسرویٹو) (۳) حریت پسند (لبرل) (۴) اجتماعیت پسند (سوشلسٹ)

ہم پہلے یونیورسٹی کی سیاسی پارٹیوں کی تنظیم دکھائیں گے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی جدوجہد کا ذکر کریں گے اور آخر میں (خواہ منطقی ترتیب سے یہ صحیح نہ ہو) ان خیالات و مقاصد پر روشنی ڈالیں گے جن سے ان پارٹیوں کے ارکان متاثر ہیں۔

ہمارے بیان کا بڑا حصّہ اجتماعیت پسندوں کے ذکر کے لئے وقف ہوگا جن کی تعداد بہت کم ہے اس لئے یہ مضمون بظاہر صحیح توازن سے خالی نظر آئے گا۔ مگر ہمارا عذر یہ ہے کہ سوائے ان لوگوں کے اور کسی کا سماجی مقصد اور سیاسی نصب العین اس قدر واضح، مربوط اور مکمل نہیں ہے۔ مثلاً اگر مجھے یونیورسٹی کی مذہبی حالت کرنا ہوتا تو میں انگلستان کے کیتھولک فرقہ اور اسی طرح کویکر جماعت کے ذکر میں طول دیتا کیونکہ اور ہر مذہب کے مقابلے میں مقدم الذکر کے عقائد زیادہ مفصل اور واضح ہیں اور موخر الذکر کا اخلاقی دستور العمل زیادہ خالص اور سخت ہے۔

پہلے ہم ان لوگوں کا ذکر کریں گے جنھیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس عنوان کے تحت میں طلبا کی غالب تعداد آتی ہے جو نہ کوئی سیاسی انجمن رکھتے ہیں نہ کسی سیاسی جدوجہد میں شریک ہوتے ہیں اور نہ اپنی زندگی کو کسی سیاسی یا مذہبی نصب العین کا تابع بناتے ہیں۔ بعض لوگ شاندار "بٹ کلب" میں روپیہ برباد کرتے

ہیں بعض کتّوں سے لومڑی کا شکار اور بندوق سے چڑیوں کا شکار کرتے ہیں اور موٹر کار چلاتے ہیں، بعض "شاہی ٹینس" سے لیکر رگبی فوٹ بال تک ہر طرح کے کھیل کھیلا کرتے ہیں اور بعض یونیورسٹی سے "معمولی" سندلے کر نکلتے ہیں اور اس پر فخر کیا کرتے ہیں کہ ہمارا طرز معاشرت بالکل اپنے آباواجداد کے قدم بقدم رہا۔

پچھلے سال کے آخر میں یونیورسٹی میں پانچ ہزار طلبا تھے۔ ان میں سے اگر سیاسی جماعت کے چیدہ لوگ شمار کئے جاتے جن میں سماجی احساس موجود ہو اور جنھوں نے نوع انسانی کی زندگی پر عموماً اور اپنے ملک کی حالت پر خصوصاً غور کرکے اپنے لئے ایک طریق عمل کا انتخاب کیا ہے تو ان کی تعداد ڈیڑھ سو زیادہ نہ نکلتی۔ علاوہ ان کے معدودے چند لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف مذہبی فرقوں سے عملی تعلق رکھتے ہیں۔

سیاست وغیرہ سے دلچسپی نہ رکھنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ اب ہم اختصار کے ساتھ سیاسی جماعتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

قدامت پسند جماعت میں پچھلے سال کے آغاز میں ۴۰۰ ممبر تھے اور کہا جاتا تھا کہ اتنی زیادہ تعداد آج تک کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ان میں سے چند لوگوں کو چھوڑکر باقی سب محض اسی لئے اس جماعت میں داخل ہوتے ہیں کہ سالانہ ڈنر میں شرکت کریں جس میں ۱۹۲۶ء میں وزیراعظم اور ۱۹۲۷ء میں لارڈ برکن ہیڈ مہمان تھے یا اس لئے کہ نقرئی رنگ کی ارغوانی دھاریوں والی نکٹائی باندھ سکیں یا اس لئے کہ ان کے والدین بھی قدامت پسند تھے اور چندہ صرف پانچ شلنگ سالانہ ہے۔

حریت پسند کلب میں تقریباً ایک سو چالیس ممبر ہیں جن میں سے ۴۰ تو اساتذہ اور منتظمین یونیورسٹی میں سے ہیں، بہت سے اس لئے شامل ہو گئے ہیں کہ ان کے والدین بھی حریت پسند تھے اور زیادہ' سے زیادہ چالیس سنجیدہ ارباب سیاست ہیں

اب یہ سوال ہے کہ اس پارٹی میں کیوں شامل ہوئے ہیں - یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس یونیورسٹی میں صرف ایک خاص طبقے کے طلبا آتے ہیں اور اس طبقے میں صرف دو قدیم پارٹیاں ہیں اس لئے جو لوگ اصلاح کا جذبہ رکھتے ہیں وہ قدرتاً حریت پسند پارٹی کی طرف کھنچتے ہیں - علاوہ اس کے بہت سے نوجوان واضح اور مستحکم اصول سے اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنے کسی شخصیت سے اور ان لوگوں کیلئے لائڈ جارج کی نظروں کو خیرہ کرنے والی ذات بہت کافی ہے - اب وہ چند افراد جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں ان کے لئے اس پارٹی میں یہ کشش ہے کہ اس کی پالیسی زراعت اور کان کنی کی صنعت کے بارے میں صاف ہے اور اس کے پیش نظر اس کمیٹی کی رپورٹ بھی ہے جو صنعت حرفت کی عام تحقیقات کے لئے مقرر ہوئی تھی - ان سب چیزوں سے ملکر ایک خاص وسیع سماجی پالیسی بنتی ہے جس کے بانی سر ہربرٹ سیموئل جیسے شخص ہیں جن کی وقّت نظر اور انتظامی قابلیت پر سب کو اعتبار ہے -

اجتماعیت پسند جماعت یعنی لیبر کلب میں ایک سو ساٹھ ممبر ہیں - یہ تعداد اس لحاظ سے حیرت انگیز ہے کہ اس یونیورسٹی کے طلبا سب کے سب اونچے طبقوں کے ہوتے ہیں - لیکن ہمیں یہ مدنظر رکھنا چاہئے کہ یونیورسٹی کا زمانہ طلبا کے شباب کی بہار ہے جس میں عینیت کی گرم بازاری ہوتی ہے تخیل پرستی اور انقلاب پسندی کے طوفان اٹھتے ہیں اور مارکس اور لینن کی آواز دل کو تڑپا دیتی ہے - زیادہ تر تو لوگ اس پارٹی میں اس لئے شامل ہوتے ہیں کہ مزدوروں کی مصیبتوں کو دیکھ کر ان کے دل میں ایک دھندلا سا ہمدردی کا جذبہ اٹھتا ہے یا سماجی ظلم و تشدد کے مشاہدے سے غم و غصہ کا ایک غیر معین احساس پیدا ہوتا ہے لیکن تھوڑے سے ایسے بھی ہیں جن کے ذہن میں واضح اور معیّن خیالات موجود ہیں اور ہمیں صرف انھیں لوگوں سے مطلب ہے -

ان سب کے علاوہ ایک مخلوط انجمن کمبرج یونین سوسائٹی ہے جس کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ اپنے اراکین کے لئے پر تکلف دعوتوں کا اور لکھنے پڑھنے کے کمرے کا انتظام کرے اور ضمناً بحث مباحثہ کے جلسے بھی کرے۔

گزشتہ سال تعلیم کے آخر میں اس انجمن کے ۲۴۰۰ ممبر تھے یعنی تقریباً یونیورسٹی کے نصف طلبا (لڑکیاں اس میں داخل نہیں ہوسکتیں اس لئے ان کا شمار نہیں) بہت بڑی تعداد اس کلب کو اس لئے پسند کرتی ہے کہ وہاں ہر طرح کا آرام ملتا ہے۔ ہفتہ وار مباحثوں میں بہت کم لوگ شریک ہوتے ہیں۔

ان مباحثوں میں انگلستان کے بہت سے مشاہیر شریک ہوتے ہیں جو صنعت و حرفت میں، یا قانون میں یا سیاست میں یا کلیسا میں یا علوم و فنون میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ٹرم میں پچاس فیصدی جلسوں میں ان لوگوں کی تقریریں ہوتی ہیں جتنی غالباً نہ ہونا چاہئیں کیونکہ اس سے طلبا کی قابلیت کو نشو و نما کا موقع نہیں ملتا۔ موجودہ صورت میں یونین سنجیدہ بحث کی جگہ نہیں ہے۔ وہاں نہ سیاسی اصول کی حمایت ہوتی ہے نہ مخالفت نہ مجادلہ نہ تبادلۂ خیالات۔ اس کا سبب ہمارے خیال میں یہ ہے کہ اکثر انڈر گریجویٹ مقرّروں کا مقصد بس اتنا ہوتا ہے کہ مجلس انتظامیہ اور چھوٹے عہدوں کے زینے سے تخت صدارت تک پہنچیں اسی لئے ان کی تقریر کا ڈھنگ یہ ہوتا ہے کہ آورد سے کام لیں اور زبردستی لطیفے تراشیں تاکہ سامعین پر اثر پڑے اور آئندہ انتخابات کے موقعہ پر انھیں زیادہ ووٹ ملیں۔

اس لئے یونین میں فرد اپنے ضمیر اور اپنے عقائد کا اظہار نہیں کرسکتا۔ یہ وہ جگہ نہیں جہاں ملک کے لیڈروں کی تربیت ہو بلکہ ایک اکھاڑا ہے جہاں "عہدوں" کے لئے کشتی ہوتی ہے۔ اس سے یہ بُرا نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف وہ لوگ جو سنجیدہ بھی ہیں اور خاص قابلیت بھی رکھتے ہیں یونین میں امتیاز حاصل کرتے

ہیں لیکن بہت سے سنجیدہ لوگوں کو زبان کھولنے کا موقع نہیں ملتا۔

غرض یونیورسٹی میں سیاسی انجمنیں اور پارٹیاں ہیں۔ ان کی جدوجہد میں باہم بہت مشابہت ہے۔ عام انتخابات کے زمانے میں ہر کلب میں ایک برقی لہر سی دوڑ جاتی ہے علاوہ اس کے بلدیہ کیمبرج کے انتخابات اور دوسرے مقامی انتخابات دلچسپی کا ذریعہ ہیں پھر ہر پارٹی ہفتے میں ایک بار کسی مشہور مقرر کو بلاتی ہے اور متھیو تھرسٹن یا ڈوروتھی قہوہ خانے میں ایک بڑا جلسہ ہوتا ہے۔ اور یوں تو روزمرّہ کالج کے کمروں میں آتش دان کے گرد پرجوش نوجوان جمع رہتے ہیں اور ہر طرح کے سماجی مسئلہ پر جو انسان کو تشویش میں ڈالتا ہے بحث ہوا کرتی ہے۔

اب ہمارے مضمون کا آخری حصّہ رہ گیا ہے جس میں ہم یہ دکھلانے کی کوشش کریں گے کہ ہر سیاسی پارٹی کن خیالات سے متاثر ہے۔

ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ سیاسی کلب میں صرف معدودے چند لوگوں میں سیاسی احساس موجود ہے۔ قدامت پسند پارٹی کے ۷۰۰ ممبروں میں زیادہ سے زیادہ ۳۰ عملی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر "نوجوان قدامت پسندوں"، مثلاً کپتان میکملن، ڈف کوپر، اسٹینلے اور میجر ہلز کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ "نئی جمہوریت" کے اصول کے قائل ہیں جو بنجامن ڈزرائیلی کے جیّد دماغ سے نکلا تھا جس کا منشا یہ ہے کہ بہی خواہ ملّت قدامت پسند امرا کے ماتحت بہت آہستہ آہستہ سماجی اصلاح ہو۔ بعض کھلے ہوتے رجعت پسند ہیں اور چرچل، لارڈ برکن ہیڈ اور مسز ڈبلیو۔ جوائنسن ہکس کے مقلّد ہیں بلکہ کمانڈر لارڈ ٹیمپسن کے ہمزبان ہو کر یہ نعرہ بھی بلند کرتے ہیں کہ "نکال دو بالشویکوں کو"۔

حرّیت پسند جماعت زیادہ توجہ کی مستحق ہے کیونکہ وہ اپنے قدامت پسند حریفوں کے مقابلے میں زیادہ واضح اور زیادہ مکمل اصلاحی خیالات رکھتے ہیں اور سچ پوچھئے تو حرّیت پسندوں کی باضابطہ پالیسی میں اور لیبر پارٹی کی باضابطہ پالیسی میں کوئی اصولی

اختلاف نہیں - حریّت پسند کہتے ہیں کہ ریاست جب موجودہ مالکان اراضی کو معاوضہ دیدے گی تو بلاشراکت غیرے ساری زمین قابض ہو جائے گی اور کاشتکار یا کان کھودنے والی کمپنیاں اس کی آسامی بن جائیں گی - ہر عہد کی حکومت جس کی رائے ہمیشہ انتخاب کنندوں کی تابع ہے اس نئے اقتصادی نظام کی مالک ہوگی اور تمام مزدوروں سے کام لینا اوران کو اجرت دینا اسی کا کام ہوگا - ظاہر ہے کہ یہ انھیں عقائد سے ماخوذ ہے جن کی تلقین ویب اوران کی زوجہ برنارڈ ہنشا اور پروفیسر گریہم ولیس عرصے سے کر رہے ہیں یعنی "ریاستی اجتماعیت پسندی" کے عقائد سے -

یہ ہے "نئی حریّت پسندی" اور یہ پرانی انیسویں صدی والی حریّت پسندی یعنی "عدم مداخلت" کے اصول کے بالکل برعکس ہے جس نے تمام دنیا میں انگلستان کی صنعتی حکومت قائم کردی تھی - اصل میں یہ "نئی حریّت پسندی" اس عظیم الشان مادّی مرفہ الحالی کے سبب سے وجود میں آئی جو قدیم "حریّت پسندی" نے پیدا کردی تھی کیونکہ اسی موخرالذکر پالیسی کی بدولت بہت سی خرابیاں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں مثلاً مزدوروں سے ناجائز انتفاع، بیکاری کی شدید تکالیف اور سارا ظلم و فساد جو غیر محدود مقابلے سے پیدا ہوتا ہے - نوع انسانی کی تکالیف کو دیکھ کر لوگوں نے ہر طرف سے "ریاست کی مداخلت" کا مطالبہ کرنا شروع کیا یہاں تک کہ اب یہ اصرار ہے کہ صنعت و حرفت پر جمہوری حکومت کا کامل تصرف ہونا چاہیئے جس کے معنی یہ ہیں کہ انفرادی مطلق العنانی کو روکنے کی غرض سے انفرادی آزادی قربان کی جارہی ہے -

اب رہے فیبین اجتماعیت پسند، "پیشہ وربرادری" (گلڈ) کے قائل اجتماعیت پسند اور اشتراکی ان سب کے خیالات ہم ترتیب وار بیان کریں گے -

(الف) فیبین اجتماعیت پسند - اس مذہب کے بانی ویب اوران کی بیوی برنارڈشا پروفیسر گریہم ولیس اور پروفیسر لاسکی ہیں - ان کے جو پیرو یونیورسٹی میں ہیں

وہ اپنے آپ کو "ریاستی اجتماعیت پسند" کہتے ہیں - مگر دوسرے اجتماعیت پسندوں نے جو انفرادی ملک کے قائل نہیں ہیں ان کا نام "ریاستی سرمایہ دار" رکھا ہے - ان کا عقیدہ وہی ہے جو جدید حرّیت پسندوں کا ہے - وہ ایسی سماج چاہتے ہیں جس میں ریاست سارے سرمایہ کی مالک ہو اور تمام مزدوروں سے کام لیتی ہو لیکن ان کا طریقہ کار دوسرا ہے - ان کا قصد یہ ہے کہ جیسے ہی سیاسی قوّت ان کے ہاتھ میں آئے وہ زمین، صنعت وحرفت اور بنکوں کو ریاست کی ملک قرار دے دیں اور ان میں سے بعض اس کے لئے بھی تیار نہیں کہ اس طرح کی املاک کے مالکوں کو کوئی معاوضہ دیں -

(ب) "پیشہ ور برادری" کے قائل اجتماعیت پسند - اس مذہب کے بانی - جی - ڈی - ایچ کول ہیں - ان کا مقصد ریاستی اجتماعیت پسندوں سے بالکل مختلف ہے - ان کے نظام کا مرکز فرد کی آزادی ہے - وہ کہتے ہیں کہ فرد ریاست سے قدیم تر اور بالاتر ہے - اسے جمہوری حاکموں کی اغراض کا آلہ کار نہیں بنانا چاہیئے - اس لئے سماج کی ساری تنظیم کو انفرادی آزادی اور انفرادی ضرورت کے معیار پر جانچنا چاہیئے -

چونکہ ہر فرد اپنی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی شخصیت کی نشوونما کے لئے اپنے بنی نوع کی صحبت کا محتاج ہے اس لئے سماج کو بہت سی انجمنوں کا جال بنا دینا چاہیئے جن میں آپس میں ربط ہو اور جن میں سے ہر ایک کا کوئی واضح اور معیّن مقصد ہو -

ہر انجمن، خواہ وہ تعلیمی ہو یا سیاسی یا اقتصادی یا کسی خاص پیشے سے متعلق ہر جگہ ایک "برادری" کی صورت میں رہے اور تمام ملک کی ایک قسم کی انجمنوں سے ملکر ایک "قومی برادری" قایم ہو - علاوہ ان کے افراد بہ حیثیت مجموعی ایک قومی برادری بنائیں جو اپنی ضرورت کے مطابق پیداوار کا بندوبست کرے - اسی طرح افراد بہ حیثیت شہریوں کے ایک قومی برادری میں منسلک ہوں جو ریاست کہلائے - اس اصول کے مطابق ریاست کے کام کی اہمیت تو بڑھ جائے گی لیکن اس کے اختیارات ایک اور ملک کی

تاریخی ارتقا کے مطابق ہونا چاہیئے - موجودہ سماج میں "سرمایہ داری" یعنی پیداوار تقسیم اور تبادلہ کے ذرائع کا چند افراد کے ہاتھ میں ہونا اکثر لوگوں کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں آزادی کی راہیں مسدود کردیتا ہے اور یہ غلامی امرا کے بنائے ہوئے قانون اور امرا کی ریاست کی بدولت قایم ہے - یہاں تک تو برادری کے قائل اجتماعیت پسندوں اور اشتراکیوں کی رائے متفق ہے - لیکن اشتراکیت پسند پارٹی تو یہ چاہتی ہے کہ مزدوروں کے لوٹنے والوں یعنی سرمایہ داروں سے ان کی املاک بہ زور شمشیر چھین لے اور امرا کی ریاست ایک زبردست اور خوف ناک انقلاب کے ذریعے بالکل برباد کردے لیکن برادری کے قائل اجتماعیت پسندوں کا مقصد یہ ہے کہ مزدوروں کی تحریک پرامن طریقے سے چپ چاپ "سرمایہ داری" کو مغلوب کرلے اور جدید ریاست کو آہستہ آہستہ اقتصادی نظام میں تبدیل کردے -

ان کا عقیدہ ہے کہ مزدوروں کی انجمنیں آہستہ آہستہ تمام ملک میں "حصّہ داروں" کو بیدخل کردیں گی اور اس طرح امیر اور غریب اجرت دہندہ اور مزدور کا امتیاز مٹ جائے گا اور ہر صنعت کا نظم ونسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو اس میں کام کرتے ہیں - اسی طرح "امداد باہمی کی تحریک" بیچ کے تھوک فروشوں اور خوردہ فروشوں کو بے دخل کردے گی -

لندن کے "معماروں کی برادری" اور "انجمن ہائے اتحاد باہمی" اجتماعیت کے آفتاب کی پہلی کرنوں کی طرح اس ملک میں روشنی پھیلا رہی ہیں جس میں اب تک سرمایہ داری کی شب تار کا دور دورہ ہے -

(ج) اشتراکی - جدید اشتراکیت کے خاص ماخذ جید فلسفی کارل مارکس کے خیالات اور جلیل القدر انقلاب پسند واڈیمیر لینن کی تصانیف اور ۱۹۱۷ء کی روسی

انقلاب کے تجربات اور اس کے بعد کے حالات ہیں۔ . . . .

ہم نے یہ مضمون تنقیدی نقطۂ نظر سے نہیں لکھا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ نہایت اختصار کے ساتھ ہر پارٹی کے متعلق اظہار رائے کریں۔ ہمیں صرف چار باتوں کی طرف توجہ دلانا ہے (۱) "ریاستی اجتماعیت پسند" اصل میں سرمایہ داری کے حامی اور انفرادی ملک کے قائل ہیں۔ انھوں نے محض اپنا نام بدل لیا ہے۔ (۲) "برادری" کے قائل اجتماعیت پسند تنگ خیالی کے ساتھ قومیت کے حامی ہیں حالانکہ آج دنیا کی تاریخ میں پہلی بار بنی نوع انسان میں اقتصادی اتحاد پیدا ہو رہا ہے۔ (۳) اشتراکیوں کے یہاں ہر چیز کا دارومدار انقلاب پر ہے جس میں اصلاح کا بھی امکان ہے۔ اور بربادی کا بھی (۴) ان کے خیالات میں ایک خاص طبقہ کے اغراض اور اخلاقی نصب العین میں جو تعلق ہے وہ ذہنی اعتبار سے بالکل ناجائز ہے۔

اگر ہم نے کیمبرج یونیورسٹی کی سیاست کا صحیح نقشہ پیش کر دیا ہے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

"انیس مور" (رسالہ نائنٹینتھ سینچری)

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے معاملات کی تحقیقات کرنے کے لئے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اس نے اپنی رپورٹ شائع کر دی۔ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب پرو وائس چانسلر نے اندرونی اختلافات کو دور کرنے اور اصلاح کا پورا موقع دینے کے لئے استعفا دیدیا۔ مسٹر وولنر پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور نے ڈھائی مہینہ علیگڈھ میں رہ کر کمیٹی کی اصلاحی تجاویز کو باضابطہ مرتب کر دیا اور یہ تصریح کر دی کہ کون کون تجاویز مجلس انتظامیہ کے سامنے پیش ہوں گی۔ کون مجلس امنار (کورٹ) کے سامنے، اور کونسی ترمیمات دستور مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے اسمبلی کی منظوری کے لئے بھیجی جائیں گی۔ یہ سب ہوا لیکن ارباب اختیار نے نہ اب تک کوئی اسپیشل آفیسر مقرر کیا اور نہ عام مسلمانوں اور حامیان یونیورسٹی کی تسکین کے لئے کوئی اطلاع شائع کی کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

اسکا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں اور یونیورسٹی بے وجہ بدنام ہو رہی ہے۔ علیگڈھ کی اسلامی تعلیم گاہ میں جو خرابیاں اب تک پیدا ہوئیں انکا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ یونیورسٹی کا رشتہ تعلق رائے عامہ سے یہانتک کہ "علیگڈھ برادری" سے بھی منقطع ہو گیا تھا۔ تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر سے اگر کچھ تسکین ہوئی تھی تو یہی کہ اصلاحات کے معاملے میں ان لوگوں سے رائے لی جائے گی جنہوں نے علیگڈھ میں تعلیم پائی ہے یا جو اس سے دلی محبت رکھتے ہیں۔ اور اسکی اصلاح و ترقی کے دل سے آرزو مند ہیں۔ پچھلے نو دس مہینوں میں ان لوگوں نے اور تعلیم مسلمین کے دوسرے حامیوں نے کمیشن کے سامنے شہادتیں دے کر اخبارات میں مضامین لکھکر اور جلسے منعقد کرکے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ مگر آخری فیصلے میں اس قدر دیر ہو رہی ہے کہ لوگوں کو پھر شکایت پیدا ہو گئی ہے ہم علیا حضرت پالمہ

صاحبہ سے درخواست کرتے ہیں کہ کمیٹی کی تجاویز پر جو آخری رائے قائم ہوئی ہے اُس سے حامیان علیگڈھ کو مطلع فرمائیں اور اُنکے جذبات وخیالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصلاحی تجاویز عمل میں لائیں تاکہ علی گڈھ کے فرزندوں اور بہی خواہوں کو جو اعتماد واطمینان پیدا ہو چلا ہے وہ پھر بے اعتمادی اور بے چینی میں تبدیل نہ ہو جائے۔

نئے تعلیمی طریقوں اور اصول تعلیم کو علمی نقطۂ نظر سے مرتب کرنے کے لئے اس زمانہ میں جابجا کوششیں کی جارہی ہیں۔ ان تعلیمی تجربات میں صوبجات متحدہ امریکہ کو نہ صرف فخر تقدم حاصل ہے بلکہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کام بھی وہیں کیا گیا ہے۔ ذہنی اور دماغی "میزانوں" (tests) کی ابتدا تو فرانس میں ہوئی لیکن انکی ترقی اور استعمال وہاں سے کہیں زیادہ امریکہ میں ہوا۔ اسی تحریک سے وہاں تعلیمی تجربات کا زور شور کے ساتھ آغاز ہوا۔ اور مختلف طریقوں سے یہ کوشش کی گئی اور کیا رہی ہے کہ تعلیم عامہ کو زیادہ مفید اور موثر بنانے کے لئے تمام روایتی اور قدیم طریقوں، اصول اور مبادیات کو جو آج تک مسلمہ سمجھے گئے ہیں تجربہ اور زمانہ کی کسوٹی پر جانچا جائے اور ان میں سے صرف انہیں کو قائم رکھا جائے جو اس آزمایش میں پورے اتریں۔

حال میں اوہیو (Ohio) یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ایچ بی چیپ مین (Chapman) نے ایک رسالہ "فن تعلیم کے متعلق باضابطہ تحقیقات علمی" شائع کیا ہے جس میں انہوں نے امریکہ کے ایک سو چار علمی اداروں کا ذکر کیا ہے جو ایک بڑی حد تک تعاون عمل کے ساتھ تعلیم کے مختلف پہلوؤں اور مسائل کے متعلق تحقیقات کرتے رہتے ہیں اور نتائج کو دوسروں کی آگاہی کیلئے مضامین اور کتابوں کی شکل میں شائع کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق یونیورسٹیوں سے ہے، بعض کا میونسپلٹیوں سے اور بعض کا ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں سے۔ بلدیہ کی

تعلیم کی نگرانی اور اصلاح میں بالعموم بلدیہ کے اداروں کو کافی دخل ہوتا ہے اور وہ نئے لیکن آزمودہ طریقوں اور تعلیمی تجربوں کو بلدیہ کے اسکولوں میں اپنی نگرانی میں چلاتی ہیں یونیورسٹی کے تعلیمی محکمے زیادہ مشکل اور دقیق مسائل پر تحقیقات کرتے ہیں۔ ان کے فرائض مختلف ہیں۔ بعض اسکولوں کی عام اصلاح کو پیش نظر رکھتے ہیں بعض ان خاص، اصطلاحی مسائل کے حل کرنے میں اساتذہ کو مدد دیتے ہیں جو انکے سامنے لائے جاتے ہیں، بعض غیر معمولی قابلیت یا طبعیت یا فطرت کے بچوں کا باقاعدہ نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اور مفید کام کرنے والے اداروں میں ایک تو نیویارک کا "ادارہ تجربات تعلیمی" ہے دوسرا واشنگٹن کا سرکاری "ادارہ تعلیمی"، تیسرا "قومی انجمن تعلیم" کا "محکمہ تحقیقات"، اور چوتھا کولمبیا یونیورسٹی کے ٹرننگ کالج کا بین الاقوامی ادارہ"۔ انہوں نے تعلیم کے بہت سے مسائل پر اپنی تحقیقات سے روشنی ڈالی ہے۔ اور اپنے ملک کے مدارس کو نفسیات اطفال سے زیادہ ہم آہنگ بنا دیا ہے۔

کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اس قسم کا ایک بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ نہیں ہے! اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ علم ایسا نہیں ہیں کو ہم دوسروں سے مستعار لے سکیں۔ اس میدان میں ہم دوسروں کی محنت کا پھل نہیں کھا سکتے۔ کوئی قدر بھی جس کے اکتساب کے لئے دماغی یا روحانی جدوجہد کی ضرورت ہو۔ براہ راست ایک شخص سے دوسرے شخص کے پاس یا ایک قوم سے دوسری قوم کے پاس منتقل نہیں ہو سکتی۔ اور تعلیم کا نظام اس صداقت کی ایک نہایت نمایاں مثال ہے۔ خواہ تعلیم کے بنیادی اصول ہر زمان و مکان کے لئے ایک ہوں لیکن ان کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے زمان و مکان کی قیود اور مقامی حالات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اور پھر فروعات، طریقہ تعلیم، نفسیات اطفال کی تفصیل ان سب باتوں میں امریکہ کی تحقیقات سے ہم براہ راست کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ وہ بطور ترغیب عمل کے

یا منہاج تحقیق کو واضح کرنے کے یا خام مواد کے مفید ہیں اور بس۔ اچھی تعلیم کو زمانہ کی ضروریات اور فطرت انسانی کی دائمی آرزوؤں اور امکانات کے موافق بنانے کے لئے ہمیں اپنے ماحول، اپنے بچوں کی زندگی اور ذہنیت اور اپنے فلسفہ زندگی کا مطالعہ کرنیکی ضرورت ہے۔

البتہ امریکہ کی علمی تحقیقات کا حال پڑھکر اور اسکے نتائج دیکھ کر ہمیں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ انکے اکثر ماہرین تعلیم نے بقول انگریزوں کے درختوں پر اس قدر نظر جمائی ہے کہ جنگل انکی نظر سے پوشیدہ ہو گیا ہے یعنی وہ بسا اوقات اصطلاحی امور اور جزئیات کی تحقیق و تفتیش میں اس درجہ مصروف و منہمک ہو جاتے ہیں کہ تعلیم کے وسیع تر اور عمیق تر پہلوؤں پر غور کرنے کا انہیں موقع ہی نہیں ملتا۔ اور پھر رفتہ رفتہ انکو ان سے دلچسپی بھی نہیں رہتی۔ ذہنی قابلیتوں کی ناپ، تعلیم کے نتائج کو ریاضی کی مدد سے جانچنا، نصاب کو مرتب اور مدون کرنے کی کوشش طریقہ تعلیم کی تکمیل کے لئے تجربات کرنا۔ یہ سب باتیں مفید ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ سب ذریعہ ہیں ایک اعلیٰ تر مقصد کا یعنی تعلیم کو ارتقائے انسانی کا موثر آلہ کار بنانے اور ان تخلیقی قوتوں کی نشو و نما کا جو فطرت نے ہر انسان میں ودیعت کی ہیں تاکہ وہ ان کو خدمت خلق کے لیے استعمال کر سکیں۔ طریقہ تعلیم کی بحث اہم ضرور ہے۔ لیکن اس کی اہمیت ضمنی ہے۔ البتہ زندگی اور تعلیم کے نصب العین کی بحث ایک مستقل اور دائمی بحث ہے۔ ان قدور کو سمجھنا جو انسان کی ذات میں مضمر ہیں اور جن کو تعلیم کے ذریعے ظاہر کرنا ہے معلموں کا فرض اولین ہے۔ ایک انقلاب پذیر عالم میں، جہاں انسانی زندگی کا ماحول روز بدلتا رہتا ہے، اور انسانی ضروریات کی شکل مختلف ہوتی رہتی ہے۔ معلم کو اپنا توازن قائم رکھنا لازم ہے اور ان ابدی حقائق سے رشتہ جوڑنا ہے جو اس کو سیدھے راستہ پر قائم رکھیں۔

امریکہ تعلیم کے متعلق اصطلاحی تحقیقات میں دنیا کی راہبری کر رہا ہے۔ یورپ تعلیمی

تجربات میں پیش پیش ہو۔ لیکن تعلیم کے گہرے اور حقیقی انسانی مسائل پر ہندوستان اس طرح روشنی ڈال سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت ملے۔ اس کی قدیم اور مختلف اثرات سے مرکب تہذیب فلسفہ زندگی کے قیمتی حقائق سے مالا مال ہے۔ جس میں مختلف نسلوں اور مذاہب اور اقوام کا نقطہ نظر ایک حد تک ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ اس لئے ہمیں خاص طور پر تعلیم کے اس پہلو پر غور و فکر کرنیکی ضرورت ہو۔

لندن ٹائمز نے اپنے تعلیمی ضمیمے میں سائمن کمیشن کی تعلیمی کمیٹی کے متعلق اظہار رائے کیا ہے۔ یہ سن رسیدہ اخبار غالباً بہ تقاضائے مروت ارکان کمیشن کی بہت تعریف کرتا ہے لیکن کمیٹی کے کام سے جو نتائج حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اُنکے بارے میں صاف گوئی کو قرین مصلحت سمجھتا ہے اس کی رائے ہے کہ ہندوستان کی تعلیمی اصلاح اور خصوصاً تعلیم کا عام کرنا تقریباً ناممکن چیز ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ لارڈ کرزن نے اپنی حکومت کے زمانہ میں شملہ میں ایک کانفرنس منعقد کی تھی کہ ابتدائی تعلیم کو عام کرنیکی تدابیر پر غور کیا جائے۔ کانفرنس میں محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام اور یونیورسٹیوں کے نمائندے بلائے گئے تھے۔ پورے پندرہ دن یہ کانفرنس صبح سے شام تک غور کرتی رہی اور اُس نے ڈیڑھ سو ریزولیوشن منظور کئے۔ جن کا مسودہ وائسرائے نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ وزیر ہند نے وائسرائے کو مبارکباد کا تار بھیجا کہ انہوں نے اتنی زحمت برداشت کی اور اتنا بڑا کام انجام دیا لیکن ہمارے معصر کو سخت افسوس ہے کہ اس کوہ کندن کا نتیجہ کاہ برآوردن بھی تو نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں کس برتے پر کہا جائے کہ سائمن کمیٹی کی مساعی بارآور ہونگی۔

ہم کو یہ دعوےٰ نہیں کہ ہم لنڈن ٹائمز سے زیادہ ہندوستان سے واقفیت رکھتے ہیں کیونکہ ہماری معلومات دیکھی سنی باتوں پر مبنی ہے اور ہمارے معصر کو براہ راست اپنے نامہ نگار

سے اطلاع ملتی ہے لیکن اپنے خیال کے اظہار کرنے میں ہم کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

یوں تو کسی ملک میں کوئی اصلاحی کام اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا۔ جب تک اس کے عام باشندوں میں اصلاح کی ضرورت کا احساس نہ پیدا ہو جائے اور وہ اتحاد عمل پر تیار نہ ہوں مگر ابتدائی تعلیم کا معاملہ خصوصًا ایسا ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت نہ اس کے مصارف برداشت کر سکتی ہے۔ اور نہ اسکا پورا اور معقول انتظام کر سکتی ہے۔ جن ملکوں میں ابتدائی تعلیم عام ہے ان سب میں ہر گاؤں یا شہر کے ہر محلہ کا مدرسہ مقامی پنچایت کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ وہی لوگ اس کے مصارف کا بڑا حصہ فراہم کرتے ہیں اور وہی لوگ اسکا انتظام اپنی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ حکومت کا محکمہ تعلیم ان لوگوں کی تھوڑی بہت مالی اعانت کرتا ہے اور تعلیمی یا انتظامی امور میں حسب ضرورت مشورہ اور مدد دیتا ہے۔ وہاں کسی کو خواب میں بھی یہ نہیں سوجھتی کہ ابتدائی تعلیم کے مسائل پر غور کرنے کے لئے مرکز حکومت میں کانفرنس کرے جس میں "اعلیٰ حکام" اور "یونیورسٹی" کے نمائندے بلائے جائیں جن میں سے اکثر نے تمام عمر میں کسی ابتدائی مدرسہ کی صورت بھی نہیں دیکھی ہوگی اور وہ تمام ملک کے لئے ایک ہی طریق کار معین کر دیں جو مقامی حالات سے قطعی ناواقفیت پر مبنی ہو۔ یا تعلیم جیسے اہم طلب مسئلے کو آئینی اصلاحات کے قیامت خیز ہنگامے کے ساتھ نتھی کر دیں۔

تعلیم و تربیت

جلد (۱) اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء مطابق جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۷ھ نمبر (۴)

فہرست مضامین

مضامینِ خاص

مدرّسوں کی تعلیم

(از "روحِ مُعلّم" مصنفہ جارج کیرشن اشٹائینر)

پہلی بنیادی شرط جس شخص کو خدا نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ناسمجھ بچّے کا جو ذہنی اور اخلاقی نشوونما کی حالت میں ہوتا ہے، مُعلّم بنے اُس کی سرشت میں نوعِ انسانی کی محبت ہوتی ہے۔ خود اُس کی ذات اور اُس کی نشوونما کا بنیادی قانون روحانی محبت ہے۔

تعلیم کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس سے ہمیں خلقی اُنس ہو اُس کی سیرت کی تشکیل کریں۔ ہم میں قدرت نہیں کہ کوئی نئی چیز پیدا کریں یعنی صورت آفریں صنّاع کی طرح نئی صورتیں بنائیں۔ ہم تو صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ بچے کے ذہن میں جو صلاحیتیں خوابیدہ ہیں اُنھیں بیدار کریں، ترقی دیں، قوت پہونچائیں۔ اگر ہمیں محبت کی امانت ودیعت کی گئی ہے تو اپنی ذات کی تکمیل کی دور دراز منزل تک ہم صرف اُس راہ سے پہنچ سکتے ہیں جس پر چلنا ہمارے سماجی اندازِ طبیعت کے لحاظ سے مناسب اور ضروری ہے۔

مگر مدرّس اور مُعلّم کا قانونِ محبت ایک انوکھا قانون ہے اُسے بچّے سے اس لئے محبت ہوتی ہے کہ وہ آگے چل کر لازوال قدور کا حامل ہوگا۔ مذہب کی زبان میں اسے عشقِ مسیح یا عشقِ الٰہی کہیں گے ہم اسے روحانیت کی محبت یا سچّائی کی محبت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں یہ شخصیت کی تشکیل کا شوق ہے۔ قدرِ شخصیت رنگ برنگ شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے کبھی دو آدمیوں میں ایک سی نہیں ہوتی بلکہ ہر فرد میں ایک نیا انداز اختیار کرتی ہے۔ اس کی ہر شکل میں عالمِ قدور کے بے شمار جلووں میں سے ایک خاص جلوہ نظر آتا ہے۔ اس لئے مُعلّم بچّے سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ اُس کا ادب بھی کرتا ہے۔

ہمیں کب اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ محبت ہماری زندگی کا بنیادی قانون ہے یا نہیں ؟ یہ علم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ہم خود حامل قدور نہ ہو جائیں یا ہونے کی ابتدا، نہ کر دیں جب تک خود ہم میں اپنی ذات کو انسانی عظمت کی جلوہ گاہ بنانے کی آرزو نہ پیدا ہو جائے۔ اس منزل پر پہونچنے کے بعد ہمیں اپنی قدر کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دل میں بچوں سے وہ الفت اور ہمدردی اور اُن کی امداد کا وہ شوق ہے یا نہیں جو آگے چل کر معلمانہ محبت بن جائیگا اگر معلّموں اور مدرّسوں کے لیئے کوئی تربیت گاہ، کوئی ٹریننگ اسکول یا کالج بنانا ہے تو اس کی بنیاد اسی سماجی روح پر ہونا چاہیئے۔ دستور اساسی کی رُو سے وہ ایسی جماعت ہونا چاہیئے جس میں طلبہ مِل جُل کر رہیں اور مِل جُل کر کام کریں ہر طالب علم کو ازلی اور ابدی قدور کا احساس پیدا ہو، اور یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ اِن قدور کو بچّوں میں اُبھارنے اور ترقی دینے کا شوق اور صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ تربیت گاہ حقیقی معنوں میں "ہیومانسٹک جمنازیم" ("انسانیت" آموز تربیت گاہ) ہو گی اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ ظاہری شکل کے اعتبار سے بھی ہمارے ملک کے "جمنازیم" سے مشابہ نہ ہو جس میں یونانی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

علمی طبیعت کے لوگوں کی تربیت کے لیئے ہمارے یہاں مدارس موجود ہیں یعنی یہی جمنازیم جس میں یونانی اور لاطینی کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے، اور ریال شولہ جس میں لاطینی انگریزی، فرانسیسی، ریاضی اور سائنس سکھائی جاتی ہے اور یونیورسٹی۔

جمالیاتی طبیعت والوں کے لیئے دست کاری کے مدارس، فنونِ لطیفہ کے مدارس اور موسیقی، نقاشی اور سنگ تراشی کی یونیورسٹیاں قایم کی گئی ہیں۔

اقتصادی طبیعت والوں کے لیئے صنعتی مدارس، کاریگروں کے مدارس، تجارتی مدارس، زراعتی مدارس، صنعت و تجارت کی یونیورسٹیاں ہیں۔ لیکن سماجی طبیعت والوں کی تربیت کے لیئے ہمارے یہاں کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ محض نظری درس کے اعتبار سے کوئی مدرسہ سماجی

تربیت گاہ نہیں بن سکتا ورنہ ہم عورتوں کے سماجی مدارس کو اس نام سے موسوم کرتے۔ یہ بھی کافی نہیں کہ کسی مدرسے کے ساتھ ایک ایسا شعبہ ہو جس میں سماجی خدمت کی عملی مشق کیجائے ورنہ ہم اپنے پرانے ٹرننگ اسکولوں کا شمار سماجی تربیت گاہوں میں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ سماجی طبیعت والوں کی تربیت کے لیئے جو مدرسہ قایم کیا جائے اُس میں نظری درس اور عملی مشق کا ہونا بھی ضروری ہے لیکن اُس کی بنیادی خصوصیت ظاہری تعلیم و تربیت نہیں، بلکہ سماجی روح ہونا چاہیئے، جو طلبا اور طالبات متعلمین اور معلمات کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کردے۔ جس طرح علمی روح محض علمی حقائق میں، جمالیاتی روح محض آرٹ کے مظاہر میں، مذہبی روح محض دینی حلقوں، اداروں اور دیندار آدمیوں کی صحبت میں، پرورش اور نشوونما پاسکتی ہے۔ اسی طرح سماجی روح محض سماجی ماحول میں یعنی مشترک زندگی اُس کے اخلاقی، معاشرتی اور قانونی تعلقات میں پنپ سکتی ہے۔

مشترک زندگی اور مشترک عمل ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت کوئی مدرسہ سماجی تربیت گاہ بن سکتا ہے۔ ہم اپنی قوم میں مشترک سماجی یا سیاسی زندگی پیدا کرنے کے لیئے چاہے جتنی تقریریں کریں، مضامین لکھیں، قانون بنائیں، نصابِ تعلیم تیار کریں، اسکول بنائیں، اگر ہم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنے مدرسوں میں یا اُن میں سے بعض میں بجائے انفرادی خودپسندی کے سماجی خدمت، بجائے علمی اور عقلی یک رنگی کے عملی انسانی جامعیت، بجائے صحیح معلومات حاصل کرنے کے اس معلومات کے صحیح استعمال کی تعلیم دیں اُس وقت تک ہماری نام نہاد "اصلاح" محض خود فریبی ہے۔ اگر اس قسم کی اصلاح کسی آزاد قوم کو تمدنی موت سے بچانے کے لیئے سب مدرسوں میں ضروری ہے تو معلموں کی تربیت گاہوں میں اس کی ضرورت بدرجہا زیادہ ہے۔

معلم کی صفات میں سب سے اہم اور نازک صفت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی شخصیت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن اگر غور کیجیئے تو دوسروں کی شخصیت اصل میں خود اپنی شخصیت کا یعنی اُس نظام قدر کا ایک جزو ہے جسے ہم حاصل کر چکے ہیں یا حاصل کرنے

کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسروں کی اخلاقی خوبیوں کی قدر اُسی کو ہوتی ہے جس میں خود اخلاقی خوبیاں ہوں، دوسروں کی مذہبیت کو وہی سمجھتا ہے جس میں خود مذہبیت ہو جس میں خود ذوقِ جمال نہ ہوگا اُسے دوسروں کی بد مذاقی کا کیا احساس ہوگا جو خود آزاد اور عالی منش نہ ہوگا وہ دوسروں کو آزاد اور عالی منش بنانے کا کیا حوصلہ کریگا۔ غرض شخصیت کی قدر و رکا سمجھنا اور اُن کا احترام کرنا خود ہمارے ذاتی احساس قدر پر مبنی ہے۔ مگر یہ احساس قدر عقلی درس و تدریس کی خشک زمین پر نہیں پنپتا۔ اُس کی نشو ونما کے لیئے ضروری ہے کہ انسان کو اپنی مادّی زندگی کی بقا کے لیئے ہاتھ پیر مارنے کی آزادی ہو اور سماجی زندگی ہو جدّ و جہد کا وسیع اور گوناگوں تجربہ حاصل ہو۔ یہ سماجی زندگی ہمیں ہمیشہ اُکساتی رہتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو دوسروں کے آئینے میں دیکھیں اپنا اور اُن کا مقابلہ کریں اپنے متعلق صحیح رائے قایم کریں اور ادنے درجے کی زندگی پر قانع ہو کر نہ بیٹھ رہیں۔ ایک تربیت گاہ میں عملی زندگی کے گوناگوں اور وسیع تجربے کا اور دوسرے اخلاقی جد وجہد کرنے والوں سے میل جول کا موقع دیا جانا اس لیئے اور زیادہ ضروری ہے کہ مدرسے کے باہر اس کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ جو تربیت گاہ مشترک زندگی اور مشترک عمل کے اُصول پر قایم نہیں ہے وہ اصلی تربیت کو اتفاقات پر چھوڑ دیتی ہے اور محض ایک درس گاہ ہے۔

دوسری بنیادی شرط لیکن اگر کسی درس گاہ میں مشترک زندگی موجود ہے اور وہ ازلی اور ابدی قدور پر مبنی نہیں ہے تب بھی نام نہاد "اصلاحِ مدارس" محض خود فریبی ہے۔ اگر معلّم طالب علم کو قدور کا حامل بنانا چاہتا ہے تو یہ قدور ایسی ہونا چاہئیں جو زمان و مکان اور شخصی زندگی کے ماورا ہوں۔ کیا ایسی قدور کا وجود ہے؟ ہم یہاں نظریۂ قدور کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے بلکہ اختصار کے ساتھ محض اُن لوگوں سے خطاب کرنا چاہتے ہیں جن میں خارجی مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت ہے۔ کانٹ نے جو الفاظ عدل کے متعلق کہے ہیں، کہ اگر یہ ایک عالم گیر اور لازمانی قدر نہیں ہے تو نوعِ انسانی کی زندگی بے معنی ہے ان کی مصداق ساری ذہنی قدور ہیں۔ عدل، حق، حسنِ اخلاق، وفاداری، نیکی، رحم، حُسن، نجات وغیرہ وہ قدور ہیں جو انسان کی ذہنی فطرت میں ودیعت

کی گئی ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ انسانی تاریخ میں ہزار ہا مرتبہ افراد نے اور قوموں نے، حاکموں نے اور محکوموں نے ان قدور کی نفی کی ہے تو اس سے اُن کے واجب التعمیل ہونے کی ذرا بھی تردید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ کوئی زمانہ ایسا ہو جب یہ قدور کسی قوم کے افراد میں مفقود ہوں۔ لیکن اِس کے بعد وہ زمانہ بھی ضرور آئیگا جب ان کے نئے سرے سے زندہ ہونے کے جشن منائے جائینگے۔ تاریخ پرستی کا نظریہ جو ان قدور کو اعتباری قرار دیتا ہے اور انھیں فطری اجسام کی طرح تغیر پذیر اور فانی سمجھتا ہے اس غلطی میں اس لیئے مبتلا ہے کہ وہ ان مظاہر میں جن میں یہ قدور موجود ہوں اور خود ان قدور میں تمیز نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ مظاہر یعنی انفرادی حقایق، عدل و انصاف کے کام اور وفاداریاں اصل میں حق، عدل اور وفاداری کا عکس ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عکس تغیر پذیر ہوتا ہے لیکن خود عین میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خود ہمارے شعور کی ذہنی ترکیب کا جزو لاینفک ہے۔ یہ افلاطون کا قدیم نظریہ تھا اور کانٹ کا فلسفہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

اِن قدور کے غیر تغیر پذیر ہونے میں اور اُن کے حامل کے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہونے میں تو صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ یہ قدم مذہب ہے۔ قدور کا غیر تغیر پذیر اور لازمانی ہونا تو خود ہمارے شعور کی ترکیب پر غور کرنے سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اس لیئے جب کسی فرد کے شعور میں ان لازمانی یعنی ما فوق الافراد قدور کی حکومت ہو تو ضروری ہے کہ خود یہ فرد ما فوق الافراد اور لازمانی عقل کائنات، یعنی ذاتِ الٰہی کا ایک جزو بن جائے۔ سچ پوچھیئے تو ہم اِسی مشیتِ الٰہی کے حامل اور آلۂ کار ہیں جس کی ہمارے دل پر حکومت ہے۔ اب جا کر یہ حقیقت کھُلی کہ معلّمی کا کام کتنی گہری اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے دل میں ان لازمانی قدور کا اور زندگی کے حقیقی منشاء کا احساس پیدا کرنا اصل میں مشیتِ ایزدی کا پورا کرنا ہے۔

اِس مذہبی احساس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اس کی ایک ترقی یافتہ صورت ثبوتی مذہب ہے جس میں سختیاں بہت ہیں لیکن انسان اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اسی کی دوسری صورت ہیگل کا انتظام فلسفہ اور شلائرماخر کا تصوّرِ کائنات ہے۔ یہاں ہمیں مذہبی احساس کی ظاہری صورت سے بحث نہیں

بلکہ خود اس احساس سے جس شخص کے دل میں یہ موجود ہوتا ہے وہ کہتا ہے :-

"میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ زمان و مکان میں ایک مشیت کا ابدی قانون کارفرما ہے، جس کے احکام کے باریک جال سے انسان کبھی بچکر نہیں نکل سکتا"

"میں اسی مشیت کا آلۂ کار ہوں جسے میرے رنج و راحت کی پروا نہیں۔ وہ اپنے مقاصد کو خود جانتی ہے"

"ہمارا کام یہ ہے کہ اُنھیں بے چون و چرا پورا کریں"

"اس ناگزیر فرض کے انجام دینے پر ہماری زندگی کی اہمیت کا دارومدار ہے حقیقت کا خوشنما چہرہ اسی کو نظر آتا ہے جسے دل سے یہ احساس ہو کہ وہ اس مشیت کا آلۂ کار ہے"

بڑے لوگوں نے اس دنیا میں جو بڑے کام کیے ہیں وہ تعریف کے مستحق نہیں ہیں۔ بلکہ جس نیت اور جس طریقہ سے اُنھوں نے ان کاموں کو انجام دیا ہے اُس پر تعریف کا دارومدار ہے ممکن ہے کہ ہم سے اپنی زندگی میں ہزاروں قصور سرزد ہوں اور دُنیا ہمیں یہ الزام دے کہ ہم سانپ کی طرح چالاک نہیں بلکہ کبوتر کی طرح معصوم ہیں تب بھی ہم اپنی معصومیت اور نیکی کے سبب سے تاریخ کے مشہور لوگوں سے برتری حاصل کر سکتے ہیں یہی معصومی اور تسلیم و رضا کا شیوہ دیانت اور سچائی کی دلیل ہے۔ جتنے بڑے معلّم ہیں اُن میں پستالوزی کی طرح طفلانہ معصومیت ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو لازوال قدر کا آلۂ کار سمجھتے ہیں۔

اگر معلموں کی تربیت گاہیں یہ چاہتی ہیں کہ اُن کے طالب العلموں میں لازوال قدروں کی خدمت کا عزم بالجزم پیدا ہو اور وہ آیندہ نسلوں کے دل میں ان قدروں کا احساس پیدا کریں تو ضروری ہے کہ اُن کی تعلیم کا اصل اُصول عقیدت مندی یعنی مذہبیت ہو۔ اس نعمت سے محروم ہونے میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ معلّم اپنے شاگردوں میں سے اُن لوگوں کی سیرت کو بالکل نہیں سمجھ سکتا جو مذہبی انداز طبیعت رکھتے ہیں۔ اور ایسے لوگ جب تک دنیا قایم ہے پائے جائینگے۔

یہ وہ دوسری بنیادی شرط ہے جس کا پورا کرنا مدرسۃ المعلّمین کی اصلاح کے لیئے ضروری ہے۔ ہم یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ مختلف مذہبی فرقوں کے لیئے الگ الگ مدارس قایم کیئے جائیں بلکہ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہر مدرسے میں صحیح مذہبی روح موجود ہو۔ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ سارے مدارس، جن میں تعلیم کا کسی قدر مکمل نمونہ نظر آتا ہے، اسی مذہبی روح پر مبنی ہیں۔ جرمنی کی مشہور تربیت گاہ کے بانی ڈاکٹر ہرمان لیٹنز، انگلستان اور امریکہ کے مصلحین میتھو آرنلڈ، ٹامس آرنلڈ، سیسل ریڈی، ہوریس مین اور ہمارے مایۂ ناز معلّمین پسٹالوزی اور فروبل ان سب نے تہذیب و تمدن کی بنیاد یعنی مذہب کا دامن مضبوطی سے پکڑا تھا۔ لیٹنز نے اینٹس ہولم کی تقلید میں صبح شام طلبہ کو جمع کر کے دعا مانگنے کا جو طریقہ جاری کیا تھا وہ سر بسر مذہبی عقیدت کا نمونہ تھا۔

تیسری بنیادی شرط سماجی اور مذہبی روح کے بعد جو چیز مُعلّمین کی تربیت گاہ کے لیئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ قومی روح ہے۔ اخلاقی تعلیم کی بنیاد اجتماعی احساس ہے جو ہمدردی اور اُنس کی جبلّتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کسی جماعت میں رہ کر اور اُس کے ساتھ کام کرنے سے ان دونوں جبلّتوں کو کام میں لانے کے لیئے ایک بہت بڑا میدان ملتا ہے۔ سب سے وسیع جماعت نوعِ انسانی ہے لیکن یہ اصل میں محض ایک معنی ہے جس کا ہم تصوّر کر سکتے ہیں لیکن ادراک نہیں کر سکتے۔ واقعی جماعت وہ ہوتی ہے جس میں باہم اشتراک قدر رہو۔ لوگوں کے مِل جُل کر رہنے کا سبب اصل میں لاعقلی قدر رہیں۔ قدر کا مشترک احساس، اُن کے حاصل کرنے کے لیئے دوش بدوش کام کرنا، اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کاموں کو بانٹ لینا ہی وہ رشتہ ہے جو لوگوں کو باہم مربوط کرتا ہے اور جس کے بغیر جماعت کی تنظیم اور تشکیل نہیں ہو سکتی۔ ان جماعتوں میں اور انجمنوں میں یہی فرق ہے کہ انجمنیں تو محدود مقاصد کے لیئے قایم کی جاتی ہیں اور جماعتیں اعلےٰ روحانی قدروں کی خاطر۔ انجمنوں کے قایم کرنے کی محرّک مختلف اغراض ہوتی ہیں۔ اُن میں کوئی اندرونی رابطہ نہیں ہوتا۔ بہ خلاف اس کے جماعتوں میں کسی قدر کا مشترک احساس یا

ں کا شوق جس میں یہ قدر پائی جائے رشتۂ اتحاد کا کام دیتا ہے۔ انجمنوں میں شامل قت لوگ عقلی مصلحتوں کو سوچ کر آپس میں معاہدہ کرتے ہیں کہ کسی خاص مقصد کے حاصل کرنے ، مل جل کر کام کریںگے۔ (جماعتوں کی رکنیت کے لیے سوچ بچار کی ضرورت ہے اور نہ معاہدے طری احساس قدر خود لوگوں میں اتحاد پیدا کر دیتا ہے) جماعت اور انجمن کا فرق اس بات سے ح واضح ہو جاتا ہے کہ اگر انسان کسی جماعت سے، خواہ وہ مذہبی ہو یا قومی یا محض سیاسی پارٹی ہو جائے تو اُس جماعت کے لوگ اس علیحدگی کو کم و بیش اخلاقی گناہ سمجھتے ہیں۔ برخلاف ہے کے کسی انجمن کا رکن جس وقت چاہے اُس سے قطع تعلق کر سکتا ہے اُس پر کسی طرح کا الزام ائیگا۔

واقعی حیثیت سے دیکھئے تو سب سے وسیع جماعت جس کا انسان رکن ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے قوم ۔ یہاں اجتماعی اتحاد کی سب شرائط پوری ہو سکتی ہیں۔ قدور کا مشترک احساس بھی ممکن ہے ن کے حصول کے لیے مشترکہ کوشش بھی کی جا سکتی ہے اور تقسیم عمل بھی ہو سکتی ہے۔ اور اگر لسی قوم میں اتحاد مذہب بھی ہو تو وہ اُن تمام اعلیٰ قدور کی حامل ہوتی ہے جنھیں ہم تعلیم کے ذریعے بچوں میں اُبھارنا چاہتے ہیں۔ قوم کی مشترکہ زبان جو اس کی مخصوص سیرت کا مظہر ہوتی ہے اعلیٰ خیالات کو خاص و عام میں پھیلانے کا وسیلہ ہے۔ قوم کی اخلاقی قوت کی معراج یہ ہے کہ اُس کے افراد میں اپنی جماعت کے حامل قدور ہونے کا احساس پیدا ہو جائے اور وہ مل جل کر اُس کی تکمیل کی کوشش کریں۔ اِسی کو ہم قومی روح کہتے ہیں۔ اِس میں اور قدر شخصیت کی سعی میں جو تعلیم کا مقصد ہے بہت مشابہت ہے بلکہ دونوں کا ایک دوسرے پر بہت اثر پڑتا ہے۔ کسی شخص کو قدر شخصیت بجز قومی تمدن کے تعلق اور ربط کے نہیں حاصل ہو سکتی۔ اِسی طرح کسی قوم کو اپنے مخصوص فرض ذمہ داری کا احساس بجز اس کے کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا کہ اُس کے افراد میں قومیت کا اور قومی قدر کا احساس ہو۔

ریاست یا سلطنت کا احساس قومی احساس سے کسی قدر مختلف ہے۔ ریاست ایک اجتماعی نظام

قانون ہے جس کا کام مختلف افراد اور مختلف طبقوں کے اغراض و مقاصد میں عدل و انصاف کے مطابق توازن قایم رکھنا ہے۔ ریاست کا احساس ہم اسے کہتے ہیں کہ فرد اس نظام قانون کے ناگزیر ہونے کو تسلیم کرے اور اُس کی اصلاح اور تکمیل میں بلا واسطہ یا بالواسطہ مدد کرنے کے لیئے تیار رہے۔ اس احساس کی بنا پر جو تعلیم ہوتی ہے اُسے ہم شہریت کی تعلیم کہتے ہیں۔

شہریت کی تعلیم کے ضروری ہونے سے آج کل کسی کو اختلاف نہیں۔ اس لیئے ہمیں معلّموں کی تربیت گاہوں کے لیئے اس تعلیم کی اہمیت ثابت کرنا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ قومی تعلیم کے معاملے میں لوگوں کے خیالات کچھ اور ہیں لہٰذا ہم اسی کو تیسری ضروری شرط قرار دیتے ہیں۔

مُعلّموں کی تعلیم قومی روح کے ماحول میں ہونا چاہیئے۔ اوپر کی بحث میں یہ صاف ہو چکا ہے کہ قومی تعلیم سے ہماری مراد کیا ہے۔ ہم ہرگز اُس قومیت کے حامی نہیں ہیں جو قوت اور شہرت کی ہوس پر مبنی اور عدل و انصاف کے منافی ہو۔ یہ چیز قوموں کو دیر سویر اُسی طرح برباد کر دیتی ہے جس طرح بین الاقوامی اتحاد اور عالم گیر برادری کا سرو پا خواب جو قوموں اور نسلوں کے اختلاف کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ہم جس قومی روح کو چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنے مخصوص اخلاقی فرض (مشن) کا احساس ہو۔ اگر احمقانہ خود بینی ہماری آنکھوں پر پٹی نہ باندھ دے تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ ہم اس معاملے میں انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ سے، جن میں قومی روح کا اثر بہت نمایاں ہے، بہت کچھ سبق لے سکتے ہیں۔ یہ قومیت ایک اعلیٰ نصب العین ہے، وائنا کے مشہور اشتراکیت پسند ایگل برٹ پرنر اسٹوفر کا قول ہے کہ اس کی بدولت ہر قوم اپنی مخصوص صفات کے ذریعے سے نوع انسانی کے ذہنی اور اخلاقی سرمائے میں اضافہ کرتی ہے اُسی طرح جیسے ہر شخصیت قومی تمدن کے سرمایہ میں اضافہ کرتی ہے۔

یہ تیسری شرط ہر صحیح اور تندرست جماعت کے لیئے بدیہی ہے لیکن ہم لوگ آج کل صحیح اور تندرست نہیں ہیں۔ ہم بیمار ہیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء / ۱۹۲۱ء میں کس قدر عجلت کے ساتھ جرمنی کے ابتدائی مدارس کے مدرسوں نے اُن سب چیزوں کو جن میں قومی روح کا شائبہ بھی نظر آیا مدرسوں سے خارج

کردیا۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کی ریڈریں، تاریخ کی اور گیتوں کی کتابیں قومی "بیہودگیوں" سے پاک کردی گئیں۔ بت شکنی کا دور شروع ہوا۔ ہیرو ورشپ (مشاہیر کی عزت وحرمت) - رجعت پسندی قرار دی گئی۔ ۱۹۲۶ء تک یہ حالت ہے کہ ڈاک کے ٹکٹ پر فریڈرک اعظم کی تصویر چھپوانا قیامت ہوگیا اور ڈاک کے محکمے پر اعتراض و ملامت کی بوچھار کردی گئی۔ اگر یہی روح معلّموں کی تربیت گاہوں میں بھی سرایت کرگئی تو ہمیں جرمن قوم کی تعلیم کی طرف سے بےفکر ہوجانا چاہیئے کیونکہ جرمن قوم خود ایک قصّہ ماضی بن جائیگی۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ کی کتابوں، ریڈروں اور گیتوں کی کتابوں میں تبدیلی کرنا بہت ضروری ہے۔ لیکن ہمارے وطنی گیت اور نظمیں اور ہمارے مشاہیر کی (خواہ وہ بادشاہ ہوں یا مزدور) تصاویر اور اُن کے حالات سچی قومیت کی جان ہیں اور انھیں محبت اور ادب کے ساتھ کل مدارس میں خصوصاً معلّموں کی تربیت گاہوں میں جگہ دینا چاہیئے۔ عام بادشاہوں کی تعریف میں جو گیت ہیں اُنھیں شوق سے قلم زد کر دیجئے، ہمیں اس جھوٹ کے انبار سے ہمیشہ سے نفرت ہے۔ لیکن جو جرمن بادشاہ واقعی صاحب عظمت وجلال تھے (اور تاریخ کہتی ہے کہ کچھ ایسے بھی گزرے ہیں) ان کی یاد ہمارے ملک کے معلّموں کے دل میں اور اُن کے ذریعے سے ساری قوم کے دل میں تازہ رہنا چاہیئے۔ اسی طرح ہمارے وطنی گیت بھی بچے بچے کی زبان پر ہونا چاہئیں۔ اگر یہ چیزیں ہمارے ملک کے کل مدارس میں داخل نہیں ہوسکتیں تو ہم اس قابل ہیں کہ صفحۂ ہستی سے مٹ دیئے جائیں۔

ہم کو قومی روح کے مٹنے کا جو خوف ہے یہ محض وہم ہی وہم نہیں ہے۔ یہ باتیں اب واقعات بن گئی ہیں۔ اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ ہمارے قومی اور وطنی گیت اُس زمانہ میں بنے ہیں جب ہم جنگ کی مصیبت میں گرفتار تھے۔ لیکن فرانسیسیوں کے گیت لا مارسائی کا بھی تو یہی حال ہے۔ یہ گیت وہ ہے جسے گاتے ہوئے مارسیلز کے والنٹیر ۱۷۹۲ء میں پیرس میں داخل ہوئے تھے، فرانس میں یہ کس کی مجال ہے کہ اس گیت کو ابتدائی مدارس کی ریڈروں سے نکال دے یا انگلستان میں کون یہ ہمت رکھتا ہے کہ "حکومت کرلے برطانیہ سمندر پر حکومت کر" کو بچوں

کی کتابوں میں نہ رہنے دے۔

لیکن اگر کسی قوم کے معلّموں میں قومی روح نہ رہے اور ساری تعلیم اُس پر مبنی نہ ہو تو قوم بھی اس روح سے خالی ہو جائے گی۔ اس کا احساس سب سے زیادہ ریمانڈ پوان کارے کو تھا جسے سب سے زیادہ اس کی فکر تھی کہ فرانس کے معلّموں میں قومی حرارت اس حد تک پیدا کرے کہ ان کا دل کھولنے لگے۔ ہم جرمن ظاہری عزت و شان والی قومیت، نفرت والی قومیت نہیں چاہتے؛ خود زیگ فرِیڈ کا وے راؤ بھی، جس نے حال میں ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا ہے کہ جرمنی کی ریڈروں اور تاریخ کی کتابوں کو جھوٹے قومی احساس سے پاک کر دینا چاہیئے ہمارے یہاں کی کسی کتاب میں ایسی عبارت نہیں دکھا سکتا جیسی فرانس کے دارالمعلّمین کی ایک کتاب میں ہے جس کے اب تک نو ایڈیشن چھپ چکے ہیں "جرمن قوم کا اب تک وہی حال ہے جو دو ہزار برس قبل سیزر نے لکھا ہے۔ یعنی وہ اب تک قزاق، چور، اور قاتل ہیں۔ انھیں ابھی تک تہذیب و تمدّن کی ہوا بھی نہیں لگی بلکہ اُن کا شمار وحشیوں میں ہے۔" ہماری پُرانی نصابی کتابوں میں حُبّ وطن کے جوش میں بہت سی نامناسب باتیں لکھی گئی تھیں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے دشمنوں سے ہمیشہ کے لیئے نفرت ہو جائے۔ ہم میں یہ مادّہ ہی نہیں کہ دوسری قوموں سے نفرت کریں بھلا جن قوموں سے نفرت کی جاتی ہے اُن کی تقلید کون کرتا ہے۔ سچ پوچھیئے تو ہم میں "آفاقی" یعنی (Cosmopolitan) بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے۔ لیکن اسی لیئے یہ اور ضروری ہے کہ ہم میں وہ قومیت پیدا ہو جو ہمیں خودداری سکھائے، جو یہ بتائے کہ نوعِ انسانی کی ترقی کے لیئے ہم کون سی مخصوص خدمت انجام دے سکتے ہیں جس کے لیئے ہمیں تیاری کرنا چاہیئے۔

چوتھی بنیادی شرط اب تک ہم نے معلّموں کی تعلیم کے لیئے جو تجاویز بتائی ہیں وہ ثبوتی ہیں۔ یہ وہ اُصول ہیں جن کے بغیر کسی جماعت کی تنظیم نہیں ہو سکتی۔ یہ سماجی، مذہبی اور روح کے مظاہر ہیں جن پر تعلیم عامّہ کی بنیاد رکھنا چاہیئے اور جن کا حامل معلّم کو ہونا چاہیئے۔ جرمن ایمپائر کے دستورِ اساسی دفعہ ۱۰ کی رو سے مرکزی حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ مدارس کی تعلیم

کے عام اُصول معین کر دے۔ اگر ایسا کیا گیا تو سب سے مقدم اور سب سے اہم یہی اصول ہونگے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ لیکن مرکزی حکومت کا تعلیم کے مقامی انتظامات میں دخل دینا تو می تعلیم کی نشو و نما کے لیئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ عام اُصول تو اعیان (ideas) پر مبنی ہوتے ہیں جو ہر جگہ اور ہر زمانے کے لیئے ایک ہیں لیکن ان پر عمل کرنے کے لیئے جو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں وہ مختلف ہوتی ہیں۔ ان صورتوں میں جتنا تنوع اور جتنی آزادی ہو اتنی ہی زیادہ توسیع کی جا سکتی ہے کہ زندگی خود رفتہ رفتہ ہمارے نصب العین کو حقیقت کا جامہ پہنائے گی۔

اِس لیئے تعلیم معلّمین کے انتظام میں اِن تین مُثبت اُصولوں کے علاوہ ایک چوتھا منفی اُصول بھی پیش نظر رہنا چاہیئے۔ ابتدائی مدارس کے معلّموں کی تعلیم میں ہمیشہ سے یہ خرابی ہے کہ تربیت گاہوں کے اونچے درجوں میں پہنچنے کے بعد بھی نصاب تعلیم کی ہمہ گیری کم نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے ہائی اسکولوں کے معلّموں کی تعلیم ابتدا ہی سے ان لوگوں سے بہتر ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی مدارس معلّم سے، جہاں تک درس کا تعلق ہے، علمی قابلیت کے ایک مقررہ معیار کے طالب ہیں اور اس قابلیت کا ہمہ گیر ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ اُصول قرار دینا کہ معلّم کو مجسّم قاموس ہونا چاہیئے گویا تعلیم کو بے ثمر بنانا ہے۔ اِس سے علم و فضل نہیں بلکہ کبر و غرور پیدا ہوتا ہے۔ قاموسی تعلیم سے بڑھ کر تعلیم کی دشمن کوئی چیز نہیں۔ "ایک بات کو اچھی طرح جاننے اور برتنے سے جو تعلیم حاصل ہوتی ہے وہ ہزاروں باتوں کے ناقص علم سے نہیں ہوتی۔"

"انسان کسی ایک کام کو ایسی اچھی طرح سمجھتا اور کرتا ہو کہ آس پاس کے لوگوں میں کوئی اُس کا مقابلہ نہ کر سکے، یہی سب سے بڑی چیز ہے" یہ وہ تعلیم ہے جو گوئٹے باوجود اپنی ہمہ گیر طبیعت کے ہمیں ولہیلم مائسٹر میں دیتا ہے۔

غرض چوتھی بنیادی شرط جس کا پورا ہونا نہ صرف تعلیم معلّمین کے لیئے بلکہ ہر قسم کی

تعلیم کے لیئے ناگزیر ہی، یہ ہے کہ ہمہ دانی اور ہمہ گیری سے اجتناب کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ ذہنی تربیت اور گہری سے گہری احساس قدور کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابتدائی مدارس کے مُعلّمین کے لیئے یہ شرط بہت خطرناک ہے۔ کیونکہ ان مدارس میں بہت سے مختلف مضامین کی تعلیم دینا پڑتی ہے (علم حیوانات، علم نباتات، معدنیات، طبیعیات، کیمیا، ہندسہ، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، دینیات، جرمن ادب، جرمن صرف و نحو) بہت سے مختلف فنون سکھانا پڑتے ہیں (زنانہ دست کاریاں، مردانہ صنعتیں، نقشہ کشی، گانا، سارنگی بجانا، جمناسٹک وغیرہ) روز بروز نئی چیزیں بڑھتی جاتی ہیں (مدنیات، تدبیر منزل، فنِ زراعت، معاشیات سماجی خدمت کا فن، تیمارداری کا فن وغیرہ) اِس پر طرّہ یہ ہے کہ ابتدائی مدارس کے معلّمین شہر کے مدرسوں کے اونچے درجوں میں بھی اس پر زور دیتے ہیں کہ ہر درجے میں ایک مُعلّم سب مضامین پڑھائے اور تقسیم عمل پر راضی نہیں ہوتے جو انگلو سکسن ملکوں کے آٹھ درجے والے ابتدائی مدارس میں عرصے سے رائج ہے۔ اس کی وجہ سے مُعلّم پر بے انتہا قاموسی علم کا جو بار پڑتا ہے اُسے ہرمان آپجز نے اپنی کتاب "نظریۂ تعلیم" کی چوتھی جلد میں بہت تفصیل سے دکھایا ہے۔ جب اڈورڈ اشپرانگر نے اپنے رسالے "تعلیم معلّمین کے متعلق چند خیالات" میں اس قاموسی علم کے خطرات پر زور دیا تو ڈاکٹر زائفرٹ نے جو اُس زمانے میں سکسنی کے وزیر تعلیم تھے اور بہت دانشمند اور تجربہ کار آدمی تھے یہ جواب دیا کہ ابتدائی مدارس کے معلّمین سے مختلف قسم کے کام لیئے جاتے ہیں اس لیئے اُن کو ہمہ گیر تعلیم دینا ضروری ہے۔

لیکن معلّموں کی تعلیم "مختلف قسم کا کام لینے" کی پابندی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ "عین" تعلیم کی۔ اِس "عین" کا تقاضا یہی ہے کہ ہر شخص کو صرف اُنھیں چیزوں کی تعلیم دی جائے جن کی اُس میں صلاحیت ہے اور اس محدود تعلیم میں حتی الامکان گہرائی پیدا کی جائے۔ اگر ارباب حلّ و عقد اسی پر اڑے رہے کہ مُعلّم ساری اقلیم علم میں، جو آج کل بے شمار مختلف خطّوں میں تقسیم ہو گئی، چپے چپے کی سیّاحی کریں اور کوئی شخص جو محض ایک فن میں خواہ

وہ کتنا ہی مفید اور قابل قدر کیوں نہ ہو، مہارت رکھتا ہو ہرگز ابتدائی مدارس میں تعلیم نہ دینے پائے تو جتنی کوششیں تعلیم معلّمین کی اصلاح کے لئے کی جا رہی ہیں سب بیکار رہیں۔ اس لئے ہماری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ بڑے شہروں میں یا جہاں کہیں ایک درجے سے زیادہ کا مدرسہ ہو وہاں بڑے درجوں میں معلّمین کام کو اس طرح تقسیم کر لیں کہ ایک شخص زیادہ تر ریاضی سائنس وغیرہ کی اور دوسرا ادب و تاریخ وغیرہ کی تعلیم دے۔

ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ صنعتی فنون مثلاً نقشہ کشی، موسیقی، جمناسٹک، دست کاری اور تدبیر منزل وغیرہ کے لئے علیحدہ معلّم مقرر کئے جائیں جو ان چیزوں میں ماہر ہوں، اگر دیہات کے ایک درجے والے مدرسوں میں یہ ناممکن ہے تو شہروں کے آٹھ درجے والے مدرسوں کو کون سی مجبوری ہے کہ اس سطحی ہمہ دانی پر قناعت کریں۔

جتنا زیادہ ابتدائی مدارس پر "مدارس عمل" کا رنگ غالب آتا جائے گا یعنی جن چیزوں میں موقع ملے اُن میں بجائے پڑھانے اور سکھانے کے خود لڑکوں سے اُصولِ فن کے مُطابق کام لیا جائیگا اور تحصیل علم کا ذریعہ تجربے کو قرار دیا جائیگا اُتنی ہی زیادہ مُعلّمین میں تقسیم عمل کی ضرورت بڑھتی جائے گی۔ ہر چیز کو خواہ وہ علم ہو یا دست کاری یا صناعی "فن" کی حیثیت سے جاننے اور سکھانے کے لئے مخصوص صلاحیت اور برسوں کی محنت درکار ہے۔ کوئی شخص جب تک وہ ذہانت کا پُتلا نہ ہو سب علوم و فنون کا تو کیا ذکر ہے چند اہم علوم، صناعیوں اور دست کاریوں کے فنی پہلو پر بھی عبور حاصل نہیں کر سکتا۔

یہ سمجھنا کہ ہم ہر چیز کے "فن" کو چٹکی بجاتے سیکھ سکتے ہیں، ناقص تعلیم، غرور، اور تنقید نفس کی کمی کی علامت ہے۔ جو شخص یونیورسٹی میں طبیعیات پڑھتا ہے اُسے دو سال سے لیکر چار سال تک کام کرنا پڑتا ہے، جو شخص کسی پیچیدہ دستکاری مثلاً قفل سازی وغیرہ کو سیکھتا ہے اُسے اپنے فن کا پورا ماہر ہونے میں دس بیس سال لگ جاتے ہیں، جو شخص موسیقی، نقشہ کشی، نقّاشی، سنگ تراشی، زرگری وغیرہ میں سے کسی ایک چیز میں کمال حاصل کرتا ہے اس کی

جوانی اسی میں صرف ہو جاتی ہے بلکہ ساری عمر اپنے کام میں نئی باتیں سیکھتا ہی رہتا ہے۔ تو کیا زبان وادب، تاریخ یا ریاضی کو فن کی حیثیت سے سیکھنا کوئی کھیل ہے؟ کیا ان میں سے ہر ایک کے لیے مخصوص صلاحیت اور عمر کی بھی محنت ضروری نہیں ہے؟ تعلیم وتہذیب کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ہم ہر شخص کا جو کسی علم یا دستکاری یا صناعی میں مہارت رکھتا ہو سچا ادب اور احترام کریں اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ہم خود بھی کسی ایک چیز پر عبور رکھتے ہوں اور جانتے ہوں کہ اس سے کیا کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی علم یا دستکاری یا صناعی کے فنی پہلو سے بخوبی واقف ہے تو گویا وہ "مدرسۂ عمل" کا طریقۂ تعلیم یا کم سے کم اس کے بنیادی اُصول خود بخود جانتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز کا طریقۂ تعلیم اصل میں اُس اندرونی منطقی ترتیب پر مبنی ہے جو اُس میں پائی جاتی ہے۔ اور جب انسان اُس کو بہ حیثیت فن کے حاصل کرتا ہے تو اُس منطقی ترتیب کو لازمی طور پر سیکھتا ہے۔

البتہ معلّمانہ روح دوسری چیز ہے۔ اِس کے بغیر کسی ماہر فن کو مدرس نہیں بنانا چاہیئے۔ یہ وہی روح ہے جو پستا لوزی میں تھی یعنی علمی روح نہیں بلکہ سماجی روح۔ کوئی شخص اپنے فن میں کتنا ہی کامل کیوں نہ ہو یہ ضروری نہیں کہ وہ معلّمی کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور جب تک وہ اس کا ثبوت نہ دے اُسے کسی مدرسے میں مدرس ہونے کا حق نہیں ہے۔ اِس سے جو نتائج نکلتے ہیں اُن کی ہم یہاں تفصیل نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم اس اعتراض کا جو زائلفرٹ نے اشپرانگر پر کیا تھا جواب دینا چاہتے ہیں "دیہات کے ایک درجے والے مدرسے کے لیے ایسے معلّموں کی ضرورت ہے جو بہت سے علوم وفنون بلکہ سب علوم وفنون میں دخل رکھتے ہوں"۔ واقعی یہ بہت بڑی عملی مشکل ہے۔ لیکن اس کا یہ کوئی معقول حل نہیں ہے کہ ہم اُس بات پر راضی ہو جائیں جو عین تعلیم کی مخالف ہے۔ یہ مانا کہ ہمیں یہاں ایک حد تک قناعت سے کام لینا پڑے گا لیکن ایسی قناعت بھی کیا کہ تعلیم کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ کیوں کہ یہ اُصولِ تعلیم عامہ کی جان ہے کہ معلّموں کو سب چیزوں کی سطحی تعلیم دینے

کے بجائے کسی ایک چیز کی حقیقی تعلیم دی جائے۔

اس معاملے میں بہت سے درمیانی راستے نکل سکتے ہیں مگر ہم اسے ناظرین کی ذاتی رائے پر چھوڑتے ہیں۔

سید عابد حسین

ایک انقلاب آفریں مُعلّم

گزشتہ سو برس میں دنیا میں کافی تعلیمی ترقی ہوئی ہے۔ مذہبی اور معاشرتی قیود جنھوں نے تعلیم کو بالکل بے دست و پا بنا رکھا تھا ایک حد تک دور ہو گئی ہیں۔ نفسیات اطفال کے متعلق غلط فرضیئے جو رائج تھے ان کی عام طور پر تردید کر دی گئی ہے۔ ان کی وجہ سے مدرسہ میں تعلیم پانے والا بچّہ ایک قیدی کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی نشو و نما اور اس کا ذوق حیات پژمردہ ہو جاتا تھا اور قدرت کی دی ہوئی قوتیں پوری طرح بارآور ہونے نہ پاتی تھیں لیکن گزشتہ صدی میں جو سیاسی اور صنعتی انقلابات ہوئے اور انھوں نے انسانی خیالات پر جو اثر ڈالا اس کا نتیجہ انسان کی زندگی کے ہر شعبے میں زیادہ آزادی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ آزادیٔ فکر و عمل کے بیش بہا اختیارات دوبارہ افراد نے حاصل کر لیے۔ اس آزادی کی فضا نے مدرسوں کی تعلیم کو بھی متاثر کیا۔ بچّوں کی زندگی کو زیادہ خوش گوار بنایا۔ ان کے نصاب تعلیم کو وسعت دی اور ان کے تدریسی مشاغل میں بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ کر کے مدرسہ کو بجائے بچّوں کے قید خانے کے ایک خوش گوار اور جیتا جاگتا ماحول بنا دیا

اس انقلاب عظیم کے رہنما اور رہبر دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جنھوں نے نظریۂ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کی اصلاح کی اور ان کو نئے اور دور رس تصورات سے آشنا کیا۔ انھوں نے فلسفۂ زندگی، انسان کی معاشرتی حالت، تعلیم کے نصب العین پر غور کیا اور اس غور و فکر کے نتیجے کو چند عالمگیر اصولوں کی شکل میں استادوں اور معلموں کی رہبری کے لیے پیش کیا۔ اس قسم کے لوگوں میں مثلاً روسو کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جس نے اپنی کتاب (Social Contract) کے ذریعے اپنے زمانہ کے سیاسی اور معاشرتی خیالات میں اور (Emile) کے ذریعے سے تعلیمی خیالات

میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور معلموں کو اس خطرناک غلط فہمی سے نجات دلائی کہ بچہ محض ایک چھوٹا سا انسان ہے جو کوئی مخصوص حقوق یا مخصوص طبیعت نہیں رکھتا (Emile) گویا بچوں کا "اعلان حقوق" تھا جس نے نظری طور پر ان کی آزادی اور تعلیمی آزادی کا آغاز کیا

تعلیمی ترقی میں دوسرا بڑا حصہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے نظری امور پر تو زیادہ غور نہیں کیا یا کم از کم اپنے نظریہ تعلیم کو ایک مرتب شکل میں معلموں کے سامنے پیش نہیں کیا لیکن خود بحیثیت معلم کے تعلیم میں ایسی راہیں نکالیں جو دوسروں کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوئیں۔ ان کا بڑا کارنامہ ان کا عمل ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین خیالات سے محسوس یا غیر محسوس طور پر متاثر ہوئے اور پھر انھوں نے اپنی عقل اور اپنی وجدانی ہمدردی کے بھروسے پر ان خیالات کو عمل کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اس طرح ان کو ایک طرف اپنے خیالات میں ترمیم کر کے ان کو قابل عمل بنانا پڑا اور دوسری طرف ان کی عملی تعلیم اور اس کے طریقے اس فلسفۂ تعلیم سے متاثر ہوئے جو اس زمانہ میں رائج تھا علم اور عمل میں یہ داد و ستد، یہ تعاون ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے اس سے ایک طرف نظریہ کو فائدہ پہنچتا ہے اور دوسری طرف عمل مستفید ہوتا ہے۔ ان تمام معلمین میں گزشتہ صدی میں پستالوزی کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ اگرچہ اس نے بعد میں اپنے تعلیمی خیالات کو مرتب کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ بچوں سے محبت، ہمدردی اور ان کی فطرت کی تفہیم ہے جس کی نہایت اعلیٰ مثال اس نے برگ ڈورف کے مدرسے میں قائم کی۔

عام طور پر مدرسے کے معلموں کو اس قسم کے لوگوں کی سیرت اور ان کے کام کا مطالعہ کرنے سے بہت فائدہ پہنچتا ہے محض نظری امور کی بحث ان کی ہدایت اور ہمت افزائی کے لئے کافی نہیں کیوں کہ ان میں سے بعض تو اس قدر علمی اور ذہنی تربیت سے بہرہ ور نہیں ہوتے کہ ان خشک علمی بحثوں کو سمجھ سکیں جو مستند کتابوں میں پائی جاتی ہیں اس لئے نظری مسائل سے نہ ان کو دلچسپی ہوتی ہے نہ واقفیت۔ علاوہ بریں اعلیٰ تعلیم یافتہ استادوں میں بھی ایسے استاد بہت کم

ہوتے ہیں جو ایک ہنرمند صناع کی طرح، اپنے خیالات اور عیوں کو کسی عملی شکل میں ظاہر کر سکیں اس کے لئے خاص قابلیت اور طبیعت کی ضرورت ہے جو انسانوں میں کم کم پائی جاتی ہیں۔ لہذا ان کو لیے عملی نمونوں کی ضرورت ہے جن کے آئینے میں وہ اپنی مشکلات اور مسائل کا عکس دیکھیں اور پھر یہ معلوم کریں کہ دوسرے کامیاب لوگ کس طرح ان سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اس مطالعہ سے نہ صرف ان کے علم اور مہارت فن میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ان کی ہمت اور امنگ بھی بڑھتی ہے اور وہ جان لیتے ہیں کہ روزمرہ کی قیود اور بندشوں اور وسائل کی کمی کے باوجود اُستاد اپنے معمول کے کام کے طلباء کی شخصیت کی نشوونما کر سکتا ہے اور اس محنت کو اپنے لئے خوشگوار اور اپنی شخصیت کے ارتقاء کے لئے معین بنا سکتا ہے

حال ہی میں جو بڑے بڑے معلم گزرے ہیں یا اب موجود ہیں ان میں انگلستان کے ایک معلم ایف ڈبلیو سانڈرسن (F. W Sanderson) کا بہت ممتاز درجہ ہے۔ یہ وہاں کے ایک پبلک سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا جو "اونڈل پبلک سکول" کہلاتا ہے۔ اس نے اپنے ہیڈ ماسٹری کے زمانے میں جو تعلیمی خیالات مرتب کئے اور جس کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو اپنے اسکول میں عمل کا جامہ پہنایا ان کا مطالعہ سب اُستاد کے لئے اور خصوصاً ہندوستانی اُستاد کے لئے مفید ہوگا۔ اس کا انتقال جون ۲۲ء میں ہوا۔ لیکن اس نے اپنے دماغ اور اپنے عمل کو دورِ جدید کے تازہ ترین اور صحیح ترین تعلیمی خیالات کا مرکز اور منبع بنالیا تھا اور اس نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ تعلیم کے میدان میں آزادی، انفرادیت، شخصیت کی تکمیل، تخلیق وغیرہ کے جو مطالبات کئے جا رہے ہیں وہ محض ہوائی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایسی قوت اور اثر ہے کہ اگر ان کو سکول کی تنگ اور محدود زندگی میں راہ دی جائے تو تعلیم دراصل دنیا کی "تعمیرِ نو" کا وسیلہ اور "آدمِ برتر کی تخلیق" کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ "تعلیم و تربیت" کے ذریعے ہندوستانی اساتذہ کو اس۔ بیچ اور نظر رکھنے والے معلم کے بعض بنیادی خیالات اور اصول سے آگاہ کروں۔ جو صاحبان اس کے

متعلق زیادہ تفصیلی واقفیت چاہتے ہیں ان کے لئے حسن قسمت سے دو بہت اچھی انگریزی کتابیں موجود ہیں۔ ایک تو ایچ۔جی۔ ویلز کی کتاب "A Great Schoolmaster" (ایک بڑا معلم) جسے سینڈرسن کی سوانح عمری اور تعلیمی خیالات کی تنقید و تحسین سمجھنا چاہیئے۔ دوسری اس کے چند دوستوں اور رفقائے کار نے Sanderson of Dundle کے نام سے مرتب کی ہے جس میں نہ صرف مختلف تعلیمی مباحث اور تعلیمی طریقوں پر اس کے خیالات سے بحث کی ہے بلکہ اس کی بہت سی اہم تقریریں اور اتوار کے مواعظ بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ میں تمام انگریزی داں اساتذہ سے ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کی بزور درخواست کرتا ہوں

سینڈرسن نے جب اونڈل اسکول کی ہیڈ ماسٹری منظور کی اس وقت اس کی عمر ۳۵ سال کی تھی جو انگلستان کا خیال کرتے ہوئے کم و بیش نوجوانی کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔ کیوں کہ وہاں بالعموم چالیس برس کی عمر سے پہلے بہت کم لوگوں کو ذمہ داری کے فرائض سپرد کئے جاتے ہیں اس وقت اس کا نام بہت کم لوگ جانتے تھے اسکول کی حالت ایسی تھی کہ اس کو بہت سی تکلیفوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا اُستاد مخالفت پر آمادہ تھے کیوں کہ نئے ہیڈ ماسٹر کا تقرر اسکول کی اصلاح کے لئے ہوا تھا اور اُستاد اس بات کو اپنے لیے باعث ہتک تصور کرتے تھے طلبا۔ ایک مقابلتہً کم عمر ہیڈ ماسٹر کی جدت تخیل اور تعلیم و تربیت کے متعلق نئے تصورات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس کی طبیعت میں انتہا درجہ کی راست گوئی عزم اور استقلال تھا وہ محض مخالفت کے خوف یا دوسروں کی ناراضی کی دھمکی سے اپنے طریقہ عمل سے ہٹنے والا نہ تھا اور یہ صفات ایسی نہیں جو شروع میں کسی افسر کو ہردلعزیز بنائیں اور اس کا راستہ ہموار کریں اس لئے ابتدا میں پانچ سال تک اس کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ضبط اور نظم و نسق میں بھی سختی کرنا پڑی لیکن آخر کار اس کا خلوص اس کی نیت کی صفائی اور اس کے کیرکٹر کی پختگی نے اُستادوں اور طلبا دونوں کو رام کر لیا اور اس کے ابتدائی مخالفین اس کے سب سے زیادہ پرجوش اور سرگرم ارکن اور رفیق بن گئے

ان فراجی اور نفسی اختلافات کے علاوہ، سینڈرسن کو بڑی مہم یہ درپیش تھی کہ وہ اس سکول کو جو گویا سولھویں اور سترھویں صدی کی تعلیمی روایات کی یادگار تھا موجودہ زمانے کی ضروریات کا کفیل اور اس کی بہترین آرزوؤں اور تعمیری خوابوں کی تعبیر بنا دے۔ جس زمانے میں اس نے اسکول کا چارج لیا، ادبیات اور سائنس کی جنگ تعلیمی مباحث کا مرکز تھی۔ ادبیات سے دراصل یونانی اور لاطینی ادب مراد لیا جاتا تھا اور ایک "شریف" طالب علم کی اعلیٰ تعلیم کا معیار اس وقت بھی زیادہ تر یہی تھا کہ وہ ان مردہ زبانوں میں اور ان کے ادب میں مہارت حاصل کرے بلکہ ان میں شعر گوئی کی قابلیت بھی رکھتا ہو! سائنس کے مطالبات بھی بروئے کار آتے جاتے تھے۔ ہربرٹ سپنسر سائنس کی حمایت میں اپنا زبردست مجاہدہ کر چکا تھا لیکن تعلیمی جماعتوں اور بالخصوص حکام نے اس کی حقیقی اہمیت کو نہ سمجھا تھا۔ محض خارجی اثرات اور حالات کے جبر سے انھوں نے بکراہ اس کے لئے نصاب تعلیم میں تھوڑا سا وقت نکالا تھا۔ لیکن اس کی تعلیم تمام تر درسی اور کتابی تھی۔ تجربہ اور عملی کام کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ اونڈل میں بھی دوسرے پبلک سکولوں کی طرح اسی قسم کی ایک "ادبی" فضا رائج تھی جو ایک گزرے ہوئے زمانے کے نقوش کو زندہ رکھنا چاہتی تھی لیکن اپنے گردوپیش کی ہنگامہ خیز زندگی سے بے تعلق اور دورِ جدید کے اہم معاشرتی اور سیاسی مسائل سے قطعاً ناآشنا تھی۔ یہاں جو لڑکے تعلیم پاتے تھے وہ پبلک سکول کے اس مخصوص "جذبہ جماعت" سے جس کو انگریزی میں Esprit de corps کہتے ہیں متاثر ہوتے تھے، کھیلوں میں دلچسپی لیتے تھے، گفتگو، نشست و برخاست، ملاقات وغیرہ میں ایک قسم کی سطحی شائستگی اور تکلف کے عادی ہوتے تھے البتہ جو طالب علم محنتی اور ذہین ہوتے ان کو یہ موقع تھا کہ وہ مطالعہ کے ذریعے یونان اور روما ادب پر دقتِ نظر کے ساتھ عبور حاصل کرلیں۔

اس بے پروائی اور امن و امان کے زمانے میں قضا و قدر کی قوتوں نے ایک ایسے شخص کو اسکول کا افسر اعلیٰ بنا دیا جس کی متحرک اور تخیل پسند شخصیت نے وہاں کے بنے بنائے اور بے جان نظام کو درہم و برہم کر دیا۔ گویا کہ ؎

دیوانہ بہ کارگہِ شیشہ گر رسید!

میرے خیال میں سینڈرسن کی سب سے بڑی صفت جس نے اس کو اس قدر کامیاب اور زبردست معلم بنایا یہ تھی کہ وہ ان تحریکوں اور رجحانات سے واقف تھا جو اس زمانے میں زندگی کے ہر ہر شعبے میں انقلاب پیدا کر رہے ہیں۔ اس کا دماغ ہمیشہ بیدار رہتا تھا وہ اپنے گرد و پیش کے اثرات کو قبول کرتا تھا اور اپنے خلاق دماغ کی کارگاہ میں ان پر غور و فکر کرکے تعلیمی نتائج اخذ کرتا تھا وہ عام استادوں کی طرح نہ تھا جو استادبن کر اپنے منصب انسانیت کو برضا و رغبت فراموش کر دیتے ہیں اور تعلیم کو زندگی سے بالکل علیحدہ اور بے تعلق ایک شعبۂ عمل سمجھتے ہیں جہاں ان قدیم اور مقررہ علوم اور جادو کے سے قاعدوں کی فرماں روائی ہے جن کو کوئی باہر کا آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی کو سکون نہیں اور تہذیب و تمدن، سیاست و معاشرت یہاں تک کہ مذہب اور فلسفہ بھی ترمیم اور تبدیلی سے محفوظ نہیں۔ انسانی زندگی کے تمام ادارے اور اصول و قوانین ارتقاء پزیر ہیں اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں اس لئے آئے دن نئے نئے مطالبات پیش کرتے ہیں جن کا پورا کرنا یا کم از کم سمجھنا اور ان پر غور کرنا ماہرین تعلیم کا فرض ہے۔ اگر تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کے پیچیدہ اور بے ربط نظام میں نوعمر بچے کی رہنمائی کرے تاکہ وہ اپنے اس آبائی ترکہ پر قابض ہو کر اس کو آئندہ خوب تر شکل دے سکے تو معلم کو ان قوتوں اور اثرات سے باخبر ہونا چاہیئے جو موجودہ زندگی کے مظاہر میں پوشیدہ ہیں اور مستقبل کو بنانے کے لئے تہ میں کام کر رہی ہیں۔ اسے کسی مقررہ اور مروجہ رسم کا پابند کسی قدیم رواج کا آنکھ بند تابع نہ ہونا چاہیئے ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ مدرسہ زندگی کی وسیع اور پر رونق شاہراہ سے ہٹ کر کسی دور از راہ پگڈنڈی پر پڑ جائے گا۔ اور انسانی زندگی کی روز افزوں ضروریات سے نہ واقف ہوگا نہ ان کے لئے ذرائع بہم پہنچائے گا۔

سینڈرسن کی خواہش تھی کہ وہ مدرسہ کو قومی زندگی کا مرکز بنا دے جہاں ایک طرف اس کے بہترین کارناموں اور علوم و فنون اور روایات کے اثر اور نفع میں عام نوعمر بچوں کی تعلیم و

تربیت ہو۔ اور دوسری طرف مدرسوں اور اعلیٰ درسگاہوں کے تعاون عمل سے اس نئی ذہنیت اور معیار قدور (Standard of Values) کی بنیاد پڑے جو موجودہ زندگی کے عیوب اور نقائص اور تنگ نظری اور رشک و مقابلہ کی نقصان دہ کش مکش کا خاتمہ کردے۔ اس کا مدرسہ کا تصور یہ تھا کہ وہ ایک اصلی اور جیتا جاگتا ماحول ہو جہاں بچوں کے لئے مختلف قسم کے دلچسپ اور آگے بڑھانے والے مشاغل میں منہمک ہوجانے کا سامان ہو، جہاں وہ محض زندگی کی نقل ہی نہیں اتارتے بلکہ اپنی فطرت کے موافق مکمل ترین زندگی بسر کرتے ہیں تاکہ باہم مل جل کر مختلف قسم کے مشاغل کو انجام دینے میں ہر طالب علم اپنی مخصوص اور پوشیدہ صلاحیتوں کو پالے اور ان کو نشو ونما دے کر انسانوں کی خدمت کے لئے وقف کردے۔ اس کے تمام تعلیمی انتظامات میں یہ تین چیزیں برابر نمایاں ہیں۔

اول مختلف قسم کے مشاغل کا سکول میں مہیا کرنا تاکہ ہر طبیعت اور ہر نفسی ترکیب کا طالب علم اپنی شخصیت کے نشو و نما کا موقع پائے اور قوم کی صلاحیت کا کوئی شمہ بھی بے کار ضائع نہ ہو۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا

دوسرے وہ اسکول کے ہر کام میں اشتراک عمل پر زور دیتا تھا اور جب کبھی کوئی بڑی مہم درپیش ہوتی۔ ہمیشہ طلباء کے جذبۂ تعاون کو ابھارتا اور اس سے کام لیتا۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ مقابلہ کی کامیابی سے کام کی حقیقی وقعت کا ہرگز اندازہ نہیں ہوسکتا۔ علاوہ بریں جب مقابلہ کی نیت سے کوئی کام کیا جائے تو اس کی اخلاقی قدر کچھ نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ شروع ہی سے طلبا کی ذہنی اور عملی قوتوں کو اس طرح تربیت دے کہ وہ قدرتاً ان کو اپنے ابنائے جنس کے ساتھ مل کر اور ان کے فائدے کے لئے استعمال کریں۔ اگر جب کوئی لڑکا تمام طلبا سے بہتر کوئی کام کرکے دکھاتا اور اس پر تعریف کا خواہاں ہوتا تو وہ کام کو یہ کہہ کر واپس کردیتا

"میرے عزیز، اس کو اتنی اچھی طرح کرو جتنا تم کرسکتے ہو"

مطلب یہ ہوتا کہ محض یہ بات کافی نہیں کہ تم دوسروں کے مقابلے میں کام بہتر کرتے ہو۔ مقابلہ

اگر نہ تو تمہارا خود اپنی ذات سے ہے اپنے پچھلے کام سے ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کی اُمنگ رکھو۔

تیسرے وہ تعلیم کو "خدمت" کا پیش خیمہ سمجھتا تھا نہ کہ حکومت اور اقتدار کا ذریعہ وہ اپنے مدرسے سے ایسے انسان پیدا کرنا چاہتا تھا جن کی طبیعتوں میں بقول برٹرینڈ رسل (B. Russel) کے "تخلیق" کا مادّہ ہو (Creative types) نہ کہ قبضہ اور ذاتی تصرف کا جن کو possessive types کہتا ہے۔ تخلیق سے اس کی یہ مراد تھی کہ انسان اپنی خداداد قوتوں کو تہذیب و تمدن کے مختلف شعبوں، تجارت، صنعت و حرفت، حکومت، معاشرت، مذہب غرض ہر جگہ اس طرح اور اس نیت سے صرف کرے کہ ان سے اس کے ابنائے جنس کی بہتری ہو اور وہ نئے حقائق، نئے نظام اور نئی شاہراہوں سے مستفید ہوں۔ گویا سکول کو تمام دنیا کے لئے ایک "آئینہ" اور ایک "نمونہ" بنا دیا جائے جہاں سے انسانیت کی تجدید حیات ہو بقول اونڈل کے ایک پرانے طالب علم کے اس کا خیال تھا کہ "زندگی ایک معرکہ ہے محبت اس کی جستجو کا انجام ہے اور اس کا موٹو ہے ے

اگر خواہی حیات اندر خطر زی"

اور اس حیات پر خطر کا مقصد خدمت خلق ہونا چاہیئے ورنہ وہ تعلیم جو محض روزی کمانے کے قابل بنائے شان انسانیت سے گری ہوئی ہے

سینڈرسن کی حقیقی عظمت محض اس بات میں نہیں کہ اس نے ان بڑے اصولوں کو سمجھ لیا تھا اور وہ ان پر اعتقاد رکھتا تھا مختلف صورتوں میں اور کم و بیش صراحت کے ساتھ بہت سے صاحبان فکر نے ان خیالات کو ظاہر کیا ہے۔ سینڈرسن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک صناع تھا، ایک آرٹسٹ تھا جو اپنے خیالات کی عملی تشکیل کر سکتا تھا اس نے اپنی اٹھائیس برس کی ہیڈ ماسٹری میں جو ایک قوم کی زندگی میں اٹھائیس برس کا عرصہ چشم زدن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اپنے سکول کا تمام نظام اس طرح بدل دیا کہ وہاں محض مردہ زبانوں اور قدیم ادبیات کے بجائے طلبا ان تمام علوم و فنون اور مشاغل سے روشناس ہونے لگے جو انسان کی بے چین اور

خلاق طبیعت نے مرتب کئے ہیں اور جن پر ہمارے موجودہ نظام تمدن کا انحصار ہے۔ وہاں بجائے طلبا کے رشک اور مقابلہ اور مسابقت کے جذبہ کو ابھارنے کے ان کو تعاون، اشتراک عمل، جماعتی کام کی ترغیب دی جانے لگی اور پبلک سکول کا وہ قدیم اور زہریلا اصول جس نے ملک کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو تباہ کر دیا تھا نہایت دلیری کے ساتھ بدل دیا گیا۔ یعنی یہ کہ تعلیم محض اپنی ذاتی بزرگی اور حصول قوت کے لئے نہیں ہے بلکہ قوم کے تمام طبقوں کی اور دنیا کی تمام قوموں کی پرامن خدمت کے لئے ہے۔ انسانی قوتیں خدا کی امانت ہیں جن کو خدا ہی کے راستے میں استعمال کرنا چاہیئے۔ سینڈرسن سچے اور اصلی معنوں میں ایک مذہبی آدمی تھا اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور اس کا تجربہ بڑھتا گیا اس کو چیزوں اور انسانی مشاغل اور کارناموں کے حقیقی روحانی مفہوم اور منشا پر زیادہ اعتقاد ہوتا گیا۔

اس نے اس بنیادی انقلاب کے لئے کیا عملی ذرائع اختیار کئے؟ اس سوال کا مفصل جواب دینے کے لئے مجھے اس سکول کی ربع صدی سے زیادہ کی تاریخ کو دہرانا اور اس پر تنقید کرنا پڑے گا جو اس جگہ ناممکن ہے۔ اس لئے میں یہاں محض بڑی بڑی اہم تبدیلیوں کو بیان کروں گا اور ان کا بھی تفصیلی حال نہیں لکھوں گا بلکہ ان کے اسباب اور اثرات بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

سب سے پہلے سینڈرسن نے دیکھا کہ محض ادبی تعلیم نہ تو موجودہ زمانے کی گوناگوں ضروریات کے لئے مکتفی ہے اور نہ ہی اس میں ہر طبیعت اور قابلیت کے لڑکے کو موقع ملتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کر سکے۔ کیوں کہ ایسے طلبا نسبتاً کم ہوتے ہیں جن کا میلان طبیعت تمام تر ادبی ہو۔ بہت سے طلبا کی ذہانت اور کامیابی کا راستہ کھول دینے کے لئے ان کو عملی کام پر لگانے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا تھا کہ واقعاً کوئی لڑکا بالکل غبی اور ناکارہ نہیں ہوتا۔ جو لڑکے عام طور پر کند ذہن سمجھے جاتے ہیں وہ دراصل ایسے لڑکے ہیں جن کو غلط راستے پر چلایا جا رہا ہے۔ جن کو ابھی تک وہ کام اور وہ راستہ نہیں ملا جس کے لئے ان کی فطرت موزوں ہے اور تقاضا کرتی ہے۔ بچے

کچھ "کرنا" چاہتے ہیں۔ محض "سیکھنا" نہیں چاہتے۔ ان کی اس خواہش عمل کو پورا کرنا چاہیئے اور جب تک ملک کے ہر باشندے کو کسی نہ کسی قسم کا صنّاع نہ بنایا جائے جو اپنے ہاتھ یا اپنے دماغ کے کام سے ملک کو مالا مال کر سکے اس وقت تک نہ افراد کو اطمینان اور خوشی کی زندگی نصیب ہو گی نہ ملک خوش حال ہو گا۔

اس نے اونڈل میں شعبۂ ادب کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کے شعبہ (Modern Side) کا اضافہ کیا اور بیس سال کے اندر اندر سکول میں سائنس، انجنیرنگ، بیالوجی، زراعت اور آرٹ کی تعلیم کا انتظام کر دکھایا۔ اس کے زمانے سے پہلے بھی چند طلبا سائنس اور ریاضی پڑھتے تھے لیکن اس کے لئے بہت ناکافی انتظام تھا اور عام طور پر ادب کے طالب علم ان کو یا تو حقیر سمجھتے تھے یا "عجیب" خیال کرتے تھے۔ مگر سینڈرسن نے اس خیال کو بالکل بدل دیا۔ اس نے سائنس کی تعلیم کو اپنے نصاب میں مقام امتیاز دیا اس کو اور اس کے منہاج تعلیم کو دوسرے مضامین کے لئے مرکز بنایا اور نہ صرف اصطلاحی نقطۂ نظر سے اس میں کامیابی حاصل کی بلکہ اس کو تعلیم کے اعلیٰ تر مقاصد اور روحانی مفہوم کے حصول کا ذریعہ بنا کر دکھا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے سکولوں کے مقابلے میں اس کو بعض آسانیاں حاصل تھیں۔ مثلاً یہ کہ پبلک سکول میں ہونے کی وجہ سے وہ محکمۂ تعلیم کے اثر سے کسی قدر آزاد تھا اور روپیہ بھی ضروریات کے لئے مہیا ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ دراصل اس کی وسعت تخیل اور شخصیت کا اعجاز تھا کہ اس نے تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی روح کو بدل دیا۔ اس کے خیالات اور دماغ میں ایک خاص وسعت اور فراخی تھی وہ ہر اسکیم اور ہر تجربہ کو ایک بڑے اور متاثر کرنے والے پیمانہ پر چلانا چاہتا تھا۔ وہ اس سکول کا قائل نہ تھا جو ایک ناقابل استعمال مکان کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں واقع ہو یا سرکاری پیمائش کے موجب فی طالب علم اتنے مربع فٹ زمین اتنے مکعب فٹ ہوا مہیا کرے وہ ایسا سکول چاہتا تھا جو بحیثیت ایک ماحول کے بیرونی دنیا سے زیادہ آرام دہ زیادہ آراستہ اور ہر قسم کے کام کے لئے زیادہ موزوں ہو۔ جہاں سکول کی تعلیم و تربیت طلباء کو

انسانی تعلقات اور تہذیب کے متعلق نئے معیار قدروں سے آگاہ کرے گی، وہاں سکول کی روزمرہ کی زندگی بھی ان کو تمدن اور بود و باش کے بہتر اور اعلیٰ تر معیار سکھائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے سکول کی عمارات کے لئے بھی ایک بہت بلند نظر پروگرام رکھا تھا جس کا بیشتر حصہ اس نے خود اپنی زندگی میں تکمیل کو پہنچایا۔ چوں کہ وہ چاہتا تھا کہ طلبا دوسروں کے خیالات کو ایک تیسرے شخص یعنی استاد سے سننے اور سکول کے لئے خاص طور پر تیار کی ہوئی درسی کتابوں پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ خود چھوٹے پیمانہ پر ہر مضمون میں تحقیق اور اجتہاد کریں اور باہم مل جل کر "تخلیقی" کام انجام دیں اس لئے اس نے چھوٹے چھوٹے جماعت کے کمروں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے فراخ اور آرام دہ ہال تیار کرائے۔ ان میں ایک طرف انجنیری اور نجاری کا کام ہوتا تھا اور اس کے لئے پورا ساز و سامان، آلات، بھٹیاں وغیرہ موجود تھیں۔ دوسری طرف مرکز میں ایک بڑی وسیع اور کتابوں سے بھری ہوئی لائبریری تھی جو گویا ادب اور آرٹ کی تعلیم کا سرچشمہ تھی جہاں طلبا بطور خود ابتدائی مستند مصنفین کی کتابوں سے ہر مضمون کا مکمل مطالعہ کر سکتے تھے اس کے ایک حصہ میں غیر زبانوں کا ادب تھا، دوسرے میں تاریخ، جغرافیہ، سیاحت، سوانح عمری وغیرہ کا ذخیرہ۔ تیسرا سلسلہ عمارات سائنس کے لئے مخصوص تھا (Science blook) جس میں انجنیری کی تعلیم کے لئے کمرے تھے۔ ہر قسم کی مشینیں جن کی ضرورت ہوتی موجود تھیں، فزکس کیمسٹری اور بیالوجی کے لئے معمل laboratories تھے اور متصل ہی زراعت کا فارم اور علم نباتات کے معمل کے طور پر باغ۔ ان کے علاوہ وہ چاہتا تھا کہ سکول کا ایک حصہ مختلف فنون لطیفہ کے لئے وقف ہو جس میں آرٹ اور موسیقی کے کمرے، ڈراما کرنے کے لئے تھیٹر اور دار الصنعت (Home of Industry) پہلو بہ پہلو واقع ہوں۔

سکول کے عمارات کی یہ فہرست ممکن ہے بعض لوگوں کو مبالغہ آمیز معلوم ہو اور بعض کو ناممکن لیکن وہ لوگ جو بچپن کے زمانے کی حقیقی وقعت سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ بچہ کی نشو و نما کے لئے جو فضا اور ماحول مہیا کی جائے اس میں انسان کی تہذیب و تمدن کے تمام شعبے اور کارنامے

اور بہترین اثرات موجود ہونے چاہئیں۔ تاکہ بچہ غیر محسوس طور پر ان کو اپنی فطرت کا جزو بنائے دنیا میں کوئی چیز ایسی قیمتی نہیں کہ اس کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھا جائے۔ مدرسہ کی اس تصویر کو جس کا خواب سینڈرسن نے دیکھا تھا اور خواب کو واقعہ بنانے کی کوشش کی تھی اس زمانے میں خاص طور پر یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مدرسہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں بچے لکھنا، پڑھنا اور حساب سیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ امتحان پاس کرکے اچھی طرح روزی کما سکیں

میں نے اسکول کی عمارتوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ وہ اس تعلیمی پروگرام اور نصب العین کی نمائندگی کرتی ہیں جو سینڈرسن کے پیش نظر تھا۔ اس پروگرام میں جیسا کہ میں پہلے ذکر کرچکا ہوں اس نے سائنس کی تعلیم کو نہایت درجہ اہمیت دی لیکن وہ سائنس کی تعلیم سے مروجہ کتابی تعلیم مراد نہ لیتا تھا۔ اس کے نزدیک وہ "عام تعلیم" کے مقاصد اور منشا کو حاصل کرنے اور انسانی قوتوں کو بیدار کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ کیوں کہ سائنس خصوصاً عملی سائنس اکثر ان طلباء کی صلاحیتوں کو پالیتی ہے۔ جن کو ادبی تعلیم سے کوئی مناسبت یا ذوق نہیں ہوتا۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس کی تعلیم میں طلباء کی ذاتی تحقیق و تفتیش اور تجربہ کو سنگ بنیاد بنایا جائے۔ اس لیے وہ اصولاً (اور طبعاً بھی) سکول میں سائنس کے بڑے بڑے تجربوں اور عملی تجاویز (projects) کو ان چھوٹے چھوٹے کتابی تجربوں پر ترجیح دیتا تھا جہاں طلباء کو اپنی جدت دکھانے اور قوتیں آزمانے کا پورا پورا موقع نہیں ملتا۔ اس کا اصول تھا کہ طالب علم کی نظر اور گرفت اس کی رسائی سے کچھ آگے ہونا چاہیئے اور وہ اپنے طلبا کو ان کی استعداد سے زرا مشکل تر کام ہی دیتا تھا تاکہ وہ اپنی قوتوں کا پورا استعمال کرنا سیکھیں۔ وہ ان تجربوں کے لئے "تعلیمی دکانوں" کے بنے ہوئے "ماڈل" آلات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے طلبا کو بڑی بڑی اصل مشینوں اور قیمتی آلات کا عادی بنانا چاہتا تھا تاکہ وہ اپنے حاصل کردہ علم کو سکول کے بعد باہر دنیا کی صنعت و حرفت کی کارگاہوں میں بھی کام میں لاسکیں۔ وہ طلبا کو دفعتہً کسی بڑے سائنس کے مسئلے یا کسی پیچیدہ مشین سے

دو چار کردیتا۔ ان کو مناسب کتابوں کا پتا دیتا اور ان کے ذوق و استعداد کے مطابق ان کے گروہ بنا کر کہتا "میرے عزیز بچو! تم خود کتابوں کو پڑھو، ان سے اس مضمون کے متعلق واقفیت حاصل کرو، نوٹ لکھو، ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات اور تقسیم عمل کے ذریعے اپنے علم کو صحیح اور مکمل بناؤ" اور اس کے بعد یا تو ان سے مضمون لکھاتا یا سکول کی کسی سوسائٹی میں اس مضمون پر مرتب اور مدلل تقریر کراتا۔ اس کے بعد جب وہ خود اس مضمون پر روشنی ڈالتا اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھاتا تو طلباء بہت ذہانت کے ساتھ اس کے خیالات کی پرواز سے مستفید ہوتے۔ کیوں کہ وہ زمین کھودنے کا ابتدائی اور محنت طلب کام کر چکے تھے اور پھر چوں کہ اس کا دماغ پھلجھڑی کی طرح ہر طرف چنگاریاں برساتا تھا، وہ سائنس کا تعلق تاریخ اور فلسفہ اور صنعت و حرفت اور اقتصادیات کے مشکل مسائل اور انسانوں اور قدوں کی تخلیق نو کے ساتھ ملاتا جس سے طلبا کو معلوم ہوتا کہ وہ کسی خشک اور مردہ علم کا مطالعہ نہیں کر رہے ہیں جس کا ان کے گرد وپیش کی زندگی اور مسائل سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سائنس کا مطالعہ ان کی زندگی اور ضروریات، ان کے مذہب اور تہذیب کا جزو ہے۔ اس نے لیڈز یونیورسٹی ہال میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

> "ہم جس چیز کو روح سائنس کہتے ہیں وہی تمام زبانوں میں تخلیقی قوت رہی ہے۔ لیکن اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ آج کل وہ تجربی سائنس کی شکل میں کام کر رہی ہے۔ وہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بزور اپیل کرتی ہے ... .. سائنس کی روح ہی صنعت و حرفت کے اس نظام کو سنبھال سکتی ہے جو اس نے خود بنایا ہے۔ اس کا نتیجہ تبدیلی اور ارتقا ہوتا ہے۔ یہ جمہوریت کی روح ہے اور اس کا میلان ہمیشہ حریت اور قابلیتوں کو آزاد کرنے کی جانب ہوتا ہے اس کا منہاج جانچنے اور علمی تحقیق پر مشتمل ہے۔ وہ رسمی اور مروجہ طریقوں اور علامتوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے وہ تنقید کرتی ہے اور نئے معیار بناتی ہے۔

چیزوں کی قدوریں تبدیلی کرتی ہے ...... سائنس کو اب ایک نئی اقتصادیات نئے معاشرتی تعلقات، نئے اصول زندگی کی ترتیب کرنی چاہیئے جو ہماری صنعتی زندگی پر عمدگی کے ساتھ محیط ہوں ... مدرسے اس کام میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اگر سائنس کی تعلیم اس وسیع اور کشادہ انداز میں دی جائے تو وہ سکول کے ہر شعبہ کو متاثر کرے گی، پرانے علوم میں نئی روح پھونک دے گی اور ان میں نئی زندگی اور نئے مقاصد کی جھلک نظر آئے گی۔ وہ تمام علوم جن کو انسانی علوم (humane studies) کہا جاتا ہے ان نئے عیون (Ideals) کے ماتحت از سر نو مرتب کئے جائیں گے۔ جب ادب، فنون لطیفہ اور تاریخ کا منہاج سائنس کے مطابق کیا جائے گا تو ان کے لئے ادبی معلموں کی ضرورت ہوگی ... ... "

میں نے سائنس کے متعلق اس کے خیالات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کیوں کہ ان کو سمجھ لینے سے اس کے عام نظریۂ تعلیم پر واضح روشنی پڑتی ہے اور ہم آسانی کے ساتھ دوسرے مضامین کے متعلق اس کے نقطۂ خیال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اساتذہ کے لئے ان بار آور خیالات اور تجربات کا مطالعہ بہت مفید ہوگا جو اس کے زمانے میں اونڈل سکول میں آزمائے گئے۔ لیکن اس تفصیلی واقفیت کے لئے انھیں مذکورۂ بالا کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ میں یہاں محض مثالوں کے طور پر مختصراً ان خیالات کا ذکر کرسکتا ہوں۔

ادب کی تعلیم میں بھی وہ اس امر کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا تھا کہ ادب اور زندگی کا قریبی تعلق جو دونوں کو شاداب رکھتا ہے قطع نہ ہونے پائے۔ ادب کا مطالعہ اس لئے کرنا چاہیئے کہ وہ گزشتہ اور موجودہ نسلوں کے زندۂ جاوید خیالات کا مخزن ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ وہ ہم تک ان تمام تحریکات اور اثرات کا بیدار کن پیغام پہنچاتا ہے جو انسانی زندگی کی تبدیلی اور تعمیر میں مشغول ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے یہ الفاظ اس کو خاص طور پر مرغوب تھے کہ:

" میں اس لئے آیا ہوں کہ تمھیں زندگی دوں اور زندگی فراوانی

کے ساتھ دوں "

اور وہ کہتا تھا کہ تعلیم کا بھی مقصد اعلیٰ یہی ہے۔ خواہ وہ ادب کی تعلیم ہو یا سائنس کی، کہ وہ زندگی دے اور فراوانی کے ساتھ دے۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد طلبا کو ان اعلیٰ مستند ادبی شاہکاروں سے روشناس کرائے جن میں قدیم اور جدید زمانے کے بڑے بڑے لوگوں نے اپنی روح کو پھونک دیا ہے۔ اس لئے وہ لائبریری کے استعمال پر بہت زور دیتا تھا۔ وہاں ہر قسم کی عمدہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس کو ان معمولی سستے اڈیشن کی کتابوں سے نفرت تھی جو عام طور پر سکولوں میں رائج ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ان میں وہ ذاتی اثر اور روحانی نفوذ باقی نہیں رہتا جو بڑے بڑے مصنفوں کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کو ہر مضمون کے مطالعہ میں اس کے " انسانی " عنصر کی بہت قدر تھی۔ اس لئے جہاں وہ سائنس کے طلبا پر تجربات اور عملی کام کی اہمیت ذہن نشین کرتا وہاں اس بات پر بھی زور دیتا کہ طلبا ان فدائیان علم کی سوانح عمریاں پڑھیں۔ جنھوں نے علمی تحقیق و تفتیش کے لئے اور فطرت کے پوشیدہ رازوں کو معلوم کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ تاکہ انھیں ان کی روزمرہ کی مایوسیوں، ہمت شکنی، دقتوں اور تکلیفوں اور اکثر اوقات جاہل اور عاقبت ناشناس پبلک اور حکومت کے مظالم کا حال معلوم ہو اور دیکھیں کہ انھوں نے کس طرح ایک اعلیٰ مقصد کو پیش نظر رکھ کر ان تمام مزاحمتوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر کامیابی حاصل کی۔

تاریخ کی تعلیم میں وہ واقعات اور تاریخوں اور ناموں کی خشک اور بے معنی فہرستوں سے قطع نظر کر کے طلبا کو اس عظیم الشان ڈرامے میں دلچسپی دلاتا جو انسان کی آہستہ لیکن باقاعدہ ترقی کے سین دکھاتا ہے اس کے نزدیک تاریخ " انسانی ترقی کی کہانی ہے " وہ انسان کی اس پیہم اور مسلسل کشمکش اور جدوجہد کی آئینہ دار ہے جس کے ذریعے سے اس نے ابتدائی بربریت اور وحشیت سے گزر کر تہذیب و تمدن، مذہب و فلسفہ، علوم و فنون، صنعت و حرفت، معاشرت و سیاست کا وہ زبردست نظام بنایا ہے جس کی کوئی مثال عالم فطرت میں

نہیں ملتی اور کون سی کہانی ہے، کون سا ناول ہے، کون سا ڈراما ہے جو اس قدر زبردست کامیابیوں اور ناکامیوں، فتح و شکست کے کارناموں، مایوسیوں اور امنگوں، انسانی دماغ کے عروج اور انسانی عزائم کی شکست کی ہوشربا داستانوں سے پُر ہو؟ انسان اور دنیا کی اس "سب سے بڑی کہانی" کے مقابلے میں اور تمام چیزیں ہیچ ہیں۔ اگر تم کو تاریخ پڑھانی ہے (سینڈرسن کا خیال تھا) تو تم طلبا میں اس زبردست انسانی معرکہ (adventure) سے شغف اور دلچسپی پیدا کرو۔ ورنہ تنگ نظری کے ساتھ چھوٹے پیمانے پر تاریخیں اور پھر سبق پڑھانے سے کیا فائدہ؟ اسی وجہ سے وہ اکثر طلبا کے کسی گروہ کو جو کسی خاص زمانے کا مطالعہ کرتے ہوتے۔ کہدیتا کہ تم اس زمانے پر فلاں فلاں مستند کتابوں کا مطالعہ کرو اور پھر معلوم کرو کہ انسانی ترقی کی جدوجہد میں اس زمانے کے لوگوں نے کیا حصہ لیا اور تہذیب و تمدن کے خزانے میں ان کی کیا یادگاریں اور کارنامے محفوظ ہیں اور بالعموم تاریخ کی تعلیم سے وہ طلبا کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ کس طرح انسان رفتہ رفتہ اندھے اور بے مقصد مقابلہ کی منزل سے نکل کر، مشترک اغراض و مقصد کے حصول کے لئے باہمی اشتراک عمل کی منزل میں پہنچا ہے۔

ذاتی تحقیق و تفتیش کو یہاں بھی وہی مرتبہ حاصل تھا جو سائنس کی تعلیم میں۔ وہ کہتا تھا کہ تاریخ کے طالب علم کے لئے ایک عمدہ اور بڑی لائبریری وہی حیثیت رکھتی ہے جو سائنس کے طالب علم کے لئے ایک معمل تجربات۔ اس لئے اس نے سکول کی لائبریری میں سے تمام پرانی، بے کار کتابوں کو نکال کر اعلیٰ مورخوں کی اصلی تصانیف اور بہت اچھے ماہرین علم کی تالیفات اس میں داخل کردی تھیں۔ ان کے مطالعہ سے طلبا اس واقفیت کو مکمل کرتے تھے جو ان کو سبقوں اور لکچروں میں حاصل ہوتی۔ اس طرح ان کو کتابوں کا استعمال آجاتا اور واقعات سے نتائج اخذ کرنے کی مشق ہوتی تھی۔ ان کا اعتماد نفس مستحکم ہوتا تھا اور آزادیٔ رائے پیدا ہوتی تھی اور یہ نہیں کہ موجودہ زمانے کی تاریخ اور اس کے

اہم واقعات کو جو بعض اوقات ہمارے لئے تمام گزشتہ تاریخ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں طلباء سے پوشیدہ یا ان کے مطالعہ سے علٰحدہ رکھا جاتا ہو۔ ایسا کرنا اس کے بنیادی اصولِ تعلیم کے خلاف تھا۔ کیوں کہ وہ تاریخ جو مثلاً ۱۸۷۰ء یا ۱۹۰۴ء پر ختم ہو جائے طلبار کو بیچ سمندر میں چھوڑ دے گی اور ان کے گزشتہ زمانے کے علم کا ربط موجودہ زمانے کے ساتھ پیدا نہیں کرے گی۔ اس لئے وہ اپنے ہاں کے بڑے طلبا کو لائبریری کلاس میں اس قسم کے سوالات مطالعہ کرنے اور جواب لکھنے کے لئے دیتا تھا جو ایک قدیم خیال کے معلم کو کم از کم حیران ضرور کر دیں گے۔ مثلاً :

۱ - فرض کرو کہ تم کوئی فرانسیسی یا امریکی ہو جو ۱۸۸۰ء میں انگلستان میں مقیم ہو۔ ایک خط لکھو اور اس میں اس زمانے میں ملک انگلستان کا حال اور دنیا میں اس کی پوزیشن بیان کرو۔

۲ - انگلستان میں ٹریڈ یونین کی تحریک کا ارتقا دکھاؤ اور اس کے حسن و قبح پر بحث کرو اور نقشوں اور شکلوں کے ذریعے اس کی توضیح کرو۔

۳ - "وہ ایک چال باز تھا جس نے جمہوری حکومت کے ساتھ دغا کی۔" "میں خود انقلاب ہوں"۔ ان دونوں مقولوں میں سے نپولین کے متعلق کون سا زیادہ درست ہے؟

۴ - "اٹھارہویں صدی نثر کا زمانہ تھا اور انیسویں صدی نظم کا۔" اس بیان سے تم کیا نتائج نکالتے ہو؟

۵ - "ترقی کے خیال" کا انقلاب فرانس پر کیا اثر پڑا اور انقلاب فرانس کا ترقی کے خیال پر کیا ردِ عمل ہوا؟

تجربہ کار استاد سمجھ سکتے ہیں کہ تربیت یافتہ طلبا جب اس قسم کے سوالات کا لائبریری میں مطالعہ کریں گے اور مستند مصنفوں کو پڑھیں گے، خود اپنی تنقید اور تبصرہ کی قوتوں کو کام میں لائیں گے تو ان میں کس قدر دماغی پختگی اور توازن پیدا ہوگا۔ اس طریقہ مطالعہ میں بہت سے

فوائد اس اسکیم کے بھی حاصل ہو جاتے ہیں جو بعد میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کینچ نے "Source Method" کے نام سے معلموں کے سامنے پیش کی۔

ان تمام جزوی اور تفصیلی انتظامات میں سینڈرسن نے اپنا مرکزی خیال کبھی فراموش نہیں کیا۔ یعنی یہ کہ تعلیم کا مقصد سب سے پہلے اور سب سے آخر نوع انسان کی خدمت اور اس کو بہتر بنانے کی کوشش ہے۔ وہ اس کو نہ صرف ایک مطمح نظر سمجھتا تھا جو مستقبل بعید میں جاکر حاصل ہوگا۔ بلکہ ایک قریبی اور روشن اصول جو ہر تعلیمی تجویز اور طریقہ میں ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ہم آئندہ نسل میں اشتراک عمل اور مل جل کر محنت کرنے کی عادت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اسکول کے کمروں اور پڑھائی کے گھنٹوں ہی میں اس ذہنیت کو پختہ کرنا ہوگا۔ آدمی کسی بات کو نہیں سیکھتا خواہ وہ کوئی جسمانی کام ہو یا دماغی عادت جب تک خود اس کو نہ کرے۔ اس لئے وہ طلبا کو ابتدا ہی سے آپس میں مل جل کر ساری جماعت یا اپنے گروہ یا تمام تعلیم گاہ کے فائدے کے لئے کام کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی وہ سائنس وغیرہ میں اس کو کہیں بہتر سمجھتا تھا کہ طلبا بجائے اس قسم کی مشقیں اور تجربے کرنے کے جو محض سکھانے کی خاطر کئے جاتے ہیں کسی مفید تعمیری کام میں مشغول ہوں جو قوم یا جماعت (Community) کے لئے کارآمد ہو اور اس کو پورا کرنے کے دوران میں اور اس کو پورا کرنے کی غرض سے، وہ تمام ضمنی مشق اور مہارت حاصل کریں جس کی ضرورت ہے تاکہ وہ کام سیکھنے میں بغیر کسی مقصد کے اندھوں کی طرح وقت بسر نہ کریں بلکہ ایک اعلیٰ اور ہمت افزا مقصد ان کے پیش نظر رہے۔ جنگ کے زمانے میں جب انگلستان میں قومی زندگی کے تمام ادارے، مدرسے، انجمنیں، چرچ، کارخانے، مختلف قسم کی جنگی خدمت انجام دے رہے تھے سینڈرسن کو اپنے سکول میں اس خیال کا عملی تجربہ کرنے کا بہت عمدہ موقع ملا۔ سکول میں مختلف قسم کا گولہ، بارود اور اسلحہ تیار کیا جاتا تھا۔ ان کے ہاں پہلے ہی سے انجینیری اور لوہار اور بڑھئی کے کام کے لئے تمام سامان موجود تھا۔ طلباء کو اس "تعمیری"

کام پر لگا دیا گیا۔ پرانے طلبا اسی کام کے دوران میں مہارت اور مشق حاصل کرتے تھے اور نئے طلبا اسی کام کو انجام دینے میں کام سیکھتے تھے۔ اس تجربہ نے اس خیال کی صداقت کا نہایت شاندار اور قطعی ثبوت دیا کہ اسکول میں ہر کام کو اس طرح سیکھنا کہ کوئی اعلیٰ اور مفید مقصد پیش نظر رہے اور کام کی نوعیت "تعمیری" ہو اس کو سیکھنے کا بہترین طریقہ ہے۔ سینڈرسن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو فوائد جنگ کا کام کرتے ہوتے حاصل ہو سکتے ہیں (جو دراصل وسیع معنوں میں تعمیری نہیں تخریبی کام ہے) وہ زیادہ عمدگی اور تکمیل کے ساتھ قوم کی پرامن خدمت اور تعمیری کام کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ انقلاب آفریں اصول اس قدر اہم اور دوررس ہے کہ میں یہاں اس کی تفصیلی بحث نہیں کر سکتا۔ استادوں اور ماہرین تعلیم کو چاہیئے کہ اپنے ذہن میں اور عملی تجربہ کے ذریعہ اس خیال کے اثر کو سوچیں اور دیکھیں۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں اس بیدار مغز اور بلند خیال معلم کا عقیدہ تھا کہ تعلیم انسانی زندگی اور تہذیب کی تعمیر اور ان کی تمام قدور کی تجدید کا ذریعہ ہے اور اگر وہ اس اعلیٰ نصب العین کو فراموش کر دے اور اس کے علاوہ کسی اور مقصد مثلاً "تربیت دماغی" یا "تہذیب نفس" یا "حصول رزق" کو اپنے پیش نظر رکھے تو وہ نہ صرف بے کار ہے بلکہ سراسر مضر ہے۔ اسی لئے اکثر اپنی معنی آفریں تقریروں میں ان امور سے بحث کی ہے کہ تعلیم کا قومی زندگی سے کیا ربط ہے، اس کا صنعت و حرفت کے نظام سے کیا تعلق ہے اور تعلیم جدید کا اس نظام پر کیا اثر ہو گا۔ آیا تعلیم جدید ان قدور کو قبول کرے گی جو اس زمانے میں رائج ہیں یا لوگوں کو ایک بہتر معیار قدور سے روشناس کرے گی۔ ۱۹۱۹ء میں لندن کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اس نے بیان کیا تھا کہ نظام صنعت کے متعلق لوگوں کے خیالات میں بعض ایسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن پر غور کرنا اور جن کی رہنمائی کرنا تعلیم اور ماہرین تعلیم کا فرض ہے۔ ان میں سے چند اہم تبدیلیاں یہ ہیں:—

۱۔ موجودہ نظام صنعت و حرفت ان مضبوط، قابل اور محنتی لوگوں کی کوشش کا نتیجہ ہے

جنھوں نے بعض علمی کام کرنے والوں کی تحقیقات سائنس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اس نظام کی آمد ایک غیر منتظم طوفانی اور بے تماشا طریقہ سے ہوئی ہے۔

۲ - سائنس کی نئی دریافتوں کی وجہ سے دنیا چھوٹی ہوگئی ہے اور دنیا کی آبادی بڑھ گئی ہے اسی سبب سے نہایت سخت مقابلہ اور مسابقت کا ہر جگہ دور دورہ ہے۔

۳ - پیداوار کو بڑھانے کی ان تھک اور بے تحاشا کوشش میں ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے گئے ہیں جو لوگوں کو بظاہر جائز معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال "کارکردگی (efficiency) کا موجودہ اصول ہے۔ جو بادی النظر میں دل و دماغ کو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن درصل بہت غور و فکر کا محتاج ہے۔

۴ - لوگ اس خیال کی طرف آرہے ہیں کہ صنعت و حرفت کی پیداوار پر سب سے پہلے خود مزدور کا مطالبہ ہے اور اپنے کام ہی کے ذریعہ مزدور گھر کا جسمانی، دماغی اور روحانی ارتقا ہونا چاہیئے۔

اس کو یقین تھا کہ جب تک تعلیم میں تبدیلی نہ ہو اس نظام کے مظالم اور ناانصافیاں دور نہیں ہوسکتیں۔ انسانوں کے خیالات اور رعیون میں تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب سکولوں میں تین اہم تبدیلیاں کردی جائیں۔ مقابلہ اور مسابقت کے طریقوں کے بجائے تعاون اور اشتراک عمل کے طریقوں پر تعلیم ہونی چاہیئے۔ تصرف اور حکومت کے جذبہ کے بجائے خدمت کے جذبہ کو پیدا کرنا چاہیئے اور اسکولوں سے امارت کی روح کو نکال کر جمہوریت کی روح داخل کرنی چاہیئے۔

جو اعتراضات اس نے انگلستان کے پبلک سکولوں اور عام سکولوں پر کئے ہیں وہ زیادہ زور اور زیادہ صداقت کے ساتھ ہمارے مدارس پر عائد ہوتے ہیں جہاں طلبا کے لئے اشتراک عمل اب تک اخلاقی گناہ ہے اور کام کرانے کے لئے اُستاد کے پاس اس سے بڑھکر اور کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ ایک طالب علم کو دوسرے طالب علم کے مقابلے میں رشک دلائے اور اپنے

ذاتی مفاد اور پوزیشن کو تمام جماعت کے مفاد سے عزیز تر سمجھنا سکھائے، جہاں تعلیم لوگوں کو محض ملازمت اور چھوٹے پیمانے پر چند ذلیل تر محکوموں پر حکومت کرنے کی طرف مائل کرے اور خدمت ملک اور خدمت قوم کے خیال کو کبھی نصاب تعلیم یا طریقۂ تعلیم کے پاس بھی نہ آنے دے جہاں دولت کو اور اس کے حصول کو زندگی کا واحد مقصد اور ترقی اور کامیابی اور ناموری کا ہم معنی سمجھا جائے اور دولت مندوں کو بلا لحاظ اس کے کہ انھیں ستم ظریفِ فطرت نے دماغ سے محروم رکھا ہے یا تعلیم کے میدان میں اہم مرتبہ اور ذمہ داری کی حیثیت دی جائے۔

اس ایک مضمون میں یہ ممکن نہیں کہ میں اس کے تعلیمی خیالات کے تمام نتائج اور دور رس اثرات سے بحث کروں۔ کیوں کہ اس کے نقطۂ خیال کے مطابق تعلیم صحیح معنوں میں اسی وقت تعلیم کہلائی جا سکتی ہے جب اس کا رابطہ گرد و پیش کی زندگی سے اس طرح قائم ہو جائے کہ وہ اس کے ہر شعبہ کو متاثر کرے۔ اس لئے اس کے خیالات کا مفصل تبصرہ دراصل سیاست و معاشرت اور صنعت و حرفت کے نظام کا تبصرہ ہوگا اور انسانی تعلقات اور انسانی حقوق کے متعلق ان نئے خیالات کا تبصرہ ہوگا جو آہستہ آہستہ زندگی کے تمام اداروں میں تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں۔ اس لئے فی الحال میں سینڈرسن کی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لئے صرف ایک دو ایسے واقعات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ اس میں طلبار سے ہمدردی اور ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور سراہنے کی کس قدر قابلیت تھی۔

کوئی استاد محض اپنی قابلیت اور علمیت کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ طلبار کی انسانی فطرت خود بخود اپنے استاد کی "انسانیت" کی طرف رجوع کرتی ہے اور اس کی متلاشی ہوتی ہے۔ اگر کوئی استاد ان کو بحیثیت ایک انسان کے ناقص معلوم ہوتا ہے مثلاً ہمدردی یا محبت یا ذوق ظرافت سے محروم ہونے کی وجہ سے، تو وہ ان کو بحیثیت معلم کے مطمئن نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ ان کو مضمون زیر بحث اچھی طرح پڑھا اور سمجھا دے لیکن وہ اثر جو دل کا دل پر، روح کا روح پر اور شخصیت کا شخصیت پر ہوتا ہے، جو انسانوں کو بگاڑ دے

بنا سکتا ہے وہ اثر بغیر انسانی صفات کے ممکن نہیں۔ سینڈرسن کی عملی کامیابی کا ایک بڑا بھید یہ تھا کہ وہ اپنی مقناطیسی قوت سے اپنے شاگردوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا تھا اور ہر طالب علم سے اس کی قابلیت کے موافق بہترین کام لے سکتا تھا۔ اس کے پاس ہر طالب علم کے لئے خواہ وہ مقابلۃً کتنا ہی کند ذہن کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی ہمت افزا کلمہ موجود رہتا تھا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر طالب علم کا دل بڑھایا جائے تو وہ کبھی نہ کبھی خود اپنے تجربے سے معلوم کرے گا کہ وہ کس کام کو کرنے کی قابلیت رکھتا ہے اور کس میدان عمل میں اس کی فطرتی قابلیتیں زیادہ مفید ثابت ہوں گی۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کے طلبا ہر کام میں شوق اور جدت کا اظہار کریں اور کسی قسم کی مشکلات سے مرعوب نہ ہوں۔ ہر دقت کو تسخیر کرنے کی کوشش کریں۔ ایک مرتبہ جب مدرسہ میں سائنس اور عملی کام کا شوق خوب زور پکڑ چکا تھا، لڑکوں نے چاہا کہ علم طبعیات اور علم کیمیا کے معمل میں علاوہ سکول کے وقت کے فرصت میں بھی کام کریں۔ لہذا انھوں نے ایسا ہی کرنا شروع کیا اور بہت دن تک اپنے فرصت کے وقت میں بھی وہاں چھپ کر جاتے اور سائنس کے تجربات کرتے۔ ہیڈ ماسٹر (سینڈرسن) کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو اس نے کچھ تو حفاظت کی خاطر سے اور کچھ طلبا کے شوق کو آزمانے کے لئے حکم دیدیا کہ سکول کے وقت کے بعد ان کمروں کو قفل لگا دیا جائے۔ طلبا کی طلب صادق تھی۔ انھوں نے تمام قفلوں کی کنجیاں بنالیں اور جب وہ موقع پاتے شام کو اور بعض دفعہ بہت رات گئے تک لبریٹری میں کام کرتے رہتے۔ ساتھ ہی ہیڈ ماسٹر کی اچانک آمد سے باخبر رہنے کے لئے انھوں نے لبریٹری سے سکول کے دروازہ تک ایک ٹیلیفون لگایا جس کے ذریعہ ان کا مخبر ان کو ہیڈ ماسٹر کی آمد کی خبر دیدیتا تھا۔ سکول کا طالب علم جو اس واقعہ کا راوی ہے لکھتا ہے کہ جب ان کو اس ٹیلیفون کا حال معلوم ہوا اور انھوں نے اس کو ہٹانے کا حکم دیا تو وہ دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ طلبا کوئی اور نیا طریقہ ایجاد کرتے ہیں یا نہیں!

یہی طالب علم ایک اور واقعہ بیان کرتا ہے جس سے سینڈرسن کی طبیعت اور سیرت شناسی پر روشنی پڑتی ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے عادت ہو گئی تھی کہ جب رات کو نیند آتی تو میں لائبریری میں جا کر پڑھا کرتا۔ ایک مرتبہ رات کے دو بجے وہ لائبریری میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ ہیڈ ماسٹر جو خود غالباً کسی وجہ سے سو نہ سکے تھے۔ وہاں پہنچ گئے اور ایسے وقت اپنے ایک طالب علم کو پڑھتا دیکھ کر بہت ناراض ہوئے اور اس کو بہت ڈانٹا کہ مدرسہ کے قواعد کی کیوں خلاف ورزی کی۔ لیکن جب غصہ کا طوفان فرو ہوا تو پھر شفیق معلم کی آواز میں پوچھا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم کر کیا رہے ہو؟" اس نے اپنے نوٹ وغیرہ دکھائے اور کہا دن میں یہ کام کرنے کو وقت نہیں ملتا۔ ان کو فوراً دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس کے نوٹ پڑھنے شروع کئے۔ ان کا تعلق معدنیات کی ساخت اور کان کنی وغیرہ سے تھا۔ انھوں نے باتیں کرنی شروع کیں اور علمی تحقیق و تفتیش کی وقعت اور اہمیت طلب علم و کمال کے لئے انسان کی پیہم کوششیں۔ جذبہ علم و تخلیق کی قدر و واقعی، سکول میں اس جذبہ کی ضرورت وغیرہ وغیرہ بہت سے ہمت افزا علمی مباحث پر گفتگو کی اور دونوں رات کی خاموشی اور تنہائی میں ایک گھنٹے تک انہماک سے باتیں کرتے رہے۔ وہ لڑکا لکھتا ہے کہ یہ میری زندگی کا اہم ترین اور وقیع ترین گھنٹہ تھا جو میں نے اس معلم کی صحبت میں بسر کیا ..... اور پھر جاتے ہوئے اس کو کہا:

اچھا، بھئی اب تم جاؤ اور آرام کرو۔ ہم تمھارے اس کام کے لئے دن میں کوئی وقت نکالیں گے ... "

اس کے تعلیمی خیالات اور اس کی طبیعت دونوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیدار مغز معلم نے موجودہ زمانہ کی مادّی اور روحانی ضروریات کو بخوبی سمجھ لیا تھا اس کو اعتقاد تھا کہ ان ضروریات کی تشفی محض تعلیم ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس نے

تعلیم کے میدان میں ایک ایسے زبردست عملی تجربہ کی بنیاد ڈالی جس نے نہ صرف اونڈل سکول میں تعلیم کے طریقوں کو بدل دیا بلکہ تعلیم کی روح میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور خودغرضی، رقابت، افراد اور جماعت کی باہمی کش مکش، دولت پرستی اور بیکاری کے اس دور میں ایک اعلیٰ تر معیار قدور لوگوں کے سامنے پیش کیا جس میں رقابت کے بجائے اشتراک عمل، خودغرضی کے بجائے خدمت نوع، دولت پرستی کے بجائے تخلیقی کام اور بےکاری کے بجائے شوق عمل کی ترغیب دی گئی اور ان قدور کو رائج کرنے کے لئے اس نے بہترین ذریعہ یہی سمجھا کہ نوخیز نسلوں کی تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ تمام پرانی بندشوں اور تعصبات سے رہا ہو کر آزادی، اخوت اور عمل کی فضا میں تربیت پائیں۔ تاکہ یہ تعلیم ان کو "زندگی دے اور زندگی فراوانی کے ساتھ دے۔"

سینڈرسن نے جو تعلیمی طریقے رائج کئے ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کا تعلق خاص طور پر انگلستان کے حالات کے ساتھ ہے لیکن اس کے تعلیمی اصول اور خیالات اور دور حاضرہ کی مشکلات اور مسائل کا تجزیہ ایک عالم گیر اہمیت رکھتا ہے اور ہندوستان کے اُستادوں کو چاہیئے کہ تنقیدی نظر سے اس زبردست ماہر تعلیم کی زندگی اور خیالات کا مطالعہ کریں۔

خواجہ غلام السیدین

تعلیم کی ظاہری غرض اور انتہائے مقصد

(از جناب آنریبل مولوی خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم بی اے ایل ایل بی)

یہ مضمون والد مرحوم نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پیشتر ۱۹۱۴ء میں لکھا تھا اور اس کو اپنے رسالۂ "عصر جدید" (دور ثانی) میں شایع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے تعلیم کے متعلق جن خیالات کو ظاہر کیا ہے ان کی اہمیت مستقل ہے اس لئے میں اس پر غور مضمون کو رسالۂ تعلیم و تربیت کے پرچوں کے لئے دیتا ہوں۔

(خواجہ غلام السیدین)

تعلیم کی غرض

کسی قوم، کسی مذہب، کسی نظام تمدن کو لے لو جب کھوج لگاؤ گے تعلیم کی غرض اتنی ہی ملے گی کہ یہ دو پایہ جانور جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات ناطق۔ ذی عقل اور خدا کی تصویر اور خلیفۃ اللہ کہتا ہے۔ سچ مچ سرتاج مخلوقات بن جائے۔ اور جو قوتیں اس میں مخفی ہیں وہ آشکارا ہو جائیں جس سے اس کو بھی فائدہ ہو اور باقی مخلوق کو بھی۔

سب مخلوق خدا کی اطاعت کرتی ہے

مٹی۔ پتھر۔ لوہا۔ دریا۔ بادل۔ پہاڑ۔ زمین۔ آسمان۔ تارے۔ کیڑے شیر اور ہاتھی غرض جملہ مخلوق جس غرض کے لئے بنائی گئی ہے بغیر کسی بیرونی یا ظاہری مدرسے مکتب یا معلم کے اپنی اپنی غرض پوری کرتی ہے اور اپنا اپنا فرض بجا لاتی ہے۔ یہ سب خدا کی تسبیح و اطاعت اپنے اپنے طریقہ سے کرنے میں مصروف ہیں۔ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ (جمعہ ۶۲/۱) تعریف کرتی ہے خدا کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے ایسا خدا جو مالک ہے۔ پاک ہے۔ غالب ہے۔ دانا ہے۔

انسان آزاد ہے

لیکن انسان کی حالت جداگانہ ہے اس میں مد و جزر کی قدرت اور بڑھنے

اور گرنے دونوں کا مادہ ہے اسی وجہ سے آدمی زادہ کی تعلیم و تربیت حد درجہ لازم ہے اور ان وحشیوں کو چھوڑ کر جو نرے جانوروں کی طرح جیتے ہیں ہر شخص چاہتا ہے کہ اپنے اور اپنے بچوں کے بہبود کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام کرے اور جس قدر جس سے بن پڑتا ہے کوشش کرتا ہے کہ اس کی زندگی عزت و آرام سے بسر ہو۔ اس کے تین طریقے اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

تقلیدی نظام

(الف) ایک طریقہ تقلید ہے۔ تقریباً سب لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بزرگ زیادہ لایق اور تجربہ کار تھے۔ جس طرح وہ دنیا میں بسر کر گئے وہی طرز ہم کو اختیار کرنا چاہئے۔ وہ لوگ اپنے دن کامیابی سے پورے کر گئے۔ اُن کی بٹیا کو چھوڑ دینا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ نو ایجاد باتوں کے تلاطم سے دور رہیں ؎

به دریا در منافع بے شمار است
و گر خواہی سلامت بر کنار است

اس تقلید کا دخل علم میں عمل میں مذہب میں بلکہ ایجادات تک میں بہت کچھ ہے لیکن جب اکثر آدمی بے سمجھے تقلید پر عمل کرنے لگتے ہیں اور زمانہ اور حالات کے بدلنے پر ویسے کام نہیں کرتے جو ایسی صورتوں میں اُن کے دانش مند بزرگ کرتے۔ وہ علمی ترقی کرنے یا اشرف المخلوقات کے درجے تک پہونچنے کے ناقابل ہو جاتے ہیں اور کلام مجید کے اس الزام کی زد میں آجاتے ہیں جو کفار قریش پر عاید ہوتا تھا کیوں کہ وہ ہر اچھی بات کے رد کرتے وقت کہا کرتے تھے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک خاص طریقہ پر دیکھا اور ہم انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ ان کا قول بیان فرماتا ہے بل قالوا انا وجدنا آبائنا علیٰ امۃ و انا علیٰ آثارھم مھتدون (زخرف ۲۲) بلکہ انھوں نے یہ کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم ان کے قدم بقدم ٹھیک رستہ پر چل رہے ہیں۔

(ب) دوسرا طریقہ مشاہدہ اور تجربہ ہے۔

نظام تجربہ و مشاہدہ اور مذہب

بار بار کے دیکھنے، سننے، چھونے، سونگھنے، چکھنے سے ہم کو معلوم ہوا اور یہی ہمارے بزرگوں کو معلوم ہوا تھا۔ بلکہ

ہر انسان کو معلوم ہوسکتا ہے کہ فلاں شے آدمی کے لئے ضرر رساں ہے اور فلاں سودمند ہے اسی طرح لوگ تجربے کرتے گئے۔ سبق سیکھتے گئے نئے مشاہدے کرتے گئے آخر ایک نتیجہ نکالا اس پر عمل کرنا شروع کیا اور فائدہ اٹھایا۔

قدیم یونانی تمدن اور موجودہ زمانہ کی تعلیم و تہذیب کا یہی ماخذ ہے اور حکمائے سابق مثل افلاطون و ارسطو و سقراط و فیثاغورث وغیرہ کی تعلیم اور موجودہ یورپین تہذیب کی بنیاد زیادہ تر اسی نظام تجربہ و مشاہدہ پر ہے۔ کوئی دوسرا نظام مذہبی اس طریقہ کو اور عقل کے ایسے استعمال کو الزام دینے اور اس کی مذمت کرنے کے لئے آمادہ ہو تو ہو۔ مگر اسلام نے جابجا اس طریقہ کی بے حد تعریف کی ہے اور خدا کے جو بندے کسی کام کو بہترین سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اُن کو خاص طور پر اپنے پیغمبر کی معرفت کی خوش خبری دی اور ایسے آدمیوں کو صاحبان عقل فرمایا حیث قال عزوجل

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه (زمر ۲۹/۱۹)

اے پیغمبر ہمارے ان بندوں کو خوش خبری سُنا دو جو کلام کو سنتے ہیں اور سب سے بہتر بات کی پیروی کرتے ہیں۔

قرآن شریف میں عقل کے استعمال اور غور و فکر کرنے اور مشاہدہ کرنے اور نتیجے نکالنے کی بار بار فرمائش کی گئی ہے اور بے شمار آیات میں علل و معلول کے سلسلہ کو ثابت کیا ہے مثلاً

لیس للانسان الا ما سعیٰ (نجم ۲۷/۵) انسان کو صرف کوشش سے متاع ہے اور

کل نفس بما کسبت رهینة (مدثر ۲۹/۷) ہر نفس جو کچھ اس نے کمایا ہے اس [illegible] میں رہن ہے۔

عقل کے مخالف اہل مذاہب

بیشک ایسے مذاہب بھی ہیں جو عقل کو اپنی زبان سے مردود کہتے ہیں اور اسلام میں بھی ایسے فقہا محدثین اور مصنفین گذرے ہیں جنہوں نے اس کی ہجو کی ہے مگر یہ ان کی غلط فہمی تھی یہ لوگ جو خود عقل کے خلاف رہے ہیں بلکہ دین میں عقل کے استعمال کو گمراہی سمجھتے تھے اس کی وجہ مولانا علی ابن ابی طالب

کے اس مقولہ سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ "الناس اعداء ماجھلوا" آدمی جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہوتے ہیں۔

عقل کے بدگو یا تو وہ لوگ ہیں جو چھچھورے اور خام عقل آدمیوں کی ظاہری عقل پر بیہودہ تکیہ کرنے اور بے موقع غرور کی وجہ سے عقل سے متنفر ہو گئے ہیں یا وہ لوگ ہیں جن کے اغراض کو عقل کے استعمال سے نقصان پہنچا ہے۔ مذہب صحیح کبھی عقل کا دشمن نہیں ہے۔

فلسفی مذاہب

جن مذاہب اور فرقوں کی بنیاد حکمت اور فلسفہ پر ہے وہ تجربہ اور مشاہدہ کو اپنی بنیاد قرار دیتے ہیں مگر ایسے ادیان کو میں مذاہب کے نام سے نامزد نہیں کر سکتا۔ مثلاً بودھ مت، یا جیسے فلاسفۂ یونان مشائی ہوں یا اشراقی، یا ہمارے زمانہ کے برہم سماج اور ایک معنی میں آریہ سماج بھی۔ یہ مذاہب وحی والہام کے مخصوص معنی میں قائل نہیں ہیں بلکہ خاص آدمیوں کے تخیلات اور آرا یا انتخابی عقاید کا نام انھوں نے مذہب قرار دے لیا ہے۔

سماعی ادیان

پھر بعض ادیان ایسے ہیں جن کی بنا سراسر سماعیات یا تقلید پر ہے اس میں تمام وہ موجودہ مذاہب شامل ہیں جو انسان کے بچپنے میں نکلے تھے اور جن میں بت پرستی کم و بیش علانیہ موجود ہے۔

سامی مذاہب اور موسویت

درحقیقت وہ مذاہب جو ایک امید اور مستقبل رکھتے ہیں اور جو نظام ہائے سائنس اور تمدن کا مقابلہ کر رہے ہیں وہ صرف سامی یا کنعانی مذاہب ہیں۔ ان کے تین نظام اس وقت موجود ہیں۔ یعنی موسوی، مسیحی، اسلامی ان میں چند بڑی بڑی باتیں مشترک ہیں۔ ان میں سے مسلک موسوی کو اس وقت بحث سے الگ رکھنا چاہیے کیوں کہ اس کی تعلیم اپنی قوم اور نسل بنی اسرائیل سے محدود ہو گئی ہے اور گو اس کے تابعین میں قوم سازی کے لیے تین صفتیں موجود ہیں۔ یعنی شدت عصبیت، دولت کو اکٹھا کرنا اور ایک حد تک علم بھی۔ مگر صدہا سال سے اس کے بہترین لوگ اسلام یا مسیحیت میں جذب ہو چکے ہیں۔ اب یہود میں سب دنیا کو تعلیم دینے یا ایک قانون ادیان کے ماتحت مختلف نسلوں کو لانے کی بلند نظری

گویا ختم ہوگئی اور صرف یہ خواہش اور احساس باقی ہو کہ سمٹ کر دوبارہ کنعان میں آکر آباد ہوجائیں اور بزرگوں کی پولٹیکل ناموری اور شہرت کو بحال کریں۔

مسیحیت مگر مسیحیت اور اسلام دنیا کو تعلیم دینے میں باہم دو رقیب ہیں۔مسیحیت میں وہ سب اعلیٰ ترین اخلاقی قواعد واصول موجود ہیں جو انسان سوچ سوچ کر نکال سکتا ہے اور پھر بھی شاید کامیاب نہ ہو۔لیکن یہ مذہب غیر سامی تصورات (یعنی یونانی تخیلات اور مابعد افلاطونی حکماء کے عقاید اور یورپین رجحانات کا اس قدر تابع ہوگیا ہو کہ وہ بمشکل ایک سامی یا کنعانی مذہب کہلایا جا سکتا ہے۔

گو سائنس اور جدید تعلیم نے اس کی دینی بنیادیں کھوکھلی کردی ہیں۔لیکن کلیسا کی پولٹیکل اور مالی طاقت زبردست ہو اور مسیحی قوموں کے دنیاوی عروج نے دین کی عمارت کو سر بفلک کر دکھایا ہے۔

اسلام اور عقل مگر اسلام نے تجربہ اور مشاہدہ کی ماتحت چٹان یعنی عقل وادراک کو واقعی طور پر آزادی بخشی ہے۔اس کے خلاف جو کچھ توہمات یا تخیلات ہیں وہ دین کا منشا نہ سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔اسلام نے بشیمار آیات قرآنی میں جن کے دہرانے کا یہ موقع نہیں ہو قرار دیا ہو کہ انسان کی ہدایت اور اس کی زندگی کو صراط مستقیم پر لانے کے لئے خدا تعالیٰ نے دو ارکان قرار دئے ہیں۔حجۃ ظاہرہ اور حجۃ باطنہ۔حجۃ ظاہری میں وہ نشان ہیں جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں یعنی انبیاء' اوصیاء' اولیا۔حجۃ باطنی یا پوشیدہ نشان عقل ہو اور حدیث میں اوّل ماخلق اللہ العقل آیا ہو (یعنی سب سے پہلے خدا نے عقل کو پیدا کیا)

الہام تکمیل عقل کے لئے ہے ان دونوں نشانات میں در اصل کچھ اختلاف نہیں ہو مگر قصور عالم اور ظاہر بینی کی وجہ سے بعض ذی اثر آدمیوں کی تقلید یا خود غرضی' و ہوا و ہوس کے غلبہ سے جب آدمی غلط راستہ پر چلنے لگتا ہے تو مذہب کی بندشیں ناگوار معلوم ہونے لگتی ہیں۔ورنہ اسلام کی الہامی تعلیم کا اصلی مفہوم تقریباً

وہی ہے جو حضرت عیسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) نے ایک موقع پر اپنی اور موسوی تعلیم کے تعلقات کے بارے میں فرمایا تھا۔ ٹھیک الفاظ مجھ کو یاد نہیں مگر وہ تقریبًا اس طور پر انجیل میں مذکور ہیں "خیال مت کرو کہ میں قانون (شرع) موسوی کو منسوخ کرنے کے لئے آیا ہوں بلکہ میں اُس کی تکمیل کے لئے آیا ہوں"۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "زمین و آسمان اپنی جگہ سے ٹل جائیں گے مگر ایک شوشہ قانون (یعنی شرح موسوی) کا اپنی جگہ سے نہ ٹلے گا" اسی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اسلام بھی عقل انسانی کی تکمیل کے لئے آیا ہے۔ زمین و آسمان اپنی جگہ سے ٹل جاویں گے مگر خدا تعالیٰ نے جو قوانین قرار دیے ہیں وہ اٹل رہیں گے۔

ولن تجد لسنة الله تبديلا۔ ولن تجد لسنة الله تحويلا (احزاب ۳۳/۶۲)

خدا کے طریقے اور سنت میں کوئی تبدیلی یا راستہ کا بدلنا تو نہ پاوے گا۔

فطرة الله التی فطر النّاس علیها لا تبدیل لخلق الله (روم ۲۰/۲۹)

خدا کی ایک فطرت ہے جس پر لوگوں کو بنایا گیا ہے۔ خدا کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

جدید تعلیم اور اسلامی تعلیم کا فرق

مگر پھر بھی آج کل کی مادی تعلیم و تہذیب یا مغربی فلسفے اور وحی و الہام کی تعلیم میں کچھ فرق ضرور پایا جاتا ہے مگر یہ تناقص یا مخالفت نہیں ہے وہ فرق ایسا ہی ہے جس کو تکمیل کہہ سکتے ہیں اور جہاں کہیں مخالفت ہے وہ ٹھیک ہے مگر موجودہ تہذیب کے دلدادگان کی عقل یا ہوا نے قطعًا غلطی کی ہے اور اس زندگی کو چند سال کے اندر محدود سمجھنے کے باعث ٹھوکریں کھائی ہیں۔ مثال کے طور پر چند باتیں عرض کروں گا۔

(۱) آدمی کو کیسا بننا چاہیے

جدید تعلیم ایک خوش باش اور کامیاب آدمی بنانا چاہتی ہے اور بس اسلامی تعلیم ایک انسان کامل بنانا چاہتی ہے جس کے مفہوم میں دنیاوی کامیابی شامل ہے۔ جدید تعلیم جسمانی ضرورت کو ترقی کی بنیاد قرار دیتی ہے اسلامی تعلیم ترقی کی بنیاد جسمانی ضرورتوں ہی کو نہیں بلکہ اس اعلیٰ روحانی فطرت کو بھی قرار دیتی ہے

جو خدا نے ہم میں رکھی ہو کیوں کہ ہم میں تو ایک خاص روح عطا کی گئی ہو۔ نفخت فیه من روحی
ایک روح جو مخلوق خدا کی ہے اس میں پھونکی گئی۔

(۲) ترقی کی غرض اور غایت کیا ہو

جدید تعلیم کہتی ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔ محنت کرو۔ جذبات پر قابو رکھو اتفاق اور اتحاد کے ساتھ مل جل کر کام کرو۔ کیوں کہ زندگی کی شرائط اور نیچر کی کشمکش ایسی سخت ہو کہ اگر لوگ مل جل کر ایک دوسرے کی مدد سے کام نہ کریں اور کل کے لئے آج تکلیف نہ اٹھائیں تو پیدائشی کمزوری عناصر کے خواص اور نیچر کے قوانین کی وجہ سے آدمی کمزور اور بالآخر جلد فنا ہو جائیں گے۔

مذہب کی تعلیم بالکل یہی ہو:۔

(۱) لیس للانسان الا ما سعیٰ (نجم ۵۳) انسان کے لئے صرف وہی ہو جو کوشش کرے۔

(۲) تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (مائدہ ۵)

ایک دوسرے کی مدد نیکی اور پرہیزگاری میں کرو۔ اور گناہ اور ظلم میں نہ کرو۔

(۳) والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس (آل عمران ۱۲۸)

یعنی غصہ کو پی جانے اور لوگوں سے درگذر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہو۔

مگر اسلام اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کام محض اپنی دنیاوی ہستی قایم رکھنے کے واسطے اور مرنے سے بچنے کی غرض سے نہ کرو بلکہ اس لئے بھی کہ تم سب ایک رحیم، حکیم اور عادل ہستی کے کارکن ہو اس دنیا میں عمل کرنے سے دوسری زندگی میں تم کو اعلیٰ مدارج ملیں گے جو معیار انسان کامل یا دوسرے لفظوں میں مسلمان کامل کے لئے رکھا گیا ہو۔ وہ بہت زیادہ اعلیٰ ہے بہ نسبت اس معیار کے جو معمولی آدمی کے لئے تعلیم جدید قرار دیتی ہو۔

نسل انسان کے افعال کا اثر کہاں تک ہے

تعلیم جدید کی نظر اور انتہا صرف اس مقام تک پہونچتی ہو جہاں خون کا دوران رگوں میں بند اور قلب کی حرکت موقوف ہو جاتی ہے یعنی صرف، چند سال آگے تک۔ لیکن جن روشن دماغ اور عالی خیال حکماء جدید نے مثل

کومٹ فرانسیسی (Comte) اور فریڈرک ہیریسن فاضل انگیسی کے ایک مذہب انسانیت کی تعلیم دی ہے جو فلسفی نظر سے نوع انسان کی خدمت کو غرض زندگی قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر اس مقام تک جاتی ہے جب کہ نسل انسانی فنا ہو جائے گی یعنی جب مثلاً کوئی دمدار ستارہ زمین کے محور میں آکر ہماری ہستی کو نیستی سے بدل دے اور ایسا نتیجہ ممکن ہے کہ اسی سال یا لاکھ سال بعد واقع ہو غرض یہ تعلیم بھی محض انسانی حدتک ہمارے کاموں کے نتائج کو قرار دیتی ہے۔ اسلامی تعلیم اس کی تکمیل کر کے کہتی ہے کہ نہ صرف چند سال یا چند ہزار سال کے لئے بلکہ ابد یعنی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کام کرو تم فنا ہونے والے نہیں بلکہ دوسری شکل میں عند ملیك مقتدرٍ (قمر ۵۴) یعنی خدائے صاحب قدرت کے پاس باقی رہو گے۔ اور تم اپنے اعمال کے ذریعے سے اُس کے خاص بندوں میں داخل ہو کر علم و معرفت کے مدارج حاصل کر سکتے ہو۔ نشأۃ موجودہ سے نشأۃ اخریٰ اور حیاتِ دنیا سے حیات عقبیٰ تک تم کو لے جائیں گے۔ جو عمل تم یہاں کرتے ہو وہ ایک بیج ہے جس کا کچھ پھل تم کو یہاں بھی ملے گا لیکن زیادہ تر بعد میں ملے گا جو سادہ لوح یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال کا نتیجہ صرف اس زندگی میں ملتا ہے اور اس غرض پر اُن کے اخلاق قائم ہیں ان کے لئے قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ہم کو یہ خیال نہ ہوتا کہ کمزور آدمی گمراہ ہو جائیں گے اور ڈگمگا جائیں گے تو کفار کے در و دیوار سونے چاندی کے کر دیتے۔

(۴) اخلاق کی بنیاد

جدید تعلیم یا مغربی فلسفہ قرار دیتا ہے کہ اعلیٰ خود غرضی اخلاق کی بنیاد ہے۔ اعلیٰ خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ عقل دور اندیش اپنی غرض اور مصلحت کو سمجھے۔ یہ نہیں کہ اس وقت جس بات سے آرام و آسائش معلوم ہوتی ہے اور کل کو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے اس سے ضرر ہو اس کو اچھا سمجھ کر انسان کرنے لگے تو یہ ادنیٰ غرض ہے۔ اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ شخصی اور نوعی غرض بالکل جائز و بجا ہے مگر وہ ادنیٰ درجہ کی ہے اصل انسانیت کا معیار یہ ہے کہ ذاتی خواہشوں کو مشیت ایزدی، قوانین کل اور مرضیٔ مولا کے تابع کرے۔

اذ قال اللہ سبحانہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ ۲/۲۵۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی اپنی کل قوتوں کو اور دولت کو یہاں اس لئے خرچ کرے کہ یہ زندگی اسی لئے دی گئی ہے کہ اپنے عمل سعی اور ایثار سے اس کو حیات ابدی دی جائے جو لوگ اس اصول کو نہیں سمجھتے اور خدا کی دی ہوئی قوتوں اور نعمتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے وہ کافر یعنی ناشکرے اور ظالم ہیں یعنی تاریکی میں ہیں۔

(۵) انسان کی مجبوری اور آزادی

جدید تعلیم اور سائنٹفک اصول کہتے ہیں کہ انسان نیچر کے ہاتھ میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ جماعت اور ماحول کی بندشوں سے خود بخود نہیں نکل سکتا۔ بلکہ مجبور ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ ایک بڑی حد تک انسان اپنی ضرورتوں سے اور ماحول سے مجبور ہے مگر اس وجہ سے کہ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنانا تجویز فرمایا ہے اس کو ایک خاص روح و عقل و تمیز و اختیار دے دیا گیا ہے تاکہ انسان کی روح و عقل مادی مجبوریوں اور تمدن کی بندشوں سے نکل کر اعلیٰ تصورات اور عملی اصول سے دوبدو ہو جائے اور انسانی فعل کو عقل کا تابع کر سکے۔

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (دہر ۷۶/۳)

ہم نے راستہ دکھایا خواہ آدمی صحیح راستہ پر چلے خواہ غلط راستہ پر۔

دوسری جگہ قرآن شریف میں تبلایا ہے۔

خلقهٗ فقدرهٗ ثم السبیل یسرهٗ ثم اماتهٗ فاقبرهٗ ثم اذا شاء انشرہ۔

وہی ذات خداوندی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ پھر اس کا اندازہ مقرر کیا پھر بذریعہ وسائل اور سامان مہیا کرنے کے اس کا راستہ سہل کیا اور پھر اس کو موت دی اور ڈھانپ دیا۔ پھر جب اس کی مشیت ہو گی اس کو پھر اٹھائے گا۔ (عبس ۸۰/۱۹-۲۲)

عام مسلمانوں کی غلط فہمی یہاں پر بالاختصار اس غلطی کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو ظاہر میں لوگوں کو اسلام میں واقع ہوگئی ہے - خداوند تعالیٰ کے مطلق محیط علی الکل قوانین فطرت کی علت ازلی اور خالق ازلی ہونے کی حیثیت سے بعض آیات قرآن شریف میں ایسی ہیں جن سے انسان کی مجبوری کا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ سوائے ان افعال کے جن میں عذاب و ثواب یا فساد و مصلحت ارادی ہے انسان مجبور ہے لیکن اسلام میں کہیں ایسی تعلیم نہیں ہے کہ آدمی کے بُرے افعال خدا کرتا ہے بلکہ یہ خیال کفار قریش کا تھا - اس کا ذکر قرآن شریف میں اس طرح آیا ہے -

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا -

جب وہ کوئی ناپاک بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اس پر عامل دیکھا ہے اور خدا نے اس کا حکم کیا ہے (اعراف ع۳)

اُن کی بات کی خدائے تعالیٰ تکذیب کرتا ہے -

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ - کہدے کہ خدا ناپاک بات کا حکم نہیں دیتا (اعراف ع۳)

اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ - میرے خدا نے مجھ کو عدالت کا حکم دیا ہے (اعراف ع۳)

بدبختی یہ واقع ہوئی کہ کفار قریش کے اس خیال کی تائید جو اکثر عرب کے دلوں میں جاگزین تھا اور شاید اب بھی اسّی فی صدی مسلمان اس کے قائل دیکھے جائیں گے - پالٹیکل وجوہات سے عرصہ تک بنی اُمیہ کے سلاطین و عمال نے اس کی تائید کی - کیوں کہ جب لوگ ان کو مظالم اور فواحش پر طعن کرتے تھے تو وہ نہایت متانت سے جواب دیتے تھے کہ تم احمق ہو ہم کیا کرتے ہیں سب خدا کرتا ہے - وہ مابعد الطبیعات اور فلسفۂ الٰہی کے دقیق مسائل کو اپنی بداعمالی کے لئے بطور جواب پیش کرتے تھے -

(۶) جبر معرفت میں داخل ہوگیا لیکن یہ خیال کہ خدا سب بدی کرتا ہے جب پالٹیکل اور فقہی دائرہ سے نکل کر تصوف اور معرفت اور خاص کر فارسی و اردو

شاعری کی خرابی پر درست ہونے لگا تو وہ اور ہی زیادہ مجلّا اور خوش نما نظر آنے لگا اور مقبول خاص و عام ہو گیا۔ خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں ؎

گناہ گرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است

یعنی گناہ تو ہمارا نہیں مگر ادب کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی طرف اسے منسوب کریں۔
میر تقی کہتے ہیں ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں ہیں سو خود ہی کرتے ہم کو عبث بدنام کیا

(۷) علم کی بنیاد اور ماخذ

علم کی بنیاد کے بارے میں تعلیم جدید کہتی ہے کہ اس کی اصلی بنیاد حواس خمسہ پر ہے۔ یہ حواس خمسہ دماغ کے ایک جال پر اثر کرتے ہیں، جو مرکز انسانی نظام کا ہے۔ بار بار حواس خمسہ کے تھپیڑے پڑنے سے اس جال (یعنی دماغ) میں یہ قابلیت پیدا ہو گئی ہے کہ باہر کے اثرات کے نقش دماغ پر لے لیوے یعنی علم ظاہری حواس سے شروع ہوتا ہے اور ظاہری حواس پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ اس کے علاوہ ایک علم بلکہ متعدد علوم اور ہیں جن کے ماخذ جدا گانہ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے خاص انسان پیدا کئے ہیں اور ان میں ایک ملکہ و استعداد تام جذب حقائق اور معرفت الٰہی کی پیدا کی ہے جیسا کہ آنحضرتؐ سے خطاب کر کے قرآن شریف میں کہا گیا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (سوریٰ ۴۲/۵۲)

ان خاص الخاص انسانوں کا کام ہے کہ آدمی کی رہنمائی کے لئے بقدر ضرورۃ علوم ظاہری اور مخاطب کے استعداد فطری کے بقدر علوم باطنی تعلیم دے۔ چنانچہ سورۂ جمعہ کی جو آیت میں نے شروع تقریر میں عرض کی تھی جہاں خدا نے بتایا ہے کہ سب مخلوق ہماری تسبیح کرتی ہے وہاں انسانوں کی بابت خاص طور پر کہا گیا ہے۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ ۳)

کلام الٰہی کو سُنانا اور سمجھانا تزکیۂ نفس اپنی خاص قوت سے کرنا - دوسرے الفاظ میں کتاب اور حکمت یعنی گہرے دین کی غوامض بتانا یہ امور حواس خمسہ سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ صرف اسی نبی سے حاصل ہو سکتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں کتاب اور حکمۃ کا معلم بتایا ہے اور خود اس رسول نے نہایت وضاحت اور دعدے سے اعلان کیا ہے کہ میں علم اور حکمت کا خزینہ ہوں - جہاں کہ بموجب اُن احادیث کے جن سے انکار نہیں ہو سکتا - فرمایا

انا دار الحکمۃ وعلی بابہا - انا مدینۃ العلم وعلی بابہا -

اسلامی تعلیم آنحضرت کو محض ایک تجربی ریفارمر یا نعوذ باللہ ایک بڑا رام موہن رائے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور نہ وہ قرآن شریف کو آنحضرتؐ کی تصنیف قرار دیتی ہے اور نہ عقلاً یہ بات ممکن ہے کہ عرب کی نیم وحشی اور جاہل قوم میں بغیر خداوند تعالیٰ کی خاص مدد کے ایک شخص نہ صرف قرآن شریف لاوے بلکہ دعوے کرے کہ علم حقیقی کا میں شہر ہوں اور کہے کہ میں کافۃ الناس کے لئے بھیجا گیا ہوں اور کہے انا رسول اللہ الیکم جمیعاً - میں تم سب کے لئے خدا کا فرستادہ ہوں اور اس زور و فصاحت سے اعلان کرے کہ سب علوم روحانی مجھ ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں یہ قول ایک رسمی ریفارمر یا پالٹیکل لیڈر نہیں کہہ سکتا - جب کہ بظاہر زیادہ عالم لوگ موجود ہوں -

(۸) اصول اخلاق کو سوسائٹی بدل سکتی ہے یا نہیں

تعلیم جدید کہتی ہے کہ تمدن یا سوسائٹی ایک معاہدہ ہے اور سوسائٹی مفروضہ اخلاق سکھاتی ہے آج ایک بات اچھی ہے کہ کل ہم سب مل کر کسی مصلحت سے اس کو بُری قرار دیں تو وہ بُری ہو سکتی ہے یعنی ہر اصل جب تک منسوخ نہ ہو مضبوط ہے ورنہ ریت کی بنیاد ہے - رسم و رواج و اخلاق دراصل ایک ہیں اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ سوسائٹی کے رسم و رواج (فقہی اصطلاح میں مروت یا فیشن) ایک معاہدہ ہے - لیکن اخلاق و عمل کے اصول فطری ہیں - ہزار تقنن اور پارلیمنٹیں ان کو بدل نہیں سکتیں یہ اصول عقل میں ملا دئے گئے - ان کی مضبوط رسی انسان کی کوشش سے ٹوٹ نہیں سکتی

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ نیکی اور بدی ایک دوسرے سے کھلی کھلی الگ ہیں۔ پس جو شخص طاغوت کی اطاعت نہ کرے اور خدا تعالیٰ پر یقین رکھے اس نے ایک مضبوط رسی پکڑ رکھی ہے جو ٹوٹ نہیں سکتی۔ (بقرہ ۲/۲۵۷)

(۹) **قوانین سے ہم مجبور ہیں** تعلیم جدید کہتی ہے کہ قوانین قدرت کی جکڑ بند سے ہم مجبور اور مادہ کے خواص کے ضرور ہم غلام ہیں عقاید اور مذہب میں آزاد ہیں جو خیال دینی ہم چاہیں رکھیں۔ اسلامی تعلیم سکھاتی ہے کہ مادیات میں بھی تم اس معنی میں آزاد ہو کہ اُن کو اپنے فوائد کے لئے استعمال کرو یا برخلاف۔ یعنی آگ سے کھانا پکاؤ خواہ اس سے ہاتھ جلالو اسی طرح مذہب میں بھی تم آزاد ہو کہ اس کو مانو یا نہ مانو۔ اس کی ہدایت پر عمل کرو یا نہ کرو۔ لیکن جس طرح خدا کے مادی قوانین تمہارے مشورہ بغیر عمل کئے جاتے ہیں اسی طرح مذہبی قوانین کی روگردانی بھی تمہارے دلوں کو سیاہ اور انجام کو خراب کرتی ہے اور قعر ہلاکت میں ڈالتی ہے۔ ورنہ خیالات اور عقاید کے میدان میں خواہ مادے کے خواص میں مساوی ذمہ داری ہر شخص کی ہے۔

(۱۰) **غرض پیدائش عالم کیا ہے** تعلیم جدید کہتی ہے کہ ہم کو نوع انسان کی غرض پیدائش معلوم نہیں ہے غالباً فضا یا ایتھر میں ایک اتفاقی موج مادہ کے سالمات کی پیدا ہوگئی ہے جس سے سالمات اجزائے لایتجزئ نے آپس میں مل جل گئے اور اس سے پروٹو پلازم یعنی خمیر عالم کی بنیاد پڑ گئی اور ایک زمانہ دراز کے بعد جماد اور پھر نبات اور پھر حیوانات اور پھر انسان دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئے۔

اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ جسمانی نمو ہوا اور ہوگا مگر انسان کی پیدائش ایک مصلحت تام کی ماتحت ہے اور وہ مصلحت ہے روحانی نمو یا ارتقا کہ دنیا کی کشمکش کے باعث صداقت، عدالت اور عمدگی میں ترقی ہو ناحق اور باطل معدوم ہوتا جائے اور حق باقی رہے اور ترقی کرے۔ چنانچہ ایک جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ کیا تم یہ خیال

کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹو گے (مومنون ۲۳/۱۱۵)

پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں (یعنی دونوں کو ٹکراتے ہیں) حق باطل کو (رفتہ رفتہ) چکنا چور کر دیتا ہے۔ اور باطل زائل ہو جاتا ہے (انبیا ۲۱/۱۸)

(۱۱) **اپنی عزت کرنے کے معنی**

جدید تعلیم اور قدیم یونانی فلسفہ کہتا ہے کہ اپنی عزت کرو اور اپنے حقوق پر قائم ہو جاؤ۔

اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ اپنے حقوق کو طلب کرو اور اپنے فرائض کو بھی ادا کرو۔ اور اپنی عزت اس حیثیت سے کرو کہ خود کو خالق کی کائنات کی منشا سے وابستہ کر لو۔ اپنی عزت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زمین پر اکڑ کر چلو اور دوسروں کے حقوق پر غصب کے ذریعہ سے قبضہ کر لو۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا

زمین پر اکڑ کر مت چل تو زمین کو پھاڑ نہیں ڈالے گا اور طول میں پہاڑ تک نہیں پہنچ جائے گا۔

(۱۲) **معاشرت میں اعتدال**

جدید تعلیم سکھاتی ہے کھاؤ۔ پیو اور خوش رہو۔ کل تم مر جاؤ گے
اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ کھاؤ پیو مگر حالت اعتدال سے نہ نکلو

کیوں کہ بے اعتدالی اور بیجا کام انسانیت کی موت ہے۔ كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (اعراف ۷/۲۹)

جدید تعلیم کے نزدیک اعتدال قائم رکھنے کے لئے خدا کے منشا اور علم مافوق الفطرت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دو پایہ جانور ایسا لائق واقع ہوا ہے کہ سب امور جانتا ہے وہ جانتا ہے کہ بے اعتدالی سے بدہضمی پیدا ہو جائے گی۔ کوئی آدمی لائق نہیں ہے تو ہم تعلیم دے کر اس کو درست کر لیں گے۔

اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ تعلیم تمہاری اصلاح میں ایک بے معنی چیز ہے۔ کیوں کہ اس کے لئے معلم کی ضرورت ہے تم معلم محض تجربے یعنی ایک بات کی تکرار کو قرار دینے موجب کہ بار بار جہالت

وحماقت ہی کا جلوہ نظر آتا ہے تو تجربی تعلیم دماغ اور اخلاق کو کیسے بالا کر سکتی ہے سرچشمہ علم کا وہ تعلیم ہے جو اوپر سے ہے وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا - (کہف ۱۵)

یہ بارہ باتیں جو میں نے محض بطور نمونہ اور مثال کے آپ کے سامنے عرض کی ہیں اُن سے آپ کو یہ امر غالباً آشکارا ہو گیا ہوگا کہ اسلام محض عقل لیکن عقل صحیح کی تکمیل کے لئے آیا ہے بلکہ سب مذاہب آسمانی کا یہی منشا ہے البتہ اس آخری مذہب نے باقی ادیان کی تکمیل کر دی ہے۔

مشنری مذاہب کا باہم موازنہ ان مذاہب میں جو داعی الی الحق ہیں یعنی جو دنیا کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں مسیحیت نیک افعال کو بمقابل عقیدہ اور ایمان کے بیکار سمجھتی ہے۔ کیوں کہ گناہ اعمال حسنہ سے نہیں بلکہ کفارہ سے بخشے جاتے ہیں۔ اسلام میں ایمان اور اعمال صالح دونوں کی حاجت ہے۔

بودھ مت اس لئے خلاف فطرت ہے کہ وہ دنیا کو ایک تکلیف دہ بلا اور حیات انسانی کو ایک نفرت انگیز شے سمجھ کر انسان کو اس گورکھ دھندے سے نکالنا چاہتا ہے اور آدمیوں کو دن رات ترک دنیا کی دعوت دیتا ہے۔ برخلاف اس کے اسلام رہبانیت کا مخالف ہے مگر اسی کاروباری اور دنیاوی زندگی میں وہ بقدر حاجت تمام اخلاق سکھاتا ہے جس کی بندوں کو ضرورت ہے۔

چھوٹے مذاہب میں یہود کی تعلیم زیادہ تر ایک نسل سے متعلق ہے اور اسلاف پر فخر اور قومی غرور اس کی زبردست چٹانیں ہیں۔ ہنود کا جدید فرقہ آریہ ایک قدیم کتاب پر تمام حقائق کی بنیاد رکھتا ہے۔ مگر وہ قدیم کتاب کسی طرح کسی ایک ملک کے لئے اخلاقی، روحانی و جسمانی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اور اس فرقہ کے ماننے والے خود بھی اپنی کتاب قدیم کو بہت کچھ بے پروائی سے دیکھتے اور اپنے دعوے کو صرف مسیحین اور مسلمین کی تقلید میں بیان کرتے ہیں۔ اور نہ واقعی طور پر وہ ایک جدید واعظ کے نظام کو مانتے ہیں۔ لیکن اصل مقصد اُن کا اصلاح تمدن ہے اور مختلف گھٹنے اور بڑھنے والے اور پر جوش لیڈروں کی رقابت میں رہ کر اور رقیب حریف ادیان پر کم و بیش سخت الفاظ میں نکتہ چینی کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی ہدایت کا کافی بندوبست

کر چکے ہیں۔

بعثت رسول کا منشار | بعثت پیغمبر اسلام کا عملی منشار جو حدیث معتبر اور متفق علیہ امت میں بیان کیا گیا یہی ہے۔

"بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، میں مقرر کیا گیا ہوں کہ اخلاق کی خوبیوں کی تکمیل کروں"

اسی میں تمام راز ترقی کا اسی میں سب فلسفہ تعلیم کا اسی میں سب دفتر تہذیب کا' اسی میں سب حقیقت تمدن کی چھپی ہوئی ہے۔ زندگی نام ہے عمل کا اور نیت اور غرض کا۔ عمل اور نیت پر اگر اخلاق یعنی اخلاق حسنہ کی عملداری ہے تو آدمی انسانیت اور تمدن کا مفید آلہ اور منشار الٰہی کا مستعد خادم ہے ورنہ حیوان سے بدتر ہے کیوں کہ اپنی زبردست عقل سے آدمی ایسے خبیث اور شیطانی افعال کر سکتا ہے اور کرتا ہے جو جانور نہیں کر سکتے۔

میں نے تقریر کے اس حصہ میں بطور نوٹ کے اور متن کے عرض کر دیا کہ بہترین تعلیم اسلام کی ہے۔ یہاں پر اس سے زیادہ وضاحت کا موقع نہیں ہے۔



تعلیمی تجربات

جامعاتِ آکسفورڈ و کیمبرج

(یہ برلن یونیورسٹی کے پروفیسر ولہیلم ڈیبلیس کی کتاب "انگلستان" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ مصنف نے انگلستان کا سفر اس لئے کیا تھا کہ وہاں کی تہذیب، تمدن اور تعلیم گاہوں کا بنظر غور مطالعہ کرے۔ یہ کتاب انکی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ ایڈیٹر)

یہ دونوں انگلستان کی سب سے قدیم یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کی بنا تیرھویں صدی کے وسط میں اور بعضوں کے نزدیک اس سے بھی پہلے پڑی۔ تاریخ سے ثبوت ملتا ہے کہ آکسفورڈ کا بیلیل کالج سنہ ۱۲۴۹ء میں اور کیمبرج کا پیٹر ہاؤس سنہ ۱۲۸۴ء میں موجود تھا۔ اصل میں یہ طالب علموں کی اقامت گاہیں تھیں، جہاں انھیں کھانے پینے کی چیزیں سستے داموں ملتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہاں اساتذہ بھی نوکر رکھے گئے اور یہ یونیورسٹی کی زندگی کا مرکز بن گئیں۔ جو لکچر یہاں دیئے جاتے تھے وہ اکثر طالب علموں کے لیئے یونیورسٹی پروفیسروں کے لکچروں سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں دونوں یونیورسٹیوں میں متعدد کالج قایم ہوئے، اور علوم انسانی (قدیم یونان و روما کے علوم) پڑھائے جانے لگے۔ اب یہ ساری انگریز قوم کے علوم و تہذیب کا مرکز بن گئیں۔ دونوں یونیورسٹیاں اصلاحِ کلیسا کی تحریک سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ آکسفورڈ میں خود جان وکلف جو انگلستان میں مذہبی اصلاح کا بانی تھا، درس دیتا تھا۔ کیمبرج پریسبیٹرین تحریک کا مرکز تھا، جس نے ملکہ ایلزبیتھ کی کلیسائی سیاست کی سختی سے مخالفت کی۔ یہاں سنہ ۱۵۸۹ء میں ایک "لامذہب" شخص فرانسس کیٹ جلا دیا گیا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ حکومت نے کچھ نرمی اور کچھ سختی سے کام لے کر دونوں یونیورسٹیوں کو اپنی کلیسائی سیاست کا حامل بنا دیا۔ سترھویں صدی کی خانہ جنگیوں میں دونوں یونیورسٹیاں

خصوصاً آکسفورڈ کی یونیورسٹی شاہی پارٹی کی پشت و پناہ بنی رہیں

خاندان اسٹوآرٹ کے دوبارہ تختِ سلطنت پر قابض ہونے سے سترھویں صدی کی قدامت پسندی کا رنگ اور گہرا ہوگیا۔ اس سے پہلے ٹیوڈر خاندان کے بادشاہوں نے بھی کالجوں اور یونیورسٹی کے باہمی جھگڑوں میں ہمیشہ کالجوں کا ساتھ دیا تھا۔ اسٹوارٹ بادشاہوں نے اس میں اور بھی مبالغہ کیا۔ بات یہ ہے کالجوں میں چھوٹی جماعتیں تھیں جن کو قابو میں لانا یونیورسٹی پر اثر ڈالنے سے زیادہ آسان تھا۔ پیورٹین (وہابیت کی) تحریکیں بعض کسی پس وپیش کے دبادی گئیں اور "قانون اتحاد عقائد" (Act of Uniformity) کی دفعہ ۳۹ کی رو سے تمام اساتذہ اس پر مجبور کیئے گئے کہ سرکاری کلیسا Anglican Church) کی پیروی کریں۔ وہ طلبہ بھی جو ان عقائد کے پابند نہ تھے، آکسفورڈ سے توسب کے سب اور کیمبرج سے ایک معقول تعداد میں نکال دیئے گئے۔ اس طرح یونیورسٹیوں کا رنگ بالکل بدل گیا۔ اب تک تو ان کا دروازہ ساری قوم کے لیئے کھلا تھا مگر اب وہ حاکم طبقے کے لیئے مورچوں کا کام دینے لگیں۔ لیکن اس میں بڑی حکمت عملی سے کام لیا گیا۔ یونیورسٹیاں ہر شخص کا، جو "انتالیس دفعات" پر دستخط کردے، خیر مقدم کرنے کو تیار رہتیں اور اس کے اندرونی عقائد کی کرید نہیں کرتی تھیں۔

انگلستان کا حاکم طبقہ ہمیشہ اُن لوگوں کو جو اُس میں منا چاہیں ملانے کے لیئے کشادہ دل سے تیار رہتا ہے۔ لیکن نیچے طبقے والے اور متوسط طبقے کے اکثر لوگ "انتالیس دفعات" پر دستخط کرنے سے انکار کرتے تھے۔ سرکاری کلیسا کے مخالف اپنے بچوں کو یونیورسٹیوں میں جو اس کلیسا کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں بھیجنے سے یہ بہتر سمجھتے تھے کہ اپنی بری بھلی تعلیم گاہیں الگ بنائیں۔ غرض یونیورسٹیاں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا مرکز بن گئیں۔ متوسط طبقے والے نہ صرف پادری کے پیشے سے بلکہ قانونی پیشے سے بھی محروم رہتے تھے۔ ان یونیورسٹیوں پر دنیا کی ساری تعلیم گاہوں سے زیادہ امارت کا رنگ چھا گیا۔

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ امرا کے لڑکے سب کے سب یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ اصل میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ پھر بھی یونیورسٹی کے طلبہ میں اُمرا کی تعداد کافی تھی اور یہ ہر چیز پر حاوی تھے۔ ان لوگوں کی ٹوپی میں سُنہرا پھُندنا ہوتا تھا، یہ کالج میں طلبہ کی میز پر کھانا نہیں کھاتے تھے بلکہ اساتذہ کی میز پر۔ اُنیسویں صدی میں یہ شکایت برابر دیکھنے میں آتی ہے کہ یونیورسٹیاں جو ابتدا میں علوم و فنون کا مرکز تھیں اور کالج، جو غریب طلبہ کے لیئے قایم کیئے گئے تھے، اب امیروں کی تفریح کا ذریعہ بن گئے ہیں اور غریبوں کا داخلہ یہاں اُصولاً تو نہیں مگر عملاً بالکل بند ہو گیا ہے۔

ریاست نے ان تبدیلیوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ جب تک امرا اور شرفا بلا شرکت غیرے یونیورسٹیوں پر قابض ہیں اُسے اُن کی طرف سے کوئی فکر نہیں اور جب تک حکومت کا نصب العین عدم مداخلت ہے کسی کو یہ خیال تک نہیں آتا کہ یونیورسٹیوں سے ہیئت اجتماعی کی فلاح کے لیئے مزید مطالبات کرے۔ جرمنی میں اُس زمانے میں مطلق العنان حکومت ہمیشہ یونیورسٹی کے معاملات میں مداخلت کرتی تھی۔ درس کی نئی مسندیں قایم کرتی تھی جب تعلیم میں سُستی ہو تو باز پُرس کرتی تھی۔ اُس نے طب، دینیات، قانون، علم السنہ کے خاص نصاب جاری کرائے اور جداگانہ سرکاری امتحانات کی بنا ڈالی۔ مگر انگلستان میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ پُرانے "اندرونی خود مختاری" کے اُصول کے مُطابق انگلستان کے دستور اساسی نے اعلیٰ تعلیم کو ادارت متعلقہ پر یعنی ماہرین فن کی جماعتوں پر چھوڑ دیا ہے۔ قانونی پیشے کی تعلیم سولھویں صدی سے بیرسٹروں کی جماعت نے اپنے ہاتھ میں لے لی اس لیئے یونیورسٹیوں کو اُصولاً اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ طبیبوں کی تعلیم جو صدیوں تک یونیورسٹی میں مطب کے طریقے پر ہوتی آئی تھی ۱۸۸۵ء سے ایک ماہرین فن کی جماعت یعنی انجمن تعلیم طب (Council of Medical Education and Registration) کے ہاتوں میں دیدی گئی ہے۔ پُرانا مطب کا طریقہ اب بھی ایک حد تک باقی ہے یعنی طبیبوں کی تربیت خاص اسپتالوں میں اساتذۂ طب کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں یہ

اسپتال یونیورسٹیوں ہی کے ماتحت ہیں اس لیئے گویا تعلیم یونیورسٹی ہی میں ہوتی ہے۔ پادریوں کا تقرر اسقف (Bishop) یا اس کا بطریق اعظم (Archdeacon) کرتا ہے۔ ان کے لیئے یونیورسٹی میں تعلیم پانے کی شرط نہیں ہے لیکن رسم یہی ہے۔ پادری ہمیشہ اور طبیب اور وکلا اکثر یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد اپنا پیشہ اختیار کرتے ہیں، لیکن وہ اس پر مجبور نہیں ہیں۔ ماہرین السنہ کے لیئے اب تک نہ کوئی خاص پیشہ ہے اور نہ کوئی مقررہ نصاب۔ مختصر یہ کہ یونیورسٹیاں معزز تعلیم گاہوں کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن پیشے کی تعلیم سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ اٹھارھویں صدی تک جب انگلستان پر "شرفا" (Gentry) کی حکومت تھی سرکاری ملازموں کا نام بھی نہ تھا کلیسا اور قانون دانوں کی جماعت "شرفا" کی حلیف تھی اور اُن کے لیئے اصول و ضوابط مقرر کرنا نہ منظور تھا اور نہ ممکن تھا۔ اس لیئے یونیورسٹیوں کی نشو و نما حاکم طبقے کے مقاصد کے لحاظ سے ہوتی رہی۔ یہ تعلیم گاہیں وہ مرکز بن گئیں جہاں اعلیٰ طبقے کے نوجوان یونان و روما کے علوم سے تھوڑی بہت واقفیت اور ذہنی استعداد حاصل کرتے تھے اور جہاں "شرفا" کے نصب العین کے مطابق شخصیت کی تربیت ہوتی یعنی ہر نوجوان "شریف" (Gentleman) بنایا جاتا تھا۔ اور باوجود انیسویں صدی کی اہم اصلاحات کے آکسفورڈ اور کیمبرج پر یہ رنگ اب تک غالب ہے۔ یہ مدارس آزاد تفکر اور علمی تحقیق کے مرکز نہیں ہیں بلکہ انگلستان کی تہذیب کے مولدہے ہیں۔ جرمنی کی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں آکسفورڈ اور کیمبرج میں جو نقائص یا خوبیاں ہیں اُن کا لب لباب یہ ہے۔ جرمنی کی یونیورسٹیوں میں اہل علم اور علمی پیشوں کے اُمیدواروں کی تعلیم ہوتی ہے اور آکسفورڈ اور کیمبرج میں شرفا (Gentleman) کی تربیت ہوتی ہے۔

---

(۲)

نوجوان انگریز اپنی یونیورسٹی میں، اپنی عمر کے فطری خیالات اور احساسات کے خلاف پہلی چیز جو سیکھتا ہے وہ قدامت پسندی ہے۔ طالب علم اپنے ملک کی روایات سے چاروں طرف سے گھرا ہوتا ہے، آکسفورڈ میں مرٹن کالج کے کھانے کے کمرے میں دیوار پر مذہبی مصلح جان وکلف کی تصویر نظر آتی ہے جو ایک زمانے میں یہاں رہتا تھا۔ بیلیل کالج کا نام چودھویں صدی کے ایک اسکاتی (Scotis) مدعی سلطنت کے نام پر ہے۔ کیمبرج میں کرسٹ فرمار لو، جان ملٹن، آئزک نیوٹن اور لارڈ بائرن کی یادگاریں دکھائی دیتی ہیں۔ دونوں جگہ ایسی عمارتیں جو قرون وسطیٰ کے طرز تعمیر کے بہترین نمونے ہیں اور صدیوں پرانے دل فریب سبزے کے تختے نوجوان کے اثر پذیر دل پر اثر ڈالنے میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ انیسویں بلکہ اٹھارھویں صدی کی عمارتیں بھی اس ماحول میں ایسی اوچھی معلوم ہوتی ہیں جیسے پرانے امیروں کے مقابلے میں نو دولت لوگ۔ طلبہ اور اساتذہ قرون وسطیٰ کے جبّے اور کلاہ (Cap and gown) میں نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹی کے اعلیٰ عہدے دار وائس چانسلر کا لقب اس زمانے کی یادگار ہے جب یونیورسٹی کلیسا کی چانسلری کی ماتحت تھی۔ یہاں کے طرزِ زندگی میں اب تک قرون وسطیٰ کی خانقاہوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ باضابطہ طلبہ کالجوں میں رہتے ہیں جہاں ان پر خانقاہوں کی سی سختی کی جاتی ہے۔ صبح کو سب سے پہلے کالج کے چھوٹے سے گرجا میں جمع ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ کھانا ساتھ کھایا جاتا ہے اور لاطینی میں دعائے طعام پڑھ کر شروع کیا جاتا ہے۔ ہر طالب علم کو گیارہ بجے رات کو کالج کے اندر پہنچ جانا چاہیئے۔ یونیورسٹی کا ضابطہ نوجوانوں کے من چلے پن کی کافی رعایت کرتا ہے مگر طلبہ کی زندگی کو سختی کے ساتھ قابل قدر انگریزی روایات کی حد کے اندر رکھتا ہے۔ شام کو اندھیرا ہو جانے کے بعد کوئی طالب علم بغیر اپنا جبّہ اور کلاہ پہنے ہوئے باہر نہیں نکل سکتا۔ مسیح کے چھٹے حکم کو توڑنا یونیورسٹی کے ضابطے کی

شدید خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ۔ اور اکثر صورتوں میں پڑھنے کے بجائے طالب علموں کا مشغلہ ورزشی کھیل ہیں مثلاً فٹ بال، کرکٹ، کشتی چلانا۔ دریائے ٹیمز میں ہینلے کے قریب کشتیوں کی دوڑ ہر سال ہوتی ہے اور یہ بڑا اہم واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ ہینلے میں کشتی چلاتے ہیں وہی یونیورسٹی کے اصلی مشاہیر سمجھے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد سے فنون جنگ کی مشق بھی ورزشی کھیلوں میں داخل ہو گئی ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں قبل اس کے کہ فوجی خدمت جبری قرار دی جائے یونیورسٹی کے طالب علم فوجی افسروں کا کام انجام دیتے تھے۔ سیاسی مسائل حاضرہ سے طلبہ کی دلچسپی انجمن اتحاد (Union) کے ذریعے سے قایم رہتی ہے۔ یہ ایک شان دار کلب ہے جن کی رُکن طلبہ کی بہت بڑی تعداد ہے جو چار پاؤنڈ سالانہ چندہ دینے کی مقدرت رکھتی ہے۔ یہاں طالب علم کے لیئے ہر قسم کے اخبار مہیا کیئے جاتے ہیں، ایک کتاب خانہ ہے جس میں عام مذاق کی کتابیں ہیں، ہفتہ میں ایک بار مباحثہ ہوتا ہے جس میں پارلیمنٹ کے ضابطوں کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ ایک طالب علم صدر (Speaker) کے فرایض انجام دیتا ہے، سیاسی مسائل حاضرہ کے متعلق باضابطہ تحریکیں پیش ہوتی ہیں اور بحث کے ختم ہونے پر رائے لی جاتی ہے۔ اس دوستی، ورزشی کھیل، ضبط نفس، حب وطن اور ناز و نعمت کے ماحول میں نوجوان انگریز اپنی قوت کا استعمال سیکھتا ہے۔ یہاں وہ جماعت کے اندر اپنی مناسب جگہ پر کام کرنے، لوگوں سے کام نکالنے، اُن پر حکومت کرنے، اپنے آپ کو مہذب انسان، انگریز اور دنیا کا مالک سمجھنے کی مشق کرتا ہے، جو کوئی ان چیزوں کے ساتھ ساتھ اپنی ذہنی قوتوں کی تربیت بھی چاہتا ہے، اُسے یونیورسٹی کے لکچروں میں اس کا کافی موقع دیا جاتا ہے لیکن اُس سے اِس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ انگریزوں کے نزدیک اگر یونیورسٹیاں اس طرح کے لوگ پیدا کر دیں جیسے وہ ملک کی حکومت کے لیئے چاہتے ہیں تو کافی ہے۔ اصل چیز یہ ہے نہ کہ علم و فضل۔ سیسل رہوڈز نے نوآبادیوں کے لیئے جو وظیفے عطا کیے ہیں اُن کا مقصد یہ نہیں کہ طلبہ کو تحصیل علم کا موقع ملے بلکہ

یہ ہے کہ انگریز جنٹلمین کی روشنی نو آبادیوں میں بھی پھیلے۔

جنٹلمین بنانے کے لئے دو چیزیں ہیں ایک تو نوجوانوں کا مِل جُل کر کالج میں رہنا اور دوسرے ورزشی کھیل (Sport) کالج میں جہاں ہر شخص اپنے ہم سنوں کی نگرانی میں رہتا ہے نوجوان پر "آکسفورڈ کا رنگ" چڑھتا ہے جس کے عناصر یہ ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں مُروّت سے کام لینا اور بڑی چیزوں میں پہلو بچانا، تمکنت، حُبّ وطن، قوتِ عمل۔ یہاں ہر شخص کی ذاتی خصوصیّات اگر وہ مدرسے کے دورانِ تعلیم میں باقی رہ گئی ہوں دُور کر دی جاتی ہیں اور وہ انگلو سیکسن جنٹلمین کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، جو قوم کا منظورِ نظر ہے۔ یہی اثر انگلستان کے ورزشی کھیلوں کا پڑتا ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ان کھیلوں میں افراد میں باہم بہترین کارِ نمایاں دکھانے کا مقابلہ ہوتا ہے وہ ان کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ وہ ورزشی کھیل جن میں ایک شخص دوسروں سے امتیاز حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً جرمنی کی طرح جمناسٹک کرنا، گولہ پھینکنا، نیزہ پھینکنا، دوڑنا، کودنا، وغیرہ، یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ تیر اندازی کا قومی کھیل جو سولھویں صدی تک جاری تھا اب مٹ گیا ہے۔ باکسنگ (گھونسہ بازی) عرصہ تک باقی رہی لیکن اب کئی قرنوں سے معزز طبقہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور آج کل جو یہ دوبارہ نظر آتی ہے اس کا سبب جنگ عظیم کا وحشیانہ اثر ہے جو عوام پر پڑا ہے۔

بہر حال انگریزوں میں سب سے زیادہ ترقی اجتماعی کھیلوں نے کی ہے اور یہی اُن کے مخصوص کھیل بن گئے ہیں۔ کشتی رانی، کرکٹ، فٹ بال میں پوری پوری ٹیمیں ایک دوسرے کے خلاف کھیلتی ہیں اور ان ٹیموں میں لوگ اِدھر اُدھر سے پکڑ کر نہیں بھر دیئے جاتے بلکہ ہر ٹیم کسی مقام یا کسی جماعت کی نمائندہ ہوتی ہے اور بڑے بڑے امتحانی مقابلے کے بعد منتخب کی جاتی ہے مثلاً اسکول کی جماعتوں کی ٹیموں کا ایک دوسرے سے مقابلہ یا بیلیل کالج کا کرائسٹ چرچ کالج سے آکسفورڈ کا کیمبرج سے یا برمنگھم کا اڈنبرا سے، یا آئرلینڈ کا اسکاٹ لینڈ سے یا انگلستان کا امریکہ سے۔ اس طرح کے ورزشی کھیل پر انگریز جان دیتے

ہیں اور یہی انگریز کی تربیت کا ذریعہ ہے۔ اوّل تو اس سے وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو عام طور پر ورزش سے پیدا ہوا کرتے ہیں: جسمانی قوت اور چستی، خورد و نوش وغیرہ میں اعتدال، جو کام پیش آئے اس میں پوری جسمانی اور ذہنی قوت لگا دینا۔ اجتماعی مقابلہ نوجوانوں کو یہ سکھاتا ہے کہ اپنے حریفوں کی بھی عزت کریں، انھیں شکست دینے کی امکانی کوشش کریں، لیکن کوئی ناجائز یا نامناسب ذریعہ نہ استعمال کریں، جب فتح ہو تو اوچھے پن سے جامے سے باہر نہ ہو جائیں اور جب شکست ہو تو اُسے صبر و سکون سے برداشت کریں۔ علاوہ اس کے اجتماعی ورزشی کھیل سے نوجوان انگریز ایک اور اہم چیز سیکھتا ہے جو کسی اور ذریعہ سے نہیں سیکھ سکتا یعنی جماعت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا، ایک مستقل فرد کے بجائے ایک مثال (ٹائپ) کا نمایندہ بن جانا۔ ٹیم کا کوئی کھلاڑی کوئی جداگانہ اہمیت نہیں رکھتا بلکہ ہر شخص جسم اجتماعی کا ایک جزو ہے۔ کھیل میں اپنے کالج، یا یونیورسٹی، یا شہر یا ملک کی لاج رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ اس سے اچھی سیاسی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہی ٹیم کے کھلاڑی آگے چل کر پارلیمنٹ کی پارٹی، کابینۂ وزارت، میونسپل کمیٹی یا انگلستان کی بے شمار کلیسائی، معاشری یا سیاسی انجمنوں میں سے کسی کی مجلسِ عاملہ کے مفید رکن بن جاتے ہیں لیکن کامیابی کے لیے ٹیم کا ایک اچھا سردار ہونا ضروری ہے جو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بہترین کھلاڑی جمع کرتا ہے، ہر کھلاڑی کو اُس کے مناسب جگہ بتاتا ہے اور مختارِ کل کی طرح ہر شخص پر حکومت کرتا ہے۔ ٹیم کا کپتان وہی نمونہ ہے جو آگے چل کر مختارِ کل ہیڈ ماسٹر، یا بشپ یا وزیر اعظم بن جاتا ہے۔ اجتماعی اُصول کی ذرا سی خلاف ورزی، کھیل میں کپتان کی معمولی سی عدول حکمی کرنے سے کامیابی میں بڑی رکاوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ فٹ بال، کرکٹ اور کشتی رانی کے ذریعے سے وہ صفات پیدا کی جاتی ہیں جس کی انگلستان کو اپنی سیاسی زندگی کے لیے ضرورت ہے۔ یہیں وہ لوگ چُنے جاتے ہیں جن میں سرداری اور قیادت کی صلاحیت ہوتی ہے اور ہر شخص اس کی عادت ڈالتا ہے کہ جماعت کا خادم اور رکن بنے۔ قائد اور سردار بھی جو انگلستان میں مختارِ کل

ہوتا ہے لیکن مطلق العنان نہیں ہوتا یہاں یہ سیکھتا ہے کہ ہر شخص سے پورا کام جتنا وہ کر سکتا ہے لے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہوشیاری سے اُس کی شخصیت کا، اُس کی کمزوریوں کا اور اُس کی خود پسندی کا لحاظ رکھے۔ یہاں عزت کے بھوکے نوجوان انگریز کو پہلی بار ایسا میدان ملتا ہے جہاں وہ کم سنی ہی میں دوسروں سے امتیاز تو نہیں کر سکتا لیکن دوسروں کا نمائندہ اور مختار ضرور بن سکتا ہے۔ وہ اپنی جماعت اپنے کالج اور اپنی یونیورسٹی کی طرف سے حریفوں کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دے سکتا ہے۔ یونیورسٹی میں انگلستان کی پارلیمنٹی زندگی کا چھوٹا سا نمونہ موجود ہے جس میں ہر نمائندہ انتخاب کے معرکے سر کرتا ہے، اور اگر ہزاروں حریفوں سے سربر ہو تو اپنی پارٹی یا اپنی قوم کا قائد بنتا ہے تفکر اور تنظیم کو نہیں بلکہ لڑنے اور غالب آنے کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے، اور ایک طرف وفاداری سے اپنے سردار کی اطاعت کرنے اور دوسری طرف مختار کل کی طرح اپنے زیردستوں پر حکومت کرنا جانتا ہے۔ انگلستان یونیورسٹی کو اسی لیئے عزیز رکھتا ہے کہ وہاں سے علما اور فضلا نہیں نکلتے جن کی قوم کو کوئی ضرورت نہیں بلکہ اربابِ عمل، ارباب قیادت اور اربابِ طاعت جن کی مدد سے انگلستان دنیا پر حکومت کرتا ہے۔

(۳)

آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبہ میں سے ۳/۵ (۱۹۲۱ء میں طالب علموں کی مجموعی تعداد آکسفورڈ میں ۱۵۶۴ اور کیمبرج میں ۵۷۰۳ تھی) یونیورسٹی میں محض "جنٹلمین" بننے کے لیئے آتے ہیں۔ اُن کی زندگی کی مختصر روداد یہ ہے: داخلے کے وقت کالج کا داخلے کا امتحان ہوتا ہے اور اُس کے بعد ہی (یا اس سے فوراً پہلے) یونیورسٹی کا پہلا امتحان جس کا معیار جرمنی کے مدرسوں کے نویں درجے کے برابر ہے، (اُن خاص خاص مدرسوں کے طلبہ جن کی نگرانی یونیورسٹی کرتی ہے اور جن کا نصاب یونیورسٹی کے معیار کے مطابق ہے

داخلے کے امتحانوں سے مستثنےٰ ہیں)۔ ہر طالب علم کے لیئے یونیورسٹی کے ان فارغ التحصیل طلبہ میں سے جو غیر سرکاری معلّم کا کام کرتے ہیں ایک اتالیق مقرر کیا جاتا ہے۔ اُسے طالب علم معاوضہ دیتا ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ طالب علم کی تعلیم، اُس کے مطالعے اور اُس کی عام زندگی کی نگرانی کرے۔ اب چاہے وہ اپنا کام اچھی طرح کرے یا بُری طرح کرے یہ اتفاقات پر اور خود اُس کے احساس ذمّہ داری پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرے سال ایک درمیانی امتحان ہوتا ہے اور تین سال کے بعد آخری امتحان ہوتا ہے جس کا معیار جرمنی کے اسکولوں کے آخری امتحان کے برابر ہے۔ اِس کے پاس کرنے پر اُسے بی اے کی معمولی ڈگری (جو آکسفورڈ میں (Pass) اور کیمبرج میں (Poll) کہلاتی ہے) مل جاتی ہے اور اگر وہ ایم اے کا لقب حاصل کرنا چاہے جس کے ذریعے سے اسے یونیورسٹی کی دوامی رکنیت اور (Congregation) اور (Convocation) میں رائے دینے کا حق مل جاتا ہے تو اُسے محض ایک مقررہ فیس دینا پڑتی ہے اور نویں سال بلا مزید امتحان کے اُسے یہ لقب مل جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے تینوں امتحانوں میں سے کسی میں کسی مضمون میں خاص مہارت کی ضرورت نہیں۔ معمولی بی اے کی ڈگری پانے والے کو سب مضامین میں تھوڑی تھوڑی واقفیت دکھانا پڑتی ہے البتہ اسے یہ حق ہوتا ہے کہ ایک قسم کے چند مضامین میں سے ایک مضمون اختیار کرے، مثلاً یونانی یا لاطینی، فرانسیسی یا جرمن وقس علیٰ ھٰذا۔ مگر اصل میں اُس نے جو پڑھا ہے وہ صرف یونانی یا لاطینی اور تھوڑی سی منطق اور ریاضی ہے۔ یہ تعلیم بالکل اسکول کے طریقے پر ہوتی ہے اور پڑھانے والے کالج کے ٹیوٹر ہوتے ہیں جو قابلیت میں جرمن ہائی اسکولوں کے معلّموں کے برابر ہوتے ہیں۔ ایک اور ٹیوٹر (اتالیق) طلبہ کو معقول معاوضہ لے کر سبق یاد کرانے اور امتحان پاس کرانے کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس طالب علم کو پروفیسر سے کبھی سابقہ نہیں پڑا ہے۔ اُس نے نہ کوئی علمی مقالہ لکھا ہے نہ اہم اور پیچیدہ علمی مسائل پر غور کیا ہے اور نہ کسی علمی شعبے

میں مہارت بہم پہونچائی ہے۔ معمولی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ اپنا کاروبار شروع کر دیتا ہے، یا کسی (Solicitor) کے یہاں یا (Inns of Court) میں قانون سیکھتا ہے یا کسی اسپتال میں طب کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ مگر وہ جہاں کہیں بھی جائے اس کی قابلیت تو جرمنی کے اسکول کے فارغ التحصیل طالب علم سے زیادہ نہیں ہوتی مگر اُس کی شخصیت کہیں زیادہ پختہ ہوتی ہے۔

(۴)

انگلستان کے لوگ عموماً اس تعلیم سے جو اچھے خاندان کے نوجوانوں کو جنٹلمین بنانے کے لیئے دی جاتی ہے مطمئن ہیں۔ جو یونیورسٹی یہ خدمت انجام دے اُس نے گویا اپنا حق ادا کر دیا۔ پھر بھی انیسویں صدی میں آکسفورڈ اور کیمبرج کو بہت سی تبدیلیاں کرنے پر راضی ہونا پڑا جن کی ابتدا ۱۸۵۲ء کے شاہی کمیشن سے ہوئی۔ رائے عامہ دو چیزوں پر معترض تھی۔ یونیورسٹی میں "انگلیکن کلیسا" اور طبقۂ امراء کا رنگ غالب تھا انگلستان کا (۱) غیر مقلد (nonconfirmist) متوسط طبقہ اسے اپنے لئے بہت مضر سمجھتا تھا (۲) قوم کے ذہنی رہنماؤں میں سے چند لوگ یونیورسٹی کی علمی پستی کو شرمناک سمجھتے تھے۔ ان میں ایسے ایسے لوگ تھے جیسے اسٹوارٹ مل، میتھو آرنلڈ، خصوصاً مرشل، ہکسلے اور سیجوک۔ مگر عام لوگوں کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی چنانچہ یونیورسٹی کا انگلیکن رنگ تو چند قوانین کے ذریعے سے دور کیا گیا جن کا سلسلہ ۱۸۷۱ء تک پہونچتا ہے۔ مگر یونیورسٹی کو جدید علمی معیار پر لانے کی کوششوں میں بڑی بڑی مزاحمتیں ہوئیں۔ حامیان اصلاح نے کچھ کیا لیکن انھیں اپنے مقصد میں پوری کامیابی آج تک نہیں ہوئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کی اصلاحات کے بعد یونیورسٹیوں میں تین طرح کی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

(۱) عقائد کی قیدیں اُٹھا دی گئیں، اور تمام انگریزوں کو یعنی غیر مقلدوں (Puritans) اور میتھوڈسٹ لوگوں کو بھی داخلے کی اجازت دے دی گئی۔

(۲) تعلیم جدید طریقے پر ہونے لگی۔

(۳) اس میں کسی قدر گہرائی پیدا ہو گئی۔

(باقی آیندہ)

عابد حسین

گروکل کی تعلیم

"گرو نے تمام چیلوں کو بُلا کر اپنے سامنے بٹھایا وہ سب اپنی تعلیم ختم کر چکے تھے اور اب دُنیا میں جا کر اُنھیں اپنے جوہر دکھانے تھے۔ گرو نے نہایت دردناک الفاظ میں قوم اور ملک کی ابتر حالت بیان کی، اُن پر ثابت کر دیا کہ دُنیا گناہوں کا بوجھ زیادہ نہیں سنبھال سکیگی، اور اُن سے التجا کی کہ اپنی قوم کو اُس کے فرائض سے آگاہ کریں اور ویدوں کی روشنی سے دلوں کی تاریکی اور طبیعتوں کی بے لگامی کو دُور کریں۔ اُتر، دکھن، پورب، پچھم ہر سمت کے لیئے ایک جواں مرد درکار تھا جو اس پاک کام کے لیئے اپنی زندگی وقف کر دے اور مرتے وقت تک دم نہ لے۔ دیانند، اُس کا شاگرد کھڑا ہوا، گرو کے آگے سر جھکایا، اُس کے پیروں پر ہاتھ رکھے اور نہایت عجز و انکسار سے قسم کھائی کہ وہ ان چار میں سے ایک ہوگا۔۔۔۔۔۔"

کسی ایک بزرگ اور باکمال شخصیت کے اثر میں تعلیم حاصل کر کے گرو کی ہدایات کے مطابق دنیا یا قوم کی خدمت کے لیئے جان اور زندگی وقف کر دینا ہندوستان کے قدیمی طرزِ تعلیم کا جوہر ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ کتاب اور مدرسہ اور امتحان کے فضول جھنجھٹ سے بے نیاز ہو کر یہ نوجوانوں کے تصوّر اور تخیل کو ایک شخصیت کے سپرد کر دیتی ہے، اور اُن میں یہ آرزو پیدا کر دیتی ہے کہ اپنی انسانیت کو فروغ دیں۔ یہ طرزِ تعلیم نہ دفتروں کے لیئے کلارک پیدا کر سکتا ہے نہ ریاست کے لیئے تابعدار، اور مجہول دماغ نوکر، مگر اس سے قوم میں ایسے جاں باز لوگوں کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے جو اُس کی رہ نمائی کر سکتے ہیں، اور اعلیٰ مقاصد پورے کرنے کے لیئے خوشی سے جان اور مال نثار کرنے کو تیار رہتے ہیں، عام کاروبار جاری رکھنے کے لیئے معمولی

ذہنیت اور پست حوصلہ کے لوگوں کی ضرورت رہتی ہے، اور یہ ضرورت صرف بڑے پیمانہ کی تعلیم گاہیں پوری کر سکتی ہیں، لیکن یہ قوم کو زندہ نہیں رکھ سکتیں، اور نہ کبھی تہذیب کو ان سے فروغ ہوتا ہے، ہماری موجودہ حالت میں گرو اور چیلے کے طرزِ تعلیم کو اُس کی قدیمی صورت میں دوبارہ قایم کرنا ناممکن ہے، لیکن اُسے بالکل ترک کر کے بغیر سوچے سمجھے یورپ کی تقلید کرنا ہمارے لیئے بہت مُضر ہے، اور مُضر ثابت ہو چکا ہے۔ زمانہ کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی آیندہ نسلوں کو صحیح تعلیم دینے کا صرف ایک طریقہ ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ تعلیم گاہوں کا پیمانہ چھوٹا رکھا جائے اور اُن میں جہاں ممکن ہو اس بات کا موقع دیا جائے کہ اُستاد کی شخصیت کا اثر شاگرد پر پڑ سکے۔

یہی ہردوار کے گروکل کا بنیادی اُصول ہے، اور پچیس سال کے تجربہ نے اسے نہایت کامیاب دکھایا ہے۔ پرنسپل ام دیو صاحب لکھتے ہیں:۔

"ہمارا گروکل اس ارادہ سے قایم کیا گیا تھا کہ علم کے شیدائیوں کو ایسے ماحول میں تعلیم دی جائے جو غلط تقلید کے مہلک اثرات سے پاک ہو۔۔۔۔۔ دنیا میں صرف یہی ایسی تعلیم گاہ ہے جہاں قدیم سنسکرت ادب کی سنسکرت زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اور ایسے ماحول میں جہاں قدیم ہندو طرزِ تعلیم اور طریقۂ زندگی اپنی دیرینہ صورت میں پائے جاتے ہیں۔ اس ماحول میں محض تقلید پر کسی طرح سے زور نہیں دیا جاتا، کیونکہ سنسکرت کے ساتھ ساتھ طلبا تمام جدید علوم کی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں اور اُن کو ترغیب دلائی جاتی ہے کہ اپنی سمجھ سے کام لیں، نکتہ چینی اور تنقید کریں، اور ہر طرح سے جدید سائنٹفک طریقہ پر عمل کریں۔"

ظاہر ہے کہ جو تعلیم گاہ اس اُصول پر قایم کی جائے اُس کا مقصد کیا ہونا چاہیئے:۔

"گروکل کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ قدیم ہندو تہذیب کو دوبارہ زندہ کرے بنی نوع انساں کے لیئے ویدوں کی صحیح تشریح کرے، اُسے مادیت کے تباہ کُن پھندوں سے چھڑائے اور سمجھ دار انسانوں کے لیئے وہ روحانی غذا مہیا کرے

جو صرف ویدوں میں مل سکتی ہے اور جس کی اُنھیں سخت ضرورت ہے۔"

دوسرے مذہب کے لوگوں کو ممکن ہے اس خیال کے عام اطلاق سے انکار ہو، لیکن جس مسلما
کا خیال ہے کہ موجودہ تہذیب اور تعلیم کی تمام خرابیاں، موجودہ بے دینی اور بے اُصولی قرآن
کے احکام کی پیروی، اور اُس کی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے سے دُور ہو سکتی ہیں، اُسے کوئی اعتراض
نہ ہونا چاہیئے اگر ہندو یہ کہیں کہ ویدوں میں عقیدت پیدا کرنے سے ہی ہندو تہذیب اور رسوم
سدھار ہو سکتا ہے۔ ویدوں میں ہندو مذہبی تعلیم کا جوہر ہے، وہ ایک آئینہ ہیں جس میں ہندو تہذیب
بہترین صورت میں نظر آتی ہے۔ سوامی دیانند اور آریہ سماج کا دعویٰ، اور عقیدہ، ہے کہ وہ بُت
اور وہم پرستی اور برہمن پرستی سے بالکل پاک ہیں، توحید اور سچی مذہبیت اور مساوات کا سبق
دیتے ہیں، اور انسان کے لیئے بہترین زندگی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے۔ اور ہمارے
لیئے اسے غلط قرار دینا مذہبی تعصّب کی دلیل ہے۔ تو وہ رسمیں اور "مذہبی" قوانین جن کی
بدولت برہمنوں نے اب تک راج کیا ہے اور ہندو تہذیب اور مذہب کو بدنام کیا ہے، بالکل مٹ
ہیں، اور وہ ہندو جنھیں برہمنوں نے اپنے دین سے بیزار کر دیا ہے پھر اپنی مذہبی ملکیت پر قابض
ہو سکتے ہیں۔

مگر یہ ملکیت محض علمی اور عقلی نہیں؛ اور اُس کے حاصل کرنے کے لیئے صرف دعویٰ کرنا
نہیں۔ قدیم ہندو تخیل کا اثر اُسی وقت ہو سکتا ہے جب اُس کے مبلّغ اپنی زندگی بھی اُسی سانچے
میں ڈھالیں۔ اِسی ارادہ سے گروکل کے دستور میں ایسے قواعد ہیں جن کا جواب کہیں نہیں
سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ آٹھ سال کی عمر سے زیادہ کے لڑکے داخل نہیں کیئے جاتے۔ جب
لڑکا اسکول میں ہوتا ہے اُسے گھر جانے کی اجازت حتی الامکان نہیں دی جاتی، اور اگر کسی وجہ
اجازت دینا ضروری بھی ہوتا ہے تو اُسے گروکل سے اتنے دن باہر رہنے کا موقع نہیں دیا جاتا
اُس کی تعلیم پر کوئی بُرا اثر پڑ سکے۔ عام گھرانوں کی زندگی، (اور یہ کچھ ہندو گھرانوں
کے لیئے مخصوص نہیں) ایسی ہوتی ہے کہ لڑکوں کی تعلیم اور تربیت کی طرف پوری توجہ نہیں

کی جا سکتی ہے۔ ماں کا پیار، باپ کی مشغولیت، عزیزوں کی بے پروائی۔ یہ سب بچے کو بہت نقصان پہونچا سکتے ہیں، اور حفاظت اسی میں ہے کہ بچہ ایک خاص ماحول میں مخصوص تربیت پائے۔ تمام اسکولوں میں اکثر استاد شکایت کرتے ہیں کہ لڑکے چھٹیوں میں صرف جو کچھ پڑھا لکھا ہو وہی نہیں بھول جاتے بلکہ بہت سی بری عادتیں بھی گھر سے ساتھ لاتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ گروکل کے علاوہ کسی تعلیم گاہ میں اتنی ہمت نہیں پائی گئی ہے کہ وہ والدین کو اس ضروری شرط پر مجبور کر سکے۔

چھوٹی عمر کے بچوں کو داخل کرنے میں ایک اور مصلحت بھی ہے، جو والدین پر شروع میں ظاہر بھی کر دی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ بچوں کی کم سنی میں شادی نہ کی جائے۔ بہت سے ہندوؤں کا یہ خیال ہے کہ کم سنی میں شادی کر دینے کی رسم اس وجہ سے اختیار کی گئی کہ مسلمان ہندو لڑکیوں کو بھگالے جاتے تھے، اور لڑکیوں کی عصمت محفوظ رکھنے کے لیئے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ لیکن یہ محض ڈھکوسلا ہے۔ کیونکہ جب ریاست اور قانون اور ایک کثیر التعداد قوم کی طاقت لڑکیوں کی حفاظت نہیں کر سکتی تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک رسم انھیں بچالے۔ اِس رسم کی اصل وجہ کچھ بھی ہو، موجودہ زمانہ میں بہت سے ہندو اس کے نتائج سے شرمندہ اور بیزار ہیں، اور اس کا توڑنا آریا سماج نے اپنے مقاصد میں شامل کر لیا ہے۔ گروکل میں داخلہ کے شرائط میں یہ بھی ایک شرط ہے کہ والدین صرف کم سنی میں نہیں بلکہ پچیس برس کی عمر تک۔ یعنی جب تک وہ گروکل میں تعلیم پاتا ہے۔ اپنے لڑکے کی شادی نہ کریں۔ قوم کی اصلاح اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب لڑکا گروکل کے سایہ میں پہونچتا ہے۔

مگر ہم کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک بیہودہ رسم کا توڑنا کافی قرار دیا گیا ہے۔ گروکل کے طالب علم کو برہمچاری کا خطاب دیا جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی طبیعت ہر قسم کے برے ارادوں سے پاک ہے، اور وہ اس تنِ خاکی کو اُس وقت کے لیئے تیار کر رہا ہے

جب وہ دُنیا میں جائیگا، اُس کی آزمایش ہوگی، اور اُسے اپنی پاک دلی اور خوش مزاجی کا ثبوت دینا ہوگا۔ برہمچاری کے معنی عام طور سے غلط سمجھے جاتے ہیں، اور اسی لیئے بہت سے لوگ اسے اُصولاً غلط یا ناکافی یا محض ایک ذہنی تعصب کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ لفظ برہمچاری جنسی معاملات کے لیئے مخصوص نہیں، اُس کا اصل مقصد خیال اور عمل کو پاک رکھنا اور ہر قسم کے عیش اور لذّتِ دُنیوی سے پرہیز کرنا ہے۔

گروکل کے طالب علموں کی زندگی کا سب سے نمایاں اور قابلِ قدر پہلو سادگی اور مساوات ہے۔ قمیص اور دھوتی عام لباس ہے، اور کپڑے چاہے محبّت کیش والدین بنا کر بھیجیں چاہے گروکل کی طرف سے بنیں، کسی کو نہ نفیس کپڑے پہننے کو ملتے ہیں نہ اس سادہ لباس سے زیادہ پہننے کی اجازت ہے۔ یہی سادگی کھانے میں بھی برتی جاتی ہے۔ دُودھ، دہی، چپاتی دال، ترکاری کا ہمیشہ دَور رہتا ہے، جس کی وجہ سے بدہضمی کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا اور خرچ بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سب خوبیاں اُس مساوات کے سامنے ہیچ ہیں جو ہر طالب علم کے دل میں اور ہر اُستاد کے برتاؤ میں پائی جاتی ہے۔ کپڑے، کھانے کی سادگی گروکل کے باہر بھی ہندو رہن سہن میں موجود ہیں، لیکن جس طرح سے ذات اور دولت، بندہ اور آقا کے فرق کو گروکل نے مٹایا ہے اُس پر مساوات کے فدائی مسلمانوں کو بھی رشک آئے تو تعجب نہیں۔ اسکول میں اُستاد اور لڑکے سب ساتھ رہتے ہیں۔ اُستاد کے لئے الگ کمرہ نہیں ہوتا، لڑکوں کے پلنگوں کی قطار میں اُس کا پلنگ بھی بچھا ہوتا ہے۔ اُس کو بھی پڑھنے کے لیئے صرف ایک میز اور لالٹین ہیں، کھانے کے وقت اُس کے لیئے کوئی جگہ مخصوص نہیں ہوتی، طالب علموں کے ساتھ وہ بھی کہیں بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ اُسے طالب علم پر کسی طرح کی ظاہری فوقیت حاصل نہیں ہے اُس کے کام اور ذمہ داری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اُسے ہمیشہ خیال رکھنا ہوتا ہے کہ وہ طالب علموں کے لیئے اعلےٰ زندگی اور بلند اخلاق کا نمونہ ہے، اور اگر اس نے ایک غلطی کی تو اُس کی بجائے

طالب علم دس کرینگے۔ ہمارے تنزل اور پستی کے دور میں یہ تو ممکن نہیں کہ ہر اُستاد ایک شخصیت رکھتا ہو، اور محض اپنے ذاتی اثر سے اعلیٰ تربیت کے لوازمات پورے کر سکے۔ لیکن جیسا ثبوت گرودکل نے اپنی تربیت کے دیرپا ہونے کا دیا ہے اُس کا مقابلہ ہندوستان کی کوئی تعلیم گاہ نہیں کر سکتی۔

رام دیو صاحب، پرنسپل، کانگڑی گرودکل جائز فخر سے کہتے ہیں :-

"گرودکل نے ویدک دھرم کے بہت سے نامور مبلغ پیدا کئے ہیں۔ دکھن کا ویدک مشن جو آل انڈیا آریا لیگ نے قائم کیا ہے تقریباً ہمیشہ گرودکل کے کسی فارغ التحصیل طالب علم کے ماتحت رہا ہے۔ ہمارے تین آدمیوں نے متعدد مشن لے کر جنوبی افریقہ کے دورے کئے اور نہایت کامیاب واپس آئے۔ ہمارے فارغ التحصیل طلبا میں سے کوئی ستر فی صدی کسی نہ کسی صورت میں قوم کی سیوا کر رہے ہیں۔ اُن کا کام زیادہ تر تعلیمی اور مذہبی ہے، لیکن سیاسی حلقوں میں بھی دو ایک ہیں جنھوں نے نام پیدا کیا ہے۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی ہندوستانی یا بیرونی تعلیم گاہ نے اس عرصہ میں قوم کے خادموں کی اتنی تعداد نہیں پیدا کی ہے۔ ترکِ موالات کے زمانہ میں جتنی گرودکل کے طلبا قید میں گئے اُتنے کسی قومی درس گاہ سے نہیں گئے۔ ان جوانوں میں سے جنھوں نے ذات کے باہر شادی کی ہے سب سے زیادہ ہمارے یہاں کے فارغ التحصیل طلبا ہیں ....."

ادبی دنیا میں بھی گرودکل کی تعلیم نے بہت پھول کھلائے ہیں :-

"پنڈت ستولیکر وہ مشہور اسکالر جنھوں نے تمام عالموں سے زیادہ ویدوں اور ویدوں کی تعلیم کو اپنی قوم میں ذہن نشین کیا ہے بڑے عرصہ تک ہمارے معلموں میں سے تھے۔ پنڈت اندر ودیا و چسپتی نے، جو گرودکل کے پہلے طالب علموں

میں سے ہیں، اپانشدون پر ایک نہایت خیال آفریں کتاب لکھی ہے۔ پنڈت وسوا ناتھ وِدیالنکار، جو اس وقت گروکل میں ویدوں کے پروفیسر ہیں، دو کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ایک ویدوں کی روشن اور عام فہم تفسیر ہے، دوسری میں جانوروں کی قربانی کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ دونوں کتابیں علم اور معلومات کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہیں۔ پنڈت چندر امنی، ویدکے جائنٹ پروفیسر نے "نروکت" کا جو ویدوں کی تفسیر کے متعلق سب سے اہم تصنیف ہے، مشرح ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ دو جلدوں میں ہے، اور ہندوستان کے تمام عالموں نے اس کی تہ دل سے تعریف کی ہے۔ وائس پرنسپل پنڈت دیوشرما نے ویدکے معقولوں پر جو وعظ کہے تھے وہ بھی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے ہیں اور ہمارے مذہبی ادب کا مایۂ ناز ہیں۔ پنڈت دھرم دت سدھانت لنکار نے ہندوستان کی قدیمی جمہوریتوں پر ایک نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھری ہوئی کتاب لکھی ہے۔

"دوسرے علوم و فنون کی طرف بھی کسی قسم کی بے توجہی نہیں برتی گئی ہے ---- ڈاکٹر پران ناتھ ودیالنکار نے، جو ہندو یونیورسٹی، بنارس میں معاشیات کے پروفیسر ہیں ---- معاشیات، سیاسیات، حکومت، اور ملکی انتظام پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جو نہایت محققانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ گروکل کے فارغ التحصیل طلباء نے ہندی کا ادبی ذخیرہ بڑھانے کی اتنی کامیاب کوشش کی ہے کہ ان میں سے چودہ پندرہ فی صدی اس وقت ادبی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر کوئی تعلیم گاہ فخر کر سکتی ہے۔"

اس نمایاں کامیابی کی دو وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو گروکل کی یکسوئی ہے، دوسری یہ کہ گروکل کے بانیوں نے اس تعلیم گاہ میں اُن جذبات کے پیدا کرنے کی صحیح تدبیر سوچی ہے جو نشوونما کے اصل محرک ہیں۔

یک سوئی سے مُراد یہ ہے کہ گروکل کے بانیوں نے ایسی تعلیم گاہ کا خیال چھوڑ کر جو ہر طالب علم کو اُس کے مطلب کے علم سکھائے، جو ایک چشمہ ہو جہاں ہر پیاسے کی پیاس بجھ سکے، اپنے مقاصد محدود کر لیئے اور صرف ایسے طالب علم داخل کیئے جن کے والدین اُن محدود مقاصد سے واسطہ رکھتے تھے یا رکھنا چاہتے تھے۔ یہ محدود مقصد جو ہر اُستاد اور ہر طالب علم کی نگاہ میں ہمیشہ موجود رہتا ہے آریا دھرم کا پرچار ہے، اور اُس تخیل اور تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنا ہے جو ویدوں کے زمانہ میں ہندوستان میں رائج تھی۔ جب بچہ کے والدین نے یہ شرط قبول کی، اس کی تعلیم اور تربیت اُنھوں نے اپنے ذمّہ لی۔ جنھیں آریا سماج اور ویدک دھرم سے واسطہ یا روحانی تعلق، نہیں تھا وہ الگ رہے، لیکن باوجود ایک خاص مقصد مقرر کرنے کے گروکل میں تعلیم کا دائرہ محدود نہیں رکھا گیا ہے۔ اور نہ محدود رکھنا ضروری سمجھنا چاہیئے۔ کسی ہندو ڈاکٹر کے لیئے یہ ضروری نہیں کہ وہ بے دین یا اپنے دھرم کی خوبیوں اور نعمتوں سے ناواقف ہو۔ لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایسے ڈاکٹر پیدا کیئے جائیں جو اپنے فن سے بخوبی واقف ہوں اور علم کے نشہ میں دین اور دل سے بے خبر نہ ہو جائیں تو ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو گروکل کے بانیوں نے کیا ہے، یعنی علم کو دین کا ایک جزو بنائیں، پہلے دل کی تربیت کریں، اس کے بعد دماغ کو روشن کریں۔

گروکل نے در اصل وہی کرشمے دکھائے ہیں جو نئے مذہب دکھایا کرتے ہیں۔ پرنسپل رام دیو اپنے طلبا کے کارناموں پر اسی وجہ سے فخر کر سکتے ہیں کہ اُن کی تعلیم گاہ ہندوؤں کے سینے ایک نئے دین کا پیغام لائی ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی نے بھی لایق اور ذہین طالب علم پیدا کیئے ہیں، لیکن اس نے اپنے طلبا کو وہ جوش نہیں دلایا اور نہیں دلا سکتی جو آیندہ زندگی میں اُن کی مدد کر سکے، اُن کی مشکلیں آسان کرے، اُن میں اپنا جوہر دکھلانے کی صلاحیت پیدا کر دے۔ گروکل کا ہر طالب علم تحصیل علم سے فارغ ہو کر یہی سوچتا ہے کہ اپنے ملک اور دھرم کی وہ کس طرح سے بہترین خدمت کر سکتا ہے، اگر وہ کون کام ہاتھ میں لیتا ہے

تو اُسے ہمیشہ یاد رکھنا ہے کہ وہ ایک مذہب کا مبلّغ ہے اور اگر اُس نے ہمّت ہاری تو یہ اُس کے مذہب پر ایک دھبّہ ہوگا۔ اِسی طرح سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے عقیدوں کا پرچار کرے، اپنی زبان پر ملکہ حاصل کرے۔ قوم کی اصلاح میں حصّہ لے۔ اگر وہ مضمون نگاری کی قابلیت رکھتا ہے تو اُسے کبھی خیالات کی کمی نہ محسوس ہوگی، نہ کبھی کسی معاملہ میں اُسے سوچنا ہوگا کہ کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اُس کے مزاج میں تمام محرّک موجود ہیں۔ نشوونما کی اُمنگ بھی ہے، اس کا بھی کامل احساس ہے کہ اُس کے لیئے کون سا راستہ، کون سا طریقہ، کون سا نصب العین مناسب بلکہ واجب ہے۔ اِس لحاظ سے اُس کا کام دوسروں کے مقابلہ میں بہت آسان ہے، اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ گروکل میں وہ تمام لڑائیاں لڑی جا چکی ہیں جو دوسری تعلیم گاہوں میں ہر لڑکا اکیلا لڑتا ہے، اور بغیر اپنی تعلیم گاہ کی مدد کے۔ گروکل میں طالب علم کو صرف مضبوط عقیدے اور مقرر نصب العین ہی نہیں ملتے، اُسے پاک اور صحیح زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ بُرے اور اچھے کا فرق صاف صاف بتا دیا جاتا ہے، اور دُنیا میں بعد کو اُس کا پیر کبھی نہیں پھسلتا۔ جو تعلیم گاہ اپنے طلبار کی اس قدر خدمت کرے اُس کے لیئے جو کچھ کہا جائے اور کیا جائے وہ کم ہے۔

گروکل کی بنیاد ۱۹۰۲ء میں سوامی شردھانند نے رکھی تھی، یعنی اُنھوں نے کوشش کی کہ گروکل کے تخیّل کو عملی صورت دیں، ہردوار کے پاس جنگلوں میں اُنھوں نے اپنے دو چار شاگردوں کے ساتھ ڈیرا لگایا۔ سُنتے ہیں کہ جگہ مخدوش تھی اور اکثر راتوں بھر سوامی جی کندھے پر بندوق لیئے ہوئے گھوما کرتے تھے کہ کہیں جو طالب علم اُنھیں مشکل سے تجربہ کے لیئے ملے تھے کسی شیر یا چیتے کے شکار نہ ہو جائیں۔ مگر اس ہمت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے جو اِس طرح سے کام شروع کرنے پر بھی راضی ہو۔ رفتہ رفتہ لوگ قائل ہوئے، گروکل کو ہر طرف سے روپیہ ملنے لگا، اُس کی عمارت بنی، طلبار کی تعداد بڑھی۔ دہلی کے سیٹھ

رگھومل نے ایک لاکھ کی زمین خرید کر گروکل کے نذر کی اور اندر پرستھ میں دہلی کے پاس گروکل کا اسکول قایم کیا گیا۔ ملک میں جگہ جگہ گروکل کی شاخیں کھُلنے لگیں، اور اب پنجاب اور صوبہٗ متحدہ میں کئی الحاق شدہ گروکل ہیں جن میں مقررہ اصولوں پر تعلیم دی جاتی ہے۔ فی الحال تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ گروکل کی تعداد بڑھتی رہیگی۔

دہلی میں لڑکیوں کا بھی ایک گروکل قایم ہوا ہے، جو بہت اچھی طرح سے کام کر رہا ہے۔

"گروکل" کے معنی گرو کا خاندان ہے، اور اسی وجہ سے گروکل کا نام ان تعلیم گاہوں کے لیئے پسند بھی کیا گیا تھا۔ لڑکوں کا رہن سہن تقریباً وہی ہے جو قدیم زمانہ میں رشی اور ان کے چیلوں کا ہوا کرتا ہے۔ یعنی ایسی "فطری" زندگی جسے تہذیب نے اس قدر ضرور بدل دیا ہو کہ آدمی انسان بن سکے اور اس کی تمام قوتیں وہ نشو ونما پاسکیں جو انسانیت کے لیئے ضروری ہیں، لیکن اتنا بھی نہیں بدلا کہ انسان کا فطرت سے کوئی تعلق نہ رہے، فطرت کو وہ حقیر سمجھنے لگے، اور اپنی زندگی اس قدر مصنوعی بنالے کہ کٹے ہوئے درخت کی طرح وہ سوکھ کر مرجائے۔ تمام گروکل آبادی سے دُور جنگل یا دریا یا دونوں کے قرب میں ہیں، جس کی وجہ سے ٹھنڈے پانی اور تازہ ہوا کی افراط ہوتی ہے، اور وہ شہری زندگی کے تمام بُرے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ معمولی درسگاہوں کی طرح ان کے یہاں اوقات کی ایسی تقسیم نہیں ہے کہ بچے دن کے چند گھنٹوں کے لیئے اُستاد کی نظر میں رکھے جائیں اور اس کے بعد ان کو آزادی دیدی جائے کہ دن کاٹنے کے تدبیریں خود سوچیں۔ استاد اور شاگرد کا گروکل میں ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ کلاس کے اندر تعلیم دی جاتی ہے تو کلاس کے باہر استاد کے اخلاق اس کے لیئے ایک زندہ نمونہ بنتے ہیں، اور اُستاد ہی پر اُس کی نظر لگی رہتی ہے۔ یہ فوائد محض بورڈنگ بنا دینے سے نہیں حاصل ہوتے، ان کے لیئے ایک بڑی شرط ہے جو صرف گروکل میں پوری ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے طالب علم، استاد، تعلیم کا دلپنے مقاصد کو ایک مذہبی حیثیت دیں اور اپنی زندگی اسی کے لیئے وقف سمجھیں۔

گروکل کے نصاب میں کوئی خاص بات نہیں، سوا اس کے کہ باوجود ایک مذہبی درس گاہ ہونے کے دنیوی علوم کو کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ آیورویدک طب، کیمیا، معاشیات، تاریخ، ادب، سب کی اُسی قدر اور اُتنی ہی توجہ سے تعلیم دی جاتی ہے جیسے اور درس گاہوں میں، اور اگر نتیجہ سے اندازہ لگایا جائے تو وہاں کی تعلیم دوسری جگہوں سے زیادہ کامیاب رہی ہے، کیونکہ اُنھوں نے ہر شعبہ کے لیئے درسی کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا ہے اور اس کام میں سب سے زیادہ مدد اُن کو اپنے طالب علموں سے ملی ہے۔



گروکل کے خلاف عام طور سے تنگ نظری اور تعصب کی شکایت کی جاتی ہے، اور اس شکایت کے بعد لوگ سمجھتے ہیں کہ گروکل مزید توجہ کے لائق نہیں۔ مغربی روشن خیالی کا ہمارے اوپر یہ اثر ہوا ہے کہ ہم نے تعصب کو سب سے بڑا اخلاقی گناہ بنا لیا ہے اور اُسے معاف کرنے پر اپنے ضمیر کو کسی طرح سے راضی نہیں کر سکتے۔ مگر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی قسم کا تعصب بھی اُس بے لبسی سے بہتر ہے جس میں ہم اپنی روشن خیالی اور بے تعصبی کی وجہ سے مبتلا ہیں۔ ہم خود کسی اچھے کام میں محو اور منہمک نہیں ہو سکتے، کسی معاملہ میں قطعی رائے نہیں رکھ سکتے، محض اس اندیشہ سے کہ ہماری نظر محدود ہو جائے گی، یا دل میں تعصب پیدا ہو جائیگا۔ اس ایک گناہ سے بچنے کے لیئے ہم ہزاروں اور گناہ کرتے ہیں، ہماری قوتِ ارادہ کمزور ہو جاتی ہے، اور تمام عمر ضائع ہوتی ہے۔

تعصب دراصل انسان کے لیئے ایک بہت اچھا محرک عمل ہے، تعصب، نفرت، جانب داری، یہ سب انفرادیت کے لیئے بہت ضروری ہیں، اگر اپنی حد سے گزرنے نہ پائیں، اور مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہونے کے بجائے خود مقصد نہ بنا دیئے جائیں۔ گروکل میں یہ سب چیزیں موجود ہیں اور اگر یہ موجود نہ ہوتیں تو گروکل کی کامیابی کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔ انسان اپنی طاقت بڑھانے کی ترکیبیں اُسی وقت سوچتا ہے جب اُسے دشمنوں کا خوف ہو، یا کسی سے مقابلہ کرنے کا ارادہ ہو۔ گروکل کے بانیوں نے ایک طرف مسلمانوں اور دوسری جانب سناتن دھرمی ہندوؤں سے اعلان

جنگ کیا ہے، اور انھیں سے لڑنے کے لئے وہ اپنی فوج تیار کر رہے ہیں۔ جن مسلمانوں میں اسلامی جوش باقی ہے وہ بجائے ان لوگوں سے نفرت کرنے کے اُن سے دوستانہ مقابلہ کرینگے اور اُنھیں خوشی ہوگی کہ صدیوں بعد ہندو قوم آخر کار جاگی ہے اور مقابلہ پر آئی ہے۔ اس جنگ کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ بزدلوں اور بے حیاؤں کی لڑائی ہے جس کا دہلی نے گزشتہ سال میں ایک نمونہ پیش کیا تھا، اور جو اخباروں میں اس وقت تک جاری ہے، ایسی لڑائیاں غالباً آیندہ زمانہ میں بھی بہت ہونگی۔ دوسری صورت ذرا دشوار معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ میدان میں باقاعدہ مقابلہ ہو، اور ہمت فیصلہ کرے۔ تیسری صورت جس کے لئے دونوں فریق ابھی تیار نہیں معلوم ہوتے، یہ ہے کہ دونوں اپنے پھول کھلائیں اور اپنے جوہر دکھائیں، راست بازی جاں نثاری میں مقابلہ ہو، اور زمانہ فیصلہ کرے۔

زمانۂ گزشتہ میں مسلمانوں کا عروج اسلام اور اسلامی اخلاق کی خوبیوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ آج میرے خیال میں موجودہ آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اخلاقی مقابلہ میں گروکل کا فریق کامیاب ہوگا۔ ہماری کسی تعلیم گاہ میں سادگی، مساوات، عقائد کی پختگی اور بلند حوصلہ پیدا کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی جاتی، اگرچہ اسلام کی تمام خوبیاں یہی ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر ایک دیوتا کو پوجتے ہیں جس کا نام دولت ہے بعض ایک اور دیوتا کو برابر کھڑا کر دیتے ہیں جسے وہ شہرت کہتے ہیں؛ مسلمان بننے کی مصیبت کسی کو گوارا نہیں۔ برخلاف اس کے گروکل نے اپنے معتقدین کو مساوات ایثار اور وحدانیت کا بہت کامیاب سبق دیا ہے، اور وہ جلد اپنی اخلاقی بلندی اور روحانی طاقت کا ثبوت دینے کے لئے تیار ہو جائینگے۔

گروکل کی تعلیم اور اُس کے طرزِ عمل پر دشمنوں کو نکتہ چینی کا نہ کوئی حق ہے نہ موقع، دوست کو یہ شکایت ضرور ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ طاقت بہترین طور پر نہیں استعمال کر رہے ہیں، اُن کی قدیمی تہذیب میں اس قدر مادہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا اُن کی موجودہ تنزل کی حالت میں آسانی سے مقابلہ کر سکے؛ لڑائی اگر در اصل ہے تو مسلمان ہندو کی ہے، قرآن اور وید کی نہیں، اور اس لئے انھیں اسلام پر حملہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنے خیالات کی تبلیغ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے اعمال سے اپنے دھرم کی خوبیاں ثابت کریں اور دوسروں پر لعنت بھیجنے میں کم وقت صرف کریں۔ محمد مجیب

قومی تعلیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

بے ترتیبی اور ابتری جماعتی اور قومی احساس کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ انحطاط کی انتہا کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کو یہ ہزار دقت کوشش کرکے یہ باور کرانا پڑتا ہے کہ جماعتی احساس، جماعتی مطمح نظر اور جماعتی تہذیب بھی کوئی چیز ہے اور اس کے لئے ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو جماعت یا قوم کی روایات کی حامل ہو۔ تعلیم کے کیا معنی ہیں؟

تعلیم اس بالارادہ اور بالقصد سعی کا دوسرا نام ہے جو ایک جماعت اپنے ماضی کو مستقبل کے ہیولیٰ کی طرف منتقل کرنے کے لئے کرتی ہے۔ یعنی در اصل قومی زندگی کے تسلسل اور ترقی کو برقرار رکھنے کی کوشش کو تعلیم کہتے ہیں۔ قومی احساس کے لئے بڑی حد تک تعلیم وہی کام انجام دیتی ہے۔ جو انفرادی احساس کے لئے حافظہ۔ تعلیم کا مقصد جماعت سے قطع نظر محض افراد کی تکمیل ہرگز نہیں۔ گروہ، قوم اور سماج ہی موجودات اصلیہ ہیں فرد جو ان کا جزو ہے محض ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ جماعت انسانی ایک جسم نامی ہے اور افراد بمنزلہ اس کے مختلف اعضاء کے۔

بہت ممکن ہے کہ اس بیان سے ایک طبعیاتی افادی، کافی بالذات اور برخود غلط انفرادیت پسند کے ابروؤں پر بل پڑ جائیں اور ایسے لوگ آج کل بے شمار ہیں لیکن ان روابط پر جو افراد کو متحد کرتے ہیں ذرا سا غور کرنے سے ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہماری کفایت بالذات محض خیالی ہے۔ ماں کا تعلق اپنے بچے سے۔ عاشق کا تعلق اپنے محبوب سے۔ پیر کا تعلق اپنے مریدوں سے اور پجاری کا تعلق اپنے دیوتا سے یہ سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ہم دوسروں میں رہتے ہیں اور دوسروں کے لئے زندہ ہیں۔ اگر فرد کا وجود ناگزیر ہے تو پھر افراد دو ہونے چاہئیں۔ "میں" بغیر "تو" خارج از تصور ہے۔

ہمیں اس حقیقت کو دوبارہ دریافت کرنا ہے اور دریافت کرکے اسے اپنی ہستی میں

ضم کرتا ہے۔ اس لئے کہ جدید انفرادیت پسندی کا بڑھتا ہوا سیلاب ہماری اجتماعی زندگی کی بنیادوں کو بہائے لئے جا رہا ہے اور اس عمارت کے ذرے ذرے کو الگ کئے دیتا ہے۔

جماعت انسانی کی تمثیل جسم نامی سے ایک بہت ہی نتیجہ خیز تمثیل ہے اور تمام بڑے بڑے مفکرین اجتماعیات نے اسے استعمال کیا ہے جسم اجتماعی اور جسم حیوانی دونوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں برابر تخلیقی عناصر کی آمد جاری رہتی ہے۔ جسم حیوانی برابر مادے کو خارج کیا کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے مادوں کو داخل کرنے کے لئے جد وجہد کرتا رہتا ہے جسم اجتماعی میں بھی یہی تماشا افراد کی موت اور پیدائش کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جس طرح جسم حیوانی باوجود مادے کی لگاتار تبدیلی کے اپنی ہستی کو قائم رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح جسم اجتماعی بھی باوجود افراد کی آمد و رفت کے اپنے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے اجتماعی تجدید اور ترمیم کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے جسم حیوانی کی تجدید تو ایک فطری اور غیر شعوری عمل ہے لیکن جسم اجتماعی کی تجدید اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عمل بھی ہے اور ایک شعوری اور اخلاقی کوشش بھی۔

خود فطرت نے جسم اجتماعی اور جسم حیوانی دونوں کے تسلسل کا انتظام کر دیا ہے۔ افزائش نسل اور وراثت، اجتماعی نظام کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے فطرت کی تدبیریں ہیں۔ بچوں کی تربیت اور حفاظت کے جذبہ نے جو انسان میں دوسرے حیوانوں سے زیادہ عرصہ تک قائم رہتا ہے بچے کی بے بسی کو بھی اس تسلط کا ایک سبب بنا دیا ہے جو والدین کو اولاد پر حاصل ہوتا ہے نوجوان بڈھوں کے جانشین ہوتے ہیں ان کے طریقۂ فکر و احساس کو اختیار کرتے ہیں۔ اُن کی زبان اور اُن کے اخلاق کو قبول کرتے ہیں اُن کی یاد اور اُن کے معاد کو مستعار لیتے ہیں اور یہی غیر شعوری طور پر جدید کا قدیم کو جذب کرنا، جسم اجتماعی کی تجدید اور تسلسل کے برقرار رکھنے کا ایک زبردست سبب بن جاتا ہے۔ زبان کے ساتھ ساتھ افکار اور اخلاقیات کا گنج گراں مایہ بھی جسے پچھلی نسلوں نے جمع کیا ہے اگلی نسل کو ورثہ میں مل جاتا ہے۔ جمالی اور افادی

اشیا رجو آبا و اجداد بناتے ہیں یعنی فکر منجمد کے یہ نمونے بچوں کے دماغوں پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں اس لئے کہ پہلے پہل بچے کے سادے مگر عمیق سوالات کا مرکز یہی چیزیں ہوتی ہیں۔ مادی اشیاء کی وراثت اگلی نسل کو پچھلی نسل سے اور زیادہ مربوط کر دیتی ہے اور یوں تخلیق اجتماعی کے تسلسل کو برقرار رکھتی ہے گذشتہ کی یاد اور آئندہ کی توقعات، روایات اور مطمح نظر، مقاصد اور قدور یہ سب ایک غیر شعوری عمل جذب کے ذریعہ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آتے ہیں۔

انسانیت کے ابتدائی دور میں تو یہی کافی ہے لیکن زیادہ تہذیب یافتہ اور زیادہ متمدن اقوام ایک خاص مقصد کے ساتھ اور ایک مرتب اور بالارادہ اجتماعی کوشش کے ذریعہ سے اس عمل میں شدت پیدا کر دیتی ہیں اور اسی کا نام تعلیم رکھتی ہیں۔ جہاں تک اُن کا تعلق ہے یہ قومی احساس کے تسلسل کو قائم رکھنے اور قومی ہستی کے تحفظ کا ایک زبردست سبب بن جاتا ہے اور یہی ایک منظم جماعت کا اہم ترین فرض ہے۔

لیکن وہ قومیں جو خارجی اقتدار میں آجاتی ہیں خواہ وہ اقتدار سیاسی ہو یا تمدنی آہستہ آہستہ اس اہم فرض سے غافل ہوتی جاتی ہیں اور اس طرح اپنی ساری ہستی کو خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔

ہندوستان جب تک اپنا آپ مالک تھا اس وقت تک اس کے پاس بھی ایک مخصوص طریقہ موجود تھا جس سے وہ اپنے ماضی کے بہترین کارناموں کو خواہ وہ مادی ہوں یا اخلاقی نوجوان نسل کی طرف منتقل کر سکتا تھا۔ سیاسی غلامی کے ساتھ ایک بدتر غلامی بھی آئی یعنی دماغ اور روح کی غلامی۔ ہندوستان اب ہندوستان نہ رہا۔ اس کے فرزندوں کو جنہوں نے غیروں کی زبان اور غیروں کا مطمح نظر مستعار لے لیا تھا اپنے ماضی پر شرم آنے لگی۔ اس لئے کہ اس ماضی کو ارادۃً ان کی ہستی کا جزو بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ اُن کو تو صاف صاف یہ تعلیم دی گئی کہ اُسے بُرا سمجھیں اور ترک کر دیں۔ اُن کو یہ سمجھا دیا گیا کہ جو کچھ اُن کا ہے وہ معیار

سے گرا ہوا ہے اور جو کچھ غیروں کا ہے وہ معیار سے بہت بلند ہے۔ ہندوستان کی روح رہن کر دی گئی۔ ایک خارجی تہذیب نے جڑ پائی کی لیکن ہندوستان کے پاس نہ تو اتنی فرصت تھی نہ طاقت کہ صرف اس کے اچھے عناصر کو جذب کرے اس لئے وہ سراسر اس کا شکار ہو گیا۔

لیکن مغرب کی ذہنی تمدن سے ربط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں ایسا سیاسی احساس پیدا ہو گیا جو اس کے لئے بالکل نیا تھا "تعلیم یافتہ" ہندوستانی یعنی وہ ہندوستانی جنھوں نے حاکموں کی زبان سمجھنے اور لکھنے میں تھوڑی بہت مہارت حاصل کر لی تھی، قومیت، جمہوریت آزادی، اور اسی قسم کے دوسرے تصورات سے کھیلنے لگے۔ اسی طرح ہندوستان میں جس کی قومیت زائل ہو چکی تھی اور جو اندھیرے میں اپنی کھوئی ہوئی دولت کے حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا ایک سطحی قسم کی سیاسی تحریک نمودار ہوئی

اب رفتہ رفتہ سیاسی رہنماؤں نے مادر وطن کی گذری ہوئی عظمت کی یاد کو دوبارہ تازہ کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نئے نئے تعلیمی تجربے کئے گئے۔ موجودہ نظام تعلیم کے خلاف جو کلیتاً اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ خارجی اقتدار کو مستحکم اور اٹل بنا دے بے اطمینانی کا اظہار ۱۹۲۰ء میں جب کہ سیاسی تحریک انتہائی بلندی پر پہنچ گئی تھی تقریباً عام ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا جب اپنی ماضی کی محبت اور اپنی گذری ہوئی عظمت پر مستقبل کی بنیاد رکھنے کی خواہش اس قدر عام ہوئی۔ سیاسی تحریک نے قومی تعلیم کو بھی اپنا جزو بنا لیا جا بجا قومی تعلیم کے ادارے قائم ہوئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی ان ہی میں سے ایک ہے۔

سیاسی ہنگامہ ختم ہو گیا اور اسی کے ساتھ بہت سی ایسی تعلیم گاہیں بھی جو اس سلسلہ میں قائم ہوئی تھیں فنا ہو گئیں۔ لیکن جامعہ اور چند دوسری درس گاہیں ابھی تک اپنا چھوٹا سا کام معمولی طریقہ سے انجام دے رہی ہیں۔ جامعہ کی ابتدا چوں کہ سیاسی تحریک کے سلسلہ میں ہوئی تھی اس لئے بہت سے حضرات کو اب تک اس کے دائرۂ عمل کے متعلق شبہات باقی ہیں وہ جاننے اور سمجھنے

کی زحمت گوارا نہیں کرتے - اس جرم کا اگر واقعی اسے جرم کہا جا سکتا ہے کہ جامعہ ایک سیاسی تحریک کے ساتھ پیدا ہوئی، ہمیں اقرار ہے - اپنی پیدائش کے اسباب پر کس کو قابو ہو سکتا ہے؟ ہاں جامعہ اس کی ذمہ دار ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے - یہ کوئی سیاسی انجمن نہیں ہے اور نہ کسی ایسی انجمن سے مالی یا کسی قسم کے تعلقات رکھتی ہے یہ کسی سیاسی جماعت سے متعلق بھی نہیں اگر ایک طرف سیاست کے معنی عوام کے جذبات کو ابھار کر لیڈر بن بیٹھنا اور منافرت قومی پیدا کرنا ہیں اور دوسری طرف "جی حضور" کہنا اور سرکاری ملازمت اور عہدوں پر جان دینا ہیں تو ہندوستان میں مشکل سے کوئی ایسا تعلیمی ادارہ ہو گا جو جامعہ سے کم سیاسی ہونے کا دعویٰ کر سکے - بیشک جامعہ سیاسی ہے لیکن ان معنوں میں کہ وہ ہندوستان میں صحیح سیاست کو قائم کرنا چاہتی ہے، ہندوستان کے مستقبل کو ماضی کی عظمت کی مستحکم بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتی ہے، ہندوستان کے نوجوانوں کو صحیح تعلیم دینا اور اس اجتماعی تجدید کے کام میں اپنی قومی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا چاہتی ہے اور اس کی یہ کوشش ہے کہ ہندوستانی زندگی کے حقائق سے ہمیشہ تعلق رکھے - ہاں ان معنوں میں جامعہ سیاسی ہونے کے جرم کا اقرار کرتی ہے اور اپنے اس جرم پر اسے ناز بھی ہے -

اس ادارے کے نام کی ترکیب تین لفظوں سے ہوئی ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ یعنی قومی اسلامی یونیورسٹی - ان تینوں الفاظ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو سکتا ہے کہ اس درس گاہ کے مقاصد کیا ہیں -

سب سے پہلے ہم لفظ قومی کو لیتے ہیں - یہ درس گاہ قومی ہے اس معنی میں کہ اس کا مقصد متذکرۂ بالا اصول کو پیش نظر رکھ کر قوم کے بچوں کو تعلیم دینا ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری قوم کی ابتری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس لفظ کو سن کر لوگوں کے کان کھڑے ہوتے ہیں اور بعض کے نزدیک تو قومی سیاسی اور انقلابی کا مرادف بن گیا ہے -

"مگر ایک درس گاہ ایک ہی وقت میں قومی اور اسلامی کیسے ہو سکتی ہے" ؟ یہ سوال اکثر

لوگوں کے ذہن میں آتا ہے اور بار بار کیا بھی گیا ہے۔ اس لئے کہ مسلمان ہندوستانی قوم کا ایک اہم جزو ہیں۔ اگر ہم پھر اس تمثیل کی طرف توجہ کریں جو قوم کو جسم نامی سے دی گئی تھی تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ جس طرح ایک جسم میں مختلف اعضاء ساتھ ساتھ موجود ہوتے ہیں اور مل کر ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں بجنسہٖ یہی حالت قومی یا سیاسی جسم کی ہے اور جو نسبت ان اجزاء کو قوم سے ہے وہی نسبت قوم کو تمام عالم سے ہے۔ جامعہ کا سب سے بڑا مقصد نوجوانوں کے سامنے اس حصے کو واضح کرکے پیش کرنا ہے جو اسلام کا ہندوستانی تمدن کی ترکیب میں ہے۔ اور بلاشبہ اس کو صحیح قومی نقطہ نظر سے پیش کرنا ہے۔ "مسلمان اور ہندوستانی" نہ تو دو متضاد الفاظ ہیں اور نہ انھیں ایسا سمجھنا چاہئے اور جامعہ ہی سب سے زیادہ موثر کوشش ہے اس امر کی کہ انھیں ایسا نہ سمجھا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جامعہ میں کام کرنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں اور طلبا میں بھی مسلمانوں کی بہت اکثریت ہے لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جامعہ کے اساتذہ اور طلباء میں دوسرے مذہب یا فرقہ کے جو لوگ کبھی تھے یا اب ہیں وہ اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ حقیقی برادرانہ تعلقات رکھتے ہیں اور جب جامعہ سے علیحدہ ہوتے ہیں تو ان کے دلوں میں بھی جامعہ کی اسی قدر محبت ہوتی ہے جتنی کسی مسلمان کے دل میں۔

اب رہا لفظ "یونیورسٹی" ہمارے ملک میں بہت سے سربرآوردہ حضرات ایسے ہیں جن کے ذہن میں یونیورسٹی کا تصور ہی نہیں آسکتا جب تک اس کے ساتھ ایک عظیم الشان "سینٹ ہال" نہ ہو جس پر بہت سا روپیہ فضول صرف نہ کیا گیا ہو۔ ہمیں ایسے "ماہرین تعلیم" سے کوئی تعلق نہیں ہے اور انہیں اپنا یہ خیال مبارک ہو کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی نہیں ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ یونیورسٹی کو لازمی طور پر سند فروخت کرنے کی دوکان بھی ہونا چاہئے خواہ اس کے خریداروں کی حالت باہر نکلنے کے بعد کیسی ہی قابل رحم ہو۔ جامعہ ایسی یونیورسٹی ہونے کے فخر سے بہ ادب انکار کرتی ہے۔ لیکن اگر یونیورسٹی سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں کچھ لوگ خواہ وہ تعداد کے لحاظ سے کتنے ہی کم اور سامان اور اسباب کے لحاظ سے کتنے ہی مفلس کیوں نہ ہوں، جمع ہو کر اپنی تمام تر قوت کو تمدنی اغراض کے پورا کرنے میں صرف کریں اور جن کا مقصد یہ ہو کہ اس شاندار ماضی کو

دوبارہ دریافت کریں جو ہندوستانی نوجوانوں کے لئے صفحہ ہستی سے معدوم کردیا گیا ہے اور اسے قوم کے برناؤ پیر، امیر و غریب کی طرف یکساں طور پر منتقل کریں تو جامعہ یقینی طور پر اس نام سے موسوم ہونے کی مستحق ہے۔

کام کرنے والوں کی اس جماعت نے جس کے ہاتھ میں جامعہ کا نظم و نسق ہے قوم کی تمدنی خدمت کو اپنا مقصد حیات بنالیا ہے۔ انھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے مختلف ذرائع اختیار کئے ہیں۔ ان میں چند ایسے نوجوان موجود ہیں جو اس کام کے لئے اتنے ہی موزوں ہیں جتنا ہندوستان کا کوئی نوجوان ہوسکتا ہے جو اپنے مقصد کے ساتھ قلبی لگاؤ رکھتے ہیں اور جو اتنے قلیل معاوضے پر کام کرتے ہیں جس پر ایک غریب قوم کے خادموں کو کرنا چاہئے اور خصوصاً ایسے خادموں کو جن کا مقصد قوم میں خوداعتمادی پیدا کرنا اور اُسے مال دار بنانا ہو۔ ان میں سے بعض نے اردو زبان کی خدمت اپنے ذمہ لی ہے اور جامعہ کی اردو اکادمی بعض قیمتی علمی کتابیں اس سلسلہ میں شایع بھی کرچکی ہے اس کے علاوہ سیاسیات تاریخ فلسفہ اور معاشیات پر بعض اہم انگریزی اور جرمن تصانیف کا ترجمہ بھی جاری ہے اور اس کے بعد معاشی اور تعلیمی مسائل پر مستقل تصانیف کے شائع کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ ہر مہینے ایک بلند پایہ علمی رسالہ 'جامعہ' اور مہینہ میں دو بار ایک تعلیمی پرچہ "پیام تعلیم" بھی شایع ہوتا ہے۔

جامعہ کا ایک مکتبہ بھی ہے جہاں سے اُردو کی تمام اچھی کتابیں مل سکتی ہیں اس کے علاوہ مکتبہ نے متعدد کتابیں بچوں کے لئے اور بعض کتابیں عام مذاق کی بھی شایع کی ہیں اور ایسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

اس کے ساتھ ہی جامعہ کا ایک مطبع بھی ہے جو اُردو کے بہترین مطبعوں میں شمار ہوتا ہے اور جتنی کتابیں مکتبۂ جامعہ سے شایع ہوتی ہیں وہ اسی مطبع میں چھپتی ہیں۔

جامعہ کے اعلیٰ اساتذہ علمی مشاغل کے علاوہ کالج کے درجوں میں تعلیم بھی دیتے ہیں۔ درجہ بندی کے طلبا کو بھی اکثر درس اردو میں دئے جاتے ہیں اور درسی کتابوں کی آفت سے انھیں

محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ جامعہ کا کتب خانہ اگرچہ بدقسمتی سے ابھی اس درجے کو نہیں پہونچا ہے جو ہم چاہتے ہیں لیکن پھر بھی اس کا شمار دہلی کے بہترین کتب خانوں میں ہوتا ہے اور دوسری درس گاہوں کے اساتذہ اور طلبا بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

اسکول جو کالج کے درجوں کے بعد کھولا گیا رفتہ رفتہ ترقی کر رہا ہے اور سال بسال اس کے طلبا کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اکثر طالب علم جامعہ ہی میں رہتے ہیں اور اُن کے قیام کا معقول انتظام موجود ہے۔ بہت چھوٹے بچوں کے لئے ایک علٰحدہ دارالاقامہ ہے جس میں چھ برس سے لے کر بارہ برس تک کے بچے رہتے ہیں ان چھوٹے بچوں کا ساتھ ساتھ نماز پڑھنا، کھیلنا، ورزش کرنا، سبق یاد کرنا اور ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانا بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ان بچوں کو دیکھنے اور اُن سے گفتگو کرنے کے بعد ہندوستان کے مستقبل کے متعلق کوئی تشویش باقی نہیں رہتی۔

ذاکر حسین خاں

بزمِ مُعلّمین

بچّوں کا احترام

ہندوستان میں اگرچہ آخری پندرہ بیس سال میں تعلیم نے نمایاں ترقی کی ہے مگر ہمارا طریقۂ تعلیم اب بھی زیادہ تر پُرانے اُصول یا بے اُصولی پر مبنی ہے۔ جب ہمارے لڑکے سکولوں اور کالجوں سے نکل کر اپنی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت نہیں دیتے جس کے ہم متوقع تھے تو بیچاروں کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے لیکن اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ موجودہ نصاب و طریقۂ تعلیم کہاں تک اِس کے ذمّہ دار ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بچّوں کے متعلق اب تک ہماری ذہنیت بہت کم بدلی ہے۔ مشرق میں بزرگوں کا احترام تو ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ اور ہر مذہب کا جزو ہے، لیکن طفولیت و شباب کے احترام کا خیال اب تک ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔ صنفِ نازک کے متعلق ہماری سوسائٹی کے خیالات اور طرزِ عمل تو کچھ عرصہ سے اعتراضات کا آماج گاہ بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی تک طفولیت کے حقوق کی حفاظت میں بہت کم آوازیں بلند ہوئی ہیں۔ حالانکہ ہمارا نقطۂ نظر اپنے اہل و عیال کے متعلق خواہ وہ بیوی ہو یا بچّے تقریباً ایک ہی ہوتا ہے۔ دونوں کی زندگی کا مقصد ہماری اطاعت و فرماں برداری ہے۔ دونوں کی ہدایت اور تعلیم و تربیت قدرت سے ہمیں تفویض کی گئی ہے۔ ہم دونوں کے لئے معیار اور نمونہ ہیں۔ اُن کے مفاد اُن کی ضروریات اور اُن کی دلچسپیوں کو ہم خود اُن سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر قوم کے روشن خیال حضرات حقوقِ نسواں کی طرفداری پر کمر بستہ ہیں تو اُن کا فرض ہے کہ وہ بچوں کے حقوق کو بھی یاد رکھیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں بچّے بھی عورتوں کی طرح اب تک اپنے پیدائشی اور

فطری حقوق سے محروم ہیں۔ ہم بچوّں کی ضرورتوں۔ اُن کی دلچسپیوں اور اُن کی خوشیوں کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں تک کو بڑوں جیسے کپڑے پہنائے جاتے ہیں جس سے اُن کے ہاتھ پاؤں آزادانہ حرکت نہیں کر سکتے۔ کم عمر لڑکوں کو معمولی شوخیوں اور شرارتوں پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں اور اُن کا چلبلا پن جو زمانۂ طفلی کی فطری ضرورت ہے بزرگوں کو معیوب معلوم ہوتا ہے۔ جب کسی بچہ کی تعلیم شروع ہوتی ہے تو اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ اس عہدِ حیات کے لئے تعلیم کس قسم کی اور کس اسٹیج پر ہونی چاہیے بلکہ بزرگ محض اپنے نقطۂ نظر سے بغیر کسی اصول کو پیشِ نظر رکھے ہوئے اس کے نصاب کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اس کی انتہائی مثال مسلم یونیورسٹی اسکول کا نصابِ دینیات ہے۔

سلسلۂ دینیات اہلِ سنّت کی رُو سے چوتھی جماعت کے لڑکوں کو جن کی عمر اوسطاً دس سال کی ہوتی ہے محض زکوٰۃ اور حج کے مسائل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پانچویں جماعت کا رسالہ موزہ پر مسح کرنے کے بیان سے شروع ہوتا ہے اور غسلِ میت اور کفن کے مسائل پر ختم۔ چھٹی جماعت کا کورس روزہ کے بیان سے شروع ہوتا ہے اور پہلے دس صفحوں میں محض روزہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں لیکن وضو اور نماز کے مسائل ساتویں جماعت میں پڑھائے جاتے ہیں! اسی طرح سلسلۂ دینیات شیعہ کی پہلی کتاب کی ابتدا توحید سے شروع ہوتی ہے اور پہلے ہی صفحہ پر باری تعالیٰ کی آٹھ صفات ثبوتیہ۔ قادر۔ عالم۔ حی۔ مرید۔ مدرک۔ قدیم و ابدی۔ متکلم۔ صادق اور آٹھ صفات سلبیہ۔ مرکب۔ جسم۔ مرئی۔ محل۔ شرکت۔ احتیاج۔ معانی۔ حلول بیان کی گئی ہیں جن کی گنتی گننے کے بعد کسی قسم کی تشریح بھولے سے بھی نہیں کی گئی۔ نصاب کے ترتیب دینے والے کو اس سے کیا غرض کہ پہلی جماعت کے بچّے ان الفاظ کے مفہوم اور مطلب کو سمجھ بھی سکتے ہیں یا نہیں اُس نے تو یہ سمجھ کر کہ پہلی سے لے کر انٹرنس تک دینیات کی اس قدر تعلیم ہونی چاہیئے اُسے دس حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد مقررہ حصّے کو یاد کرنا طالب علم کا فرض ہے اور اگر وہ اس فرض کو انجام دینے میں کوتاہی کرے تو وہ قابلِ ملامت و سزا ہے۔ دینیات کے متعلق

تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تعلیم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو تعلیم کے اصولوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ اُن کی ذوات عظمت کے لئے بنائی گئی ہیں اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ طلبا کا احترام کریں اور ان کی ذہنی کیفیت اور ضرورت کو پیش نظر رکھیں زیادتی ہے۔ لیکن ہمارے اسکولوں میں تو ہر مضمون کی تعلیم اسی اسٹیج پر ہوتی ہے۔ اچھے ہوشیار اور ہمدرد معلم بھی اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ ہر شخص کو کیا کیا جاننا چاہیئے اور بچّوں کی ذہنی قابلیت اور صلاحیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں والدین اور اساتذہ سبھی یہ چاہتے ہیں کہ لڑکے بڑے ہو کر فلاں فلاں علم حاصل کر چکے ہوں تاکہ وہ مفید روزگار کارآمد زندگی بسر کر سکیں۔ بچّوں کی فطرت اور اُن کے جسم اور ذہن کے اقتضا کو مقصود نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ اُن کی تمام تعلیم کا معیار اور بنیادی اصول اس لیاقت کو سمجھا جاتا ہے جو بالغوں میں ہونی چاہیئے۔ گویا بہ الفاظ دیگر بچپن صرف بالغ زندگی کے تیاری کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے نہ کہ ایک ایسا عہد حیات جو بجائے خود کوئی قدر و قیمت رکھتا ہو اسی لئے اسکول کی تعلیم کا مقصد عام طور پر صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ طلبا چند مضامین مثلاً لکھنا پڑھنا۔ حساب، جغرافیہ۔ تاریخ وغیرہ رسمی طریقہ سے حاصل کرتے رہیں تاکہ وہ چند سال بعد محکمۂ تعلیم کے مقرر کردہ امتحانات میں کامیاب ہو کر ڈپلوما اور ڈگریاں پا سکیں۔ اسکول میں تمام تر توجہ اور زور ان مضامین میں ایک خاص حد تک واقفیت حاصل کرنے پر ہوتا ہے جو چیزیں اس مقصد کے حصول میں ممد و معاون ہو سکتی ہوں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جو اُس کو پورا نہ کرتی ہوں۔ انھیں باغ کے خس و خاشاک کی طرح کاٹ چھانٹ کر پھینک دیا جاتا ہے موجودہ زمانہ میں تمام ماہرین نفسیات اس امر میں متفق ہیں کہ تعلیم کا پہلا اصول یہ ہونا چاہئے کہ بچوں کی خلقی قوتوں کا اندازہ کیا جائے اور قوتوں کی نشو و نما استحکام اور استعمال کے مناسب ترین فضا پیدا کی جائے۔ اگر بچوں اور نوجوانوں میں فطرت نے کوئی قوت اور صلاحیت ودیعت کی ہی نہیں تو پھر تعلیم و تربیت انھیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ بیلوں اور گدھوں کو آپ ساری عمر اسکولوں میں رکھیں تو کبھی اُن کے ذہن ترقی نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر انسان

کو فطرت کا فیاض ہاتھ پیدائش کے وقت مختلف صلاحیتوں سے مالا مال کر کے دنیا میں بھیجتا ہے تو یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم کفرانِ نعمت نہ کریں بلکہ اس خلقی ملکہ کو نگہِ احترام سے دیکھیں اور اس کے لئے مساعد ماحول اور فضا پیدا کریں۔ یہ سمجھنا کہ تعلیم ایک تلخ دوا ہے جو جبراً بچہ کے حلق سے اتارنی چاہیے ایک عام اور افسوسناک غلطی ہے تعلیم بیرونی اثرات کے دباؤ کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ انسانی فطری ضروریات کا۔ یہ خیال کرنا کہ دماغ تحصیل علم سے قدرتاً متنفر ہوتا ہے ایسا ہی لغو اور بے معنی ہے جیسا یہ سمجھنا کہ اعضاءِ ہضم غذا سے متنفر ہیں اور بیرونی جبر و استبداد ہی اُن کے اس تنفر اور بے تعلقی کو دور کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر معلمین کا تجربہ انہیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے [illegible] تعلیم سے بھاگتے ہیں تو انہیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے طریقِ تعلیم کا [illegible] ہے اگر وہ نگہِ غور سے دیکھیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ یا تو وہ ایسی چیزوں کے متعلق [illegible] ہیں جو طلباء کی موجودہ ضروریات اور ذہنی نشو و نما کے مطابق نہیں یا انہیں پیش کرنے کا [illegible] نفس بچوں اور بچوں کی حقیقی ضروریات سے ہے وہ کو نمایاں نہیں کرتا بچے اسی بات کو جاننا چاہتے ہیں جن کا تعلق اُن کی روزانہ دلچسپیوں سے ہو جس شے کے جاننے کی وہ ضرورت محسوس نہیں [illegible] کا جبر یہ اُن کے دماغوں پر ڈالنا بالکل بیکار ہے۔ ساری دقت تو یہ ہے کہ ہمیں بچوں کے فطری میلانات اور اُن کی آزاد نقل و حرکت پر اعتماد نہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر والدین اور استاد ہر ہر قدم پر بچہ کی زندگی میں دخل نہ دیں اور یہ فیصلہ نہ کرتے رہیں کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، کیا سیکھے اور کیا نہ سیکھے تو اس کی عمرِ عزیز ضائع ہو گی اور وہ کچھ نہ سیکھ سکے گا۔ یہ خیال ایک عظیم غلطی پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اسکول کی رسمی تعلیم کو مبالغہ آمیز اہمیت دیتے ہیں۔ انسان کی تعلیم اسکولوں کی چار دیواری سے کہیں زیادہ دنیا کی وسیع فضا میں ہوتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں جن چیزوں اور موقعوں سے اسے سابقہ پڑتا ہے۔ خود ہی اسے سب سے زیادہ قیمتی سبق دیتی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اسکول کی تعلیم ایک عبث اور قابلِ نفرت شے ہے۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ہم اسکول کی تعلیم کو اس وسیع اور نتیجہ خیز تعلیم کا ہم آہنگ بنائیں جو درسگاہ حیات

میں صبح سے شام تک جاری رہتی ہو۔ پیدائش کے دن سے لے کر پانچ چھ برس کی عمر تک جب وہ مدرسہ جانا شروع کرتا ہے بچہ ہزار ہا باتیں سیکھتا ہے جن کے متعلق اُسے کوئی مجبور نہیں کرتا۔ ہر کام اس کے ذاتی شوق اور فطری رجحانات کا نتیجہ ہوتا ہو۔ اس کی ضروریات اُسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ بہت سی باتیں سیکھے اور اس کی تمام جدوجہد اس کے بقائے حیات اور نشوونما کے سلسلہ کا اقتضا ہوتی ہو۔ ایک ننھے بچہ کی روزانہ نقل وحرکت کا سرسری مطالعہ بھی اس کی جستجوئی پیہم اور کوششِ دریافت کا ثبوت دیتا ہو وہ چیزوں کو چھوتا ہو۔ ٹٹولتا ہے۔ چوستا ہو چاٹتا ہو ان کو آگے پیچھے کھینچتا ہے اٹھاتا ہے اور پھینکتا ہے۔ اس کی ہر کوشش اسے گرد وپیش کی اشیاء کے نئے صفات وخواص بتلاتی ہو۔ بچہ کی یہ باتیں بڑوں کو خواہ کتنی ہی فضول معلوم ہوں لیکن انھیں کے ذریعہ وہ اپنی دنیا سے واقفیت حاصل کرتا اور اپنی قوتوں کے استعمال اور حدود سے آگاہ ہوتا ہے۔ بچوں کی جبلی حرکتیں بڑوں کو اس لئے بے معنی معلوم ہوتی ہیں کہ وہ اپنے گردوپیش کی دنیا سے واقف ہوچکے ہیں اور نت نئے تجربوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن بچوں کے لئے ہر وہ تجربہ جو انھیں اُن کے ماحول سے واقف بناکر اُن کے آئندہ عمل پر اثر ڈالے۔ تعلیمی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کوششِ انکشاف اور خواہش دریافت کے بغیر اُن کی ہستی کے انسانی پہلو ترقی اور نشوونما نہیں پا سکتے۔

انسان اور ادنیٰ مخلوقات میں ایک بڑا فرق ہو کہ انسان اپنے تجربات کی بنا پر اپنے موجودہ اور آئندہ طرزِ عمل کو تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن ادنیٰ جان دار اس سے محروم ہیں۔ پروانہ متعدد تجربوں کے بعد بھی شعلہ دیکھ کر لپکے گا۔ خواہ اس کے پر جل جائیں یا وہ خود فنا ہو جائے۔ لیکن انسان اپنے تجربہ کی بنا پر اپنے عمل کو ماحول کے مناسب بنا سکتا ہو۔ اور یہی صلاحیت اس کے تمام تعلیمی امکانات کی بنیاد ہے۔ لیکن انسان کے لئے تعلیم ممکن ہی نہیں بلکہ لازمی بھی ہو پروانہ کا بچہ پیدا ہوتے ہی اپنی جنس والوں کے تمام کام انجام دے سکتا ہے۔ اور بغیر کسی تعلیم یا امداد کے اتنا ہی عمدہ پروانہ بن سکتا ہو جتنا کہ اس کے ماں باپ۔

لیکن انسان کا بچہ بغیر تعلیم کے حیوانیت کے درجہ سے بہت آگے نہ بڑھ سکے گا - اور ان تمام خصائل وفضائل انسانی سے محروم رہے گا جو بجائے نطفہ کے تہذیب و معاشرت کا نتیجہ ہوتے ہیں -

انسان صرف اپنے ہی تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بلکہ اس میں اپنی نوع کے تجربات سے بہرہ مند ہونے کی صلاحیت بھی ہے - افراد کی زندگی محدود ہوتی ہے اگر اُن کی ہدایت نہ کی جائے تو ہر نسل وہ تمام کوششیں اور غلطیاں کرنے پر مجبور ہو گی جو اس کے پیش رو کر چکے ہیں لیکن چوں کہ انسان صرف ذاتی بلکہ بزرگوں اور ہمعصروں کے تجربوں سے بھی مستفید ہو سکتا ہے - اس لئے وہ اپنے عمل کو ماحول کے مناسب بنانے کی زیادہ بہتر صورتیں اختیار کر سکتا ہے اور ترقی کے راستے وسیع تر ہو جاتے ہیں -

اگر نوع کے مجموعہ تجربات کا نام ہی علم ہے - اور ہر وہ تجربہ جو انسان کے آئندہ عمل پر اثر ڈالے اور اُسے ماحول کے مطابق بنانے میں مدد دے - تعلیمی اہمیت رکھتا ہے تو پھر یہ سمجھنا غلطی ہے کہ تعلیم کا سلسلہ مدرسوں کی چار دیواری میں محدود ہے - بچپن کے زمانہ میں تو خاص طور پر انسان کا قول یا ہر فعل اس کی آئندہ زندگی پر اثر ڈالتا ہے - اپنی زندگی کو بہتر بنانا - مخالف قوتوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنا - نوع انسان کے تجربہ کو اپنا بنانا - اس سے فائدہ اٹھانا - ان سب کے متعلق جو کچھ بھی کوئی فرد دوسروں سے سیکھے تعلیم کی نوعیت رکھتا ہے - بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کہا جا سکتا ہے - کہ اگر کوئی شخص اپنے ذاتی تجربات سے فائدہ اٹھا کر آئندہ مواقع پر زیادہ کامیاب عمل کا سبق سیکھتا ہے تو اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی بغیر کسی استاد کے جاری ہے اسکول جانے سے پیشتر بچہ جو کچھ بھی اپنے خاندان سوسائٹی اور "درس گاہ حیات" سے سیکھتا ہے نہ صرف اس کی تعلیم کا نہایت اہم جزو ہے - بلکہ یہ عملی اور غیر عملی اسباق مدرسوں کی رسمی تعلیم سے کہیں زیادہ مستقل اور نتیجہ خیز اثر رکھتے ہیں - لہذا اگر مدرسے اور زندگی دونوں بچوں کو تعلیم دیتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہی بچے جن کو زندگی کی آرزو بےچین رکھتی ہے - اور جو صبح سے شام تک سرگرم جدوجہد رہتے ہیں سکول کی فضا سے گھبراتے ہیں ؟ سکول کے باہر وہ مسرت و انبساط کے مجسمہ ہوتے ہیں دوڑتے ہیں بھاگتے ہیں بناتے ہیں بگاڑتے ہیں لیکن سکول میں پہنچ کر اُن کی تمام خوشی روانی اور دلچسپی جاتی رہتی ہے اور اُن کا

عملی اور تخلیقی جوش ٹھنڈا پڑجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معلمین عہد طفلی کی مخصوص ضرورتوں اور دلچسپیوں کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ تحکمانہ طریقہ سے یہ فیصلہ کرکے بچوں کو کیا کچھ جاننا چاہئیے انھیں واقفیت حاصل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ وہ محض یہ جانتے ہیں کہ بچے انھیں "استادِ ازل" سمجھیں اور طوطی مثال آنکھ کی طرح جو کچھ انھیں بتلایا جائے دہراتے رہیں۔ اُن کا یہ طریقہ بچوں کی ضروریات نشو ونما اور اُن کی ذہنی ترقی سے بالکل بے تعلق ہوتا ہے۔ اور اس لیئے بجائے فائدہ کے نقصان پہونچاتا ہے۔ بچوں کو آیندہ زندگی کے لیئے تیار کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انھیں وہی چیزیں سکھائی جائیں جن کی انھیں ضرورت ہو۔ بچوں کی "شورشِ امروز" کو "اندیشۂ فردا" کے خیال سے برہم نہ کیا جائے۔ اُن کے مستقبل کی کامیابی کی بہترین ضمانت یہی ہے کہ انھیں اپنی طفولیت کے مزے لوٹنے دیا جائے۔ بچہ کو بڑے ہوکر کامیاب زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لیئے کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیئے جو اُس کی نشو ونما میں حارج اور اُس کے جسم و دماغ کی آزاد اور مکمل ترقی میں مانع ہو۔ ہمارے اسکول بچوں کی موجودہ ضروریات کو نظر انداز کرکے ان کی تعلیم کو بالغوں کے نقطۂ نگاہ سے مدوّن کرتے ہیں۔ بچے کے لیئے زندگی کا ہر سال، ہر روز بلکہ ہر لمحہ بجائے خود مکمل ہے اور اُسے مستقبل کا فکر کبھی سرگرمِ عمل نہیں بنا سکتا۔ وہ انہی چیزوں کے متعلق جاننا چاہتا ہے جو اس کی روزانہ یا لمحہ بہ لمحہ دلچسپیوں اور ضرورتوں سے متعلق ہوں لیکن معلمین اس کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ وہ تو محض یہ چاہتے ہیں کہ بچہ الکتاب واقفیت کرے خواہ اس واقفیت کی اُسے ضرورت ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان اسکولوں سے نکل کر مختلف مضامین میں واقفیت کا تو کچھ نہ کچھ ثبوت دے سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان میں خود دریافت کرنے کی عادت نہیں ڈالی گئی تھی اس لیئے وہ بہ وقتِ ضرورت اپنے علم کو کام میں نہیں لاسکتے۔ سکول کی مستبدانہ فضا اُن کی صلاحیتِ عمل کو مُردہ کردیتی ہے۔ اس لیئے وہ رکاوٹوں کو دُور کرنا اور اپنی تخلیقی قوتوں کو کام میں لانا نہیں جانتے۔ اگر ہم قومی ترقی کے خواہش مند ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ سکولوں کے متعلق اپنے معیارِ قدر کو بدلیں۔ اور انھیں جبر و واقفیت کی دوکان بنے

بدلے ایسی زندگی کا سرچشمہ بنائیں جو اِن کی دماغی وجسمانی ترقی کی ضامن اور اُن کی دلچسپی کی جاذب ہو۔ جو ان میں غور و فکر تجسّس و دریافت، مشاہدہ اور تجربات کی عادتوں کو پختہ کرنے اور اُن میں آزادی اور انفرادیت پیدا کر سکے۔ بجائے اس کے مدرسے بچوں کو ایک محدود اور مُردہ ماحول میں رکھ کر ان کی نشوونما اور شوقِ جستجو کو پامال کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس تنگ محبس سے بچنے اور بھاگ نکلنے کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں۔ اور انھیں تعلیم سے ہمیشہ کے لیئے نفرت اور بددلی پیدا ہو جاتی ہے۔

بچوں کو شروع میں رسمی مضامین کی تعلیم دینے کے بجائے اُستادوں کو چاہیئے کہ وہ اُن کے لیئے ایسے مشاغل مہیا کریں جو اُن کی دماغی وجسمانی ترقی کی ضروریات کے مطابق ہوں۔ تاکہ وہ اپنے فطری شوقوں کو جاری رکھ سکیں۔ اپنے ہاتھوں، پیروں اور حواس کو کام میں لائیں۔ اور اپنے گرد و پیش کی وسیع، دلچسپ اور تحیّر خیز دنیا کو دیکھیں بھالیں۔ اپنے اعمال و مشاغل کے دوران میں انھیں مختلف دقتیں پیش آئینگی۔ جن کے متعلق وہ اپنے بزرگوں، اُستادوں اور والدین سے طالبِ امداد ہونگے۔ اور انھیں مزید واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی۔ رفتہ رفتہ انھیں کتابوں کی اہمیت کا اندازہ ہوگا اور کسی خاص مسئلہ کے متعلق کتابوں کے ذریعہ واقفیت حاصل کرنے کا شوق انھیں آمادہ کریگا کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ اس طرح اُن کی نگاہوں میں کتابیں خشک مضامین پر مشتمل ہونے کے بجائے اُن کی دلچسپیوں اور شوقوں کے پورا ہونے کا ذریعہ بن جائینگی۔ اور وہ جو کچھ پڑھینگے اُسے یاد رکھینگے اور اُس سے فائدہ اُٹھائینگے۔ کتابیں جو عام طور پر سکول کے مقررہ نصاب کی مترادف ہوتی ہیں اُن کے لیئے مفید علم کی کنجی بن جائینگی جس کے ذریعہ وہ ہر قسم کی ضروری اور دلچسپ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اُن میں خوداعتمادی، استدلال اور رضاکارانہ تحقیق و دریافت کی عادتیں پختہ ہو جائینگی۔ سکول کا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ وہ ایسے حالات اور فضا پیدا کرے جن کے ذریعہ سے لڑکوں کے مخصوص رُجحانات اور شوقوں کی پرورش ہو سکے اور وہ اُن کی

تکمیل کے خواہش مند نہیں۔ اسی خواہش کے زیرِ اثر وہ بتدریج علم کے مختلف منازل و مراحل کو طے کرتے چلے جائینگے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ منزلوں کی ترتیب اور مسافت کا فیصلہ خود طلباء کی ذہنی ضرورتیں کرینگی نہ کہ اُستاد۔

میں نے اس مضمون میں ان عام اُصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو بچوں کی تعلیم میں پیش نظر رہنے چاہئیں۔ ان کا عملی اطلاق ایک مستقل مسئلہ ہے جس کا میں کوئی سطحی حل یا خاکہ یہاں پیش نہیں کرنا چاہتا۔ علاوہ بریں اس میں ہر اُستاد کو جداگانہ حالات پیش آئینگے اور اُن کے مطابق طریقۂ عمل اختیار کرنا پڑیگا۔ جدّتِ فکر اور جدّتِ عمل دونوں کی ضرورت اور دونوں کے لیئے موقع ہوگا۔ اِس لیئے کوئی بنے بنائے مقررہ قواعد اور اشارات نہیں بتائے جا سکتے۔ ہر شخص کو اپنی مہم خود سر کرنی ہوگی۔ لیکن "انسان برتر" کی تخلیق کے لیئے اس سعی ہیم میں ہر اُستاد کو یہ یاد رکھنا ضروری اور مفید ہے کہ بچوں کی شخصیت کا احترام کرنا اس کی کامیابی کی بہترین ضمانت ہے۔ کیونکہ ان ہی کی فطرتِ خوابیدہ میں وہ جوہر پنہاں ہیں جن کو بیدار کرنے اور صحیح تربیت کرنے سے ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہونچ سکتے ہیں۔ ٹیگور کا یہ قول ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ "ہر طفل نوزائیدہ دُنیا میں پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا"۔

سید بشیر حسین زیدی

برٹرینڈ رسل کا تعلیمی نصب العین

موجودہ صدی میں انگریزی زبان میں تعلیم پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں غالباً برٹرینڈ رسل کا رسالہ "تعلیم" سب سے زیادہ فلسفیانہ اہمیت رکھتا ہے۔ رسل کی کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کا جسم علم ہے اور اس کی روح محبت۔ اس مطلب کو خود اس نے ذیل کے الفاظ میں ادا کیا ہے:

جب ہم نوجوانوں کے دلوں کو خوف بیرونی مزاحمت اور سرکشی اور دبائی ہوئی جبلتوں سے آزاد کرلیں تو ہم اُن کی آنکھوں سے پردے اُٹھا کر انھیں کما حقہ دنیائے علم کے کونے کونے کی سیر کرا سکینگے اور اگر درس و تدریس کا مناسب طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ تعلیم لڑکوں پر بار خاطر ہونے کے بجائے اُن کے لیئے ایک خوشگوار مشغلہ بن جائیگی۔ کوئی ضرورت نہیں کہ لڑکوں پر کتابوں کا بوجھ اُس سے زیادہ لادا جائے جتنا آج کل بیشتر اسکولوں مدارس میں ہوتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ان میں آزادی اور منچلے پن کی روح پھونکی جائے اور یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ میدان تحقیق میں سرگرم سفر ہیں۔ اگر ابتدائی تعلیم اس عنوان سے دی جائے تو مستعد طالب علم اپنی ذاتی سعی سے اس پر بہت کچھ اضافہ کر لینگے جس کا انھیں پورا موقع دیا جانا چاہیئے۔ علم ہی وہ چیز ہے جو بشر طبعی رجحانات اور تخریبی عادات کی قید سے آزاد کرتا ہے۔ بغیر علم کے ہماری اُمیدوں کی دُنیا تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ اگر آیندہ نسل کو بے خوفی اور آزادی کی تعلیم دی گئی تو اس کے دل میں وہ امیدیں موجزن ہونگی جو ہمارے خیال میں بھی نہیں کیونکہ ہمارے تحت الشعور میں تو اب تک ضعیف الاعتقادی کے توہمات چھپے ہوئے ہیں جن سے ہمیں جنگ کرنا پڑتی ہے۔ یہ شرف ہمیں نہیں بلکہ ہمارے دامن تربیت میں پلے ہوئے آزاد مردوں اور عورتوں کو حاصل ہوگا کہ وہ پہلے عالم تصور میں نئی دنیا کی جھلک دیکھیں اور پھر عالم حقیقت میں اُس کے جلوے کا مشاہدہ کریں۔

راستہ صاف ہے۔ کیا ہمیں اپنے بچوں سے اتنی محبت ہے کہ اللہ کا نام لیکر اُس پر چل کھڑے ہوں؟ یا ہم انہیں بھی وہ مصیبتیں جھیلنے دینگے جو خود ہم نے جھیلی ہیں؟ کیا ہم انھیں جوانی میں اس طرح دب جانے دینگے کہ نامرادی کا زہر ان کے دل میں گھر کر بیٹھ جائے اور وہ آگے چلکر اُن کا لقمہ بنجائیں جنھیں وہ اپنے ضعف عقل کی بدولت دیکھ نہ سکے خوشی اور آزادی کی راہ میں سرراہ رکاوٹیں ہیں۔ لیکن محبت خوف پر غالب آسکتی ہے اور اگر ہمیں اپنے بچوں سے کافی محبت ہے تو ہمیں کوئی طاقت اس بات سے نہیں روک سکتی کہ ہم انھیں وہ سعادت بخشیں

مسلمانوں کا تعلیمی مستقبل

پچھلے پچاس سال میں تعلیم جدید کو مسلمانوں میں عام کرنے کے لئے بہت کافی کوشش کی گئی۔ کانفرنس قائم ہوئی۔ سکول اور کالج کھولے گئے، چندے جمع ہوئے، وظیفے قائم ہوئے، مضامین لکھے گئے، لکچر ہوئے، قومی نظمیں لکھی گئیں، گورنمنٹ سے امداد کی درخواستیں کی گئیں۔ غرض کہ تمام قومی تحریکوں کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا جائے۔ اور ایسا انتظام کیا جائے کہ یہ تعلیم میں دوسروں سے ایسے پیچھے نہ رہ جائیں کہ ان کی قومی ہستی بھی باقی نہ رہے بلکہ اپنی حالت کو بہتر بنائیں۔ گزشتہ غفلت سے جو نقصان ہوا تھا اس کی تلافی کریں۔ چنانچہ یہ تمام تحریکیں اس حد تک تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں کہ اب جدید تعلیم کی مخالفت نہیں ہوتی اور اگر کوئی آواز اس تعلیم کی مخالفت میں بلند بھی ہوتی ہے تو اس کی شنوائی نہیں ہوتی لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمیں اپنے اصلی مقصد کے حصول میں کہاں تک کامیابی ہوئی اور اس تعلیم سے ہماری حالت کس حد تک درست ہوئی ہے۔ یہ اندازہ لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم وضاحت سے یہ بیان کردیں کہ جدید تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنے سے کون کون سے فوائد ہمارے مدنظر تھے۔ ہم اپنے نصب العین کو صاف اور واضح طور پر سمجھ کر یہ اندازہ بہتر طریقہ پر کرسکیں گے کہ ہم کہاں تک اپنے نصب العین کے حصول میں کامیاب ہوئے ہیں اور ہماری کوششیں ایسی ہیں یا نہیں کہ وہ ہمیں اپنی منزل مقصود تک پہونچا ئیں۔

مغربی تعلیم کے حاصل کرنے سے ہمارا ایک مقصد یہ تھا کہ اس کی مدد سے ہماری مالی حالت بہتر ہو جائے گی۔ سلطنت کھونے کے بعد مسلمانوں میں افلاس بہت تیزی کے ساتھ پھیلتا جاتا تھا اور اس کی روک تھام کے لئے جدید تعلیم کا حاصل کرنا ضروری تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے سرکاری

ملازمتیں مل سکیں۔ کچھ لوگ ڈاکٹری، وکالت، انجنیری، مدرسی وغیرہ وغیرہ پیشوں میں داخل ہوکر عزت کی روزی کما سکیں اور کچھ لوگ تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دے کر قومی فارغ البالی میں اضافہ کریں۔ دوسرا بڑا مقصد جو اس تعلیم سے تھا اور ہے وہ یہ ہے کہ وہ دماغی سستی اور ذہنی کاہلی جو مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہے دُور ہوجائے۔ ذہنی کاہلی نام ہے اس بے توجہی کا جو مسلمانوں کو اعلیٰ خیالات، علمی تحقیقات اور عقلی کمالات سے ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں نے علمی ذوق و شوق کا وہ ثبوت دیا تھا کہ دنیا کے تمام علوم و فنون میں انھوں نے بہترین حیثیت حاصل کرلی تھی۔ مگر ہمارا یہ حال ہے کہ مغربی علوم تو درکنار خود عربی اور فارسی علوم کی تحقیقات میں مغرب والوں کے ممنونِ احسان ہیں۔ اس وقت یہ خیال کیا گیا تھا کہ مغربی علوم کے حاصل کرنے سے ہمیں مغرب والوں کے اصول تحقیقات سے واقفیت ہوگی اور اس طرح ہم نہ صرف علوم جدیدہ مثلاً سائنس وغیرہ میں علمی کمالات حاصل کرسکیں گے بلکہ خود عربی اور فارسی علوم کے خزانوں سے جو آج بھی علمی دولت سے مالا مال ہیں صحیح طور پر بہرہ اندوزہ ہوسکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارا یہ بھی مقصد تھا کہ وہ اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں جو دماغی پستی کا نتیجہ ہیں علم کی روشنی سے دُور ہوجائیں اور ہماری قوم کو تہذیب یافتہ قوموں میں مالی، معاشرتی اور علمی اعتبار سے اعلیٰ درجہ حاصل ہو ان تمام باتوں کو سرسید اور ان کے ساتھیوں نے پوری طرح محسوس کیا اور ان مقاصد کے حصول کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں لیکن ان لوگوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ دنیاوی اور علمی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان دینی اور روحانی ترقی کو بھی پیش نظر رکھیں۔ چنانچہ جہاں مفید مغربی علوم کی تعلیم کے لئے بندوبست کیا گیا وہاں دینی اور عربی علوم کی تعلیم کے لئے بھی اہتمام کیا گیا۔

اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اس جد و جہد سے مسلمانوں کی حالت کس حد تک درست ہوئی اور اُنھوں نے جدید تعلیم کے ذریعے کیا مالی، معاشرتی اور ذہنی فائدے حاصل کیے؟ ہمیں صریحاً اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی مالی حالت آج بھی نہایت

زبوں ہے۔ پنجاب کے زمیندار اب بھی قرض کے دام میں ایسے گرفتار ہیں کہ ہر سال لاکھوں روپیہ سود کی صورت میں قرض خواہ جماعت کی نذر کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی زمینیں قرض خواہوں کی دست برد سے بچی ہوئی ہیں لیکن جو محنت وہ سال بھر کرتے ہیں وہ زیادہ تر اپنے قرض خواہوں کے لئے ہوتی ہے خود انھیں اپنی محنت کا پھل قرض خواہ جماعت کے دروازے پر پہنچانا پڑتا ہے اور اگلے سال کے گزارے کے لئے ان ہی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ سندھ میں زمینداروں کی حالت اتنی خراب ہوگئی ہے کہ وہاں بھی گورنمنٹ چاہتی ہے کہ پنجاب کی طرح ایک ایسا قانون جاری کردے کہ کاشتکار جماعت کے قبضے سے زمینیں نہ نکل سکیں تاکہ وہ قرض خواہوں کی چالوں سے ایک حد تک محفوظ ہو جائیں۔

سرکاری ملازمتوں میں ہماری کیا حالت ہے؟ ایک طرف تو وہ لوگ جو تعلیم میں ہم سے آگے تھے اور جنھوں نے سرکاری دفاتر پر پہلے سے قبضہ جما لیا تھا وہ اپنے حقوق کی حفاظت میں کافی سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل ہیں چنانچہ جو مسلمان بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد کامیاب ہوتے ہیں اکثر ملازمت کی تلاش میں در در مارے پھرتے ہیں اور کہیں جگہ نہیں پاتے۔ یہ سچ ہے کہ اسامیاں بھی پہلے کی نسبت مقابلۃً کم خالی ہوتی ہیں لیکن اگر ہوتی بھی ہیں تو ان کے متعلق صحیح واقفیت زیادہ ان لوگوں کو ہوتی ہے جو پہلے دفاتر میں بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں اور اکثر بوجہ دیرینہ ملازمت کے اپنے اثر سے اپنے ہی متعلقین میں سے کسی کو جگہ دلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ ملازمتوں میں جہاں اُمیدواروں کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مسلمان بہت ہی تھوڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان امتحانوں میں شامل ہونے کے لئے اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مسلمان اعلیٰ تعلیم میں پہلے ہی سے بہت پیچھے ہیں (جیسا کہ ہم آگے مفصل بیان کریںگے) اس لئے مقابلہ کرنے والوں ہی میں مسلمان اُمیدوار کم ہوتے ہیں اور نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ کامیاب ہونے والوں میں بھی ان کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

اگر آپ ملازمت کے علاوہ دوسرے اعلیٰ پیشوں کی حالت پر غور کریں تو وہاں بھی مسلمانوں کو بہت پیچھے پائیں گے۔ وکالت اور ڈاکٹری تو اس قسم کے پیشے ہیں کہ ان میں کامیابی کے لئے ایک عرصہ تک امیدوار رہنا پڑتا ہے۔ شروع میں اپنے پاس سے خرچ کرکے گزارہ کرنا ہوتا ہے ہماری قوم میں افلاس کا پہلے ہی رونا ہے اس لئے مسلمان طلبا پیشہ ورانہ تعلیم کم حاصل کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ لا کالجوں اور میڈیکل کالجوں میں اب بھی مسلمان بہت کم تعداد میں داخل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء کی تعلیمی رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ پنجاب اور صوبجات متحدہ کے لا کالجوں میں کل ۱۶۱۴ طلبا تھے جن میں مسلمانوں کی تعداد محض ۲۰۵ تھی۔ میڈیکل کالجوں میں کل ۷۴۲ طلبا ہیں۔ اور ان میں مسلمان ۲۱۹ ہیں پنجاب میڈیکل کالج میں مسلمان طلبا خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ کیوں کہ وہاں داخلے کے وقت یہ لازم ہے کہ ۴۰ فی صدی مسلمان طلبا داخل ہوں چنانچہ اگر وہاں کے ۱۷۷ طلبا اس تعداد سے منہا کر دئیے جائیں تو اس صوبہ میں ۲۵۴ طلبا میں سے صرف ۴۲ مسلمان رہ جاتے ہیں۔

اب رہا انجنیری کا پیشہ۔ اس میں بہت سے شعبے ہیں اور اس وقت ملک میں خصوصیت کے ساتھ بجلی اور مشینری کے انجنیروں کی ضرورت ہے۔ مگر مسلمان ان پیشوں میں بہت ہی کم داخل ہوتے ہیں چنانچہ ۸۸۰ طلبا میں سے جو ان کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں مسلمان صرف ۷۵ ہیں اور اس سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری حالت خراب ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ صورت حال نہایت خطرناک ہے اور آئندہ کے لئے اس کے نتائج قوم کے لئے مہلک ہونگے شروع میں جب سرسید نے علی گڑھ کالج کی بنا ڈالی اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ بہت جلد سرکاری ملازمتوں کے لئے ایک معقول تعداد کو تیار کیا جائے۔ چنانچہ آرٹس کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ لیکن باوجود اس کے بھی ہم ان ملازمتوں میں بہت پس ماندہ ہیں۔ انجنیری کی تعلیم کو اس وقت یہ اہمیت حاصل نہ تھی اس لئے گو اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرنا بھی مدنظر تھا مگر اس کے لئے فوری انتظام مشکل تھا اور اس وقت کچھ نہ کیا گیا۔ اب جب کہ اس تعلیم کی اہمیت زیادہ ہوگئی ہے کسی میں یہ توفیق

نہیں کہ مسلمانوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ اس تعلیم کا بندوبست کرے۔ کہنے کو تو ہر ایک کالج میں راستہ کھلا ہے مگر صورت حال یہ ہے کہ مسلمان طالب علم بہت کم تعداد میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں اور ٹیکنیکل کالجوں میں زیادہ تر غیر مسلم طلبا تعلیم پا رہے ہیں - لیکن ہمارے بیدار مغز برادران وطن نے جو مواقع سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں اپنی قوم کے لئے بہترین سہولتیں مہیا کردی ہیں۔ گورنمنٹ کالجوں کے علاوہ جو عملاً ان ہی کے ہیں ہندوؤں نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں اعلیٰ پیمانہ پر اس تعلیم کا بندوبست کر دیا ہے اور اپنی قوم کے لئے ترقی کی راہیں کھول دی ہیں - چنانچہ ہر سال سیکڑوں ہندو طلبا انجینری کے عہدوں کے قابل ہو کر ملک میں عمدہ عمدہ اسامیاں حاصل کرتے ہیں۔ مگر ہم ابھی غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں اور جب پانی سر سے گزر جائے گا تو شاید چونکیں۔ لیکن اس وقت یہاں بھی وہی حال ہوگا جو آج سرکاری ملازمتوں میں ہو رہا ہے سیکڑوں انجینیر جو آج تیار ہو رہے ہیں اپنے اپنے لئے جگہ حاصل کرلیں گے اور ہر جگہ اپنے اور اپنی قوم کے حقوق مضبوطی سے قائم کرلیں گے اور پھر جب ہمارے طالب علم فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے (بشرطیکہ ہم نے کبھی ایسی تعلیم کا بندوبست کیا) تو وہ ہر جگہ دوسروں کو مسلط پائیں گے۔ در بدر مارے پھریں گے اور ہماری آج کی غفلت اور بے پروائی کا خمیازہ بھگتیں گے۔

جب انجینیری میں یہ حال ہے تو صنعت و حرفت میں ترقی کی کیا اُمید ہو سکتی ہے؟ رہی تجارت سو اس میں تو شمالی ہند کے مسلمان بہت ہی کم حصہ لیتے ہیں۔ کچھ تو مالی کمزوری نے اور کچھ قوموں کی آپس کی کش مکش نے ہمیں اس قدر تنگ حال کر دیا ہے کہ آئندہ کے لئے بھی بہتری کی صورت نظر نہیں آتی۔ بلکہ وہ لوگ جنھوں نے تجارت میں قدم رکھا تھا۔ آج قومی بنکوں اور کارخانوں کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت نقصان اٹھا رہے ہیں۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ گزشتہ پچاس سال میں مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے لیکن اگر ان کی مالی حالت کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے مسلمانوں کی مالی حالت بہت کم درست ہوئی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ گروہ بھی ایک مفلس گروہ ہے۔ ان کے ظاہری

ساز وسامان پر نہ جائیے بلکہ یہ دیکھئے کہ یہ طبقہ قومی مفاد کے لئے کس قدر روپیہ خرچ کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ قومی چندوں کی فہرست اٹھا کر دیکھئے تو بعض پرانی وضع کے رئیس اور غیر تعلیم یافتہ تجار تو فراخ دلی سے قومی کاموں میں روپیہ خرچ کرتے نظر آئیں گے۔ اگرچہ اس وقت ان کی حالت بھی اچھی نہیں تاہم جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی نسبت اس طبقے کے لوگوں میں ابھی اتنا احساس اور استطاعت ہے کہ اپنے مال سے قوم کی مدد کرسکیں تعلیم یافتہ گروہ میں ایسے لوگ تو کہیں کہیں مل جاتے ہیں جو قدمے اور سخنے قوم کی خدمت کرتے ہیں لیکن مالی خدمت کی بحیثیت مجموعی یا تو ان میں استطاعت ہی نہیں یا توفیق خیر نہیں کہ وہ اس میں حصہ لیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ جدید تعلیم نے مسلمانوں کی مالی حالت کو کچھ بھی بہتر نہیں کیا بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم بتائیں کہ مسلمانوں نے اس تعلیم میں اب تک اتنی ترقی نہیں کی کہ مجموعی طور پر قوم کی حالت بہتر ہوسکے ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں مسلمانوں کے ایک ایسے صوبہ کو پیش کرتے ہیں کہ جس میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صدی سے زیادہ ہے۔ جہاں کے مسلمانوں کو "زندہ دل" کہا گیا ہے اور جس صوبہ کی وزارت تعلیم ۱۹۱۹ء کے بعد کئی سال تک ایک مسلمان وزیر کے ہاتھوں میں رہی جو چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے لئے پوری پوری تعلیمی آسانیاں بہم پہنچائے اور جہاں کے مسلمانوں کی حالت کو اب بھی ہندوستان میں بہترین خیال کیا جاتا ہے۔ ۸۸-۱۸۸۷ء کے تعلیمی اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ پنجاب کے کالجوں میں کل ۲۹۶ طلبا میں سے مسلمان طلبا کی تعداد ۶۶ تھی ۱۹۲۷ء میں اعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کالجوں میں کل ۴۴۷۰ طلبا ہیں اور ان میں ۱۸۴۲ مسلمان ہیں۔ ان اعداد سے صاف ظاہر ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں عام تعلیم میں مسلمانوں نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی وہ آج بھی اسی نسبت سے پیچھے ہیں جو چالیس سال پہلے ان میں اور ہندوؤں میں تھی اور ہم یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ فی الحال اس صورت کے بہتر ہونے کے آثار بھی نہیں ہیں۔ کیوں کہ ہائی سکولوں میں بھی مسلمان اسی نسبت سے کم ہیں۔ چنانچہ انھیں اعداد کے مطابق ۲۶۶۵۷ طلبا میں سے ۷۹۶۱ مسلمان ہیں۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ

مسلمان طلبا کی اکثر تعداد بالعموم انٹرنس کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیتی ہے اور کالجوں میں داخل نہیں ہوتی۔

لڑکیوں کی تعلیم کے لحاظ سے تو ہماری حالت اور بھی خراب ہے۔ کالجوں میں لڑکیوں کی تعداد ۷۷ ہے اور ان میں کل ۱۲ مسلمان لڑکیاں ہیں۔ ہائی سکولوں میں ۱۵۱۴ لڑکیوں سے ۸۴ مسلمان ہیں صنعتی سکولوں میں ۳۰۵ لڑکیوں میں ایک مسلمان لڑکی ہے اور میڈیکل سکول میں ۱۹۲ لڑکیوں میں سے ۲۰ مسلمان ہیں۔ ہماری تعلیمی پستی کا پورا اندازہ محض ایک سال کے اعداد و شمار سے نہیں ہو سکتا اندیشہ ناک امر یہ ہے کہ ہم گزشتہ پچاس سال سے اسی سست رفتار سے چل رہے ہیں

بر خلاف اس کے اگر ہم سکھوں کی حالت کا اندازہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے جدید تعلیم کی بدولت اپنی حالت کو بہت بہتر بنا لیا ہے۔ پچاس برس قبل وہ بھی تعلیم میں بہت پیچھے تھے مگر اب لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے ہر شعبے میں وہ اپنی آبادی کے لحاظ سے بہت آگے ہیں اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ لہذا اگر مسلمانوں کی مالی حالت میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آتی تو کیا تعجب ہے؟ انھوں نے تعلیم ہی میں کوئی غیر معمولی ترقی نہیں کی کہ قوم کی اقتصادی حالت کی بہتری کا راستہ پیدا ہو۔

سب سے بری بات یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو اپنی تعلیمی پستی کا احساس بھی نہیں رہا قومی لیڈر سیاسی مشاغل میں منہمک ہو گئے ہیں تعلیمی معاملات سے انھیں دلچسپی نہیں یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دس سال میں مسلمانوں کے لئے کسی قسم کی نئی تعلیمی سہولتیں مہیا نہیں کی گئیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی نے انجنیری اور دوسرے مفید پیشوں کی تعلیم کے لئے اپنے ہاں نئے اور کامیاب شعبے کھول دیئے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مسلم یونیورسٹی میں کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں! درحقیقت یونیورسٹی مظہر ہے قوم کی تعلیمی دلچسپیوں کا۔ جب قوم ہی کو تعلیمی ترقی سے دلچسپی نہ رہی تو یونیورسٹی میں کیا ہو سکتا ہے؟ ایک مفلس اور بے حیثیت جماعت پولٹیکل آزادی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکے گی۔ پچھلے دس سال میں تعلیم کا شعبہ زیادہ تر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں رہا ہے مسلمانوں نے

اس عرصہ میں خصوصیت کے ساتھ کیا ترقی کی؟ کچھ نہیں بلکہ پچھلے سالوں کے تجربہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جب تک خود مسلمان اپنی قوم کے لئے تعلیم کا بہتر بندوبست نہ کرینگے، انھیں دوسروں کی مدد سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ انجنیری، صنعتی اور تجارتی تعلیم میں مسلمانوں کی حالت اس وقت نہایت ہی خراب ہے اور اگر اس قسم کی تعلیم کے لئے جلدی کوئی بہتر انتظام نہ کیا گیا تو قوم کی پستی اور فلاکت کی کوئی حد نہ رہے گی۔ ضرورت ہے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اسی سال کوئی عملی تدبیر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اختیار کرے۔

جدید تعلیم کے حاصل کرنے سے ہمارا یہ بھی مقصد ہے کہ مسلمان علمی تحقیقات کے میدان میں بڑھیں اور اپنے علمی وقار کو دوبارہ حاصل کریں۔ پچھلے چند سال ہی میں رامن، رے وبوس اور سہا کی علمی تحقیقات نے دنیائے سائنس میں ہندوستان کے نام کو روشن کردیا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے اعلیٰ علمی حلقوں میں ان کا اور ہندوستان کا نام عزت اور احترام سے لیا جانے لگا ہے۔ لیکن مسلمانوں کا اس میدان میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ اعلیٰ تعلیم میں ان کی حالت یہ ہے کہ پنجاب کے تعلیمی اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ "سائنٹیفک ریسرچ" کرنے والے ۱۹ طلبا میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ یو۔پی میں من جملہ ۲۸ طلبا کے صرف ۲ مسلمان ہیں یہ دو بھی شاید مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کی برکت سے ہوں لیکن کیا یہ تعداد ہمارے مقصد کے پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیا اسی کوشش کے بل بوتے پر ہم اپنا قومی وقار دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی

کایں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان ست

اب دینی اور عربی تعلیم کا حال سنئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اسلامیہ سکولوں اور کالجوں میں اپنی تعلیم کا کچھ نہ کچھ بندوبست موجود ہے لیکن آپ نے کبھی اس کورس کو بھی ملاحظہ فرمایا ہے جس کا نام "دینیات کا کورس" ہے۔ کیا بچّوں کے لئے دینی تعلیم نکاح اور طلاق کے مسائل۔ نجاست اور طہارت کے اقسام خمس وزکوٰۃ کے شرائط تک محدود ہونی چاہیئے؟ کیا یہی طریقہ ہے بچّوں میں

حقیقی دینی روح پیدا کرنے کا ؟ تعلیمی کورس بدلتے رہتے ہیں۔ اچھی کتابوں کو شامل کرنے اور چننے کے لئے محکمۂ تعلیم کی کمیٹیاں مقرر ہیں۔ مگر ہم نے اپنی تعلیم کا مفہوم سمجھنے اور اس کے لئے صحیح طریق کار اور صحیح نصاب تیار کرنے کے لئے کیا کیا ؟ عربی تعلیم کا بھی خدا حافظ ہے ! خود علی گڑھ میں جہاں عربی تعلیم کو خاص اہمیت ہونی چاہیے یہ حال ہے کہ سکول اور انٹرمیڈیٹ کالج میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی طالب علم سائنس اور عربی دونوں مضامین پڑھ سکے۔ اگر سائنس کی تعلیم کو حاصل کرنا چاہو تو عربی چھوڑ دو اور اگر عربی پڑھو تو سائنس کی تعلیم نہیں ہو سکتی ! اجتماعِ ضدین ناممکن ہے !

ایک زمانہ تھا کہ ہم میں سرسید، حالی، شبلی اور محسن الملک جیسی ہستیاں تھیں جو قوم کی حالت کا اندازہ کر کے قوم کو آگاہ کرتی تھیں اور قوم کو بیدار کرنے کے لئے دوڑ دھوپ ان کا شیوہ تھا۔ مگر آج ہم اپنی حالت سے بے خبر ہیں۔ بلکہ اسی بدحالی میں مست ہیں۔ حالانکہ آج کام کرنے کے لئے بہت سی سہولتیں موجود ہیں۔ ہر صوبہ میں تعلیمی کانفرنسیں صوبہ وار موجود ہیں۔ مسلمانوں کی ایک یونیورسٹی بفضل خدا قائم ہے۔ ضرورت محض اس بات کی ہے کہ ہم اپنی حالت کو محسوس کریں اور جان لیں کہ ابھی محض کام کا آغاز ہے۔ ہماری پیشرو جماعت نے اپنی تندہی، کوشش اور ایثار سے ہمارے لئے مثالیں قائم کر دی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس بارہ میں ان کی تقلید کریں۔ ان کے کام کو جاری کریں، اسے ترقی دیں، اس کی رفتار کو بڑھائیں اور اس میں وسعت پیدا کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو نہ صرف ملک کا علمی کام ادھورا رہ جائے گا بلکہ قومی ترقی کی جو امیدیں بندھی ہیں وہ سب بھی فوت ہو جائیں گی۔ کیوں کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ابھی ہم نے ایسی ترقی نہیں کی جس سے ہم برادرانِ وطن کے دوش بدوش چل سکیں۔ ہم پیچھے تھے، پیچھے ہیں اور اگر یہی حالت رہی تو سدا پیچھے رہیں گے۔ اندیشہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے تھوڑا بہت حاصل کیا ہے اس کے نشہ میں یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ ہم نے منزلِ مقصود کو پا لیا۔ منزل ابھی دور ہے اور وقت کم۔ قوم کے جمود اور غفلت سے مقابلہ کرنا ہے۔ جہاں بیداری پیدا ہو چلی ہے

زمانۂ حال کی بلکہ وہ اپنی عمومیت میں سب قوموں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ تاہم ہندوستان کی رجحان اور موروثی اوصاف کی وجہ سے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو حاصل ہوتے ہیں علم کو آگے بڑھانے کی خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ روشن تخیل جو بظاہر متضاد باتوں کے انبار میں سے عمدہ ترتیب پیدا کرسکتا ہے وہ کسی ایک بات پر خیال کو جمانا کی عادت ڈالنے سے قابو میں رکھا جاسکتا ہے، اور یہی وہ روک ہے جس سے نفس کو حقیقت کی تلاش میں بے حد صبر کے ساتھ کام کرنے کی قوت حاصل ہوتی ہے۔۔۔۔

۴۔ خیال کا نیا مرکز سب سے بڑی مشکل جو میری تحقیقات علمی میں پیش آئی وہ ہندوستان میں صحیح اور اعلیٰ درجہ کے ذکی الحس آلات کے بنانے والوں کی عدم موجودگی تھی اور ان آلات ہی کے ذریعہ سے نامعلوم اور غیر مرئی کائنات کی تحقیقات کامیابی کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ مجھ کو اس مشکل میں کامیابی اس طرح پر ہوئی کہ میں نے اپنے لوگوں کی مخفی قوت پر بھروسہ کیا اور اس اعتماد کی وجہ سے ان لوگوں میں جوش پیدا ہوگیا اور وہ بہت سادہ ذرائع سے بہت عجیب و غریب آلات بناسکے۔ گھڑی کے چھوٹے چھوٹے پرزوں، کچھ سوئیوں اور ڈبیوں کے ذریعے ایسی مشینوں کا بنانا ممکن ہوا جن سے پودوں کا بڑھنا، ان کے دھڑکنے والے رگ و ریشہ کا مثل نبض کے چلنا اور ہضم کا فعل آنکھ سے نظر آنے لگا۔ میں نے اکثر اپنے صناعوں کو بے خبری کی حالت میں پتوں اور پھولوں کے ٹکڑوں میں جن کو انھوں نے آلات کے اندر رکھا تھا زندگی کی علامات کا مشاہدہ کرتے دیکھا ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے طریقہ پر دیکھتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گویا خیال کے ایک بالکل نئے بھنور میں پہنچ گئے ہیں بہت کم لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں سے بڑے بڑے موجد بنتے ہیں۔

پودے سے اس طرح پر اپنی زندگی کی تاریخ اسی کے قلم سے لکھوائی گئی اور اس سے ہر قسم کی نباتات اور انتظام حیوانی کی یکسانیت ثابت ہوئی۔ پودے کی زندگی کا مطالعہ اب حقیقی طور سے وسیع اور پُر معنی بن گیا ہے اور یہ وقعت نہ صرف مسئلہ ارتقا کے لحاظ سے ہے، بلکہ ان توقعات کی

بنا پر بھی ہے جو حیوانات کی زندگی کے بہت سے حیرت انگیز مسائل کے حل کے متعلق اُس سے وابستہ ہیں

۴۔ ہندوستان کا تعلیمی خراج وائس چانسلر صاحب شکایت کرتے ہیں کہ چونکہ یہ خیال عام ہے کہ اعلیٰ درجہ کا کام ہندوستان میں نہیں ہوسکتا ہے، ہمارے طلبہ کو یورپ، امریکہ یا جاپان جانا پڑتا ہے، یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ میں ابھی بتاؤں گا کہ ہمارے صیغۂ سائنس میں ایسے آدمی ہیں کہ اگر آپ اُن کی حمایت کریں تو وہ ایسی روایات قایم کرنے کے قابل ہیں کہ جن پر ہر ایک یونیورسٹی کو فخر ہوسکتا ہے۔ اس وقت ہمارے کئی ہزار طلبہ یورپ میں ہیں اور حساب لگایا گیا ہے کہ اس طرح سے ہندوستان ایک سالانہ خراج ادا کرتا ہے جو مقدار میں ایک کروڑ سے زیادہ ہے اور یہ ایسا خراج ہے کہ جس کی بابت کبھی کوئی شکایت نہیں کی جاتی۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ اس کا بہت سا حصہ ہندوستان ہی میں خرچ ہو۔ انگریزی یونیورسٹیاں ہندوستان سے ایک محدود تعداد سے زیادہ طلبہ نہیں لے سکتی ہیں۔ اور اس سے بہت کچھ بدگمانی بھی پیدا ہوئی ہے۔ علاوہ بریں اور بھی شکایتیں ہیں جو بالکل بے بنیاد نہیں ہیں۔ مثلاً وہ مشکلات جو ہندوستانی طلبہ کو حرفت میں عملی دسترس حاصل کرنے میں ہوتی ہیں یا یہ شکایت کہ اُن کو اُن بے شمار وظائف میں سے کوئی نہیں مل سکتا جن سے دیگر انگریزی ممالک کے باشندے مستفید ہوتے ہیں۔ اس انوکھے اور ذلیل کرنے والی حالت کے مقابلہ کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنی تعلیمی اور حرفتی کوششوں میں بتدریج بیرونی امداد سے بے نیاز ہوجائیں۔

۵۔ موجودات عالم میں باہم جنگ و جدل نظریۂ ڈارون کے بعض ماننے والوں نے موجودات کے باہم جنگ و جدل اور اُس کش مکش پر جو ہستی کے پردہ میں پنہاں ہے خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ لیکن میرے انسٹی ٹیوٹ میں جو نئی تحقیقات ہوئی ہے اس سے حیات کے تار و پود میں بہت کچھ ہم آہنگی ظاہر ہوئی ہے۔ اِس غلط خیال سے کہ زندگی کا قانون فقط کش مکش ہے سائنس کی قلمرو میں ہر شخص بے تحاشا اِس تلاش میں دوڑتا ہے کہ علم کا استعمال معلوم کرے، تحفظ حیات کے واسطے اس قدر نہیں جتنا کہ اس کو برباد کرنے کے واسطے۔ چونکہ کوئی روکنے

والی طاقت نہیں ہے، شائستگی آج بربادی کے کنارہ پر کھڑی کانپ رہی ہے۔ مگر یہ سمجھنا کہ کش مکش ہی ایک قوت ہے جو عمل کر رہی ہے قانونِ قدرت کے غلط معنی سمجھنا ہے۔ کیونکہ ارتقا کے عظیم الشان تسلسل میں باہمی امداد اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

۶۔ ہندوستان کے علمی امکانات میں میرا زندہ یقین آخر کار پورے طور سے صحیح ثابت ہوا ہے اور ایسا اتفاق ہے کہ کوئی خاص ادارۂ علم ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں ہر ایک یونیورسٹی انسانی معلومات کے مجموعہ میں بہت کچھ اضافہ کر رہی ہے۔ اور وہ رفتار جس سے یہ ترقی ہو رہی ہے ہر جگہ غیر معمولی سمجھی گئی ہے۔

۷۔ **فرضی خطرہ** میں اب صاف گوئی کے ساتھ اُن موہوم خیالات پر بحث کروں گا جو بعض لوگوں کو ہیں کہ اعلیٰ تعلیم سے ناراضی پیدا ہوتی ہے۔ اب قابلِ غور یہ مسئلہ ہے کہ آیا اشاعتِ تعلیم اور سمجھنے کی قوت سے گورنمنٹ کو زیادہ استحکام ہوتا ہے یا عام جہالت اور پریشانی سے جو سب بے بنیاد خبروں سے پیدا ہوتی ہے، اور جن سے لوٹ مار کرنے والے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

۸۔ **بدلنے والی دُنیا** کسی جاندار کے زندہ رہنے کے واسطے ایک بہت ضروری چیز ماحول کی مسلسل تبدیلی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے موافق بنانے کی قوت ہے۔ نباتات اور حیوانات دونوں میں عظیم الشان ہستیاں تھیں جو اپنے ہم جنسوں پر غالب رہتے تھے۔ کیونکہ وہ اُس زمانہ کے حالات کے زیادہ موافق تھے۔ لیکن دُنیا بدل گئی ہے اور وہ دنیا سے مثل خس و خاشاک کے دُور کر دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو تبدیلی کے موافق نہ بنا سکے۔ اسی قسم کی صورتیں لوگوں کی پولیٹکل زندگی اور انسانی رسم و رواج میں بھی پائی جاتی ہیں اور کوئی تبدیلی ایسی یک لخت اور ہلچل پیدا کرنے والی نہیں ہوئی جیسا کہ گزشتہ لڑائی سے بہت جلد ہو گئی۔

بیکاری کا مسئلہ اب غیر معمولی طور سے قابلِ غور ہو گیا ہے اور اُس کے کامیابی کے ساتھ حل ہونے پر ہر ایک مستقل گورنمنٹ کی کامیابی کا انحصار ہے۔ یہ مسئلہ بعض معاون اسباب سے پیچیدہ ہو گیا ہے۔ مثلاً مقابلہ میں دوسری قوموں کے کامیابی اور اُن کا

سائنٹفک انتظام بہتر ہونے کی وجہ سے تجارت میں کمی نے اُس کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ اس لیئے گورنمنٹ اور یونیورسٹیوں کے لیئے ضروری ہے کہ علمی تحقیقات میں بہت زیادہ کوشش کریں۔ ایک اور غیر متوقعہ صورت جو ابھی حال میں پیدا ہوگئی ہے وہ مزدوروں کی قوت ہے۔ ساری دُنیا میں بے چینی کا بڑا سبب اقتصادی ہے۔ جو مسئلہ کہ ہم کو ہندوستان میں درپیش ہے وہ غیر معمولی نہیں ہے۔ وہ اُن ہی طریقوں سے حل ہو سکتا ہے جو دوسرے ملکوں میں کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔

جیسا کہ میں ابھی بتا چکا ہوں ہندوستان میں بے چینی دیگر حصص دنیا کی طرح سے اقتصادی مُصیبت کی وجہ سے ہے۔ یہ دل دُکھانے والی بات ہے کہ ہمارا ملک جس میں بہت کچھ مخفی دولت موجود ہے۔ اور حرفتی ترقی کے بہت امکانات میں ایسی مایوس کن حالت میں ہو۔ بھوک ہی لوگوں کو جان پر کھیلنے اور اس سب انتظام کو درہم برہم کرنے پر مجبور کرتی ہے جو منتظم ترقی کے واسطے تیار ہوا تھا۔

۹۔ ایک تنبیہ | اب بہت سے نوجوان طلبہ ہیں جن کو عمدگی سے چلتے ہوئے انسٹی ٹیوٹس میں خصوصیت کے ساتھ سکھایا جا سکتا ہے۔ جن کا معیار دنیا میں دیگر انسٹی ٹیوٹ سے کم نہ ہو۔ ایسے پروگرام پر عمل کرنے کے لیئے گورنمنٹ کی طرف سے ایک دور اندیش حکمتِ عملی کی اشد ضرورت ہے۔ مجھکو یقین ہے کہ ملک خوشی سے ضروری خرچ برداشت کریگا، بشرطیکہ روپیہ یہاں ہندوستان کو نفع پہونچانے اور دولت مند کرنے اور اُس کے بچوں کے واسطے زیادہ وسیع دائرۂ عمل پیدا کرنے پر خرچ کیا جائے۔ کام کے واسطے ایک بڑا میدان ہے جس میں انگریز اور ہندوستانیوں کو بطور شریک کے مل کر کام کرنے اور ایک کو دوسرے کی قدر کرنے کے مواقع ملینگے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اب ہندوستان الگ تھلگ نہیں ہے، بلکہ اب اُس کو مقابلہ کی صف میں باقی دنیا کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیئے۔ لوگوں کی زندگی میں ایک عجیب کمزوری آگئی ہے اور اگر یہ بُرائی دُور نہ ہوئی تو نتیجہ لابدی ہے۔

۱۰۔ بڑی مُہم | مجھے توقع ہے کہ وہ نوجوان طلبہ جن کو آج میں اپنے سامنے دیکھتا ہوں

ہماری عظیم الشان قدیم شائستگی کو کمزوری یا سستی کی وجہ سے برباد نہ ہونے دینگے۔ پھر تم اپنے ملک کی انتہائی خدمت کیونکر کروگے اور اُس کے واسطے ضروری تیاریاں کیا ہونی چاہئیں؟ ممکن ہے کہ تم میں سے بعض ایک دارالعلم میں جو پابندیاں عاید کی جاتی ہیں اُن سے اپنے آپ کو آزاد کرنا بہتر خیال کرتے ہوں۔ اور ضروری ڈسپلن کو غلطی سے غلامی کے روح پیدا کرنے والا ظلم سمجھتے ہوں۔ مگر سب سے زبردست قوت وہی ہوتی ہے جو رُکی ہوئی ہو اور اُس مخصوص کام کے واسطے محفوظ رکھی جائے جو تمھاری زندگی کا اعلیٰ مقصد ہوگا۔ ڈسپلن کے باب میں تم کو جہالت سے مدد نہیں ملیگی، بلکہ علم سے مدد ملیگی جو تم نے حاصل کیا ہے۔ ڈسپلن کے ذریعہ سے تم کو وہ قوت اور استقلال حاصل ہوگا جس کے بغیر کوئی بڑا کام کبھی نہیں ہوا۔ پس برداشت کے ذریعہ سے مضبوط بنو، اُس وقت تم دوسروں پر اپنا قانون عائد کرنے سے نفرت کروگے۔ کیونکہ تمھارا بڑا قانون یہی ہے کہ اپنے سے قانون کی پابندی کراؤ۔ زمانہ گزشتہ یعنی ہندوستان کے سورماؤں کے زمانہ میں کام کی تعریف ہوتی تھی بے حسی کی تعریف نہ تھی۔ جو خوشی کہ سب کے واسطے نہ ہو ہم میں سے کسی ایک کو اس سے خوشی نہیں ہوسکتی ہے۔ جب کہ ملک کے سامنے ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ ہم ذلیل آرام کی زندگی بسر نہیں کرسکتے اور نہ ذاتی بہبودی پا سکتے ہیں۔

پس اے عزیزو زندگی کی بڑی مہم پر جاؤ یہ جس قدر زیادہ مشکل کام ہے اسی قدر اس کے کرنے میں عزت زیادہ ہے۔ جب تم کو ایک ایسا مقصد معلوم ہو جائیگا جس کے واسطے تم کو اپنے تئیں پورے طور سے وقف کردینا چاہیئے اُس وقت بند دروازے کھل جاوینگے اور جو مقصد ناممکن معلوم ہوتا ہے پورے طور سے قابل حصول ہو جائیگا ۔۔

--- --- ---✶--- ---

(۴)

۱۵ نومبر کو اندھرا یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا۔ اس میں خطبہ پڑھنے کے لیئے ہندوستان کے مشہور سائنس داں پروفیسر راؔمن کو مدعو کیا گیا تھا۔ آپ نے اپنے خطبہ کے دوران میں اُستادوں کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا اور یونیورسٹی کے مقاصد کا بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"وہ اقامتی یونیورسٹی جو تعلیم کے پردہ میں جہالت، فرقہ پرستی اور مذہبی تعصب کو پھیلائے اس یونیورسٹی سے بدرجہا بدتر ہے جس کا کام محض کالجوں کا الحاق کرنا اور امتحان لینا ہو۔ یونیورسٹی کو علم کی جمہوریت" (Republic) ہونا چاہیئے۔ اس کے لیئے یہ بے شک ضروری ہے کہ بہت بڑے بڑے، اور آراستہ کتب خانے ہوں، آلات سے بھرے ہوئے معمل ہوں، لکچروں کے لیئے کمرے ہوں، کارخانے ہوں، کھیل کے میدان، اور اقامت گاہیں ہوں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ ضرورت ہے کہ ملک کی بڑی بڑی ہستیاں اور صاحبان علم اس میں معلّمی کریں۔ کوئی حادثہ اس سے زیادہ المناک۔ کوئی اسراف اس سے زیادہ مہلک نہیں ہوسکتا کہ عظیم الشان عمارات کتابوں اور ساز و سامان اور آلاتِ تعلیم سے معمور ہوں، لکچروں کے لیئے وسیع لکچر ہال ہوں، لیکن اُن میں معمولی قابلیت کے اُستاد راہ گم کردہ طلبا کو بہت معمولی اور متوسط درجہ کا کام کرائیں۔ ہندوستان میں یہ صورت حال اس قدر عام ہے کہ ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے ......"

"ہمیں ایسے رہنما اور اساتذہ درکار ہیں جن کی زندگی کا واحد مقصد علم کی ترقی ہو اور جو طلبا میں ایسے ہی مقاصد کی روح پھونک دیں۔ لیکن اگر آپ کی یونیورسٹی کی حیثیت محض ایک شاندار اسکول کی حیثیت سے زیادہ نہ ہوگی تو آپ نہ ایسی مقتدر ہستیوں کی خدمات حاصل کرسکتے ہیں اور نہ مستقل طور پر اُن کو اپنا بنا سکتے ہیں۔"

(۳)

ہز اکسلنسی لارڈ ارون نے ۵ ار نومبر کو سائنس کالج پٹنہ کی رسمِ افتتاح ادا فرمائی۔ سر سلطان احمد وائس چانسلر نے اپنے استقبالیہ اڈریس میں بتایا کہ چودہ لاکھ روپیہ سے زیادہ معمل خانوں (laboratories.) پر خرچ ہو چکا ہے اور ان کا مقابلہ یورپ کے معمل خانوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہندوستان میں بہترین تسلیم کئے گئے ہیں۔ وائسرائے نے اپنے جواب کے دوران میں فرمایا کہ مرکزی حکومت جامعہ کو زبردست امداد دینے سے معذور ہے۔ اس صوبہ کے قیام سے اب تک تعلیمی اخراجات کا زیادہ حصّہ یونیورسٹی کی امداد پر صرف ہوا ہے۔ گو میرے خیال میں یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ یہ تعلیم قصرِ علم کا تاج ہے مگر اس کی کامیابی کا انحصار اُن آسانیوں پر ہے جو تمام صُوبہ میں عمدہ ثانوی تعلیم کے لیئے مہیا کیئے جائیں کالج کے رسمی افتتاح کے بعد آپ نے فرمایا:۔

"کوئی جامعہ اس دورِ سائنس میں مکمل نہیں کہی جا سکتی جب تک کہ وہ علمی اور سائنٹفک تحقیقات کے لیئے پوری طرح مسلّم نہ ہو۔۔۔۔ ہم اکثر سنا کرتے ہیں کہ جدید زندگی کی مشکلات کا حل سائنس کے عملی استعمال سے ہو سکتا ہے۔ بیشک اس دعوے میں مُبالغہ ضرور ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی مادّی دولت کی نشوونما، صنعتی ترقّی، زراعتی اور انجنیرنگ مسائل کا حل ان لوگوں کے لیئے ایک مستقل دعوتِ عمل ہے جن کا دماغی رُجحان سائنس کی تحقیقات کی طرف ہو۔ میں آپ حضرات سے جو یہ تعلیم جاری رکھیں گے یہ کہونگا کہ اگر آپ سائنٹفک تربیت کی تمام برکتوں سے مستفید ہو گئے تو علاوہ اُس وسیع امداد کے جو آپ دوسروں کی کر سکتے ہیں۔ آپ کو خود ایسے فوائد حاصل ہونگے جو یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد آپ کی وسیع دنیاوی زندگی میں بہت کار آمد ثابت ہونگے۔"

ایک جدید مصنف نے صحیح سائنٹفک طریقہ کی اس طرح تشریح کی ہے:۔

"کسی دعوے کی تصدیق بغیر تحقیق کے نہ کی جائے۔ ہر امر کو جس قدر سختی سے ممکن ہو پرکھ لیا جائے۔ کوئی بات صیغۂ راز میں نہ رکھی جائے۔ اور نہ کسی علم کو بالکل اپنی ذاتی ملکیت بنایا جائے۔ اپنی بہترین معلومات کو انکسار اور صفائی کے ساتھ پیش کیا جائے اور علم کے سوا کوئی مقصد پیشِ نظر نہ رہے۔"

خوش قسمتی سے انسانی تحقیقات کے تقریباً ہر شعبہ میں ایسے لوگ ملینگے جو علم کو صرف علم ہی کی خاطر حاصل کرتے ہیں۔ ایسے سائنس داں موجود ہیں جو سوائے سائنس اور طلب حق کے اور کسی مطمحِ نظر یا ذاتی مفاد کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے۔ لیکن ایک معمولی آدمی کے لیئے اہم مسئلہ یہ ہی کہ تحقیقاتِ سائنس کو صنعت وحرفت کی ترقی کے ساتھ اِس طرح منسلک کردیا جائے کہ وہ اس دُنیا کو پہلے سے کسی نہ کسی طرح بہتر حالت میں چھوڑے۔ پس میری دلی خواہش اور آرزو ہی کہ عمارات عملی نفع رسانی اور رفاہِ عام کا ایک کامیاب اور مستقل سرچشمہ ثابت ہوں۔ لیکن میں آج بہت سے ایسے حضرات سے بھی مخاطب ہوں جو سائنس داں نہیں۔ ہم ایسے موقع پر قدرتاً یہ سوچیں گے کہ ایک بڑی تعلیمی جماعت اُس مختلف النوع زندگی کی ارتقا میں کیا حصّہ لے سکتی ہی جس سے کہ وہ خود اپنی روحِ حیات حاصل کرتی ہی۔

حصولِ علم کے نتائج کو پرکھنے کی ایک عمدہ کسوٹی یہ ہی کہ آیا یہ تمام جدّوجہد ہمارے دماغوں سے تعصّب اور قوّتِ فیصلہ کی غلطیوں کو دُور کر کے تحقیقِ حق کا جوش اور عشق پیدا کرتی ہی یا نہیں۔ یہ تحقیق بلاشک کوئی آسان کام نہیں۔ خواہ آپ کسی راستہ پر چلیں اگر آپ عقیدت کے ساتھ اُس پر گامزن ہونگے تو آپ کے لیئے علم کی دنیا وسیع تر ہوتی چلی جائیگی۔

تعلیم سے میری مراد صرف مادّی مفاد نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم وہ صفات ہیں جو تحصیلِ علم کی کوشش اور علم کی معرفت کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ اِسی نقطۂ نظر سے میرا ایمان ہی کہ ہند اور بیرونِ ہند کی یونیورسٹیاں قوم کی تمدّنی زندگی میں نہایت اہم اور زبردست حصّہ لے سکتی ہیں۔ کسی ملک میں رائے عامّہ کی اہمیت جتانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ خصوصاً

ایسے ملک میں جہاں جمہوری ادارے ابھی نشو و نما ہی پا رہے ہیں۔ ایک انگریز سیاست دان کا قول ہے کہ: "ایک جمہوری نمایندوں کی حکومت میں ہم کو سیاست دانی کی ضرورت ہے جس کی مضبوط بنیاد صرف ایک ہی ہو سکتی ہے یعنی رائے عامہ کا سیاسی معاملات سے با خبر ہونا۔" مگر بعض دفعہ رائے عامہ غلط اور گمراہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عامۃ النّاس بلکہ کوئی فرد واحد بھی اُن اُمور پر کلیّۃً عبور حاصل نہیں کر سکتا جن کی مدد سے کوئی مکمل فیصلہ کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں اکثر حضرات میں یہ کمزوری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ اُن کی بجائے سوچنے کا کام کریں اور وہ صرف چند مشہور اقوال یا فرسودہ خیالات اور کتابوں اور اخباروں میں چھپی ہوئی باتوں پر کلی اعتماد اور ایمان رکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن تعلیم کا اور خصوصاً اس یونیورسٹی کا کام یہی ہے کہ آزادانہ تحقیقات اور غور و خوض کی ہمت افزائی کرے۔ ایک کاروباری اور گنجان مرکز میں واقع ہونے کے باعث پٹنہ یونیورسٹی مختلف اقوام، مختلف مذاہب اور مختلف جماعتوں کا مظہر بن سکتی ہے۔ یہاں ایک دماغ کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے۔ یہاں وہ آزادانہ غور و فکر اور علمی پختگی حاصل ہو سکتی ہے جس کی شناخت علم انسانی کے محدود ہونے کا احساس ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ دماغوں کے باہمی تاثرات سے یہاں طلبہ کی آزاد خیالی اس حد تک نشو و نما پائیگی کہ وہ اپنے یقین اور ایمان کے لیئے صداقت کی اٹل بنیادیں قائم کیئے بغیر چین نہ لینگے۔

میری یہ رائے نہیں کہ طلبہ سیاسی اور علمی مناقشات میں فوراً حصّہ لینے لگیں، اس پُر خطر میدان میں گامزن ہونے والوں کے لیئے ابھی بہت مُہلت چاہیئے۔ لیکن پیارے طالب علمو! جب تم جامعہ کو چھوڑ کر اپنے وطن، قصبہ یا دیہات کو جاؤ تو میری خواہش ہے کہ تم اور تمھارے جیسے سب تعلیم یافتہ لوگ یونیورسٹی کی تعلیم سے بے بہرہ لوگوں کی رائے اور خیالات کو درست کرنے میں بہت بڑا حصّہ لیں رہا یہ امر کہ تمھارا اثر اچھا پڑیگا یا بُرا۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ تم اپنے زمانۂ تعلیم میں اس یونیورسٹی کی برکتوں اور مواقع کا صحیح استعمال بھی کرتے ہو یا نہیں



(۴)

جرمن میں ورزشی کھیل

ورزشِ جسمانی میں فرینکفورت کی نمایاں ترقی

جرمنی کے نوجوان پورے انہاک کے ساتھ جو جرمن قوم کا خاصّہ ہے کھیلوں اور ورزشِ جسمانی کی طرف متوجہ ہیں اور جیسا کہ اولمپک کھیلوں سے ثابت ہوتا ہے جو ایمسٹرڈم میں ہوئے اُن کو اپنے اس مقصد میں نمایاں کامیابی ہوئی ۔

آج کل ہر ایک مدرسہ کے لڑکے اور طالب علم کے دل پر اُس کے اُستاد یہ نقش کرتے ہیں کہ جسم اور دماغ دونوں کی ضرورتوں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیئے جس وقت بھی موقع ہو ورزشِ جسمانی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور اس نظری تلقین کو گورنمنٹ اور مینوسپلٹیاں حد درجہ بڑھاتی اور ترقی دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ یا تو خود زمین یا روپیہ جس سے کھیلوں کے واسطے زمین مہیا ہو سکے دینے کے واسطے ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ شہر فرینکفورٹ جو دریائے مین پر واقع ہے نو عمر جرمن نسل کے ورزشی کھیلوں کے واسطے مکمل انتظام کی نمایاں مثال پیش کرتا ہے۔ اس شہر میں سب سے عمدہ اور مکمل ورزش خانہ اور کھیلوں کا میدان ہے اور دنیا کا کوئی شہر اس باب میں اُس کی برابری نہیں کرسکتا اور ہر ایک مرد عورت اور بچہ جو فیس داخلہ ادا کرے اُس کو استعمال کرسکتا ہے۔ بڑے تالاب کے قریب ایسے لوگوں کے واسطے جو تیرنا نہیں جانتے ہیں اور بچوں کے لیئے ایک اور نہانے کا تالاب ہے جس میں پانی زیادہ سے زیادہ تین فٹ گہرا ہے۔ اور اُس کے قریب بڑوں اور بچّوں کے لیئے ایک بڑا کھیل کا میدان ہے۔ نہانے والوں اور تماشائیوں کی آسایش کے واسطے ہر چیز مُہیّا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے واسطے بال دُرست کرنے والے موجود ہیں۔ اخبارات اور رسائل ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں اور ایک بڑا ہوٹل سب کی جسمانی ضرورتیں مُہیّا کرتا ہے

یہ ورزش خانہ اس زمانہ میں تیار ہوا تھا جب مارک کی قیمت بہت گری ہوئی تھی۔ اس لیئے اس میں فقط ایک لاکھ اسّی ہزار پونڈ صرف ہوئے ہیں اور یہ صرفہ بے جا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہزاروں آدمیوں کے واسطے تھوڑے سے خرچ سے خوشی اور تندرستی کا ذریعہ ہے اور دُنیا بھر میں ہر لحاظ سے لاثانی ہے۔

---

(۵)

جامعۂ ملّیہ میں ایک مُفید تعلیمی تجربہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۸ء جامعہ کے آٹھویں "یوم تاسیس" کی تاریخ تھی۔ اس روز جامعہ میں حسب دستور تعطیل رہی۔ اب کی سال یہ مُبارک دن ایک بالکل نئے طریقہ پر منایا گیا۔ کئی ہفتہ پیشتر سے تمام طلبا اور اساتذہ کو یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ وہ اب کی بار جامعہ کے ساتھ اپنے تعلق اور محبت کے اظہار کے لیئے جامعہ کو کوئی نہ کوئی نذر یا ہدیہ پیش کریں۔ چنانچہ اس کی تیاری کے لیئے اسکول، کالج، شاخ مدرسہ، اور اُن کے تمام شعبوں نے کافی تیاریاں کر کے طرح طرح کے تحائف وہدایئے تیار کیئے۔ ۲۹ر تاریخ کی شام کو ان تحائف و ہدایا کو قبول کرنے کے لیئے ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں شیخ الجامع صاحب کی خدمت میں ہر ایک جماعت یا شعبہ اپنے اپنے تحفے پیش کرتا اور وہ اسے عزیز جامعہ کے نام سے قبول کرتے جاتے تھے۔ جامعہ میں کوئی ایسی جماعت، شعبہ یا طالب علم نہیں رہا جس نے کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ سے بنا کر یا لکھ کر نہ پیش کیا ہو۔ ڈرائنگ کے شعبہ کی جانب سے طرح طرح کی تصویریں، نقاشیاں اور خاکے پیش کیئے گئے تھے۔ ان میں ایک اسلامی ممالک کے بڑے بڑے اشخاص کی تصویروں کا سٹ تھا جس میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا، امیر امان اللہ خاں، شاہ رضا خاں پہلوی، اور زاغلول پاشا وغیرہ کی تصویریں شامل تھیں۔ اسی طرح ایک ہندوستان کے لیڈروں کی تصویروں کا سٹ تھا جس میں مہاتما گاندھی کی تصویر اپنے تازہ ترین ہونے اور خوبی کے لحاظ سے سب سے زیادہ ممتاز تھی۔

اِسی طرح ایک اُردو زبان کے عناصرِ خمسہ کا نہایت عمدہ سٹ تھا جس میں شمس العلما آزاد، مولٰنا حالی، اور مولٰنا نذیر احمد کی تصویریں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شعرا میں غالب اور انیس کی تصویریں جو دستیاب ہوسکتی تھیں، بنائی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ بعض اور تخیلاتی تصویریں بھی تھیں، جو کسی جرمن مرقع یا چغتائی وغیرہ کی تصویروں کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی تھیں۔

شعبہ نجّاری کی طرف سے لکڑی کی ایک بہت بڑی اور خوش نما شیلڈ (ڈھال) پیش کی گئی تھی جس پر نہایت عمدہ کھدا ہوا کام تھا اور بیچ میں جامعہ کی مُہر بنی ہوئی تھی۔

شعبۂ تاریخ وجغرافیہ کی طرف سے اسلامی تاریخ میں قدیم وجدید دُنیا کے کئی ایک مفید نقشے اور تاریخ ہند میں سکندر کا ہندوستان پر حملہ، سکندر و پورس کی جنگ، اور اشوک کی وسعت سلطنت کا نقشہ جس میں خاص طور سے وہ مقامات دکھائے گئے تھے جہاں اُس نے گوتم بدھ کی تعلیم اور اپنے احکامات پتھر کی لاٹوں پر کندہ کراکر نصب کرائے تھے۔ نیز تاریخ ہند کی جانب سے تین مضامین بھی پیش ہوئے تھے جن میں سے ایک سلطان محمود غزنوی بہ حیثیت مربی ادب و شاعری، دوسرا قلعۂ معلّٰی دہلی معہ تاریخی عمارات و میوزیم کے حالات کے، اور تیسرا ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کی قدیم وجدید درس گاہوں پر تھا۔

شعبۂ اسلامیات کی طرف سے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا آخری خطبۂ حج، آپ کی بعض مشہور و مفید احادیث وغیرہ دی گئیں۔ اسی طرح انگریزی اور اُردو جماعتوں کی طرف سے منتخب نظموں اور اشعار کے نمونے اور کہانیاں خوشنما اور خوش خط لکھی ہوئی پیش کی گئیں۔

سائنس اور معلومات عامّہ کی جانب سے مفید نقشے، چارٹ، اور دیگر معلومات پیش کیے گئے تھے۔ کتابی صورت میں ایک چیز خود "معلوماتِ عامّہ" کے نام سے شاخ مدرسے نے پیش کی جس میں عام معلومات کے علاوہ گزشتہ تحریک ترک موالات کے متعلق بعض مفید باتیں بھی درج تھیں۔ ایک بڑا نقشہ معہ تصاویر مختلف قسم کی غذائیں کھانے والوں کا بھی اسی شعبے کے لڑکوں نے بنا کر پیش کیا تھا۔

خطاطی و خوشنویسی کے شعبہ سے نسخ و نستعلیق ہر دو خطوں میں نہایت عمدہ اور خوش خط لکھے ہوئے کتبے اور قطعات پیش کیئے گئے تھے۔ ایک وصلی اکبر بادشاہ کے زمانہ کی کسی خوش نویس کی لکھی ہوئی بھی دی گئی تھی جو اپنی قدامت کی وجہ سے کسی قدر بوسیدہ حالت میں نظر آرہی تھی۔

شعبہ معاشیات کی جانب سے ہندوستان کے افلاس و غربت کو ظاہر کرنے کے لیئے نہایت مفید نقشے، چارٹ، اور گراف بنا کر دیئے گئے تھے۔

غرض جامعہ کا کوئی شعبہ، کوئی جماعت حتیٰ کہ غالباً کوئی طالب علم ایسا نہ تھا جس نے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ بنا کر یا لکھ کر پیش نہ کیا ہو اور شیخ الجامعہ کی طرف سے جسے شرف قبولیت بخشے جانے کے بعد انتہائی مسرت و خوشی نہ ہوئی ہو۔ ہر لڑکا اور ہر بچہ اپنی اپنی جگہ پر یہ سمجھتا تھا کہ اس کا تحفہ سب سے بہتر سمجھا گیا اور اسی کو سب سے زیادہ شرفِ قبولیت عطا ہوا۔ جامعہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ جامعہ اور اس کے متعلقین میں محبت و عقیدت کا اس طرح پر عام اظہار کیا گیا ہے۔

(پیام تعلیم)



(۶)

یونیورسٹی کی تعلیم پر ایک اصلاحی نظر

"پچھلے سال بنگال کے کالجوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں مسٹر این جی بینرجی نے بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ کے ایک خطبہ پڑھا تھا۔ یہ خطبہ اگرچہ کلکتہ یونیورسٹی کی اصلاح و ترمیم کے متعلق تھا۔ لیکن موجودہ تعلیم کے جن عیوب و نقائص پر اس میں بحث کی گئی ہے وہ تقریباً ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں مشترک ہیں۔ ہم بعض غیر ضروری حصوں کو حذف کر کے اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں :۔

ہماری تعلیم کا نظام آج تک تمام تر حکومت کے نظام پر مبنی رہا ہے۔ جو بذاتِ خود ایک غیر ملکی نظام ہے اور یہ مسلّمہ امر ہے کہ اس نظام تعلیم کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ آج جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے وہ یہ نہیں ہے کہ حکومت کی مشین کے لیئے عمدہ کل پُرزے تیار کیئے جائیں۔ بلکہ ایسے اشخاص پیدا کیئے جائیں، جو روشن خیال، اعلیٰ دماغ، با اخلاق، صاحبِ عمل اور زندگی کے ہر شعبہ میں ایجاد و اختراع اور جراٴت و ہمت کا مادہ رکھتے ہوں! ملک کا تقاضہ آج ایسے نوجوانوں کے لیئے ہے جو تمام معاملات میں حبّیت وچالاک اور ایک عملی نقطۂ نظر رکھنے والے ہوں، جن میں تازگیٔ خیالات ہو۔ جو سوسائٹی کی ہر خدمت کے لیئے آمادہ ہوں۔ نہ صرف ایسے ہوں جو محض اپنے لیئے روزی پیدا کر سکیں۔ بلکہ نہایت جوش اور سرگرمی کے ساتھ قوم و ملک کی خدمت بھی کر سکیں۔ ضرورت ہے کہ اس نظام کی بنیاد جن خیالات اور اغراض پر قایم ہے وہ سب کے سب بدل دیئے جائیں۔ پُرانے بتوں کو چھوڑ کر ایک نئی روح افزا "فضا" پیدا کرنی چاہیئے۔

"انگریزی زبان کی بے جا پاسداری"

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انگریزی زبان و ادب کو جو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے بغیر اعلیٰ تعلیم نامکمل رہ جائیگی۔ اور کوئی فن یا سائنس بغیر اس کے سیکھ ہی نہیں سکتا۔ ہمیں اسی بات کی اصلاح کرنا سب سے ضروری ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد اس خیال کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اس کے بجائے ایک صحیح اور وسیع نقطۂ خیال کی بنیاد ڈالنی چاہیئے، اب تک سمجھا جاتا ہے کہ انگریزی زبان اعلیٰ تعلیم اور تہذیب و معاشرت کی علامت ہے جس طرح انگریزی کپڑوں کو پہننا تہذیب و تمدن کی علامت سمجھا جاتا ہے، اسی قسم کی ذہنیت "غلامانہ ذہنیت" ہے۔ یہی "ذہنیت" یہی "تہذیب" ہماری ملکی زبان کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے، جو زبان کہ کبھی شکسپیر اور ملٹن کی زبان تھی، اور جو زبان کہ تقریباً نصف کرۂ ارضی پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہ بے شک عزت و احترام کے قابل اور لائق ہے، لیکن اپنی تہذیب و تمدن کے اظہار کے لیئے اپنی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنانے کے لیئے ملکی زبان کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اب ہم لوگوں کا فرض ہے کہ اپنی زبان کو اس درجہ تک پہونچائیں جو قوانینِ فطرت اور آئینِ ملت دونوں کی رو سے اُسے حاصل ہے۔

"ہماری تعلیم کا مقصد ملکی زبان ہو"

ایک بار جہاں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا (اور آج کل اصولاً ذمہ دار اصحاب نے اسے تسلیم بھی کر لیا ہے) اور اپنی دیسی زبان کی تعلیم کے لیئے مناسب انتظامات ہو گئے۔ تو اس سے ہماری تعلیمی مقصد کو ایسی تقویت اور اعانت ہو پہونچیگی جو ابھی تک خواب و خیال ہے۔ آج کل ہمارے طلبا کی قوت اور محنت کا نوے فی صدی حصہ ایک ایسی زبان کی پیچیدگیوں کے حل کرنے میں صرف ہو جاتا ہے جس کے قواعد و محاورات کو ہماری زبان سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ اس زبان کی تعلیم کا طریقہ اکثر بالکل مصنوعی اور غیر فطری ہوتا ہے اور ویسا ہی اثر اس کا بھی ہوتا ہے۔ میں بہت سے ایسے طلباء کو جانتا ہوں جنھوں نے اپنے امتحانات "منطق" اور "فلسفہ" لے کر پاس

کیئے۔ لیکن جب اُن سے اس کے بعض مسائل کو خود اپنی زبان میں بیان کرنے کو کہا گیا تو وہ "غوں غوں" کرکے رہ گئے۔ میں اکثر ایسے طلبار کو بھی جانتا ہوں، جنھوں نے ایڈیسن، شکسپیئر اور ملٹن کے کلام کو پڑھا تھا۔ لیکن وہ اصل زبان کے چٹخاروں، اور اُس کی اَدبی چاشنیوں سے بالکل محروم اور ناکام رہتے ہیں ایسی تعلیم کا دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ اس سے طبیعت کو اطمینان و تشفی حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے ضعیف العقل اور کمزور دماغ اشخاص پیدا ہوتے ہیں جو صرف سُنے سُنائے الفاظ و محاورات کے غلام ہوتے ہیں اور ایک ایسی تیرہ و تاریک فضا میں رہتے ہیں جسے علم اور واقفیت کی روشنی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دُور از کار تخیلات اور نظریوں کا آج جو اس قدر زور ہے اُس کی بڑی حد تک ذمہ داری اسی ناقص تعلیم کے سر ہے۔

تعلیم کو سیاست سے علیحدہ رہنا چاہیئے؟

جس طرح تعلیم کو زبان کی غلامی سے پاک رہنا چاہیئے، اسی طرح اس کو جماعتی سیاست سے بھی دُور رہنا چاہیئے۔ تعلیم اور اُس کے مقاصد صرف ایسی ہی فضا میں ترقی پاسکتے ہیں، جہاں اغراض و مقاصد کی تنگی نہ ہو، اس لیئے کہ سیاسی تعصبات کی تیز و تُند ہَوائیں اس کے نشو و نما کو بڑھنے نہ دینگی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یونیورسٹی کو اپنے وجود و استقلال کو باقی رکھنے کے لیئے برابر جنگ کرتے رہنا چاہیئے۔ اُسے نہ حکومت کا آلۂ کار رہنا چاہیئے اور نہ کسی غالب سیاسی جماعت کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔ تعلیم کے اغراض کو ان سے یکسر بے تعلّق ہونا چاہیئے۔ انسانی دماغوں کو گوناگوں معلومات سے بھرنا، ذہن اور دماغ کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا، "دماغ" اور "فطرت" کے مخفی قوائے پر قابو حاصل کرنا، مختلف تہذیبوں میں اتحاد و یک جہتی پیدا کرنا، یہ ہیں یونیورسٹی کے اصل مقاصد، جو بذاتِ خود کافی اور اہم ہیں کہ اُن کے لیئے مدّتوں سکون و اطمینان سے کام کرنے کی ضرورت ہے!!

"نصابِ تعلیم میں ترمیم و اِصلاح"!!

اِسی طرح نصابِ تعلیم کی بھی از سرِ نو ترمیم و اصلاح ہونی چاہیئے ——— !

"آرٹ" (جس میں زبانیں اور علوم داخل ہیں) اور سائنس کی تعلیم میری ناقص رائے میں صرف اعلیٰ سندی جماعتوں میں ہونا چاہیئے اور اس لحاظ سے پُرانے قواعد زیادہ بہتر تھے۔ علوم کا تخصیصی مطالعہ ابتدائی منزل میں نظر کو محدود اور تنگ کر دیتا ہے۔ جغرافیہ، تاریخ، ریاضی، اور علوم طبیعی کے وسیع مطالعہ سے عمق نظر پیدا ہوتا ہے۔ باقی دوسرے طریقوں سے محض اعداد وشمار کا گننا، اور اُن سے عاجلانہ نتائج کا نکالنا جان سکتے ہیں ---------- ! سندی جماعتوں میں بھی مضامین میں ایک طرح کا باہم ربط اور تعلق ہونا چاہیئے، نہ کہ وہ کہیں تو "معاشیات" ہوں اور کہیں فقط ———— "طبیعیات وتاریخ" ———— !! انگریزی، زبان و ادب میں سولھویں صدی کے ادب سے زیادہ زمانہ حال کا ادب ولٹریچر ہونا چاہیئے۔ امتیازی جماعتوں کے نصاب میں البتہ ایک ایسا مضمون ہو جو اس سے قریبی تعلق رکھنے والے مضامین کے ساتھ زور دیا جائے۔

"ثانوی تعلیم میں اصلاح کی ضرورت"

لیکن یہ تمام اصلاحات اُس وقت تک بےکار رہیں جب تک کہ اب ہم اپنی تعلیم کو مضبوط نہ کر لینگے۔ ہمارے ثانوی مدارس حد درجہ ناقص اور بےکار ہوتے ہیں۔ ان میں تعلیم کا معیار اور بلند ہونا چاہیئے، اور نہ صرف یہی بلکہ پورے نظام کو از سرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ ان مدارس کی تعلیم میں کاشت کاری اور دوسری دست کاریوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ نیز تنظیم، صفائی وحفظانِ صحت، اور دوسرے مفید کاموں کا سبق بھی ہونا چاہیئے۔ جو تعلیم اعضا کو بےکار چھوڑ دے، اور صرف حافظہ اور ذہن سے کام لے وہ حد درجہ بےکار اور ناقص ہے!

"جسمانی ورزش اور فوجی تعلیم"

دو اور ضروری مسائل ہیں جن کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جسمانی تربیت لازمی کر دینی چاہیئے۔ اور دوسری یہ ہے کہ ہماری ذہنی اور دماغی ترقی کو عوام کی ذہنی اور "اخلاقی" ترقی سے بےتعلق نہ رکھنا چاہیئے۔ اور ملک کی

خام پیداوار کو مفید اور کار آمد بنانا چاہیئے۔ اچھی غذا کے نہ ملنے اور بیماریوں کے پھیلنے سے ہمارے طلباء کی صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حفظانِ صحت کے قاعدہ کی طرف سے بے توجہی برتنے اور کوئی جسمانی ورزش وغیرہ نہ کرنے کے سبب یہ اور بھی بد سے بدتر ہو جاتی ہے، اس کے لیئے ضرورت ہے کہ بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا جائے، ایسی تعلیم سے کیا حاصل جبکہ ہمارے تعلیم یافتہ اپنے حقوق اور اپنی عزت و آبرو کے لیئے اعضاء سے کام ہی نہ لے سکیں؟ وہ زمانہ اب نہیں رہا جب کہ لوگ معمولی غذاؤں پر زندگی بسر کر لیتے تھے، یا چاند اور تاروں سے روشنی کا کام لیتے تھے۔ اب زمانہ وہ ہے کہ دماغ اور جسم دونوں پر برابر برابر توجہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دوسرے مسئلہ کے متعلق بھی سائنس سے کام لینا چاہیئے، اور ملک کی خام پیداوار کو مفید اور کار آمد بنانا چاہیئے، "معاشیات" سے جو اب تک غیر مفید مضمون رہا ہے بہت کچھ کام نکل سکتا ہے، ہمارے طلباء اور اساتذہ کو گاؤں اور دیہات میں جانا چاہیئے، لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے، اُجرت اور مزدوری کے معیار اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا بغور مُطالعہ کرنا چاہیئے کچھ ان سے جاکے سیکھیں، اور کچھ ان کو سکھائیں، تاکہ اس سے گاؤں والوں کی حالت بہتر ہو سکے!!

میں یہاں کالج کے بعض دوسرے مسائل کی طرف بھی کسی قدر اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔ مثلاً لکچروں میں لازمی شرکت، یا پوری جماعت کے سامنے لکچر دینا، یہ دونوں طریقے محض بے کار اور فضول ہیں، تحریری امتحانوں کا جو دستور ہے وہ بھی محض بے کار ہے، اس کی بجائے تقریری امتحان ہونے چاہئیں تاکہ اسی طرح بالمشافہ سوال و جواب سے طلبہ کے اندر طوطے کی طرح رٹنے کی عادت نہ ہو، اسی طرح کالجوں میں طلباء کی انجمنیں ہونی چاہئیں، جو علمی مسائل پر بحث و مباحثہ کرنے کے علاوہ اور خدمات بھی انجام دیں، علاوہ بریں مختلف کالجوں میں تعلیمی معاملات کے اندر باہم اتحاد عمل اور تعاون کا رشتہ پیدا کرنے کا بھی دستور ہونا چاہیئے، ایک کالج کے طلباء دوسرے کالج میں جایا کریں اور کچھ عرصہ وہاں کی تعلیم میں شرکت کیا کریں، بعض مسائل باہم مشترک ہو کر آسانی

سے حل ہوتے ہیں، اساتذہ اور طلبا میں جتنا قرب ہوگا اُتنا ہی مفید ہوگا !!

"اساتذہ کے حقوق کا تحفّظ"

اِس کے بعد میں اپنی انجمن کے حقوق و فرائض کے متعلق بھی چند باتیں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں ہماری یہ انجمن حقیقت میں متلاشیانِ حق و صداقت کی انجمن ہے، جو بحالاتِ موجودہ محنت و مزدوری کرنے والوں کی انجمن ہوگئی ہے، ہم دُنیا کے تمام مزدوروں کی برادری میں داخل ہیں ہم سب خود مزدور ہیں، خواہ ہم دماغ سے کام لیں یا ہاتھ سے، ہمیں زندہ رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، ہم اس امر کا استحقاق رکھتے ہیں کہ بیماری و علالت اتفاقی حادثات اور ضعیفی کی حالت میں ہماری امداد و اعانت کی جائے، اور چونکہ ہم بھی اکثر لوگ راہبانہ زندگی نہیں بسر کرتے اس لیئے ہمارے بچّوں کی خوراک و پوشاک اور مکان کا بھی انتظام ہونا چاہیئے ——

اِس کے عوض میں ہم سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم سب سادگی اور جفاکشی کی زندگی بسر کریں اور ہم ہمیشہ اس سے زیادہ دینے کی کوشش کریں جتنا کہ ہم لیتے ہیں۔ ہم بالکل ہی مزدوروں کی انجمن (ٹریڈ یونین) نہیں ہیں، اس لیئے کہ پڑھانا محض مزدوری کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نہایت مقدّس پیشہ ہے، لیکن اس حیثیت سے بھی جب تک کہ ہم اپنی جماعتی تنظیم نہ کرینگے اور باہم مِل کر کام نہ کرینگے اُس وقت تک ہم یونیورسٹی اور کالجوں کے اندر جن سے کہ ہماری تقدیریں وابستہ ہیں، اپنے قدرتی حقوق کی حفاظت نہ کرسکیں گے۔ خداوند تعالیٰ ہماری کوششوں کو بارآور کرکے اور ہمارے دلوں کو اپنے خوف سے اور بندوں کی محبت سے معمور کردے !!

(مخزن)



شذرات

عرضِ حال

ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ تعلیم و تربیت کا یہ نمبر تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ رسالہ کے مرتب کنندہ کو گزشتہ چند ماہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے اور اس قسم کی مصروفیت رہی کہ کام وقت پر نہ ہو سکا۔ دوسری وجہ زیادہ مستقل ہے اور وہ یہ کہ ہم نے ابتدا سے اس بات کا التزام رکھا ہے کہ رسالہ کا ہر مضمون بلند پایہ اور مفید ہو۔ اور اس کے اعلےٰ تعلیمی اور ادبی معیار کو قائم رکھا جائے خواہ اس نصب العین کو پیش نظر رکھنے میں کتنی ہی مشکلات پیش آئیں! چنانچہ ہم نے اب تک اپنی معیار پرستی کو نباہا ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی اس اصول پر عمل رہے گا۔

موجودہ نمبر رسالہ کے پہلے سال کی تکمیل کرتا ہے۔ اس سال بھر کے عرصہ میں ہم نے جو کچھ اپنے ناظرین کے لئے پیش کیا ہے اس کی قدر واقعی کا وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں، ہمارے رسالہ کی اب تک اُس معنی میں زیادہ ہمت افزائی نہیں کی گئی جو بالعموم اخباروں اور جرائد کے پیش نظر ہوتا ہے یعنی اس کے خریداروں کی تعداد ابھی تک بہت کم ہے بلکہ سوائے حیدر آباد کی علم دوست حکومت کے جس نے اپنے ثانوی مدارس کے لئے رسالہ کی ایک معقول تعداد میں خریداری منظور کی ہے اور کسی جماعت یا افراد نے اس کی اشاعت کی کوشش نہیں کی ہے ہمیں اس بات کی شکایت کسی مالی نقطۂ نظر سے نہیں ہے کیوں کہ مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس جس نے اس رسالہ کی اشاعت کے اخراجات اپنے ذمہ لئے ہیں ایک تعلیمی جماعت ہے، کاروباری جماعت نہیں اور وہ ایک ایسے کام میں خوشی اور آمادگی کے ساتھ روپیہ لگانے کو تیار ہے جو صریحاً مفید اور ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے لازمی ہے۔

لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ تعلیم یافتہ جماعت کی فرض ناشناسی ہے کہ وہ اس کام کا تمام تر مالی بار صرف ایک جماعت پر ڈال دیں جس کو اپنے محدود وسائل اور بھی بہت سے ضروری کاموں پر

صرف کرتے ہیں۔ مگر ہماری اصلی شکایت دوسری ہے یعنی یہ کہ ہمارے اساتذہ اور تعلیمی جماعتیں ان مفید تخلیقی تحریکات میں دلچسپی نہیں لیتیں جن کی کامیابی پر ان کی کامیابی کا انحصار ہے۔ ان کو اب تک اس امر کا احساس پیدا نہیں ہوا کہ ہماری تعلیم کا تمام نظام اصلاح طلب ہے اور اس میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کی ضرورت ہے ورنہ وہ قومی ضروریات اور قومی ذہنیت سے ہمیشہ اتنی ہی بے تعلق رہے گی جس قدر آج ہے۔

اس رسالہ کے اجرا کا صرف یہی مقصد ہے کہ وہ تعلیم کے متعلق بہترین قدیم و جدید خیالات اور موجودہ تحریکات سے ناظرین کو روشناس کرے اور قومی تعلیم کو صحیح بنیاد پر قائم کرے اس کا رشتہ دوبارہ ملک کی تہذیب اور رسن ملی کے ساتھ جوڑے۔ استادوں کو ایک دوسرے کے مسائل اور مشکلات اور کارناموں سے آگاہ کرے تاکہ آپس میں اشتراک عمل سے مفید اور دور رس نتائج مترتب ہوں یہ مقاصد اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب کانفرنس کی امداد کے لئے نہیں بلکہ خود اپنی مدد کے لئے تمام اساتذہ اور مدارس اور تعلیمی جماعتیں رسالہ کو خریدیں اور مطالعہ کریں اور اس کو مفید تر بنانے میں ہاتھ بٹائیں۔ اپنی شکایات اور معاملات کو دوسروں کے سامنے پیش کریں اور اہم تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیال کریں۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ اعلیٰ معیار کے مستقل مضامین شائع کریں۔ مقامی اور عملی طور پر مفید مضامین صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جو عملاً تعلیم دینے کے کام میں مشغول ہیں ان کو از خود جوش اور شوق سے اس کام میں شریک ہونا چاہئے اور ان کا معیار اتنا بلند ہونا چاہئے کہ وہ کسی کام کی طرف راغب ہونے کے لئے اشتہار بازی کی ضرورت محسوس نہ کریں۔

یونیورسٹیوں کے خطبات صدارت
تعلیمی معیار کی پستی

ہم نے شعبۂ اقتباسات میں سر جگدیش چندر بوس اور ڈاکٹر رامن کے خطبوں سے مفید حصے نقل کئے ہیں جو گزشتہ ماہ میں الہ آباد اور میسور یونیورسٹیوں میں تقسیم اسناد کے موقع پر دیئے گئے تھے۔ ہم ناظرین کی توجہ ان خطبات کی جانب مبذول کراتے ہیں ان دونوں سیاح عالموں اور صاحبانِ فکر نے یونیورسٹی کی تعلیم کے بعض نہایت اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور حکامِ یونیورسٹی کی توجہ ان کی طرف مبذول کی ہے۔

ڈاکٹر رامن نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس امر کے متعلق خاص طور پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کا علمی معیار بحیثیت مجموعی بہت گرا ہوا ہے۔ وہاں اوسط قابلیت کے استاد بسا اوقات اوسط سے بھی کم قابلیت کے طلبا کو گھٹیا قسم کا کام کراتے ہیں۔ یہ اعتراف کہ ہماری یونیورسٹیاں علمی حیثیت سے محض اوسط درجے کی تعلیم گاہیں ہیں ایک نہایت تکلیف دہ احساس ہے۔ لیکن صاف گوئی اور صداقت کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس نقص کا اعتراف کریں۔ کیا وجہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں نے مقابلۃً مختلف علمی شعبوں میں اعلےٰ درجہ کے محقق اور مجتہد اس قدر کم پیدا کئے ہیں کہ ان کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے؟ یورپ کے بعض چھوٹے چھوٹے ممالک نے بھی علوم و فنون کی مملکت میں ہم سے کہیں زیادہ توسیع اور اضافہ کیا ہے۔ وہاں یونیورسٹیوں کے طلبا رطلب علم کے لئے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ ہمارے ہاں ان کا مقصد دکم از کم بچانوے فی صدی کے لئے) یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح طلب معاش کریں۔ لیکن وہ اس مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوتے اور سالہا سال کی قیمتی تعلیم دکم از کم خرچ کے نقطۂ نظر سے قیمتی تعلیم) کے بعد بھی ان میں سے بعض بمشکل معمولی قسم کی دفتری ملازمت حاصل کرتے ہیں اور اس پر قانع ہو جاتے ہیں! لہٰذا طلب حق کے لئے جد و جہد تو درکنار وہ طلب معاش میں بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے۔

ہمارے خیال میں اس صورت حال کی ایک وجہ علاوہ اور وجوہات کے یہ بھی ہے کہ ہماری ثانوی تعلیم کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ انگلستان میں جو طالب علم ثانوی مدرسہ کی تعلیم کو مکمل کر لیتا ہے دجن کو اتنا ہی زمانہ درکار ہے جس قدر ہمارے ہاں انٹرنس تک کی تعلیم کے لئے) وہ دماغی اور علمی تربیت اور پختگی کے اعتبار سے اس قابل ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم اور طریقۂ تعلیم سے مستفید ہو سکے۔ اور درجۂ اعزازی (آنرز کلاس) کے لئے کام کرے اس کی عام واقفیت زیادہ وسیع ہوتی ہے اس کو اپنی مادری زبان پر بہت زیادہ عبور اور قدرت ہوتی ہے۔ اس کا مطالعہ زیادہ گہرا اور زیادہ متنوع ہوتا ہے اور وہ بحیثیت مجموعی اس قابل ہوتا ہے کہ اگر آئندہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرے تو بھی ملک کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کی جد و جہد میں عمدگی کے ساتھ حصہ لے سکے۔ اسی طرح جرمنی کے ثانوی مدارس Hochschule اور (Gymnasium) کی تعلیم کا معیار اور عمق بھی ہم سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہاں

یونیورسٹی کی تعلیم کے معنی ہیں تحقیقات علمی میں حصّہ لینا کسی ایک مسئلہ کا نظر غائر سے مطالعہ کرنا اور اس پر کوئی مستقل تصنیف پیش کرنا اس لیے جرمنی کے ثانوی مدارس طلبا کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ براہ راست اسکول سے نکل کر یونیورسٹی کا کام ہاتھ میں لے سکیں۔

برخلاف اس کے ہمارے طلبا رجو ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں سے نکلتے ہیں وہ انگریزی زبان پر اتنی قدرت نہیں رکھتے کہ لکچروں کو آسانی سے سمجھ سکیں اور مضامین مطالعہ پر مستقل تصانیف کو روانی سے پڑھ سکیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمنان تعلیم کے تیار کئے ہوئے نوٹوں اور چند دیسی کتابوں کے رٹنے پر اپنا تمام وقت صرف کرتے ہیں۔ ان کو اعلےٰ علمی تصانیف اور مستند مصنفین کے ساتھ سابقہ ہی نہیں پڑتا وہ بالعموم ان پروفیسروں سے خوش رہتے ہیں جو اُن کی اوسط قابلیت (mediocrity) کے مطابق اوسط درجہ کے آسان اور زمیں بوس لکچر دیں اور جدت یا تخیل کی پرواز نہ دکھائیں۔ اگر کوئی استاد اس معیار سے بڑھ کر یونیورسٹی کے معیار کے لکچر دینا چاہتا ہے تو وہ لکچر ان کے سروں پر سے گزر جاتے ہیں اور وہ نہ صرف اپنے ضروری حواس رئیسہ یعنی آنکھ اور کان بلکہ اس مقصد کے لئے ایک غیر ضروری عضو یعنی منہ کھولے ان کو سنتے رہتے ہیں! نہ صرف آرٹس بلکہ سائنس میں بھی عملی کام جدت اور دریافت کے لئے نہ تو ان کو موقع دیا جاتا ہے نہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کو ایسے خطرناک مواقع حاصل ہوں استاد اور شاگرد دونوں تحصیل علم کی خطرناک لیکن دل فریب راہ گزار سے ہٹ کر کم سے کم مشکلات کا راستہ ڈھونڈھ لیتے ہیں اور آنکھیں اور دماغ بند کرکے اس پر پڑ جاتے ہیں۔

سر جگدیش چندر بوس نے بھی اپنے خطبہ میں اس امر کی شکایت کی ہے کہ ہندوستان میں تحقیقات علمی کے لئے ایسے ادارے بہت کم ہیں جہاں اعلیٰ درجہ کا علمی کام ہو سکے اس لئے ہر سال سینکڑوں طلبا یورپ اور خصوصاً انگلستان جاکر مغرب کے علمی دسترخوانوں سے ریزے چنتے ہیں۔ وہاں ان کو نہ صرف بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں نہ صرف ملک کا ایک کروڑ روپیہ سال سے زیادہ ان پر صرف ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات ایسی ذلتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں جو ان کے قومی وقار کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ کیا وجہ ہے (سر جگدیش پوچھتے ہیں) کہ اس رقم کا بیشتر حصہ ہندوستان ہی میں صرف نہ کیا جائے تاکہ زیادہ تعداد میں طلبا اعلیٰ ترین

تعلیم سے مستفید ہو سکیں اور وہ ان خطرات سے بھی محفوظ رہیں جو ان کو نوعمری کے زمانہ میں غیر ممالک میں پیش آتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم "نارائی پروانہ" کو چھوڑ کر "طواف آتش بیگانہ" سے بے نیاز نہ ہوں گے اس وقت تک ہماری یونیورسٹیاں اپنے معراج کمال تک نہ پہونچ سکیں گی ان پر پست معیار ہونے کا الزام قایم رہے گا اور غیر ملکی ڈگریوں کی بے اندازہ قدر ہوگی۔ اس مقصد کے حصول کا صحیح ذریعہ یہ نہیں ہے (اگرچہ سرجگدیش کے خطبۂ صدارت سے یہ ترشح ہوتا ہے) کہ یونیورسٹیوں سے علحدہ کوئی اور غیر معمولی ادارہ یا (super-university) تحقیقات علمی کے لئے قائم کی جائے۔ سائنس کے لئے البتہ اس قسم کے چند ادارے مفید ہو سکتے ہیں لیکن بالعموم انھیں یونیورسٹیوں کو جو آج کل زیادہ تر محض امتحان لینے اور سندیں تقسیم کرنے کا کام کرتی ہیں قوم کی علمی اور ادبی زندگی کا مرکز اور خزانہ ہونا چاہیے کیوں کہ تعلیم اور تعلّم اور علمی تحقیقات میں ایک لازمی، نفسی رابطہ ہے جس کو قایم رکھنے سے طلبا اور اساتذہ دونوں کو فائدہ پہونچتا ہے اور دونوں کی دماغی جد و جہد زرخیز ہوتی ہے۔ ملک کی تمام یونیورسٹیوں کو باہم مل کر اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس زبردست علمی فرض کو کس طرح انجام دے سکتی ہیں اور اپنی تمام تعلیم کا (جس کے معنی لازماً یہ نہیں ہیں کہ امتحانوں کا) معیار زیادہ بلند کر سکتی ہیں۔ اگر نوعیت کو بہتر بنانے کے لئے ان کو تعداد کم کرنا پڑے، نا اہلوں کو داخل ہونے سے روکنا پڑے تو انھیں اس پالیسی کے لئے تیار ہو جانا چاہیے کیوں کہ عوام کی تعلیم کی اصل منزل دراصل ثانوی تعلیم ہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم انھیں کے لئے مخصوص ہونی چاہیے جو اپنی بہتر دماغی قابلیت اور فطری صلاحیت کے باعث اس سے بجا طور پر مستفید ہو سکتے ہیں ورنہ بے سوچے سمجھے یونیورسٹیوں کا دروازہ ہر کس و ناکس پر کھول دینے سے نہ صرف تعلیم کا معیار پست ہوتا ہے بلکہ ان غریبوں پر بھی ظلم اور زیادتی ہے جن کو قدرت نے اس کام کے لئے موزوں نہیں بنایا۔ ان کے لئے اور بہت سی راہیں کھلی ہیں یا کھولی جا سکتی ہیں جن میں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل اور مکمل اظہار کر سکتے ہیں اور اپنی ذات کو اور سوسائٹی کو زیادہ فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔ یہ اصول یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ دونوں پر عاید ہونا چاہیے!

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

یہ جامعہ ہندوستان کی اُن معدودے چند مفید اور قابل قدر تعلیم گاہوں میں سے ہے جو نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ قوم اور مذہب کی خدمت کر رہی ہیں اس کو خوش قسمتی سے چند ایسے خادم نصیب ہو گئے ہیں جن میں علاوہ علمی قابلیت کے ایثار اور خلوص کا مادہ ہے اور جو بے نفسی کے ساتھ علم کی خدمت کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اگر تعلیم گاہوں کی قدر اور کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ ان میں کس قسم کے انسان کام کرتے ہیں اور وہ کس قسم کے انسان اپنے ہاں پیدا کرتی ہیں تو جامعہ ہر طرح سے قدر کے قابل اور کامیابی کی مستحق ہے۔ یونیورسٹی انسانوں سے بنتی ہے، عمارتوں، ساز و سامان آمدنی و کتب سے نہیں بنتی۔ یہ بھی مفید ہیں لیکن اس صورت میں جب عمدہ اور پختہ سیرت اساتذہ کی شخصیت ان سے کام لے اور ان کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے جامعہ نے اس بنیادی اصول کو سمجھ لیا ہے اور اسی میں اس کی آئندہ کامیابی کی بشارت مضمر ہے۔ ہم اس نمبر میں اپنے محترم دوست جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا پُر جوش مضمون شائع کرتے ہیں۔ اس میں انھوں نے ملک کی تعلیم کے مسئلہ پر بعض نہایت سچی اور نہایت تلخ اور نہایت دور رس باتیں کہی ہیں جن کی جانب ناظرین کی توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اب تک ملک نے اس تعلیم گاہ کی معقول امداد نہیں کی اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی قابل احترام خدمات کا کوئی نمایاں شان اعتراف نہیں کیا۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر جناب شیخ الجامعہ نے یوم تاسیس کے جلسہ میں جو تقریر کی اس کا ایک ایک لفظ ملک کے صاحبان دولت و ثروت کے لئے تازیانۂ عبرت و غیرت ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ ان کی اس تقریر کے چند ہی روز کے بعد ان کے پاس مدراس کے ایک علم دوست رئیس التجار سیٹھ جمال محمد صاحب کی دعوت آئی اور وہاں سے ان کے لئے چالیس ہزار روپیہ کا وعدہ ہوا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ان کے خلوص اور ایثار اور جذبۂ عمل کو مشکور کرے اور ان کو روز افزوں کامیابی عطا کرے۔

نئے تعلیمی تجربے ہمارا ارادہ ہے کہ تعلیم و تربیت میں ایک سلسلۂ مضامین ان تمام تعلیم گاہوں کے متعلق شائع کریں جو ملک میں اپنے اپنے خیال کے مطابق صحیح قسم کی تعلیم کو رواج دینے اور پامال راستوں سے ہٹ کر آزاد تعلیم کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ مضامین حتی الامکان ایسے صاحبان سے لکھائے جائیں گے جو اپنے اپنے موضوع سے بخوبی واقف ہیں اور بغیر تعصب یا بے جا طرف داری کے ان کی خصوصیات پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ گویا جدید تعلیمی تحریکات کا ایک نقشہ ناظرین کے سامنے پیش کرے گا۔

چنانچہ اس مرتبہ ایک مضمون جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا شائع کیا جاتا ہے اور ایک مضمون پروفیسر محمد حبیب صاحب کا "گروکل کی تعلیم پر"۔ پروفیسر صاحب موصوف نہ صرف اپنے ذاتی مشاہدہ کی وجہ سے بلکہ اپنے مخصوص انداز طبیعت اور وسیع مطالعہ کی وجہ سے اس مشکل مضمون پر اظہار خیال کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جیسا کہ ناظرین کو خود اندازہ ہوگا۔

آئندہ ہم "تعلیم و تربیت" کے نمبروں میں مسلم یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، جامعۂ عثمانیہ، شانتی نکیتن، سابرمتی آشرم، ندوہ وغیرہ مخصوص تعلیم گاہوں کے متعلق مضامین شائع کریں گے اور ممکن ہے کہ بعد میں اگر ناظرین نے ان کو پسند کیا تو ان سب کو ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

ہم نے گزشتہ مرتبہ "خاموش مطالعہ" پر جو مضمون شائع کیا تھا اس کے متعلق بہت سے احباب کے ہمارے پاس خطوط اور پیغام پہنچے ہیں کہ اس مسئلہ پر اور روشنی ڈالی جائے اور اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے کیوں کہ یہ ایک ایسا عملی سوال ہے جو ہر استاد کے روزمرہ کے کام میں پیش آتا ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج میں کچھ کام کیا جا رہا ہے اور ہمیں امید ہے کہ

جب اس سے کچھ نتائج مرتب ہوں گے تو ان کو ناظرین اور اساتذہ کے سامنے پیش کیا جائے۔
اس مرتبہ میں ہم ایک اور نہایت اہم تعلیمی تجربہ کی طرف اساتذہ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔
جس کا مختصر بیان اقتباسات کے سلسلہ میں دیا ہوا ہے۔ یہ وہ تجربہ ہے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں یوم تاسیس
کے موقع پر کیا گیا ہے اس میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے امید ہے اور مدرسوں کے اساتذہ کو ہمت
ہوگی کہ وہ بھی اس قسم کا عملی اور تخلیقی کام اپنے ہاں کرائیں۔ اور دیکھیں کہ کس طرح اس قسم کے مشاغل سے
جن میں اشتراک عمل ہوتا ہے جذبۂ تخلیق کی تشفی ہو کر طالب علم اور اس کی مادر تعلیمی کا رشتۂ الفت
مستحکم ہو جاتا ہے اور مدرسہ کے تمام معمول میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس عملی تجربہ کے بنیادی اصولوں
کا بیان "ایک انقلاب آفریں معلم" میں کیا گیا ہے۔ سینڈرسن نے اس قسم کے دستی کاموں کی نمائش
(Convereazione) کو ایک سالانہ دستور بنا دیا تھا اور اپنے روزمرہ کے کام کی بہت
کچھ بنیاد اس پر رکھی تھی ہمیں امید ہے کہ اساتذہ "تعلیم جدید" کے اصل اصول کو بخوبی سمجھ لیں گے
(اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں گے) کہ وہی تعلیم دیرپا اور موثر ہوتی ہے جو تعمیری اور تخلیقی مشاغل کے
ذریعہ دی جائے کیوں کہ محض کتابیں اس گوناگوں عملی اور جذباتی زندگی کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں جو
بچوں کو فطرت نے عطا کی ہے۔

انجمن تعلیم جدید
New Education Fellowship

گزشتہ مرتبہ ہم نے جنیوا کے بین الاقوامی ادارہ تعلیم کا رسالہ میں ذکر کیا تھا اس مرتبہ ہم اپنے ناظرین کا تعارف ایک اور بین الاقوامی تعلیمی جماعت سے کراتے ہیں جس کا نام درج عنوان ہے اس کی تین بہت بڑی شاخیں ہیں ایک انگلستان میں ایک فرانس میں، ایک جرمنی میں۔ ان تینوں کی طرف سے ایک نہایت مقتدر تعلیمی رسالہ (سہ ماہی) شائع ہوتا ہے۔ انگریزی رسالہ
کا نام The New Era ("عصر جدید") ہے اور اس کے فرانسیسی اور جرمن ہم عصروں کا نام
بھی اسی کے مرادف ہے۔ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تعلیم جدید کے متعلق تمام بین الاقوامی
تحریکات اور خیالات پر ریویو کرتا ہے اور اس میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کو تازہ ترین تجربوں

اور مقامی کوششوں سے باخبر رکھتا ہے۔ اس کا تازہ ترین نمبر خاص طور پر "انگریزی کی تعلیم" کے مبحث سے تعلق رکھتا ہے۔ اور نہایت ہی مفید اور رامنگ پیدا کرنے والے مضامین پر مشتمل ہے۔ ادب کے ہر اُستاد کے لئے اس کا مطالعہ سودمند ہوگا۔ علاوہ ان تین رسالوں کے جو خاص طور پر اس انجمن کی نگرانی میں نکالے جاتے ہیں۔ گیارہ مختلف ممالک اور مختلف زبانوں کے تعلیمی رسالے اس سے ملحق ہیں یعنی وہ ان بنیادی اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں جو انجمن نے اپنے مقاصد میں رکھے ہیں۔ لیکن ان کے مضامین مقامی ضروریات کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد اور اصولوں کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے امید ہے کہ ناظرین کو اس سے دلچسپی ہوگی۔

اصول

۱۔ تعلیم کا مقصد اعلیٰ یہ ہونا چاہیئے کہ بچہ کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ مادہ پر روح کی فضیلت اور تسلط کا خواہشمند ہو اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس احساس فضیلت کا اظہار کرے لہٰذا تعلیم جدید کا ہمیشہ یہ مقصد ہونا چاہیئے (خواہ معلم دوسرے مسائل میں کوئی نقطۂ نظر رکھتا ہو) کہ بچہ کی روحانی قوت کو فروغ دیا جائے۔

۲۔ اس مقصد کو خاص طور پر بچہ کے طریقۂ تربیت discipline میں ملحوظ رکھنا چاہیئے معلم کو بچہ کی شخصیت کا مطالعہ اور احترام کرنا چاہیئے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی انفرادیت اسی وقت نشو و نما پاسکتی ہے جب اس کی تربیت کے انتظام میں اس کی روحانی قوتوں کو آزادئ اظہار حاصل ہو۔

۳۔ جدید طرز کے مدارس میں تعلیم ایسی ہونی چاہیئے (خواہ اس کا مقصد حصول علم ہو یا کیرکٹر اور عمدہ جذبات کی نشو و نما کے ذریعے طلباء کو بعد کی زندگی کے لئے تیار کرنا) جو طلباء کے فطرتی شوقوں کو اُبھارے اور بڑھائے یعنی ان شوقوں کو جو خود بچہ کی ذات سے بغیر کسی بیرونی اثر کے ظاہر ہوتے ہیں۔ مدرسہ کے نصاب میں ان تمام شوقوں کی تکمیل کے لئے انتظام اور مواقع ہونے چاہئیں خواہ

تو کن زبانوں میں ؟

۷۔ کیا اس قسم کی کوئی تحقیق و تفتیش جیسی کہ ہم کر رہے ہیں آپ کے ملک میں پہلی ہوئی ہے اگر ہوئی ہے تو کب اور کس نے کی ہے ؟

۸۔ کیا اس تحقیقات کے نتائج شائع ہوئے ہیں ؟ کیا آپ ان کے متعلق ہمیں کسی کتاب یا مضمون وغیرہ کا حوالہ بتا سکتے ہیں۔

۹۔ کیا آپ ہمیں کچھ اور لوگوں (اڈیٹر، استاد، والدین، پبلیشر وغیرہ) یا جماعتوں کا پتہ دے سکتے ہیں جو اس کام میں دلچسپی رکھتے ہیں؟

۱۰۔ کیا آپ ان تحقیقات کا نتیجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں؟

(اس تحقیقات میں بچوں کی کتابوں سے مراد ۳ برس کے بچوں سے لے کر ۱۶ برس کے طالب علموں تک کی کتابوں سے ہے)

یہ لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص تعلیمی شعبہ میں ہمارا ملک دوسرے ممالک سے کس قدر پیچھے ہے۔ یہاں ابھی بچوں کے لئے خاص طور پر کتابیں لکھنا اور ان کو شائع کرنا ضروری ہی نہیں سمجھا گیا ہے اور اب اگر کچھ اشاعت کرنے والوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی ہے تو وہ نہ ضرورت کے لحاظ سے بلکہ مالی فائدہ کی غرض سے۔ اس لئے ان کتابوں میں (جن کی تعداد بہت کم ہے) بہت سے نقص پائے جاتے ہیں ان کی لکھائی چھپائی خراب اور ناموزوں ہوتی ہے۔ ان کی زبان ... ہوتی ہی نہیں یا اس قدر خراب ہوتی ہیں کہ ان کا نہ ہونا بہتر ہوتا۔ وہ بالعموم ایسے لوگوں سے لکھائی جاتی ہیں جن کو نفسیات اطفال سے آگاہی نہیں ہوتی۔ اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ جو کتاب بڑوں کے لئے موزوں ہے بچوں کے لئے بھی موزوں ہے۔ اگر عبارت آسان کر دی جائے، اور چند زیادہ مشکل حصوں کو حذف کر دیا جائے۔ اچھی کتابیں اس الزام سے ضرور مستثنیٰ ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے۔

ہم جو کچھ بھی بچوں کا لٹریچر ہندوستان میں موجود ہے (اور جو ہمیں اس وقت اردو زبان کے

ادب سے بحث ہی) اس کو مدوّن کرنا اور استادوں کے لئے اس کو سہل الحصول بنانا نہایت ضروری ہے۔ اس وقت تو اکثر استاد یہ بھی نہیں جانتے کہ بچوں کے قابل کیا کیا کتابیں لکھی گئی ہیں اور وہ کہاں سے اور کس قیمت پر مل سکتی ہیں۔ اس لئے ہم تمام ناظرین "تعلیم و تربیت" سے بالخصوص استاد انسپکٹروں اور اشاعت کرنے والی انجمنوں اور تعلیم گاہوں اور دوکانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بچوں کی کتابوں کی فہرستیں وغیرہ ہمارے پاس بھیج دیں تاکہ ہم اس مفید تحقیقات تعلیمی میں حصہ لے سکیں۔ اور اردو زبان میں جس قدر بچوں کا ادب موجود ہے اس کی ایک مستند اور قابل اعتبار فہرست (مع تمہیدی اور تشریحی نوٹ کے) تیار کر سکیں۔

ہمارا آئندہ نمبر

ہمارا آئندہ نمبر اس دفعہ کی تاخیر کی تلافی کرنے کے لئے انشاء اللہ بہت جلد شائع ہوگا۔ اور اس میں کئی بلند پایہ تعلیمی مضامین ہوں گے۔ ایک نیا مضمون ہمارے محترم بزرگ عبداللہ یوسف علی صاحب کا ہوگا۔ ایک مضمون ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کا اپنی تعلیم گاہ پر اور ایک ریورنڈ ہارپر کا موگا کے ٹریننگ سکول کے متعلق شائع کیا جائے گا اس کے علاوہ جامعۂ ازہر پر موعودہ مضمون اور بعض دیگر قابل قدر مضامین سال دوم کے پہلے نمبر کی زینت ہوں گے۔

اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اس سال کانفرنس کا سالانہ اجلاس دسمبر کی آخری تاریخوں یعنی ۲۸، ۲۹، ۳۰ کو اجمیر میں منعقد ہوگا۔ آنریبل مسٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد نے اجلاس کی صدارت کو منظور فرمایا ہے۔ ہم مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اور اس میں عملی حصہ لینے والے اصحاب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کافی تعداد میں کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوں اور اپنی عملی ہدایت اور تجاویز سے کانفرنس کو مستفید کریں اور اس کو سال بسال زیادہ سود مند اور مفید تعلیمی جماعت بنائیں۔ جب تک استاد اور دیگر ماہرین تعلیم اس میں دلچسپی نہ لیں گے کانفرنس ملک کی تعلیمی اصلاح پر کوئی زبردست اثر نہ ڈال سکے گی۔

دو سال ہوئے دہلی کے اجلاس کانفرنس میں یہ تحریک پاس ہوئی تھی کہ ایک سہ ماہی تعلیمی رسالہ نکالا جائے۔ اس خواہش کی تکمیل یہ رسالہ "تعلیم و تربیت" ہے۔ گزشتہ سال مدراس کانفرنس میں یہ قرارداد پاس ہوئی تھی کہ کانفرنس اسلامی مدارس میں سکاؤٹنگ کو رواج دینے کی خدمت اپنے ذمہ لے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے تامل اور پس و پیش کے بعد ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کانفرنس نے اس مسئلہ میں عملی دلچسپی لینی شروع کی ہے اور وہ اردو میں سکاؤٹنگ پر ایک مفصل کتاب شائع کرنے والی ہے۔ علاوہ اس کے یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ ایک ٹرینڈ سکاؤٹ آرگنائزر کی خدمات حاصل کی جائیں جو مختلف سکولوں وغیرہ میں سکاؤٹنگ کو جاری کرے اور تحریک کو منتظم کرنے میں مدد دے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ کانفرنس کے کارکن اس کام میں مستعدی اور ہمت سے کام لیں گے اور اس کو جلد عملی جامہ پہنائیں گے۔

دو نہایت ضروری تجاویز البتہ ایسی ہیں کہ ان پر کانفرنس نے اب تک کوئی عمل نہیں کیا۔ دہلی کے اجلاس میں یہ قرارداد پاس ہوئی تھی کہ کانفرنس اردو میں فن تعلیم پر کتابیں شائع کرائے تاکہ اس شعبہ میں جو اب تک بالکل خالی ہے کچھ مفید اور ضروری کتابوں کا اضافہ ہو جائے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے کانفرنس نے اب تک اس معاملہ میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ ہم کانفرنس کے کارکنوں کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں۔

دوسرے ہم نے گزشتہ سال یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہر سال ایک کانفرنس استادوں اور ماہرینِ تعلیم کی ہونی چاہئے جس میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے ملک کے مختلف تعلیمی کارکنوں اور اساتذہ کو دعوت دی جائے کہ وہ اس میں شریک ہو کر تعلیمی مباحث کے متعلق تبادلۂ خیالات کریں۔ اعلیٰ علمی معیار کے مضامین پڑھیں اور ملک اور قوم کی تعلیمی اصلاح کے لئے صحیح تجاویز سوچیں۔ اس تحریک کے متعلق اب تک کانفرنس نے کوئی غور نہیں کیا۔ کانفرنس کے وہ سالانہ اجلاس جو آج کل ہوتے ہیں زیادہ تر عوام کے لئے ہیں ان کا مقصد تعلیم کی تبلیغ ہے اور اس کے لئے پروپیگنڈا کرنا ہے اور مقامی لوگوں میں تعلیمی ترقی کے متعلق جوش اور سرگرمی پیدا کرنا۔ اگر ممکن ہو تو کچھ چندہ جمع کرنا۔

اور اس قسم کے ریزولیوشن پاس کرنا جو مختلف انتظامی جماعتوں اور حکومتوں کے پاس بھیج دیئے جائیں تاکہ مسلمانوں کے تعلیمی حقوق کی حفاظت ہو۔ یہ سب چیزیں بھی اپنی جگہ پر ضروری ہیں لیکن اس قسم کی کانفرنسوں کی حیثیت ماہرین فن کے اجتماع کی نہیں ہو سکتی۔ وہاں علمی مضامین کا نہ موقع ہے نہ قدر۔ اس کے لئے علاحدہ کانفرنس کی ضرورت ہے جس کی نوعیت ایسی ہو جیسی سائنس کانگریس یا اورنٹیل کانفرنس یا اکونامک کانفرنس کی جس میں صرف وہی لوگ جمع ہوتے ہیں جو اپنے فن کے کسی شعبہ کے متعلق قابل قدر خیالات کا اظہار کرکے حاضرین کے علم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس قسم کا تعلیمی اجتماع جو مختلف علمی مراکز میں منعقد ہو ایک نہایت ضروری اور مفید مقصد کو پورا کرے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اپنے گزشتہ جلسہ میں جو اپریل میں منعقد ہوا مسلم یونیورسٹی کورٹ نے چانسلر کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کو فی الجملہ منظور کیا تھا اور اس کی مختلف تجاویز پر غور کرنے اور ان پر عملدرآمد کرانے کے لئے کچھ کمیٹیاں بنائی تھیں۔ مقصود یہ تھا کہ بہت جلد ان تمام تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

ایک کمیٹی دستور اساسی کے متعلق ترمیمات پیش کرنے کے لئے بنی تھی سنا ہے کہ اس کا کوئی جلسہ ہوا تھا اور اس نے کچھ تجاویز مرتب کی ہیں۔ لیکن ان کو اب تک شائع نہیں کیا گیا۔ اگر شائع کر دیا جاتا تو اس میں یہ فائدہ تھا کہ لوگوں کو ان پر اظہار خیال کرنے کا موقع ملتا اور کورٹ کو فیصلہ کرتے وقت کمیٹی اور پبلک دونوں کے خیالات سے آگاہی ہوتی۔ ایک اور کمیٹی یونیورسٹی کے اندرونی نظام اور اساتذہ وغیرہ کے متعلق اصلاحی تجاویز پیش کرنے کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ یہ نہایت اہم کام تھا مگر اب تک اس کمیٹی کا کوئی جلسہ نہیں ہوا۔

ایک تیسری کمیٹی نیا پرو وائس چانسلر یا سپیشل آفیسر تجویز کرنے کے لئے منتخب ہوئی تھی اس نے کئی ماہ کے بعد یعنی اگست میں بھوپال میں جمع ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ اخباروں میں اشتہار دے کر اس جلیل القدر عہدے کے لئے درخواستیں طلب کی جائیں۔ بہتر ہوتا کہ اگر یہی صورت اختیار کرنی تھی تو کورٹ کے جلسے کے فوراً بعد ہی کی جاتی۔ اس کے بعد ہم کو معلوم نہیں اب تک کیا کارروائی ہوئی ہے

سُنا گیا ہو کہ جناب نواب صاحب بھوپال انگلستان تشریف لے گئے تھے اور وہاں اُنھوں نے بعض مقتدر ماہرین تعلیم سے گفت و شنید کی لیکن بوجوہ ان میں سے کوئی شخص آنے کے لئے تیار نہ ہوا چنانچہ اب ہم پھر وہیں ہیں جہاں ابتدائے سال میں تھے۔ ہم حکام یونیورسٹی کو دوبارہ با دب یہی مشورہ دیتے ہیں کہ

دلا تا رائی پروانہ تا کے
طوافِ آتشِ بے گانہ تا کے!

ان کو چاہئے کہ وہ کسی قابل تجربہ کار اور صاحب تخیل مسلمان ماہر تعلیم سے درخواست کریں کہ وہ اس یونیورسٹی کی ناخدائی کو قبول کر کے موجودہ بے اطمینانی کی حالت کو دور کرے۔

